1
محمد صلی اللہ علیہ وسلم
نورِ سرمدی
فخرِ انسانیت
محمد فتح اللہ گولن

نور سرمدی

فخر انسانیت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(جلد اول)

(İNSANLIĞIN İFTİHAR TABLOSU

SONSUZ NUR-1)

مؤلف

محمد فتح اللہ گولن

مترجم

محمد اسلام

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی شکل میں یا کسی بھی ذریعے سے خواہ وہ الیکٹرانک، میکینکل بشمول فوٹو کاپی، ریکارڈنگ یا کسی اطلاع کو محفوظ کرنے یا معلومات کے حصول اور اصلاح کی غرض سے دوبارہ شائع نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی منتقل کیا جاسکتا ہے۔

نام کتاب : نور سرمدی، فخر انسانیت حضرت محمد ﷺ (جلد اول)

مصنف : محمد فتح اللہ گولن

ترجمہ : محمد اسلام

نظر ثانی : شازیہ یعقوب

ناشر : ہارمنی پبلی کیشنز
ہاؤس نمبر 9، مین ڈبل روڈ۔ایف ٹین ٹو اسلام آباد
فون: 92-051-2212250
فیکس: 92-051-2212186

تعداد 16,000

اشاعت 2011ء

9, Main Double Road, F-10/2,
Islamabad-Pakistan
Tel: +92-51-2212250, Fax: +92-51-2112186
www.harmonypublications.pk
harmony.publications@gmail.com

فہرست مضامین

فہرست مضامین

کچھ مصنف کے بارے میں 15

مقدمہ از مصنف 25

تمہید: نبی مرسل اور رحمت للعالمین ﷺ

الف: صبح منتظر 39

ب: دورِ تاریکی 43

۱- دور جاہلیت میں بت پرستی 43

۲- کلیاں جنہیں مسل دیا جاتا تھا 44

۳- نئی اقدار 47

۴- خدائی بندوبست 48

۵- نورِ منتظر 51

۶- عظیم بدلہ 51

ج: علاماتِ نبوت 53

۱- شام کا سفر اور بحیری راہب سے ملاقات 53

۲- شام کا دوسرا سفر 54

د: نبی منتظر جس کی بشارت سنائی جا چکی تھی 55

۱- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسی علیہ السلام کی بشارت 55

۲- تورات کی بشارتیں 56

الف- فاران کے پہاڑیاں 56

ب- وہ نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ہوگا 57

ج- دیگر اوصاف 59

۳- انجیل کی بشارتیں 61
الف- فارقلیط 61
ب- سردار جہاں 63
ہ: وہ جس کی آمد کا ایک زمانے سے انتظار تھا 65
و: اہل کتاب ایمان کیوں نہ لائے؟ 67
۱- بغض اور حسد 67
۲- مسابقت کا جذبہ 70
۳- دیگر اسباب 74
ز: ایک نیا پہلو اور ایک نئی جہت 75

پہلا حصہ: انبیاء ورسل علیہم السلام

پہلا باب: بعثت انبیاء کے مقاصد 81
الف- عبادتِ خداوندی 83
ب- تبلیغ دین 85
ج- اسوہ حسنہ 91
د- دنیا وآخرت کے درمیان توازن کی ضمانت 95
ہ- اتمام حجت 97

دوسرا باب: انبیائے کرام علیہم السلام کی خصوصیات اور صفات 99
الف- للٰہیت 99
ب- خلوت اور یادِ الٰہی 100
ج- اخلاص 103
د- موعظہ حسنہ 105
ہ- توحید کی دعوت 108

تیسرا باب: انبیائے کرام کے اوصاف اور ان کی نبی کریم ﷺ کی نظر میں اہمیت 109
پہلی فصل: سچائی 109
سچے لوگ تعریف کے مستحق 111
سچائی اور رسول اللہ ﷺ 114
الف: رسالت سے پہلے آپ کی امانت داری 114
ب: ہمیشہ سچائی کا درس دینے والی شخصیت 117
ج: آپ ﷺ کی گفتگو آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل 126
پہلی قسم: دورِ نبوی سے متعلق غیب کی خبریں 130
دوسری قسم: مستقبل سے متعلق پیش گوئیاں 132
الف- مستقبل قریب کے بارے میں پیش گوئیاں 132
۱- فتنے 133
۲- نصرتِ خداوندی 134
۳- تم مجھ سے سب سے پہلے ملوگی 134
۴- صلح 135
۵- وہ ایک صدی جیئے گا 136
۶- غزوہ خندق کے موقع پر بیان کردہ پیش گوئیاں 136
۷- امن اور مالی فراوانی کی خوشخبری 138
۸- حضرت عمارؓ کی شہادت 139
۹- دائرہ اسلام سے نکل جانے والی جماعت 140
۱۰- حضرت ام حرامؓ اور بحری سفر 142
ب: مستقبل بعید سے متعلق پیش گوئیاں 143
۱- بنو قنطورا 143
۲- فتح استنبول (قسطنطنیہ) 143
۳- وہن 145
۴- فتنۂ اشتراکیت 147
۵- دریائے فرات کا خزانہ 148

۶- عیسائیت کا اپنی اصل روح کو اختیار کرنا	148
۷- زرعی اصلاحات	149
۸- دورِ حاضر کا عدم توازن	149
۹- علم کا عام ہونا	150
۱۰- قرآن کریم سے دوری	151
۱۱- زمانے کا مفہوم	151
۱۲- سود کا عام ہونا	152
۱۳- اہل ایمان کے روپوش ہونے کا وقت	153
۱۴- طالقان میں تیل کی دریافت	154
۱۵- اہل کتاب کی پیروی	155
تیسری قسم: مختلف علوم سے متعلق پیش گوئیاں	156
الف- ہر بیماری کا علاج	156
ب- جذام اور احتیاطی تدابیر	160
ج- کتے کا جھوٹا	161
د- کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا	163
ہ- مسواک: منہ اور دانتوں کی صفائی	164
و- کھانے میں میانہ روی	165
ز- سرمہ	165
ح- کلونجی	166
ط- مکھی	167
ی- ایک اہم طبی انکشاف	167
ک- شراب میں شفا نہیں	168
ل- ختنہ	168
دوسری فصل: امانت داری اور ثقاہت	**170**
امانت داری اور رسول اللہ ﷺ	**172**
الف: تبلیغِ احکام میں امانت داری	173

ب: ساری کائنات کے بارے میں امین 176
ج: امت کو امن کی تعلیم 180
د: بے پناہ توکل 185
ہ: امید کی کرنیں 190

تیسری فصل: تبلیغ 191

تبلیغ کے تین بنیادی اصول 193
۱- مخاطب کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا 193
۲- بدلے کی توقع نہ رکھنا 194
۳- نتائج کو اللہ کے سپرد کرنا 194

نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ کے تناظر میں تبلیغ کی اہمیت 200
الف: آپ ﷺ کی دعوت کے اہم اصول 200
۱- باطنی فراست 200
۲- دعوت کو پہلے خود اپنانا 204
۳- دعوت بلا معاوضہ 208
ب: دعوت و تبلیغ آپ ﷺ کی فطرتِ ثانیہ 212
ج: دعوت و تبلیغ کا ولولہ 214
۱- وحشی کو دعوتِ اسلام 215
۲- عکرمہ کو دعوتِ اسلام 218
د: دعوت کے غم نے آپ ﷺ کی نیند اڑا دی 221
ہ: سربراہانِ ممالک کے نام خطوط 225
۱- نجاشی کے نام خط 225
۲- ہرقل کے نام خط 226
۳- دیگر سلاطین کے نام خطوط 228
و: صلح حدیبیہ کا دعوتی پہلو سے جائزہ 230

ز: انفرادی دعوت 231
ح: اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی نگرانی وحفاظت 233

چوتھی فصل: فہم وفراست 236

رسول اللہ ﷺ کی فہم وفراست 238
الف: آپ ﷺ کی فہم وفراست کی چند مثالیں 240
۱- تعمیر کعبہ 240
۲- حضرت حصین رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام 241
۳- ایک بدوی سے اس کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو 242
۴- غزوہ حنین کے موقع پر انصار سے خطاب 244
ب: رسول اکرم ﷺ اور جوامع الکلم 250
۱- گلدستۂ احادیث کا تجزیہ 257
الف: توحید پر مشتمل سب سے بہترین کلمات 257
ب: انسان ایک مسافر 258
ج: سچ اور جھوٹ کا انجام 258
د: انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہوتا ہے 260
ہ: تقویٰ 261
و: جیسی رعایا ویسے حکمران 262
ز: نیت کی اہمیت 265
۱- نیت 265
۲- ہجرت 267
الف: گناہوں سے ہجرت 268
ب: رحمت الٰہی کی طرف ہجرت 268
ح: زبان اور ہاتھ کا وبال 270
۱- مثالی مسلمان 270

	۲- مسلمان اور سلامتی	271
	۳- ہاتھ اور زبان کا انتخاب کیوں؟	272
ط:	اسلام کی زینت: لایعنی سے اجتناب	274
	۱- انسان کا ظاہر اُس کے باطن کا پرتاؤ	274
	۲- سنجیدگی اور مرتبہ احسان کو ملحوظ رکھنا	275
	۳- ہر کام خوبی سے کرنا	276
ی:	صبر	277
ک:	اوپر والا ہاتھ	280
	۱- وصیتیں	282
	۲- بین الاقوامی معیار	282
ل:	تین قسم کے لوگ جن کی مغفرت نہ ہوگی	283
	۱- تین محرومیاں	284
	الف- ہم کلامی سے محرومی	284
	ب- نظر الٰہی سے محرومی	285
	ج- مغفرت سے محرومی	285
	۲- انجام: دردناک عذاب	286
	۳- غرور اور تکبر	286
	۴- احسان جتلانے والا	287
	۵- مکافاتِ عمل از جنس عمل	288
م:	عفت اور زبان کی آفات	289
	۱- گفتگو کی صلاحیت ایک عظیم نعمت	290
	۲- گفتگو کا ایک ادب	291
	۳- مابین رجلیہ	291
	۴- عمودی ولایت	292
	۱- نماز ایک عظیم مقصد	296
	۲- نماز کی تیاری	297

۳- گناہوں کی مغفرت 299
۴- الرباط 299
س: صالح افراد کیلئے غیر متوقع اجر 302
ع: جنت ناگوار امور سے اور جہنم خواہشات سے ڈھانپی ہوئی ہے 305
ف: تین حقوق: اللہ کا حق، ریاست کا حق اور دین کا حق 309
ص: ایک بل سے دوبارڈسا جانا 310
ق: لوگ معادنیات کی طرح ہیں 311
ر: ظلم کا انجام برا ہوتا ہے۔ 312
ش: رحمان کے عرش کے سائے تلے 313
ت: دنیا ایک سایہ 316
ث: سید البشر ﷺ کی پانچ خصوصیات 316
خ: مؤمن بحیثیت ایک ذمہ دار انسان 319
ذ: حرام اور مکروہات کی بعض اقسام 321
۱- ماں کی نافرمانی 321
۲- بیٹیوں کو زندہ در گور کرنا 321
۳- امانت میں خیانت 321
۴- افواہیں 322
۵۔ کثرتِ سوال 323
ض: احسان 324
۲- آپ ﷺ کی دعاؤں کا گلدستہ 325
ج: آپ ﷺ کی رحمت آپ کی فراست کا ایک پہلو 332
۱- رحمت میں افراط وتفریط 332
۲- ہیومن ازم (Humanism) کا فریب 333
۳- آپ ﷺ کو ہر معاملے میں درجہ کمال حاصل تھا۔ 334

۴- عالم گیر رحمت 337

۵- بچوں پر شفقت 342

۶- حیوانات پر شفقت 344

د: بردباری 348

ہ: آپ ﷺ کی سخاوت اور تواضع پسندی 362

۱- آپ ﷺ کی سخاوت کی ایک جھلک 362

۲- آپ ﷺ کی تواضع پسندی 370

الف- لوگوں کے درمیان 372

ب- فطرت سے ہم آہنگ رویہ 373

ج- تواضع اور عبدیت 374

و: حاصل گفتگو 377

پانچویں فصل: عصمت 378

دوسرا حصہ: نبی کریم ﷺ بحیثیت مربی

پہلی فصل: نبی کریم ﷺ بحیثیت مربی اور سربراہ خانہ 381

الف: نبی کریم ﷺ بحیثیت سربراہ خانہ 382

ب: رسول اللہ ﷺ کی نظر میں ازواجِ مطہرات کی قدر ومنزلت 387

ج: ازواجِ مطہرات کے ساتھ مشاورت 389

د: واقعہ تخییر 391

دوسری فصل: نبی کریم ﷺ بحیثیت باپ 396

الف: آپ ﷺ کا اپنی اولاد اور نواسے نواسیوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ 398

ب: رسول اللہ ﷺ کی حضرت فاطمہ سے محبت وشفقت 401

ج: رسول اللہ ﷺ کا اپنی اولاد کو ابدی زندگی کے لیے تیار کرنا 403

د: آپ ﷺ کے گھر میں تربیت کی عمومی فضا 408

تیسری فصل: نبوی تربیت اور اس کا طریق کار 410

الف: روحانی، قلبی اور فکری بلندی 414

ب: نبوی دعوت کی عالمگیریت 415

ج: حرکت اور عمل 421

د: تجارت، زراعت اور جہاد 423

ہ: علم سے متعلق ایک ملاحظہ 425

چوتھی فصل: نبوی نظام تعلیم و تربیت کی بعض مثالیں 428

الف: مسجد میں پیشاب کرنے والے بدوی کے سات آپ ﷺ کا برتاؤ 428

ب: رسول اللہ ﷺ کی نظر میں عورت کا مقام 429

ج: پیکر استغنا 431

د: دورِ جاہلیت کی ایک جھلک 433

ہ: سخاوت اور ایثار 439

و: حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی شجاعت 441

ز: مہاجر سوار 442

ح: حق پر قائم رہنے والا 443

ط: واقعہ ماعز اور ضمیر کی نگرانی کا نظام 444

پانچویں فصل: رسول اللہ ﷺ کے تیار کردہ روحانی ماحول میں تربیت پانے والی عبقری شخصیات 448

الف- علمی میدان میں محمدی درسگاہ کی عبقری شخصیات: 452

۱- علم فقہ 452

۲- علم تفسیر 453

۳- علم حدیث 454

۴- وضعی علوم 455

ب- روحانی دنیا کے ہیرو 456
ج- خطباء 458

تیسرا حصہ: مشکلات کا حل پیش کرنے میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی ثانی نہ تھا

تمہید 461

پہلی فصل: قائد اور پیغام زندگی 463
الف: آپ ﷺ کی شخصیت: پرعزم و پُر اعتماد 464
ب: مالداروں کا امتیازی برتاؤ کا مطالبہ 466

دوسری فصل: قائد اور انسانی پہلو 468

تیسری فصل: قائد اور مناسب مقام پر صلاحیتوں کا استعمال 471
الف: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ 472
ب: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ 474
ج: حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ 476
د: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ 478
ہ- ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن 479

چوتھی فصل: نور وحی سے منور فراست کے مالک 480
الف: حجر اسود کے بارے میں فیصلہ 482
ب: غزوہ حنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم 484

ج: مسئلہ ہجرت 485
۱- استغنا اور سخاوت میں مقابلہ 487
۲- پہلا دستور 488
د: جنگ کا مسئلہ 490
۱- غزوہ احد کی حکمت عملی 490
۲- شوریٰ 494

پانچویں فصل: وحدتِ فکر و عمل 500

الف: منصوبہ ساز انسان 501
ب: نسل پرستی: دورِ حاضر کا اہم ترین مسئلہ 503
ج: صلح حدیبیہ 505
۱- پانی کا معجزہ 505
۲- نمائندوں کا تبادلہ 506
۳- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کی حیثیت سے 507
۴- موت پر بیعت 507
۵- غم کے بادل چھٹ گئے 508
۶- معاہدہ 508
۷- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی برافروختگی 509
۸- ابو جندل 510
۹- ابو بصیر اور ان کے ساتھی 511
د: صلح حدیبیہ کے نتائج 513
۱- کعبے پر کسی کی اجارہ داری نہیں 514
۲- حالت امن: دعوتی کام کے لیے سازگار فضا 514
۳- صلح کے دوران اسلام کا تعارف 515
۴- باقاعدہ طور پر اسلام کا اعتراف 515
۵- اس سب کچھ کے پیچھے قدرتِ خداوندی کارفرما تھی 516

حواشی اور حوالہ جات 518

کچھ مصنف کے بارے میں

شیخ محمد فتح اللہ گولن کی عظیم خدمات کی بدولت ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور ہر صاحب نظر آپ کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہے، لیکن اس کے باوجود آپ اپنی تعریف اور اپنی طرف قیادت کے انتساب کو پسند نہیں کرتے۔ آپ کی جائے پیدائش اناطولیہ میں واقع ایک چھوٹی سی بستی ہے، جس میں سال کے نو ماہ موسم سرما رہتا ہے۔ اس بستی کا نام کوروجک ہے، جو صوبہ ارضروم کے شہر 'حسن قلعہ' کا ایک نواحی علاقہ ہے۔ اس بستی کی آبادی ساٹھ ستر گھرانوں سے زائد نہیں۔ آپ کے آباواجداد ''اخلاط'' نامی تاریخی گاؤں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ''اخلاط'' صوبہ بتلیس میں پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی آل میں سے بعض حضرات امویوں اور عباسیوں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے وادی بتلیس کے علاقے کی طرف آئے اور اس علاقے کے لوگوں کے روحانی پیشوا بن گئے، جس کے نتیجے میں اس علاقے کے ترک قبائل کے دلوں میں اسلامی روح جاگزیں ہوگئی۔

محمد فتح اللہ گولن نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی، جس کے اطراف میں اسلامی روح کی کرنیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں دین کی گہری بصیرت کے حامل تھے۔ آپ کے دادا ''شامل آغا'' عزت ووقار اور دینی مضبوطی کا نمونہ تھے، جن کا اپنے پوتے کے ساتھ مضبوط روحانی اور قلبی تعلق تھا۔ آپ کے والد ''رامز آفندی'' اس مشکل اور بے ثمر دور میں بھی علم وادب، دین داری اور ذہانت کے لحاظ سے معروف شخصیت تھے۔ وہ اپنا وقت صرف فائدہ مند کاموں میں صرف کرتے اور جودوسخا میں معروف تھے۔ آپ کی دادی ''مؤنسہ خانم'' دینی تشخص اور تعلق مع اللہ کی وجہ سے مشہور تھیں۔ ان کی پرہیز گاری کی جھلک ان کے مشاغل اور کاموں میں واضح طور پر نظر آتی تھی۔

آپ کی نانی ''خدیجہ خانم'' پاشا خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وقار، رحم دلی اور ادب واحترام کا پیکر تھیں۔ آپ کی والدہ ''رفیعہ خانم'' بستی کی عورتوں کو قرآن کریم پڑھایا کرتیں اور رحمدلی، شفقت اور نیکی سے لگاؤ کی وجہ سے مشہور تھیں۔

شیخ محمد فتح اللہ گولن نے ایسے عظیم گھرانے میں پرورش پائی، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے چار برس سے بھی کم عمر میں اپنی والدہ سے قرآن کریم سیکھنا شروع کر دیا تھا اور صرف ایک ماہ میں قرآن کریم ختم کرلیا۔ آپ کی والدہ آدھی رات کو اٹھتیں اور آپ کو بیدار کر کے قرآن کریم سکھاتیں۔ جس گھرانے

میں آپ نے پرورش پائی وہ اس علاقے کے معروف علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی زیارت وضیافت گاہ تھا۔آپ کے والد ''رامز آفندی'' علماء اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کو بہت پسند فرماتے اور ان کی خواہش ہوتی کہ روزانہ کم از کم کسی نہ کسی عالم کی ضرور ضیافت کریں، اس طرح محمد فتح اللہ گولن کو بچپن ہی سے بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنے آپ کو ابتدائے عمر ہی سے علم وتصوف کی آماجگاہ میں پایا۔جن علمائے کرام سے آپ متاثر ہوئے ان میں سب سے نمایاں شخصیت شیخ محمد لطفی آلوارلی کی تھی۔آپ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے منہ سے نکلنے والی ہر بات کو کسی دوسرے جہان سے وارد ہونے والے الہامات سمجھتے۔آپ شیخ محمد لطفی آلوارلی کی شخصیت سے کس قدر متاثر ہوئے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود آپ ہمیشہ ان کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں: ''میں اپنے جذبات، احساسات اور بصیرت میں بڑی حد تک ان سے سنی ہوئی باتوں کا احسان مند ہوں۔''

شیخ محمد فتح اللہ گولن نے عربی اور فارسی زبان سیکھنے کا آغاز اپنے والد ماجد سے کیا، جو کتب بینی میں مستغرق رہتے، ہر وقت چلتے پھرتے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہتے اور عربی و فارسی کے اشعار گنگناتے رہتے تھے۔آپ کے والد نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے عشق کی حد تک محبت کرتے تھے۔وہ صحابہ کرام کے حالات زندگی سے متعلق کتابوں کا اس کثرت سے مطالعہ کرتے کہ وہ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے بالکل بوسیدہ ہو جاتیں۔آپ کے والد کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت کا بیج اپنے بیٹے کے دل میں بو دیا۔محمد فتح اللہ کے والد ''رامز آفندی'' نے آپ کو اپنی میراث میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے ساتھ جو محبت اور تعلق عطا کیا تھا، اسے سمجھے بغیر آپ کی شخصیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔اب یہ انتہائی دشوار ہے کہ آپ کی کوئی نظیر دیکھی جائے یا کسی ایسے شخص کا ذکر کیا جائے جسے نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ کرام کے ساتھ ایسا لگاؤ ہو کہ جب بھی اس کی زبان پر ان کا تذکرہ آئے تو اس کی آنکھیں اشک بار اور دل بے چین ہو جائے۔

ابتدائی تعلیم اور نفسیاتی پس منظر

تقدیر نے محمد فتح اللہ گولن کی تمام باطنی صلاحیتوں کو اچھی طرح اجاگر کرنے کے لئے انہیں معتدل اور متوازن ماحول میں پروان چڑھایا۔اگرچہ آپ کی فطری صلاحیتیں باطنی قوت، چاق وچوبند طبیعت، جرات وشجاعت، عمدہ انتظامی لیاقت، تاریخ پر گہری نظر اور ولولے سے لبریز دل کی صورت میں خوب

اجاگر ہو چکی تھیں اور ان کی نشو ونما ایک محبت و شفقت کے پیکر اور اپنے خاندان اور رشتہ داروں سے گہری وابستگی کے حامل شخص کی صورت میں ہوئی، تاہم آپ کو اپنی انتہائی حساس طبیعت اور اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ گہری وابستگی کی وجہ سے قلبی طور پر بہت سی تکالیف بھی اٹھانی پڑیں، کیونکہ آپ کے والد ماجد اپنے بعض دوستوں کی بے وفائی اور ظلم کا نشانہ بنے اور انہیں اپنے خاندان کی نقل مکانی کا دکھ جھیلنا پڑا پھر مختصر سے عرصے میں اپنے بھائی، دادا اور دادی کی وفات کی وجہ سے آپ کے دلِ ناتواں پر بے شمار غم آپڑے، ان سب مصائب اور صدموں نے آپ کے دل پر گہرا زخم لگایا، جس کی وجہ سے عین ممکن تھا کہ حالات کی ستم ظریفی آپ کو ایک صوفی درویش بنا ڈالتی، تاہم قدرت نے جہاں آپ کی دینی مدرسے (جہاں سے آپ نے دینی علوم حاصل کیے) کی طرف راہنمائی کی، وہیں آپ کو خانقاہ (جہاں آپ نے روحانی تربیت پائی) کا راستہ بھی دکھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے رسمی علوم اور فلسفے پر بھی توجہ دی، چنانچہ تعلیم کا جو سلسلہ آپ نے اپنے والد کے گھر میں شروع کیا تھا، وہ ارضروم شہر آکر بھی جاری رہا، نیز آپ نے جو روحانی تربیت سب سے پہلے اپنے گھر میں حاصل کی تھی، وہ محمد لطفی آفندی کی خانقاہ میں بھی جاری رہی، یہی وجہ ہے کہ آپ کا روحانی تربیت کے ساتھ تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا، بلکہ اسلامی علوم کی تحصیل کے پہلو بہ پہلو عمر بھر جاری رہا۔ آپ نے اپنے علاقے کے مشہور علماء سے دینی علوم حاصل کیے، جن میں سب سے نمایاں شخصیت عثمان بکتاش کی ہے، جو اپنے وقت کے چوٹی کے فقہاء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ان سے نحو، بلاغت، فقہ، اصولِ فقہ اور عقائد کی کتابیں پڑھیں۔

زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کی رسائل نور اور طلبۂ نور کی تحریک سے شناسائی ہوگئی۔ یہ ایک ہمہ گیر احیائی اور تجدیدی تحریک تھی، جس کی بنیاد حضرت بدیع الزمان سعید نورسی نے بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں رکھی تھی۔

عمر میں پختگی، دینی مدارس اور خانقاہوں سے اپنے حصے کے علوم و فیوض حاصل کرنے اور رسائل نور جو بذاتِ خود ایک ہمہ گیر معاصر دینی مکتب فکر کی حیثیت رکھتے ہیں، سے آشنائی کی وجہ سے آپ کی تمام خداداد صلاحیتیں اور قابلیتیں نکھر کر سامنے آگئیں۔

مزید برآں آپ نے ان رسمی علوم کو پڑھنے اور سیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا جو آپ نے سرکاری درسگاہوں سے حاصل کیے تھے، جس کے نتیجے میں آپ کو ان علوم کے اصول و مبادی کے بارے میں ٹھوس معلومات حاصل ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے نہ صرف البرٹ کامو (Albert Camus) سارتر (Sartre) اور مارکوس (Marcos) وغیرہ وجودی فلاسفہ کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا، بلکہ

مشرق و مغرب کے دیگر فلسفیانہ افکار کے اصل سرچشموں سے بھی واقفیت حاصل کی۔ خلاصہ یہ کہ ان سب عوامل اور حالات نے مل کر شیخ فتح اللہ کی شخصیت کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

شیخ فتح اللہ

ابھی محمد فتح اللہ کی عمر بیس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ انہوں نے ترکی کے انتہائی مشرق میں واقع ارضروم شہر کو خیرآباد کہہ کر ادرنہ کا رخ کیا، جو ترکی کا مغربی دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں انہیں جامع مسجد ''اُچ شرفلی'' کا امام مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے اڑھائی سال اسی مسجد میں انتہائی زہد اور مجاہدے سے گزارے۔ انہوں نے مسجد میں ہی مستقل قیام کو ترجیح دی اور بغیر ضرورت کے باہر نہ نکلتے۔ مسجد میں رات گزارنے کا کوئی مناسب بندوبست نہ تھا، اس لئے انہیں مجبوراً مسجد کے صحن کے فرش پر ہی ایک کونے میں اپنا مختصر سا بستر بچھا کر رات گزارنی پڑتی تھی۔

پھر جب عسکری خدمات کا وقت آیا تو آپ نے ماماک اور اسکندرون کے مقام پر یہ خدمات سرانجام دیں اور پھر ادرنہ اور ادرنہ سے ''کرکلارائی'' کی طرف لوٹ آئے۔ جب آپ ادرنہ میں مقیم تھے تو وہاں کے لوگ آپ کو ارضرومی شیخ کے نام سے پکارتے تھے، لیکن جب آپ ارضروم آئے تو لوگوں نے آپ کو ادرنلی شیخ کہنا شروع کر دیا، تاہم جب آپ نے ازمیر میں سکونت اختیار کی تو شیخ فتح اللہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

آپ نے اپنے کام کا آغاز ازمیر کی جامع مسجد ''کستانہ بازاری'' سے ملحق ''مدرسہ تحفیظ القرآن'' سے کیا اور پھر ایک چلتے پھرتے واعظ کے طور پر کام کرنے لگے، چنانچہ آپ نے مغربی اناطولیہ کے سارے گردونواح کا دورہ کیا اور پھر ۱۹۷۰ء کے آغاز میں تربیتی کیمپ لگانا شروع کیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ نے لوگوں کی اطاعت و عبادت کے مطابق تربیت کر کے اپنے آپ کو اپنے پروردگار، دین، وطن اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا، چنانچہ لوگوں کی ذہن، دل اور پوشیدہ باطنی احساسات یہاں آ کر معرفت کے گہرے معانی سے آشنا ہوتے، گویا لوگ موت کی مدہوشی سے بیدار ہو رہے ہوں اور طویل ماضی کے بعد انہیں نئے سرے سے اٹھایا جا رہا ہو... آپ وہ شہسوار تھے جس کے کارناموں کی آپ کئی بار منظر کشی اور اس کے اعلیٰ اوصاف کا اپنے اشعار اور مقالات میں تذکرہ کر چکے تھے... وہ شہسوار کہ جس کے غم میں آپ نے مرثیے پڑھے اور آنسو بہائے... ایسا شہسوار جو تیز دکھ بھری نظر اور فکرمند و غمزدہ دل کا مالک تھا، جس کی منظر کشی آپ نے کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ شدید تھکن کے باوجود اپنے سیاہی مائل گھوڑے پر سوار ہو کر دامنِ کوہ پر چڑھ رہا ہوتا ہے کہ اچانک شدتِ تکان سے اُس کے گھوڑے کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گھوڑے سے زمین

بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اس وقت شیخ فتح اللہ نے یہ کہہ کر کہ ترکی دارالخدمت ہے اس بحث کو ہی ختم کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ خدمت کا یہ جذبہ تقریباً ساری دنیا میں پھیلتا چلا گیا اور ایک ایسی نسل تیار ہوگئی جو بالکل خاموشی کے ساتھ لوگوں کی خدمت کرنے لگی۔ انہیں کسی معاوضے کی خواہش تھی اور نہ کسی دنیوی نفع کی لالچ، بلکہ اخلاص میں کمی کے خوف سے وہ کسی روحانی مرتبے کی خواہش بھی نہ کرتے۔ محبت اور صبر ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ انہیں اختلافات میں پڑنے کی فرصت نہ تھی۔ انہیں بس باہمی تعاون اور تعمیری کام کی دھن لگی رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے تھے۔ جلد ہی ان کی خدمات کا دائرہ وسیع ہو کر زندگی کے دوسرے شعبوں تک پھیل گیا، چنانچہ انہوں نے پہلے اخبارات اور رسائل نکالنا شروع کیے اس کے بعد ریڈیو اسٹیشن اور پھر ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی قائم کر لیے، جس کے نتیجے میں وہ فضل خداوندی سے لوگوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے۔

محبت، افہام و تفہیم، نرم مزاجی اور گفت و شنید کی بادِ صبا

۱۹۹۰ء سے شیخ فتح اللہ نے باہمی گفت و شنید، افہام و تفہیم اور تعصب سے پاک ایک قائدانہ تحریک کا آغاز کیا۔ آہستہ آہستہ اس تحریک کی بازگشت نہ صرف ترکی بلکہ ترکی سے باہر بھی سنی جانے لگی۔ اس تحریک کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ محمد فتح اللہ نے پوپ کی دعوت پر ویٹی کن سٹی میں اس سے ملاقات کی، جس میں شیخ نے اس بات پر زور دیا کہ چونکہ ذرائع مواصلات کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت پوری دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے، اس لئے تعصب، اختلافات اور نفرت پر مبنی کوئی بھی تحریک مثبت نتائج تک نہیں پہنچ سکتی، نیز چونکہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہونے والے حادثے یا تبدیلی کا اثر پوری دنیا پر پڑ سکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کسی بھی عقیدے، فکر اور فلسفے سے تعلق رکھنے والے افراد سے فراخ دلی کا برتاؤ کیا جائے۔ سویت یونین کی شکست و ریخت اور وارشو پیکٹ کی ناکامی کے بعد عالمی طاقتوں نے اسلام اور مسلمانوں کو آسان ہدف سمجھ کر ان کے خلاف جنگ کو ناگریز قرار دے دیا، جس کے نتیجے میں بعض اوقات انتہاء پسندی اور دہشت گردی کا بھی ظہور رہا۔ یہ طاقتیں جہاد کو بغاوت، جنگ کو سلامتی، ظلم کو انصاف اور بغض کو محبت کا نام دیتی ہیں۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کے پیش نظر شیخ فتح اللہ نے ترک معاشرے میں گفت و شنید اور رواداری کی دعوت کا آغاز کیا، کیونکہ بہت سی قوتیں نسلی، قومی، مذہبی، گروہی اور فکری اختلافات کو ہوا دے کر اس معاشرے کا شیرازہ بکھیرنے کی سر توڑ کوششیں کر رہی تھیں۔ تاہم آپ نے اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ گفت و شنید اور رواداری کی اس دعوت کو ترکی سے باہر بھی جہاں کہیں ممکن ہو سکا پھیلانے کی کوشش کی۔

مؤلفات

بہت سے بلند پایہ لوگ نئے افکار ونظریات کے حامل ہوتے ہیں، لیکن جب وہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکام ہو جاتے ہیں۔ بہت سے حضرات فعال اور سرگرم داعی ہوتے ہین، لیکن بقدرِ ضرورت علم اور گہری بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ صرف حکومت واقتدار کے مالک ہوتے ہیں یا پھر محض حکمت عملی اور سیاسی داؤ پیچ کے ماہر۔ اسی طرح بعض حضرات زندگی کے کسی خاص شعبے میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن عمل کے دوسرے میدانوں میں ان کی کوئی خاص خدمات نہیں ہوتیں، چنانچہ بعض لوگ بڑے اچھے لکھاری یا شاعر یا فنونِ لطیفہ کے ماہر یا بہت بڑے عالم یا خطیب یا فلسفی تو ہوتے ہیں، لیکن معاشرے میں مثبت تبدیلی کا باعث بننے والی کوئی تحریک نہیں چلا پاتے۔

اسی طرح بعض لوگ اقتصادیات یا سیاسیات میں صفِ اول کے ماہر یا مایہ ناز عسکری قائد ہوتے ہیں، لیکن دین اور اخلاقیات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی زبانیں گنگ ہو جاتیں ہیں، جبکہ دوسری طرف بہت سے حضرات دینی مسائل اور روحانی واخلاقی امور میں اپنی تمام توانائی خرچ کر ڈالتے ہیں، لیکن انہیں اقتصادی اور معاشرتی مسائل پر دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا نے اپنی طویل عمر میں بے شمار بلند پایہ شخصیات کو دیکھا، لیکن ان میں سے ہر ایک کے اثرات کسی نہ کسی خاص میدان میں منحصر ہو کر رہ گئے اور اپنی نافعیت کامل طور پر دوسروں کی طرف منتقل نہ کر سکے، لیکن اس کے مقابلے میں جب شیخ فتح اللہ گولن کا ذکر آتا ہے تو نہ صرف ان کی کتابوں، مواعظ، بیانات اور آڈیو اور ویڈیو خطبات کی طرف ذہن جاتا ہے، بلکہ ایک اور چیز کی طرف بھی خیال جاتا ہے، جسے وہ ''جیش النور'' یا ''جنود الحق'' کا نام دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ سے استفادہ کیا اور آپ کے آثارِ جمیلہ میں شمار ہوئے، نیز آپ کے منتسبین کی خدمات کو ان اداروں اور تنظیموں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، جن کا جال انہوں نے دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا ہے۔

آپ کی تحریر کردہ کتابوں کی تعداد 60 سے زائد ہے۔ جن کا 35 زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہم ذیل کی سطور میں ان کے چند علمی آثار کا اختصار کے ساتھ ذکر کیے دیتے ہیں:

۱- ان کے خطبات، مواعظ، بیانات اور مجالس پر مشتمل ہزاروں کی تعداد میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹیں موجود ہیں۔

۲- الأسئلة الحائرة التی أفرزها العصر (۴ حصے) یہ کتاب مختلف اوقات میں ان سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

۳- الموازين أو أضواء على الطريق (۴ حصے) یہ کتاب معرکہ زندگی میں عقل و روح اور تصوف وحکمت کے پیمانوں پر مشتمل ہے۔

۴- العصر والجيل، الانسان في تيار الازمات، نحو الجنة المفقودة، الصبفحة الذهبية للزمن، أنفاس الربيع اور عندمانقيم معبدر وحنا.

یہ پانچوں کتابیں آپ کے ان مضامین کا مجموعہ ہیں جو سالہا سال تک بعض ماہانہ اور سہ ماہی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

۵- النور الخالد: مفخرة الانسانية محمد ﷺ (۳ جلدیں) یہ کتاب خاتم الانبیاء رحمت للعالمین محمد ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر آپ کے بیانات کا مجموعہ ہے۔

۶- في ضلال الايمان (۲ جلدیں) یہ کتاب ایمانی حقائق کے بارے میں ناقابل تردید دلائل کا مجموعہ ہے۔

۷- تلال القلب الزمردية: اس کتاب میں سرچشمۂ اسلام سے پھوٹنے والی روحانی زندگی اور تصوف کی درست اصلاحات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

۸- براعم الحقيقة في جيل الألوان (۲ جلدیں) یہ آپ کے اشعار اور مقالات کا مجموعہ ہے۔

۹- تأملات في سورة الفاتحة: یہ ان لیکچرز کا مجموعہ ہے جو آپ نے علوم شرعیہ کے طلبہ کو دیئے تھے۔

۱۰- المنشور (۲ جلدیں) یہ مختلف مواقع پر آپ سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات اور مختلف مجالس کے دوران بیان کردہ احادیث کا مجموعہ ہے۔

۱۱- الجهاد؛ أو اعلاء كلمة الله: اس کتاب میں دورِ حاضر میں جہاد کے موضوع کے علمی ونظری پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۲- الحياة بعد الممات: اس کتاب میں اخروی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۳- القدر في ضوء الكتاب والسنة: اس کتاب میں مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۴- محور الارشاد: اس کتاب میں دورِ حاضر میں فعال اور سرگرم طریقے سے دعوت وتبلیغ کے کام کو سرانجام دینے کے طریق کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۵- البعد الميتافيزيقي للوجود (۲ جلدیں) اس کتاب میں علمی، عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ

وجود کی حقیقت اور روح، جنات اور فرشتوں کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۶- ریشۃ العازف المکسورۃ: یہ آپ کے اشعار کا مجموعہ ہے۔

آپ کی مذکورہ بالا تمام کتابیں ترکی میں ستر ستر ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں، نیز آپ کی بعض کتابوں کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

آپ کی درج ذیل کتب کو انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالا جا چکا ہے:

النور الخالد، فی ظلال الایمان، الحیاۃ بعد الممات، الأسئلۃ الحائرۃ التی أفرزھا العصر کی پہلی جلد، براعم الحقیقۃ کی پہلی جلد، الموازین کی پہلی جلد، تلال القلب الزمردیۃ اور نحو الجنۃ المفقودۃ.

درج ذیل کتب کا جرمن زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے:

النور الخالد، فی ظلال الایمان، الحیاۃ بعد الممات، الموازین، الأسئلۃ الحائرۃ اور نحو الجنۃ المفقودۃ. ان میں سے ہر ایک کی صرف پہلی جلد کا ترجمہ ہوا ہے۔

آپ کی کتاب فی ظلال الایمان کا ترجمہ بلغاروی زبان میں، آپ کے دیوان ریشۃ العازف المکسورۃ اور الأسئلۃ التی أفرزھا العصر کے منتخب حصوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے، نیز آپ کی کتاب الأسئلۃ الحائرۃ کے پہلے حصے کا ترجمہ روسی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔

درج ذیل کتب کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے:

۱۔ القدر فی ضوء الکتاب والسنۃ

۲۔ الموازین، أو أضواء علی الطریق

۳۔ مختارات من کتاب الأسئلۃ الحائرۃ التی أفرزھا العصر

٤۔ الجھاد: أو اعلاء کلمۃ اللہ.

جیسے جیسے ممکن ہوگا ان شاء اللہ آپ کی بقیہ کتب کو بھی عربی زبان کے قالب میں ڈھالا جاتا رہے گا۔

اردو زبان میں درج ذیل کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں:

۱۔ تقدیر کتاب وسنت کی روشنی میں

۲۔ المیز ان یا چراغِ راہ

۳۔ روح جہاد اور اس کی حقیقت

۴۔ اسالیب دعوت اور مبلغ کے اوصاف

۵۔ اضواءِ قرآن در فلک وجدان

۶۔ تخلیق کی حقیقت اور نظریہ ءارتقاء

۷۔ نورِ سرمدی، فخرِ انسانیت حضرت محمد ﷺ (دو جلدیں)

۸۔ روح کے محل کی تعمیر

۹۔ ملاحظات فاتحہ

۱۰۔ جنت گمشدہ کی طرف

۱۱۔ اسلام کے بنیادی ارکان

۱۲۔ اسلام اور دورِ حاضر (جدید ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات

۱۳۔ روح کے نغمے اور دل کے غم

آپ کی بقیہ کتب کا اردو ترجمہ بھی ان شاء اللہ جلد شائع ہو جائے گا۔

چونکہ یہ کتاب مساجد میں دیئے گئے مواعظ اور طلبہ و مریدین کے لیے منعقد کی گئی خصوصی مجالس میں سوالات کے جوابات کا مجموعہ ہے جسے مصنف کے شاگردوں نے تحریر کیا اور مصنف کی رضامندی اور تصحیح کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ اس لیے بعض مقامات پر اس کے اسلوب اور مضامین پر خطیبانہ انداز کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔

استاد فتح اللہ گولن کے بارے میں دیگر معلومات تقریباً 25 ویب سائٹس پر موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ پر رجوع کر سکتے ہیں۔

English :http//:en.fgulen.com

Urdu :http://pk.fgulen.com

Arabic :http://ar.fgulen.com

مقدمہ از مصنف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ.

دوسرے بہت سے حضرات کی طرح میری بھی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کی عظیم شخصیت پر روشنی ڈالوں اور آپ کے شایانِ شان آپ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کروں تا کہ لوگوں کو بتایا جا سکے کہ آپ ﷺ تمام انسانیت کے لئے نجات دہندہ اور آپ ﷺ کی تعلیمات ناقابل حل مشکلات کا حل اور لاعلاج بیماریوں کا علاج ہیں، لیکن میری رائے میں یہ ایک ایسا موضوع ہے، جس کی سحر انگیزی اور دلکشی کے سامنے ٹھہرا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے گریز ممکن ہے۔

آپ ﷺ کی ذات اقدس تمام انسانیت کے لئے باعث افتخار ہے، یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال سے ہر دور کے بڑے بڑے فلاسفہ، عظیم مفکرین اور دنیائے فکر کو اپنے افکار سے مزین کرنے والی نامور و باکمال شخصیات آپ ﷺ کے سامنے دست بستہ کھڑے یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں: ''آپ ﷺ ہی وہ انسان ہیں، جن کے ساتھ انتساب کو ہم اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔''

آپ ﷺ کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے یہی کافی ہے کہ دورِ حاضر میں گمراہی و بربادی کے تمام اسباب کے پائے جانے کے باوجود ہم مسجد کے میناروں سے مسلسل ''أشهد أنّ محمداً رسول الله'' کی صدائیں سن رہے ہیں اور مسلسل اس بات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کیسے ''روحِ محمدی'' ہر جگہ رفعت و بلندی کے نئے نئے آفاق کھولتی ہے، جس کے نتیجے میں ہم روزانہ پانچ مرتبہ عالم روحانی میں شوق و اشتیاق کے جذبات سے سرشار ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ کی عظمت کی دلیل کے طور پر ہم یہ بات بھی پیش کر سکتے ہیں کہ گمراہی پھیلانے اور فتنے برپا کرنے کے لئے دشمنانِ اسلام کی مسلسل ہر قسم کی داخلی اور خارجی تدبیروں اور سازشوں کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ''حقیقت احمدیہ'' (جس کے دقیق اور مشکل مفاہیم کو سمجھنا آسان نہیں) سے پوری طرح آگاہی نہ رکھنے کے باوجود اس کی طرف متوجہ ہو کر پروانوں کی طرح اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ یہ ایسی منفرد بات ہے جس کی نظیر دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ زمانہ ہمارے دل و دماغ سے آپ ﷺ کی ذات سے منسوب کسی بھی حقیقت کے

آثار کو مٹا سکتا ہے اور نہ ہی دھندلا کر سکتا ہے، بلکہ وہ ہمیشہ تروتازہ اور شگفتہ رہتے ہیں۔ میں اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ جب میں مدینہ منورہ جاتا ہوں تو آپ ﷺ کی خوشبو اپنے اردگرد اتنی شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں اگلے ہی لمحے آپ ﷺ سے ملنے والا ہوں اور آپ ﷺ اپنی حیات بخش اور پرسوز آواز سے مجھے اھلاً و سھلاً مرحبا کہہ رہے ہیں۔

بلاشبہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہمارے دلوں میں اسی طرح تروتازہ اور زندہ ہے اور مرورِ زمانہ سے ہمارے دلوں میں اس کی تروتازگی اور زندگی میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

زمانہ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ تنزل کا شکار ہوتا ہے، جس سے بعض اصول ونظریات شکست وریخت کا شکار ہوکر اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کی عظمت دلوں میں خوشبودار پھولوں کے شگوفوں کی مانند ہمیشہ تروتازہ اور قائم ودائم رہے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم آپ ﷺ کی شخصیت کو اجاگر کرنے کا ویسا ہی اہتمام کرتے جیسا کہ دوسری اقوام اپنی بہادر اور عظیم شخصیات کو اجاگر کرنے کے لئے کرتی ہیں اور اس مقصد کے لئے اپنے تمام علمی اور معاشرتی اداروں کو وقف کر دیتے تو ممکن نہ تھا کہ آپ ﷺ کے سوا کوئی اور شخصیت انسانیت کے دلوں میں بسیرا کر سکتی یا جگہ پاسکتی۔

لیکن آپ ﷺ کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے صحیح اہتمام کے نہ ہونے کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ مشرق ومغرب سے ہر ایک آپ ہی کے صاف وپاکیزہ چشمۂ سخاوت کی طرف دست حاجت پھیلائے دوڑا چلا آرہا ہے اور محبت وعشق اسے آپ کے روضۂ انور کی طرف کھینچے چلے جارہے ہیں، ایک ایسے انسان کے روضۂ انور کی طرف جو آفتابوں کے سروں پر تاج رکھ دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم تمام اطرافِ عالم خصوصاً امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں جہاں آپ ﷺ کی راہ ہدایت پر چلنے کے لئے نئے جذبے اور ولولے کا مشاہدہ کررہے ہیں، وہیں مسلمانوں کی طرف سے آپ ﷺ کی سیرت کو خوبصورت، دلکش اور متوازن انداز میں پیش کرنے کی مسلسل جدوجہد بھی دیکھ رہے ہیں، جسے دیکھ کر زمانۂ نبوت کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کے ساتھ محبت ولگن کا جو منظر غیر مسلم دنیا میں دکھائی دے رہا ہے، یہی حال مسلم ممالک کا ہے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صدی دو صدی پہلے اگرچہ بہت سے لوگ اسلام کے ساتھ صدقِ دل سے تعلق رکھتے

تھے، لیکن اس کے بارے میں ان کی معلومات سطحی نوعیت کی ہوتی تھیں، لیکن آج وہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور جانتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کیوں قبول کیا ہے؟ اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ انہوں نے امت مسلمہ کو درپیش مسائل کا علمی انداز میں دقت نظری سے تجزیہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

آج تک دشمنانِ اسلام یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور تعلیم یافتہ طبقے کو غلط استعمال کرتے رہے، انہیں خوشنما نعروں کے ذریعے دھوکا دیتے رہے اور کفر و گمراہی پھیلانے کے لئے وطن عزیز کے اداروں کو استعمال کرتے رہے، لیکن اب یہ سب تدبیریں اور سازشیں ختم ہونے کو ہیں اور پانی پر تیرتے ہوئے برف کے تودوں کی طرح پگھل اور بکھر رہی ہیں۔ انسانیت رسول اللہ ﷺ کی سیرت و ہدایت کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوگئی ہے۔

جو لوگ سالہا سال تک اپنے افکار و نظریات بار ہا تبدیل اور ایک نظریہ چھوڑ کر دوسرا نظریہ اختیار کرتے رہے ہیں وہ یہ دیکھ اور آزما چکے ہیں کہ ان کی جدوجہد اور کوششوں کو کس طرح ناکامی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر انہوں نے مان لیا کہ واحد مکتب فکر جس کے قریب سے بھی رسوائی اور ناکامی کا گزر نہیں ہوا آپ ﷺ کا مکتب فکر ہے اور آپ ہی کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، چنانچہ انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس سلسلے میں موریس بوکائے (Maurice Bucaille) اور Roger Garaudy وغیرہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں [1]

لیکن کیا ہم لوگوں کے دلوں میں بسی رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو مکمل طور پر سمجھ کر اس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں؟ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں دوسروں کی بات کروں؟ میں خود کہاں کھڑا ہوں؟ کیا میرے بس میں ہے کہ میں آپ ﷺ کی عظمت کے پہلوؤں کو کما حقہ بیان کر سکوں؟ یا آپ ﷺ کے شایانِ شان آپ ﷺ کی شخصیت کو اجاگر کر سکوں؟ میں تو پانچ سال کی عمر سے نماز کے لئے پیشانی ٹیکنے لگا ہوں اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں قطمیر [2] کا مقام حاصل کرنے کے لئے اپنی گردن میں رسی ڈال چکا ہوں؟ کیا میں آپ ﷺ کی عظمت سے متعلق اپنے دلی جذبات کا آپ کو کما حقہ احساس دلا سکا ہوں؟ میں تو خود اپنے آپ سے اور دعوت و تبلیغ سے منسلک تمام احباب سے کہتا ہوں کہ کیا ہم دورِ حاضر کے انسان کے دل کو سید المرسلین ﷺ کی محبت سے لبریز اور آپ کی عظمت سے معمور کر سکے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔

اگر انسانیت آپ ﷺ کو کما حقہ پہچان اور سمجھ لیتی تو عشق و محبت میں اپنے حواس کھو بیٹھتی اور اگر آپ ﷺ کی خوبصورت یادیں روحوں پر چھا جاتیں تو ان کے شوق کے جذبات بھڑک اٹھتے، آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتے، آپ ﷺ کی پاکیزہ نبوت کے عالم کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے بدن کانپ اٹھتے اور روحیں اپنے آپ کو ہوا کے سامنے ڈال دیتیں تاکہ آپ ﷺ کی آتشِ عشق میں جلنے والے دلوں کی چنگاری خاک ہو جانے کے بعد پھر سے بھڑک اٹھے اور وہ ہوا اسے اڑا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے جائے۔ چونکہ انسان اپنی فہم و ادراک کے بقدر ہی محبت کرتا اور نامانوس چیز سے دور بھاگتا ہے، اس لئے ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو نقطہ ہمیشہ سے ہمارے دشمنوں کی تمام تر کوششوں اور سازشوں کا محور رہا ہے، وہ آپ ﷺ کی محبت لوگوں کے دلوں سے نکالنے، آپ ﷺ کے تذکرے کو بے وقعت بنانے، نئی نسلوں کے دل و دماغ میں آپ ﷺ کے بغض و عداوت کو پروان چڑھانے اور اس کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کرنے کی جدوجہد ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت کو دیکھئے کہ وہ تمام رکاوٹیں اور تدبیریں، جنہیں ہمارے دشمنوں نے ہمارے دلوں سے آپ ﷺ کی محبت نکالنے اور ہمارے ذہنوں سے آپ کی یاد مٹانے کے لئے اختیار کیا تھا، سب کی سب اکارت اور رائیگاں گئیں اور انسانیت نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ نوجوان آپ ﷺ کی طرف خوشی سے دوڑنے لگے ہیں۔ وہ اس پیاسے آدمی کی طرح خوش ہیں، جو ویران صحراء میں کئی دن کی پیاس کی شدت و تکلیف جھیلنے کے بعد اپنے قریب ٹھنڈا اور خوشگوار پانی پالے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کی طرح کی رحمدل ذات اپنی طرف اس قدر اشتیاق و محبت اور عشق کے ساتھ متوجہ ہونے والے شخص کو کبھی مسترد نہیں فرمائے گی، بلکہ محبت و شفقت کے ساتھ اسے اپنے سینے سے لگالے گی۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کبھی ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچا جو جمعہ کے دن اس کثرت سے مساجد میں آتے ہیں کہ بڑی بڑی کشادہ مسجدیں بھی نمازیوں سے بھر جاتی ہیں؟ اگر آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان میں اکثریت نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو ان نوجوانوں کو سخت سردی، بارش اور برف باری میں جامع مسجدوں میں آنے اور وضو کرنے پر آمادہ کرتی ہے، جبکہ سردی سے ان کے دانت بج رہے ہوتے ہیں؟ وہ کون سی ناقابل مزاحمت قوت ہے، جو اہل باطل کی تمام تر کوششوں کے باوجود ان نوجوانوں کو

مساجد کی طرف کھینچ کر لے آتی ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بابرکت و دلکش قوت ہے۔ ہماری عقلیں اس حقیقت کو سمجھیں اور اس کا احاطہ کریں یا نہ کریں، ہمارے دل ہمیشہ اسی شمع کے گرد اڑتے اور اسی آفتاب کے گرد چکر کاٹتے ہیں اور عنقریب آپ ﷺ کی طرف رجوع نہ کرنے اور آپ کے بارے میں لاپرواہی برتنے والے ندامت کے آنسو بہائیں گے اور رنج والم کے کڑوے گھونٹ پئیں گے۔ جس نے آپ ﷺ کی پیروی نہ کی اور بھاگا اور موسم سرما کی مکھی کی طرح علیحدہ اور تنہا رہا، وہ عنقریب تکلیف سے کراہتے اور پشیمانی وحسرت سے کف دست ملتے ہوئے کہے گا: ''میں کیوں نہ آپ کی طرف متوجہ ہوا اور کیوں نہ پروانوں کی طرح آپ کے گرد گھوما۔'' لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی اور بہت سے لوگوں کے ہاتھ سے وقت نکل چکا ہوگا۔

عنقریب تمام اہل جہاں آپ ﷺ کی طرف لپکیں گے، علمی حلقے آپ پر ہر اعتبار سے تحقیق کریں گے، میدانِ فکر کے شاہسوار آپ کے پیچھے چلنے لگیں گے اور آپ کے بہت سے دشمن سچے دوست بن کر آپ کی پناہ حاصل کرنے کے لئے آپ کی طرف دوڑیں گے، بلکہ آپ ﷺ کے مقام و مرتبے کا پلڑا مدمقابل کے ترازو میں اس کے اپنے پیمانوں اور معیاروں کے مطابق بھی بھاری ہونے لگا ہے اور آپ ﷺ کے دشمن حلقے بھی آپ کی عظمت کا اعتراف اور گواہی دینے لگے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وزن آپ کی امت کے دس آدمیوں کے ساتھ کیا گیا تو آپ کا پلڑا جھک گیا پھر آپ کا وزن سو آدمیوں کے ساتھ کیا گیا تو بھی آپ کا پلڑا جھک گیا، اس کے بعد آپ کا وزن آپ کی امت کے ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ کیا گیا تب بھی آپ وزن میں ان سے بڑھ گئے۔ اس پر فرشتے نے اپنے ساتھی سے کہا: ''ان کا وزن کرنے کو رہنے دو، کیونکہ اگر تم ان کا وزن ان کی پوری امت سے کرو گے پھر بھی ان کا پلڑا بھاری رہے گا۔''(3) اسی قسم کا مضمون ایک اور حدیث میں بھی وارد ہوا ہے۔(4)

جی ہاں، اگر صحابہ، تابعین، تبع تابعین، قیامت تک کے مشاہیر عالم، تمام صوفیاء، اتقیاء، اولیاء اور نیکوکار جنہوں نے لوگوں کے دلوں کو وا کر کے ان تک رسائی حاصل کی کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور سرکارِ دو جہاں ﷺ کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو یہ دوسرا پلڑا جھک جائے گا، کیونکہ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہی تمام موجودات کے وجود کا سبب ہے۔ آپ کی ہی خاطر ساری کائنات کو پیدا کیا گیا۔ یہ مقولہ تو زبانِ زدِ عام ہے: ''لولاك لولاك ما خلقت الأفلاك''۔ (5) ''اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔''

چونکہ نا قابل فہم کتاب لکھنا ایک فضول کام ہے، جس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک ہے، اس لئے سرورِ کونین سید البشر حضرت محمد ﷺ جیسے ایک ایسے بلند آہنگ، رہبر و راہنما کی ضرورت تھی، جو وجود اور کائنات کی حقیقت بتائے، نیز ایک ایسے صاحب بیان اور مبلغ کی بھی ضرورت تھی، جو حضرتِ انسان کہ جس کے لئے زمین و آسمان، سورج، چاند، ستاروں اور پوری کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے، کو بتائے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور کس چیز کا امیدوار ہے؟ تا کہ وہ ان تمام امور کی وضاحت اور اعلان کرے اور وجود کے پردوں سے ماوراء حقائق سے روحوں کو آگاہ کرے۔ اگر آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات نہ ہوتی تو کائنات اور انسان کی تخلیق کا کوئی مقصد باقی نہ رہتا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ ہی وہ انسان ہیں، جنہوں نے تمام مخلوقات کو زندگی کا مقصد عطا فرمایا۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس تمام قابل محبت چیزوں سے زیادہ محبوب اور ہم سے قریب تر ہے۔ باوجود اس کے کہ میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ گناہ گار سمجھتا ہوں، لیکن میں آپ ﷺ کے ساتھ محبت کے احساسات میں سے ایک احساس کو بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس احساس کا اظہار کرنے سے میرا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ جب میں رسول اللہ ﷺ سے اس قدر محبت کر سکتا ہوں تو آپ ﷺ کی محبت کے اعلیٰ مراتب پر فائز دلوں اور روحوں کا کیا حال ہوگا؟ اور وہ دل آپ ﷺ کی محبت و عشق سے کس قدر منور ہوں گے؟ میں صرف اس نقطہ نظر سے اپنے احساسات کا آپ سے تبادلہ کرنا چاہتا ہوں، وگرنہ ادب کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں آپ لوگوں کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہ کروں۔

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے مقاماتِ مقدسہ کی خاک سے اپنی پیشانی آلودہ کرنے کے لیے ان کی زیارت سے نوازا تو مجھ پر رسول اللہ ﷺ کے شہر کے انوارات کا اس قدر ظہور ہوا کہ میں نا قابل بیان روحانی خوشی محسوس کرنے لگا یہاں تک کہ میں سوچنے لگا کہ اگر بالفرض اس وقت میرے لئے جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے اور مجھے ان میں داخل ہونے کی پیشکش کی جاتی تو سچ جانیے میں جنت میں داخلے پر رسول اللہ ﷺ کے شہر میں قیام کو ترجیح دیتا۔

سچ تو یہ ہے کہ جنت ہم سب کی امیدوں کا مرکز ہے اور اس کا تصور بھی مشکل ہے کہ کوئی شخص جنت کے حصول کی خواہش نہ رکھتا ہو... کیا ہم صبح و شام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر جہنم سے پناہ اور جنت کے حصول کی دعائیں نہیں مانگتے؟ لیکن اس سب کچھ کو تسلیم کرنے کے باوجود اگر مجھے یہ بلند مرتبہ پیش کیا گیا اور جنت میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی تو شاید میں اپنے پروردگار سے روضہ

اطہر میں ٹھہرنے کی اجازت چاہوں گا۔ کسی کو یہ گمان ہرگز نہ ہو کہ میں اپنے آپ کو اس عظیم سعادت کے قابل سمجھتا ہوں، بلکہ میرا مقصد تو صرف آپ ﷺ سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرنا ہے، وگرنہ میں نے تو تمام عمر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے گزار دی کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے ادنیٰ صحابی کی خدمت کے اعزاز سے نواز دیں اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی خاکِ پا سے اپنی پیشانی کو آلودہ کرنے کی خواہش ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل سے ختم نہ ہو۔ میری زبان سدا اسی قسم کی دعاؤں سے تر رہی۔

بیت اللہ میں بھی میرے دل میں اسی قسم کے جذبات موج زن رہے۔ ہوسکتا ہے ہم سب کے دلوں میں ایسے ہی جذبات ہوں، نیز اس قسم کے جذبات صرف میری ذات یا چند افراد تک محدود نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں گھلنے والے ایسے نہ جانے کتنے افراد ہیں، جن کے ہاں ایسے جذبات بالکل خام اور ابتدائی درجے کے تصور ہوتے ہیں۔

اس موضوع پر گفتگو کے دوران میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک اور واقعہ بھی بیان کرتا چلوں:

ایک دفعہ ہم حج کے سفر میں اس وقت کے رکن قومی اسمبلی محترم عارف حکمت کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے یہ نذر مان رکھی تھی کہ مدینہ منورہ پہنچ کر اس کی خاک میں لوٹیں گے، چنانچہ ہم جیسے ہی مدینہ منورہ پہنچے انہوں نے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا اور مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ مجھے جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بشارت گزشتہ تمام انبیائے کرام نے سنائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے کرام سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ آپ ﷺ پر ضرور ایمان لائیں گے اور آپ کی ہر طرح سے مدد کریں گے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ﴾[آل عمران: ۸۱] ''اور جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا: (ہاں) ہم نے اقرار کیا۔ (خدا نے) فرمایا کہ تم (اس عہد و پیمان کے) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔''

تمام انبیائے کرام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کئے گئے اس عہد کی پاسداری کی، اس کی تکمیل کی خاطر زندگیاں وقف کر دیں اور اسے اپنی تمام تر جدوجہد کا نصب العین قرار دیا۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو سفرِ معراج کرایا تو تمام انبیائے کرام کی روحوں نے آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔(6)

جی ہاں! گویا تمام انبیائے کرام خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب کے سب یہ چاہ رہے تھے کہ انہیں آپ ﷺ کے سامنے اذان کہنے کی سعادت نصیب ہو جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجیل میں فرماتے ہیں: ''میں جا رہا ہوں تاکہ تمہارے پاس سردارِ جہاں آئے۔'' (یوحنا ۱۶:۸) یعنی عیسیٰ علیہ السلام انسانیت کی توجہ آپ ﷺ کی طرف مبذول کر رہے تھے۔

جب آپ ﷺ سفرِ معراج کے دوران آسمانوں پر تشریف لے گئے تو آسمان جواہرات اور موتیوں سے بھر گئے اور ستارے آپ کے قدموں کے نیچے بچھا دیئے گئے اور جب آپ کا سورج کے سامنے سے گزر ہوا تو وہ بھی آپ کے تاج کا ایک نگینہ بننے کی خواہش کرنے لگا، حاصل یہ کہ کائنات آپ کی نبوت کے گرد چکر کاٹنے اور گھومنے لگی۔

چونکہ آپ ﷺ نے ہمارے لئے اسوہ حسنہ بننا تھا، اس لئے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس تمام انسانی صفات کے اعلیٰ ترین مراتب کی جامع تھی۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ اپنے خاندان کے مثالی سربراہ تھے اور جس گھر میں دوائے نبوت قطرہ قطرہ ٹپکتی تھی اگر اس میں تربیت پانے والے افراد میں سے ہر ایک کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا جاتا تو ان میں ایسے مجتہدین اور مجددین پیدا ہوتے جن میں سے ہر ایک سے زمانہ بھر منور ہو جاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنے لوگوں نے آپ ﷺ کو اس پہلو سے پہچاننے میں کامیابی حاصل کی ہوگی۔

آپ ﷺ ایسے سپہ سالار تھے، جس کے لئے جنگ کی گرمی کوئی دشواری پیدا نہ کرتی۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ذریعے جو چاند کے ہالے کی مانند آپ ﷺ کے گرد حلقہ ڈالے ہوتی تھی، ایسے ظالم اور سرکش بادشاہوں کے تخت الٹ دیئے، جو پوری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکے تھے اور بڑے بڑے بادشاہ آپ کی محبت میں ایسے گرفتار ہوئے کہ اس

سے رہائی کی خواہش ان کے دلوں میں کبھی پیدا نہ ہوئی، حالانکہ آپ ﷺ نے فنونِ حرب کی تعلیم کسی سے حاصل نہ کی تھی۔

آپ ﷺ پر تمام علوم کی انتہا ہو جاتی ہے، گویا آپ ایک اسکرین کے سامنے بیٹھے قیامت تک کے واقعات کا مشاہدہ کر کے ہمیں بتا رہے ہیں۔[7] اگرچہ آپ ﷺ کو اس دنیا سے کوچ کیے کئی صدیاں بیت چکی ہیں، لیکن اس آخری دور میں بھی تمام تر تحقیقات اور جدید ٹیکنالوجی کے تمام تر وسائل کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو پرچم رسول اللہ ﷺ نے چودہ سو برس پہلے گاڑھا تھا وہ اب بھی سب سے اونچا لہرا رہا ہے۔ ہم ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے نوازا اور وہ قافلۂ اسلام میں ایک روشن جماعت بن کر شامل ہو گئے۔ اس قسم کے بے شمار واقعات میں سے ایک واقعہ قارئین کی دلچسپی کے لئے آئندہ سطور میں پیش کیا جا رہا ہے:

میں نے ٹورنٹو (Toronto) یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں سرجری کے کینیڈین پروفیسر کیتھ مور (Keith Moore) جو علم جینیات کے بھی اسپیشلسٹ ہیں کو ایک ویڈیو فلم میں دیکھا کہ وہ ماں کے پیٹ میں جنین کی نشوونما کے مختلف مراحل کے بارے میں قرآنی تعلیمات پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ ان مراحل کا دورِ حاضر کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے بغیر انکشاف کیونکر ممکن ہوا۔ اسی طرح میں نے ایک جاپانی عالم طبیعیات کو دیکھا کہ وہ بڑی مشکل سے کلمہ شہادت پڑھ رہے تھے اور اپنے علمی میدان سے متعلق قرآنی آیات کی صداقتوں کا مشاہدہ کر کے پورے اطمینان کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ جب بھی سائنس کے راستے بند ہونے لگتے ہیں تو قرآن کریم سائنس کے سامنے نئے آفاق کھول دیتا ہے۔ جہاں سائنس کے علم کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے رسول اللہ ﷺ کے علم کی ابتدا ہوتی ہے، لیکن آپ ﷺ کو یہ سارے علوم کس نے سکھائے؟ وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ علیم وخبیر ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ نے سارے علوم سیکھے، چونکہ ان علوم کے پس پردہ ازلی معلم موجود ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ان علوم میں پرانا پن آیا اور نہ ہی بوسیدگی، بلکہ مرورِ زمانہ سے ان میں مزید نکھار، حیات اور تروتازگی پیدا ہوتی گئی اور جب تک زمین وآسمان قائم رہیں گے، اس وقت تک ان کی نئی نئی جہتیں سامنے آتی رہیں گی۔

آپ ﷺ کو اپنے صحابہ اور ساتھیوں میں محبوبیت کا ایسا مقام حاصل تھا، جو کسی اور کے حصے میں نہ

آیا، مثال کے طور پر جب کفار رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ جنہیں غزوہ ماء الرجیع میں قید کرلیا گیا تھا، کو قتل کرنے کے لئے لائے تو انہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو پھانسی دینے سے پہلے پوچھا: ''کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ محمد (ﷺ) تمہاری جگہ ہوتے اور تم اطمینان وسکون سے اپنے گھر ہوتے؟'' آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''نہیں، اللہ کی قسم! مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک میں کانٹا چبھے اور میں اس جگہ ہوں۔'' اس بہادرانہ جواب کے بعد آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور دعا کی: ''اے اللہ ہم نے تیرے رسول ﷺ کا پیغام پہنچادیا تو بھی ہمارے ساتھ کیے جانے والے سلوک کی اطلاع اسی وقت اپنے رسول ﷺ تک پہنچادے۔ اس کے بعد کافروں کے بارے میں بددعا کرتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ ان کو چن چن کر مار، انہیں بکھیر کر ہلاک کر اور ان میں سے کسی ایک کو زندہ نہ چھوڑ۔'' اس کے ساتھ ہی کافروں نے آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا۔ (8)

رسول اللہ ﷺ کو حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کا یہ سلام مل گیا اور آپ ﷺ نے حزن وملال کے ساتھ اپنے صحابہ کرام کو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع دی۔ موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق خبیب اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما ایک ہی دن میں شہید کئے گئے اور اس دن رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا گیا: ''اور تم پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی ہو۔ قریش نے خبیب کو قتل کر دیا''۔ (9)

ایک اور واقعہ سنیے جو آج بھی ہر مومن کے دل کو تروتازگی بخشتا ہے:

جب رسول اللہ ﷺ کی صحابیہ حضرت سمیرا رضی اللہ عنہا نے جنگِ احد میں رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر سنی تو وہ جبلِ احد کے دامن کی طرف دوڑ پڑی، جہاں لوگوں نے اسے اس کے والد، شوہر اور بیٹوں کی لاشیں دکھائیں، لیکن اس نے ان کی ذرا پرواہ نہ کی، بلکہ مسلسل رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتی اور آپ کے بارے میں پوچھتی رہی کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ اور آخرکار جب لوگوں نے اسے رسول اللہ ﷺ کا پتہ بتایا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف تیزی سے لپکی، آپ ﷺ کے سامنے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا اور کہنے لگی: ''اگر آپ خیریت سے ہیں تو پھر ہر مصیبت ہیچ ہے۔'' (10) اس طرح رسول اللہ ﷺ کی محبت نے لوگوں کے دلوں اور سینوں میں بسیرا کرلیا تھا۔

صحابہ کرام کی نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کی ایک دوسری مثال بھی پڑھیے:

فخر دو جہاں رسول اللہ ﷺ کو رفیق اعلیٰ سے ملاقات کے وقت کے آ پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی، گویا آپ ﷺ کو آسمانوں سے ملاقات کی دعوت موصول ہو چکی تھی۔ آپ کے لئے اپنے ان پیارے صحابہ کرام سے جدا ہونے کا وقت آ چکا تھا، جنہوں نے تیئس برس تک آپ کے ساتھ جہاد کیا تھا، اس لئے آپ ﷺ زندگی کے آخری ایام میں غمگین حالت میں اپنے صحابہ کرام سے ملنے کے لئے نکلتے اور صحابہ کرام بھی آپ کی اس حالت سے پریشان اور غمگین ہو جاتے اور جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھتے تو ان کے سینے غم اور افسوس سے پھٹنے لگتے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنے پیغامات، احکام اور تعلیمات پہنچانے کے لئے یمن روانہ فرماتے اور جب آپ رضی اللہ عنہ یمن سے لوٹتے تو چشم دید معاملات و واقعات اور پیش آمدہ مشکلات سے آپ ﷺ کو آگاہ کرتے۔ یمن کی طرف اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے سے پہلے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دعا کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''اے معاذ! ہو سکتا ہے کہ اس سال کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو اور شاید آئندہ تمہارا گزر میری مسجد اور قبر کے پاس سے ہو۔'' یہ ارشاد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر بجلی بن کر گرا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بے بال و پر پرندے کی طرح محسوس کیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

رسول اللہ ﷺ مشکل ترین معاشرتی مسائل کو بڑی آسانی سے حل فرما لیتے۔ آپ ﷺ کے تشریف لے جانے کے تیرہ سو سال بعد جارج برنارڈ شو (George Bernard Shaw) نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے: ''دورِ حاضر کو محمد ﷺ کی طرح کی ہستی کی ضرورت ہے، جو چٹکیوں میں مشکلات کا حل تلاش کر لیتی ہو۔'' یہ بڑی اہم بات ہے، کیونکہ کمال تو وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ انسانیت جب آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اطمینان وسکون محسوس کرتی ہے، درخشاں و پرنور آفاق تک رسائی اور ذلت و جہالت سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہے، زمانے کے ہاتھوں کھیل تماشا بننے کی بجائے دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے سرفراز ہوتی ہے اور اپنے شایانِ شان بلند و برتر مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود تمام آثار اور اشارے نئے سرے سے ترقی کی نوید سنا رہے

ہیں۔ جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾[الصف:٨-٩] "یہ چاہتے ہیں کہ خدا (کے چراغ) کی روشنی کو منہ سے (پھونک مارکر) بجھا دیں، حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا، خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔ وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے اور سب دینوں پر غالب کرے، خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے۔" کا مصداق ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جلد ہی اپنے دین کو غالب اور اپنے نور کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے اور پیاسی انسانیت اطمینان وسکون کی تلاش میں اس دین کی وسعتوں کی طرف دوڑنے لگے گی: جس کے نتیجے میں دنیا میں ہی جنت کی زندگی کا مزا آنے لگے گا اور جلد ہی وہ صبح بھی طلوع ہوگی جب تمام انسانیت کے دل ودماغ کے دریچے خاتم الانبیاء اور سید الاولیاء حضرت محمد ﷺ کی محبت کے لئے کھل جائیں گے، جن کے مبارک نام کو ہم ہر روز پانچ مرتبہ علی الاعلان پکارتے ہیں، اگرچہ غفلت کے شکار مسلمانوں اور یورپ وایشیاء کے ظالم کفار ومنافقین کو یہ بات پسند نہیں۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس اطمینان وسکون کا باعث ہے۔ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ آپ ﷺ کا لایا ہوا پیغام امن وآشتی کا سرچشمہ ہے۔ تاریخ اس پر گواہ ہے۔ اس امن کو دوبارہ حاصل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسانیت رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت سے راہنمائی حاصل کرے، کیونکہ انسان آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے جس قدر متعارف ہوتا ہے، اسی قدر اس کے دل میں آپ ﷺ کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے میں خوشگوار تبدیلی آتی ہے۔ [11]

اس مقدمے میں جس کے لئے پہلے "دیباچہ" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی، میں نے اللہ کی مدد اور فضل واحسان سے عنوانات قائم کر کے فخرِ کائنات سرورِ کونین حضرت محمد ﷺ کی عظمت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

آپ ﷺ کی تعریف میں کہی گئی ہر بات ہی خوبصورت ہوتی ہے، تاہم اگر آپ اس میں کوئی نقص دیکھیں تو اسے میری ذات سے منسوب کریں، کیونکہ فخرِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے منسوب ہر چیز خوبصورت اور درخشاں وتاباں ہوتی ہے۔

تمہید

نبی مرسل رحمت للعالمین

اس دور کا نام دورِ جاہلیت تھا، لیکن یہاں جاہلیت سے مراد علم کا متضاد معنی نہیں، بلکہ کفر کا مترادف مراد ہے، جو ایمان اور اعتقاد کی ضد ہے۔ اس مقام پر زمانۂ جاہلیت کے عیوب ونقائص کو بیان کرنا مقصود ہے اور نہ ہی ظلم وناانصافی کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے دور کی منظر کشی کرنا پیشِ نظر ہے، چونکہ باطل کی منظر کشی بعض اوقات فکری بگاڑ اور گمراہی کا باعث بن جاتی ہے، اس لئے میرے نزدیک یہ ایک قسم کا جرم ہے، تاہم اس دور کو سمجھنے کے لئے اس کی بعض رسوم وعادات کی طرف اشارہ کرنا ناگزیر ہے، تاکہ فخرِ کائنات سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کی صورت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اہلِ دنیا پر انعام واحسان کو یاد رکھنا ہمارے لئے ممکن ہو سکے۔

آپ ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری اہلِ جہاں کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت اور احسان ہے، جس کی طرف قرآنِ مجید نے درج ذیل الفاظ میں اشارہ کیا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [آل عمران: ١٦٤] ”خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجے جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم اور رحمت واحسان کا اندازہ لگائیے کہ لوگوں میں سے ہی ایک شخص کو ان کی طرف رسول اور راہِ حق کا رہبر وراہنما بنا کر بھیجا جو دوسرے انسانوں کی طرح تمام بشری تقاضوں اور احساسات کا حامل ہے۔ اگر انہیں رہبر ورہنما کی ضرورت ہے تو آپ ﷺ ان کے لئے رہبر وراہنما ہیں۔ اگر انہیں ممبر پر خطبہ دینے والے خطیب کی ضرورت ہے تو آپ ﷺ فصیح وبلیغ خطیب ہیں۔ اگر انہیں حکمران کی ضرورت ہے تو آپ ﷺ ایسے حکمران ہیں، جو سلاطین کے نام خطوط لکھتے اور ان کے ساتھ معاہدات کرتے ہیں اور اگر انہیں سپہ سالار کی ضرورت ہے تو آپ ﷺ بہترین سپہ سالار ہیں، غرض زندگی کے جس شعبے کو بھی لے لیجیے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانیت کی پہلی نافرمانی کو معاف کرنے کے لئے اپنے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا، جس کے نتیجے میں حضرت آدم علیہ السلام سے سرزد ہونے اور پیدائشی طور پر تمام اولادِ آدم میں منتقل ہونے والی پہلی نافرمانی دھل گئی۔ اگرچہ یہ عقیدہ غلط اور بے شمار غلط تاویلات کے باعث گمراہ کن ہے، تاہم اس سے ایک صحیح اشارہ ملتا ہے کہ اللہ سبحانہ

وتعالیٰ نے افضل ترین مخلوق اور اپنے سب سے پسندیدہ رسول محمد ﷺ کو پیش آنے والی تکالیف ومصائب کے علم کے باوجود انہیں دنیا میں بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو گمراہی اور بدی کے راستے سے بچا کر انسانِ کامل کے مرتبے پر فائز کریں۔ ایک صوفی شاعر اور محقق ابراہیم حقی نے اسے یوں تعبیر کیا ہے: ''مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے رب کو اپنے دل کے خزانے کی طرح پہچانیں۔'' انسان کا دل ایک ایسا مخزن ہے، جس میں زمین وآسمان کی وسعتوں میں نہ سما سکنے والی ذاتِ باری تعالیٰ جلوہ گر ہوتی ہے۔ کتابیں، انسانی عقلیں، افکار ونظریات، فصاحت وبلاغت اور زمین وآسمان غرض کائنات کی کوئی بھی چیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ عالیہ کا احاطہ کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے تعبیر میں لا سکتی ہے۔ یہ صرف انسانی دل ہی ہے، جو کسی نہ کسی درجے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ترجمان بن سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دل کو بے مثال قوتِ بیان اور بلاغت سے نوازا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں محبت الہیہ کی مسافت طے کرے اور جس چیز کو تلاش کرنا چاہیے اسے تلاش کرے یہاں تک کہ اسے اللہ تعالیٰ کا وصال نصیب ہو جائے اور اس کی محبت میں فنا ہو جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا یہی مقصد تھا۔

آپ ﷺ کو انسانیت کی طرف اس لئے بھیجا گیا تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں، اپنے معجزات انسانیت کے سامنے پیش کریں اور انسانیت کو اس کی حقیقت سے روشناس کرائیں۔ آپ ﷺ کی بدولت ہی انسانیت مادی نجاستوں سے پاک صاف ہو کر روحانی زندگی کے اعلیٰ مراتب کو حاصل کر سکتی ہے اور انسانیت نے عملاً یہ مقصد حاصل کر بھی لیا۔

آپ ﷺ لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے تا کہ کتاب وحکمت کی روشنی میں انسانیت اپنے مقام کو پہچانے اور آخرت کی طرف متوجہ ہو کر ابدی زندگی سے سرفراز ہو اور انسانیت عملاً اس راستے پر چل بھی پڑی۔ مسلمانوں کے ہاں کچھ ایام خوشی اور احترام کے دن سمجھے جاتے ہیں، جن میں سے بعض دن بطورِ عید کے منائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہر ہفتے جمعہ کے دن مسلمان خوشی محسوس کرتے ہیں اور یہی خوشی کسی قدر بڑے پیمانے پر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر منائی جاتی ہے۔ عید الاضحیٰ کے دنوں میں مسلمان جانوروں کی قربانی کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی یاد تازہ کرتے ہیں اور اپنی عاجزی وانکسار ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔ بعض مسلمان اس مقصد کے لئے حج کی نیت سے بیت اللہ کا رخ کرتے ہیں اور غلافِ کعبہ سے لپٹ کر اور میدانِ عرفات میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور آہ وزاری کرتے اور آپ ﷺ کے وسیلے سے بخشش مانگتے ہیں۔

عید الفطر بہت ہی بابرکت اور لاتعداد مقاصد کا حامل خوشی کا دن ہے، کیونکہ یہ اس خوشی کا نام ہے جسے ایک مسلمان پورے ایک ماہ کے روزوں کے بعد اپنے پروردگار کی طرف سے حاصل ہونے والی خوشنودی کے موقع پر محسوس کرتا ہے۔

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے علاوہ ایک اور خوشی کا دن بھی ہے جو در حقیقت نہ صرف انسانیت بلکہ پوری کائنات کے لئے باعثِ مسرت ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کا دن ہے، یعنی جس دن آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ جس دن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آسمانِ انسانیت میں نورِ محمدی کی قندیل کو درخشاں آفتاب کی طرح معلق کیا، جس سے جاہلیت کا اندھیرا چھٹ گیا اور روشنی نے ساری کائنات کو ڈھانپ لیا۔ آپ ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری جن وانس سب کے لئے عظیم ترین نعمت خداوندی ہے۔

ب: دورِ تاریکی

عقیدۂ توحید سے محروم دور دورِ تاریکی کہلاتا ہے، کیونکہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ جن کے نور سے زمین وآسمان منور ہیں پر ایمان لانے سے سب لوگ روگردانی کریں تو کفر کی تاریکی نفوسِ انسانی پر چھا جاتی ہے، دل سیاہ ہو کر راہِ حق کی پہچان کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں اور آنکھیں حقائق کا مشاہدہ کرنے سے دھندلا جاتی ہیں۔ ایسا انسان چمگادڑ کی مانند تاریک دنیا میں زندگی گزارتا ہے۔

یہ وہ دور تھا جس میں دین کی بنیادیں متزلزل اور آسمانی مذاہب خود اپنے پیروکاروں کے ہاتھوں ردوبدل کا شکار ہو چکے تھے۔ سوائے چند ایک ایسے موحدین کے کوئی بھی باقی نہ رہا تھا جو اگرچہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے، لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم تھا اور نہ ہی اس کے اسمائے حسنیٰ سے آگاہی، اس لئے وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا حق عبودیت کیونکر ادا کریں؟

ا: دورِ جاہلیت میں بت پرستی

مشرکین نے بیت اللہ کو بتوں سے بھر رکھا تھا۔ وہ نہ صرف ان کی پوجا کرتے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے اور اسے اپنے لئے باعث تسلی سمجھتے۔ جن لوگوں کے پاس تھوڑا بہت علم تھا وہ یہ عذر پیش کرتے کہ ہم ان بتوں کی عبادت صرف قربِ خداوندی کے حصول کے لئے کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم انہی کی زبانی اس طرف درج ذیل الفاظ سے اشارہ کرتا ہے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾[الزمر:۳] ”(وہ کہتے ہیں) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔“

انسانی فطرت میں ودیعت بندگی کا قیمتی جذبہ خیانت اور غلط استعمال کا شکار ہو چکا تھا... اس لئے ایسے لوگوں سے پتھر، درخت، مٹی، سورج، چاند، ستاروں کی عبادت کیسے بعید ہو سکتی تھی جو کھانے پینے کی بعض چیزوں مثلاً مٹھائی اور پنیر وغیرہ کو اپنے ہاتھ سے بنا کر ان کی پوجا شروع کر دیتے اور کچھ دیر کے بعد جب بھوک لگتی تو انہیں کھا لیتے۔

اس قسم کے غلط اور بوسیدہ نظریات کا قرآنِ کریم درج ذیل آیات مبارکہ میں ذکر کرتا ہے: ﴿وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾[یونس:۱۸] ”اور یہ (لوگ) خدا کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، جو نہ ان

کا کچھ بگاڑ ہی سکتی ہیں اور نہ کچھ بھلا ہی کر سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔ کہہ دو کیا تم خدا کو ایسی چیز بتاتے ہو جس کا وجود اسے نہ آسمانوں میں معلوم ہوتا ہے نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور (اس کی شان) ان کے شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔" ﴿أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ [الزمر:۳] "دیکھو! خالص عبادت خدا ہی کے لئے (زیبا) ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں تو جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں خدا ان میں ان کا فیصلہ کر دے گا۔ بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے ہدایت نہیں دیتا۔"

مشرکین اپنے گمراہ کن نظریے کی تائید میں دلائل بھی پیش کیا کرتے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ انہوں نے اپنے آباواجداد کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ قرآنِ کریم مشرکین کی اس دلیل کو یوں بیان کرتا ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ [البقرة: ۱۷۰] "اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) خدا نے نازل فرمائی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے رستے پر ہوں (تب بھی وہ ان کی تقلید کئے جائیں گے)۔"

۲: کلیاں جنہیں مسل دیا جاتا تھا

قرآنِ کریم زمانہ جاہلیت کی برائیوں میں سے ایک اور برائی کو یوں بیان کرتا ہے: ﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَى ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ يَتَوَارَى مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَى هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ [النحل: ۵۸-۵۹] "حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہناک ہو جاتا ہے اور اس خبر بد سے (جو وہ سنتا ہے) لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور) سوچتا ہے کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے۔ دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بری ہے۔"

زمانۂ جاہلیت میں جیسے ہی کسی کو اس کے گھر میں بچی کی پیدائش کی خبر دی جاتی اُس کا چہرہ غصے سے متغیر ہو جاتا اور یہ تکلیف دہ خبر سن کر شرمندگی کے مارے اُس کے چہرے پر تاریکی چھا جاتی۔ یہ خبر اسے اِس قدر بری لگتی کہ وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے شرماتا اور اسے یقین ہو جاتا کہ اسے دو کاموں میں سے ایک کام کرنا ہی ہوگا یا تو بچی کو زندہ رکھ کر معاشرے میں ذلت و رسوائی کی تکلیف برداشت کرتا رہے یا پھر اس بچی کو زندہ درگور کر کے شرمندگی کے داغ کو دھوڈالے۔

یہ وہ ذلت آمیز سلوک تھا جو زمانۂ جاہلیت میں عورت ذات کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ عورت کی یہ تذلیل و توہین صرف زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے ہاں نہ تھی، بلکہ اس وقت متمدن کہلائی جانے والی روم و فارس کی سلطنتوں میں بھی عورت کے ساتھ اسی قسم کا ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے ہاں اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے یہ ایک ایسا فقید المثال کارنامہ ہے، جس کی پورے روئے زمین پر کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم نے ہی سب سے پہلے اس ظلم و ستم کو ختم کرتے ہوئے کسی بھی سبب سے بچوں کے قتل کو حرام قرار دیا، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ﴾ [الانعام: ۱۵۱] ''اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا کیونکہ تم کو اور ان کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔''

گویا اللہ تعالیٰ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی اولاد کو کیوں قتل کرتے ہو؟ میں ہی تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق دیتا ہوں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ زمین تمہارے لئے سینکڑوں قسم کی تروتازہ کھانے کی چیزیں لیے ہوئے ہے؟ کیا تم غور نہیں کرتے کہ آسمان تمہارے لئے حرکت کر رہا ہے؟ اور اس میں چلتے بادل تمہاری نفع رسانی کے لئے برف اور پانی برساتے ہیں؟ زمین پر لاکھوں قسم کے نباتات کو میرے سوا کس نے اگایا؟ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود تم کیوں رزق کی کمی کے خوف سے اپنی اولاد کے قتل کے درپے ہو؟ یاد رکھو! جو بھی اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرے گا وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل نہ کر پائے گا، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُن بے گناہ بچوں سے ہم کلام ہوں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ انہیں کس گناہ کے سبب قتل کیا گیا تھا۔ ظلم و زیادتی کرنے والے اپنے جرم کی پوری پوری سزا بھگتیں گے۔ قرآن مجید کی آیت مبارکہ: ﴿وَإِذَا الْمَوْءُوْدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ [التکویر: ۸-۹] ''اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماردی گئی؟'' ایسے انداز سے زمانۂ جاہلیت کی اخلاقیات کی منظر کشی کر رہی ہے کہ جسم کانپ اٹھتا ہے۔

ایک دفعہ ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے سامنے زمانۂ جاہلیت کی اس وحشیانہ رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ ہم زمانۂ جاہلیت میں بتوں کی پوجا کیا کرتے اور اپنی اولاد کو زندہ درگور کردیا کرتے تھے۔ میری ایک بیٹی تھی جب وہ کچھ بڑی ہوئی، باتیں سمجھنے لگی، میرے آگے پیچھے چلنے لگی اور میرے بلانے پر خوشی سے دوڑی چلی آتی تو ایک دن میں نے اسے بلایا اور وہ میرے پیچھے چل پڑی۔ جب میں گھر سے قریب ہی ایک کنویں کے پاس پہنچا تو میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کنویں میں پھینک دیا اس کی زبان پر آخری کلمات ''میرے پیارے ابا جان! میرے پیارے ابا جان!'' تھے۔'' یہ واقعہ سن کر رسول اللہ ﷺ اِس قدر روئے کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ حاضرین مجلس میں سے ایک آدمی نے قصہ بیان کرنے والے سے کہا: ''تم نے رسول اللہ ﷺ کو غمگین کردیا!'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے ملامت مت کرو، کیونکہ وہ اپنے لئے پریشانی کی باعث چیز کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا ہے۔''

اور پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اپنی بات پھر کہو۔'' چنانچہ اس نے دوبارہ قصہ بیان کیا، جس پر رسول اللہ ﷺ دوبارہ اِس قدر روئے کہ آپ کے آنسو آپ کی داڑھی مبارک پر ٹپکنے لگے پھر آپ ﷺ اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت کے تمام اعمال کو معاف کردیا ہے، اس لئے تم نئے سرے سے اعمال کرو۔''(14) گویا رسول اللہ ﷺ اس قصے کو دوبارہ سن کر لوگوں کو یہ بات سمجھانا چاہتے تھے کہ اسلام سے پہلے تمہاری حالت یہ تھی کہ اپنی بچیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے۔ میں نے قصے کو دوبارہ اس لئے بیان کرنے کے لئے کہا ہے کہ تمہیں اسلام کی وجہ سے انسانیت کو حاصل ہونے والی قدر و منزلت کا احساس ہو۔

اِس تکلیف دہ مثال سے اُن برائیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جن میں اُس دور کا انسان مبتلا تھا۔ زمانۂ جاہلیت کی دیگر ہزاروں برائیوں کے ساتھ ساتھ اُس دور کے تاریک صحراء میں ہر روز ایک گہرا گڑھا کھودا جاتا اور معصوم بچوں کو اس میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُس دور کی انسانیت نے وحشی پن میں بھیڑیوں کو بھی مات دے دی تھی۔ جس کے پاس اپنا دفاع کرنے کی طاقت نہ ہوتی وہ طاقت وروں کے ظلم وستم کا نشانہ بن کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ معاشرہ انتہائی سنگین بحرانوں میں گھرا ہوا تھا اور کوئی ایسی ہستی دکھائی نہ دیتی تھی جو ان بحرانوں کو ختم کرتی یا ان کا کوئی حل تلاش کرتی۔

یہ وہ دور تھا، جس میں ہمارے نبی کریم ﷺ غارِ حراء جسے عنقریب آپ ﷺ کی امت کے ہاں

جبل النور کا نام دیا جانے والا تھا، میں سب سے الگ تھلگ قیام کرتے اور افق میں اپنی نظریں گاڑھے جاہلیت کے اندھیرے کے چھٹنے کا انتظار کرتے۔ شاید آپ ﷺ اس دور میں اپنی پیشانی زمین پر ٹیکے کئی کئی گھنٹے اپنے پروردگار کے سامنے آہ وزاری اور انسانیت کی نجات کے لئے دعائیں مانگنے میں گزارتے، کیونکہ بخاری و مسلم نے اس زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے ''فیتحنث فیھا'' کی تعبیر اختیار کی ہے، جس سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لوگوں سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے آپ کو عبادت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ اِس غار میں لمبے عرصے تک قیام فرماتے اور اُس وقت تک مکہ واپس نہ جاتے جب تک آپ ﷺ کا توشہ ختم نہ ہو جاتا، لیکن پھر بقدرِ ضرورت توشہ لے کر دوبارہ غارِ حرا کی طرف لوٹ جاتے(15) آپ ﷺ غار میں قیام کے دوران جہاں وجود اور ماوراء الوجود، مخلوق اور کائنات اور تخلیق کی غرض وغایت کے بارے میں غور وفکر کرتے تھے وہیں آپ ﷺ انسانیت کی اُس تکلیف دہ صورت حال کے بارے میں بھی سوچتے تھے، جس کے تصور سے ہی رونگھٹے کھڑے جاتے ہیں اور دل پارہ پارہ ہونے لگتا ہے۔

۳: نئی اقدار

یہ وہ دور تھا، جس میں تمام انسانی اقدار کے پیمانے بدل چکے تھے، جس کے نتیجے میں معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ باعث فضیلت باتوں کو معیوب اور معیوب اور بری عادات کو قابل فخر اور باعث فضیلت سمجھا جانے لگا تھا۔ وحشی پن کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا اور رحم دلی اور انسانی اوصاف کو ذلت ورسوائی کا باعث سمجھا جاتا۔ جنگل کے سنگ دل بھیڑیے بھیڑوں کے ریوڑ کے رکھوالے بن چکے تھے، جس کے نتیجے میں کمزور و لاچار بھیڑیں ان سنگ دل رکھوالوں کے ظلم وستم سے کراہ رہی تھیں، لیکن ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اخلاقی پستی اور بدی کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ شراب نوشی اور جوابازی جیسے معاشرتی جرائم کو معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ ذخیرہ اندوزی عام معمول بن چکی تھی اور چوری، ڈاکہ زنی اور قتل وغارت گری کو بہادری اور مہارت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

ایسے حالات ایک سحر انگیز اور مؤثر گفتگو کے حامل مصلح کے متقاضی تھے، جو اس بگاڑ کی اصلاح کر سکے، چنانچہ یہ ضرورت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ رحمت خداوندی کو جوش آیا اور اللہ تعالیٰ نے فخر کائنات محمد ﷺ کو انسانیت کی نجات اور ہدایت کے لئے رسول بنا کر مبعوث فرمادیا۔ آپ ﷺ کی

تشریف آوری سے ہر چیز میں تبدیلی آئی اور ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔

ممتاز شاعر احمد شوقی نے کیا خوب منظر کشی کی ہے:

ولد الهدى فالكائنات ضياء　　وفم الزمان تبسم وثناء

''آفتابِ ہدایت کا طلوع ہونا تھا کہ کائنات منور ہو گئی اور وقت کے لبوں پر آپ ﷺ کی تعریف کے نغمے اور خوشی کی مسکراہٹ آ گئی۔''

یعنی زمان و مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے کہ اچانک رسول اللہ ﷺ کی آمد کی خوشی سے مسکرا اٹھے۔ چند ہی سالوں بعد جب آپ ﷺ مدینے تشریف لے گئے تو اہل مدینہ آپ ﷺ کی آمد کی خوشی اور استقبال میں نعتیہ ترانے پڑھنے لگے:

طلع البدر علينا من ثنيات الوداع

وجب الشكر علينا مادعا لله داع[16]

''مقام وداع کی پہاڑیوں سے ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہوا، اس لئے اب ہم پر لازم ہے کہ ہم اُس وقت تک بارگاہِ خداوندی میں شکر کے لئے سجدہ ریز رہیں جب تک کائنات میں اللہ کا نام لیا جاتا رہے۔''

۴: خدائی بندوبست

نبوت سے پہلے آپ ﷺ کی زندگی کے تمام مراحل بچپن، بلوغت اور جوانی آپ کی نبوت کے اس قدر واضح پیش خیمہ تھے کہ آپ ﷺ نے جوں ہی نبوت کا اعلان کیا آپ کو اچھی طرح جاننے والے فوراً آپ پر ایمان لے آئے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا گیا، اس لئے اب جب آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوئ نبوت کر رہے ہیں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جس شخص نے کبھی چھوٹے سے معاملے میں بھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ ایسے عظیم و مقدس معاملے میں جھوٹ بول سکتا ہے۔[17] اس دور کے انسان کا یہ اندازِ فکر تھا۔ اگرچہ تمام لوگ آپ ﷺ پر ایمان نہ لائے، لیکن جس نے بھی بغض و عناد سے اجتناب کیا وہ فوراً آپ ﷺ پر ایمان لے آیا۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ شاید آپ ﷺ بھی زمانۂ جاہلیت کی آلودگی سے متاثر ہوئے ہوں گے، کیونکہ

جس ماحول میں آپ ﷺ نے پرورش پائی، اگرچہ وہ جاہلیت کا ماحول تھا، لیکن جاہلیت کی آلودگی آپ سے اور آپ کی پاکیزہ زندگی سے کوسوں دور تھی۔ اس دور میں بھی آپ ﷺ نہایت امانت دار تھے اور آپ کی امانت داری سے ہر کوئی واقف تھا، یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں اگر بالفرض کسی کو سفر پر جانا ہوتا اور اس نے اپنی اہلیہ کو کسی کی حفظ وامان میں دینا ہوتا تو وہ اس کے لئے آپ ﷺ کا انتخاب کر سکتا تھا، کیونکہ اسے یقین ہوتا کہ آپ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے مال کی حفاظت مقصود ہوتی تو وہ بلا تردد اسے آپ کے پاس امانت رکھوا سکتا تھا اور اسے مکمل اطمینان ہوتا کہ اس کے مال کو کچھ گزند نہ پہنچے گا۔ اگر کوئی کسی معاملے کی حقیقت کو جاننا چاہتا تو وہ آپ ﷺ کی طرف رجوع کر کے بالکل مطمئن ہو جاتا، کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔

آپ ﷺ کی صداقت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ صفا پہاڑ پر چڑھتے ہیں اور اپنے اردگرد کے لوگوں سے پوچھتے ہیں: ''تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر نکل کر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے؟'' اس پر سب حاضرین نے کہا: ''یقیناً، کیونکہ ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔'' آپ کی تصدیق کرنے والے حاضرین میں دشمنانِ اسلام عتبہ بن ربیعہ، ولید بن مغیرہ اور ابوجہل وغیرہ بھی شامل تھے، لیکن اس موقع پر ان سب نے آپ کی صداقت وامانت کی گواہی دی۔

چونکہ مشیت ایزدی میں تھا کہ آپ ﷺ کو اللہ کے سوا ہر کسی کی محتاجی سے محفوظ رکھا جائے اور اپنے تمام امور کو اللہ کے سپرد کرنے کی نہج پر آپ کی تربیت کی جائے اس لئے ابتدائے عمر سے ہی جس نے بھی آپ ﷺ کی حمایت کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گیا، چنانچہ آپ ﷺ ابھی رحمِ مادر میں ہی تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا اور اپنی زندگی کے چھٹے برس کو بھی نہ پہنچے تھے کہ ماں کی مامتا سے بھی محروم ہو گئے پھر آپ کے دادا عبدالمطلب آپ کی پرورش کرنے لگے تو ابھی آپ پورے آٹھ برس کے بھی نہ ہو پائے تھے کہ وہ بھی دنیا سے کوچ کر گئے۔ ہر قسم کے ظاہری سہارے سے محرومی کے اس تسلسل سے دراصل تقدیر آپ کے ذہن میں یہ بات بٹھانا چاہتی تھی کہ توحید کے نورانی سائے اور اللہ تعالیٰ کے رازِ وحدانیت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی ہر طرح کی نصرت وحمایت آپ ﷺ کے ساتھ ہے تاکہ کلمہ توحید کے اثرات آپ ﷺ اپنے وجدان کی گہرائیوں میں محسوس کریں اور آپ ﷺ کی نظر میں دنیا کے ظاہری اسباب بے وقعت ہو جائیں اور حقیقتاً ایسا ہی ہوا۔

آپ ﷺ کے والد گرامی کا نام عبداللہ اور والدہ محترمہ کا نام آمنہ تھا، جن کے ذریعے آپ دنیا میں تشریف لائے۔ آپ ﷺ کے والدین کے ناموں میں حسنِ معانی کا امتزاج کوئی اتفاقی امر نہ تھا، بلکہ خدائی تقدیر کا طے شدہ فیصلہ تھا۔ آپ ﷺ کی والدہ کے نام میں امن اور امانت داری کا مفہوم پایا جاتا ہے، جبکہ باپ کا نام خدا تعالیٰ کی بندگی کے مفہوم کا حامل ہے۔ یہ سب کچھ خدائی بندوبست اور انتظام کا نتیجہ تھا تاکہ رسولِ امین ﷺ رسالت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے بھی بندگی کے ماحول میں پرورش پائیں۔

چونکہ آپ ﷺ نے مستقبل میں نبوت و رسالت کی ایک اہم اور بھاری ذمہ داری کو اٹھانا تھا، اس لئے ضروری تھا کہ آپ کو اس کے لئے پہلے سے تیار کیا جائے تاکہ کسی بھی مشکل کا سامنا کرتے وقت آپ ﷺ اللہ تعالیٰ پر بھروسے اور اعتماد کی معراج تک پہنچ جائیں، چنانچہ سب سے پہلے تو آپ کی پرورش یتیمی کی حالت میں ہوئی، دوسرے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو غرور و تکبر کا باعث بننے والی حد سے زیادہ مالداری سے بھی بچایا اور ذلت و عجز کا باعث بننے والی غربت سے بھی محفوظ رکھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی شخصیت افراط و تفریط سے محفوظ انتہائی اعتدال اور زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی کے ساتھ پروان چڑھی۔

ایک قائد کے لئے اس قسم کے مشکل مراحل سے گزرنا ناگزیر ہوتا ہے، کیونکہ جس نے یتیمی کا زمانہ گزارا ہو، وہی اپنی امت کے لئے مشفق اور مہربان باپ ثابت ہوسکتا ہے... قائد کے لئے فقر اور تنگدستی کی حقیقت سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اسے ان لوگوں کی مشقت کا احساس ہو، جو انتظامی امور کو سنبھالتے اور زندگی کے مختلف شعبوں کو چلاتے ہیں۔

یتیموں اور فقراء کی مدد و نصرت اور ان کی دیکھ بھال کرنا رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کا حصہ ہے۔ آپ ﷺ نے یتیمی کے دن دیکھے اور اس میں اپنے شب و روز گزارے، لیکن بعد میں بلندیوں کی انتہا تک پہنچنے کے باوجود ان اخلاق کو چھوڑا اور نہ ہی اپنی سادہ اور زاہدانہ زندگی کو ترک کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے عمر بھر کسی یتیم کو ڈانٹا اور نہ کسی حاجت مند کو اس کی حاجت کے بغیر لوٹایا یا جھڑکا، کیونکہ آپ ﷺ کو ان اخلاق کی تعلیم و تربیت خود اللہ تعالیٰ نے دی تھی، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيماً فَآوَى ()وَوَجَدَكَ ضَالاًّ فَهَدَى ()وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَأَغْنَى ()فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ()وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ()وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾[الضحى:٦-١١] "بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی (بے شک دی) اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا اور تنگ دست پایا تو غنی

کر دیا تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔"

چونکہ آپ ﷺ ہم سب کے شفاعت کنندہ ہیں، اس لئے میں جب بھی اس سورت کو پڑھتا ہوں تو (باوجود اس کے کہ میرے والد کے انتقال کو ایک عرصہ گزر چکا ہے) میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں اپنی یتیمی کا تذکرہ کرتے ہوئے عرض کروں: "اے اللہ کے رسول! دیکھئے میں یتیم ہوں اور آپ کی چوکھٹ پر کھڑا ہوں۔ مجھے اپنے در سے خالی ہاتھ لوٹا یئے اور نہ اپنی شفاعت سے محروم کیجیے۔"

۵: نورِ منتظر

آپ ﷺ کے جدامجد عبدالمطلب آپ ﷺ کی ذات میں نورِ نبوت ایک عرصے سے دیکھ چکے تھے۔ آپ ﷺ کے اپنے جدامجد کے ہمراہ گزرے ہوئے تمام ایام بڑے بابرکت تھے۔ عبدالمطلب آپ ﷺ کو اکابر کی محفلوں میں لے جا کر آپ کا اعزاز واکرام کرتے۔ شاید آپ ﷺ کی ذات میں انہیں ایک نجات دہندہ دکھائی دے رہا تھا، کیونکہ وہ آپ کی نگاہوں کی اس گہرائی کو دیکھ چکے تھے جو کسی اور کی نگاہوں میں نہ تھی، نیز انہوں نے اپنے جدامجد لوی بن کعب سے مروی وہ روایات بھی سن رکھی تھیں، جن کے مطابق ان کی نسل میں ایک نبی کا ظہور ہونے والا تھا۔ شاید انہی وجوہات کے سبب عبدالمطلب نے آپ ﷺ میں نبوت کی علامات دیکھ لیں تھیں اور ان کے دل میں اپنے پوتے کی محبت اس قدر رچ بس گئی تھی کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو وہ عبدالمطلب جن کی آنکھیں ابرہہ کے لشکر کے سامنے نہ جھپکیں اور کئی دشمن قبائل کے ساتھ سالہا سال تک لڑی جانے والی "جنگِ فجار" کے دوران جن کی آنکھوں سے ایک آنسو نہ ٹپکا آج وہ اپنی وفات کے وقت اپنے باسعادت پوتے کی جدائی کے غم میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے کہ آئندہ وہ اپنے پوتے محمد ﷺ کو اپنے سینے سے نہ لگا سکیں گے۔(18) اس طرح عبدالمطلب کی وفات کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا یہ دُرِّ یکتا اپنے چچا ابوطالب کی کفالت و پرورش میں آ گیا۔

۶: عظیم بدلہ

آپ ﷺ کے چچا ابوطالب نے چالیس سال تک آپ ﷺ کی حفاظت وحمایت کا فریضہ

سرانجام دے کر اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا، جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے ہونہار بیٹے سے نوازا، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس شرف عطا کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے ذریعے آپ ﷺ کے نسب مبارک کی حفاظت کا انتظام کیا۔ اس کی تائید رسول اللہ ﷺ سے مروی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔ (19)

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی ولایت کے نمائندے ہیں، اسی لئے آپ کو امیر الاولیاء کہا جاتا ہے اور تصوف و طریقت کے تمام سلسلے آپ پر جا کر مل جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قیامت تک تمام اہل طریقت و تصوف آپ کی پیروی کرتے رہیں گے اور آپ کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ تمام فضائل در حقیقت آپ کے والد ابو طالب کی جانب سے مشکل وقت میں آپ ﷺ کی حمایت و نصرت کرنے کا صلہ ہیں۔ اسی صلے کا تسلسل تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علی المرتضیٰ، بہادر شاہسوار اور حیدرِ کرار جیسے القاب اور رسول اللہ ﷺ کی دامادی ایسے مقام سے نوازا گیا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ کے چچا ابو طالب اور دادا عبد المطلب کی نصرت و حمایت آپ ﷺ کی کامیابیوں کا پیش خیمہ تھی، بلکہ در حقیقت آپ ﷺ کی اصل حامی و ناصر تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالیہ ہی تھی۔ ابو طالب اور عبد المطلب کا انتخاب تو محض ظاہری اسباب کے درجے میں تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جس میں اللہ تعالیٰ ایک طرف آپ ﷺ کی نابغۂ روزگار شخصیت کو پروان چڑھا کر منصب نبوت کے لئے تیار کر رہے تھے تو دوسری طرف معاشرے کو آپ کی دعوتِ نبوت کو قبول کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے، یہی وجہ تھی کہ روز بروز آپ ﷺ کی نبوت کی علامات کا ظہور ہو رہا تھا اور ہر کوئی آپ کے بارے میں گفتگو کرنے لگا تھا۔ آپ ہر کسی کے لئے جانی پہچانی شخصیت بن گئے اور آپ کی شخصیت ہر محفل کے لئے ایک زندہ موضوع (burning issue) کی حیثیت اختیار کر گئی۔

ج: علاماتِ نبوت

۱- سفر شام اور بحیری راہب سے ملاقات

تمام کتب سیرت اس پر متفق ہیں کہ جب آپ ﷺ بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ شام کا سفر کیا۔ راستے میں ایک جگہ قافلے نے آرام کے لئے پڑاؤ ڈالا تو آپ ﷺ کو قافلے کے ساز و سامان کی نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس دوران اس جگہ موجود بحیری نامی ایک راہب نے قافلے میں ایک عجیب و غریب بات دیکھی کہ قافلے پر ایک بادل سایا کیے ہوئے ہے، جب قافلہ چلتا ہے تو بادل بھی چلنے لگتا ہے اور جب قافلہ رکتا ہے تو بادل بھی رک جاتا ہے، چنانچہ راہب نے حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے تمام قافلے والوں کے لئے کھانے کی دعوت کا انتظام کیا۔ یہ بات اہل قافلہ کے لئے باعث حیرت تھی، کیونکہ اس سے پہلے راہب نے کبھی بھی قافلے والوں کو لائقِ التفات نہ سمجھا تھا۔ جب سب اہل قافلہ حاضر دعوت ہوئے تو راہب نے اپنے مطلوبہ فرد کو نہ پاکر پوچھا کہ کیا قافلے والوں میں سے کوئی پیچھے رہ گیا ہے؟ تو ایک بچے کے بارے میں بتایا گیا کہ اسے سامان کی نگرانی کے لئے پیچھے چھوڑ دیا گیا ہے، جس پر راہب نے اسے بھی بلانے کے لئے کہا۔ جب وہ بچہ آیا تو اسے دیکھتے ہی راہب کو یقین ہو گیا کہ یہی وہ شخصیت ہے، جس کی اسے تلاش تھی۔ اس کے بعد وہ ابو طالب سے آپ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ابو طالب نے بتایا کہ وہ ان کا بیٹا ہے، لیکن راہب اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ آپ ہی نبی آخر الزمان ہیں، جس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے ہوں پھر اس نے ابو طالب کو تنہائی میں بلا کر آپ ﷺ کو شام کی طرف نہ لے جانے پر پرزور اصرار کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہود آپ ﷺ میں خاتم النبیین کی صفات دیکھ کر حسد کی وجہ سے آپ ﷺ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، چنانچہ ابو طالب نے راہب کی نصیحت پر عمل کیا اور باقی قافلے والوں سے معذرت کر کے آپ ﷺ کو واپس مکہ لے آئے۔

اگرچہ بحیری راہب کی بات درست تھی لیکن اسے یہ بات یاد نہ رہی کہ آپ ﷺ اپنے پروردگار کی حفظ و امان میں ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ اس آیت مبارکہ میں کیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المائدۃ: ٦٧] "اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔" اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر کے دکھایا۔

۲- شام کی طرف دوسرا سفر

پچیس سال کی عمر میں آپ ﷺ نے دوبارہ شام کا سفر کیا۔ اس دفعہ آپ ﷺ حضرت خدیجہ کے تجارتی قافلے کی سربراہی کرر ہے تھے۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شراکت پر کاروبار کرتے تھے۔ اس سفر میں بھی آپ ﷺ کی ''بحیرا'' نامی ایک راہب سے ملاقات ہوئی، جس نے آپ ﷺ میں موجود نبوت کی علامات سے آپ کو پہچان لیا۔

د: نبی منتظر جس کی آمد کی بشارت سنائی جا چکی تھی

ا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت

ایک دن آپ ﷺ سے صحابہ کرام نے پوچھا: ''آپ اپنے بارے میں ہمیں کچھ بتائیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری کا مصداق ہوں۔ [20] قرآن کریم میں اس موضوع کو دو مستقل آیات میں زیرِ بحث لایا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا درج ذیل آیت مبارکہ میں ذکر آیا ہے: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[البقرة: ١٢٩] ''اے پروردگار ان (لوگوں) میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان (کے دلوں) کو پاک صاف کرے۔ بے شک تو غالب (اور) صاحب حکمت ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا درج ذیل آیت میں تذکرہ ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ [الصف: ٦] ''اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں (اور) جو (کتاب) مجھ سے پہلے آچکی ہے (یعنی) تورات اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت سناتا ہوں۔ (پھر) جب وہ ان لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے آئے تو کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔'' اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا ظہور اچانک ہی نہیں ہوا، بلکہ ایک لمبے عرصے سے آپ ﷺ کی بشارت سنائی جاتی رہی تھی اور سارا جہاں آپ ﷺ کا منتظر تھا۔

آپ ﷺ کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل قرآن کریم ہے، جو رہتی دنیا تک ایک زندہ معجزے کی حیثیت سے جانا جاتا رہے گا۔ اعجازی اوصاف کے حامل قرآنِ کریم کی سینکڑوں آیات فخر کائنات حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا کھلا ثبوت ہیں۔ جب تک کوئی پورے کے پورے قرآن کا انکار نہ

کردے، اس وقت تک اس کے لئے آپ ﷺ کی نبوت کو جھٹلانا ممکن نہیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، جس کا یہ محل نہیں، تاہم آئندہ صفحات میں دلائل کے ضمن میں جن قرآنی آیات کا ذکر آئے گا ان سے اس موضوع پر کسی قدر روشنی پڑے گی۔

۲: تورات کی بشارتیں

آئندہ صفحات میں ہم بعض ان بشارتوں کا ذکر کریں گے جو تورات، زبور اور انجیل میں ان کے سینکڑوں قسم کی تحریفات کا شکار ہو چکنے کے باوجود ابھی تک موجود ہیں۔ جو حضرات اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہیں، انہیں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جن میں یہ موضوع بڑی تفصیل سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس موضوع پر شیخ حسین الجسری کی کتاب ''رسالہ حمیدیہ'' خصوصی اہمیت کی حامل ہے، تاہم آئندہ سطور میں ہم صرف زیادہ اہم دلائل کے ذکر پر ہی اکتفا کریں گے۔

الف: فاران کی پہاڑیاں

۱۹۴۴ء میں انگلینڈ سے شائع ہونے والے تورات کے عربی ترجمے میں مذکور ہے: (جاء الله من سيناء، وأشرق من ساعير واستعلن من جبال فاران) [استثناء ۳۳-۲] ''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا اور وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔'' یعنی انسانیت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل کا ظہور سینا میں ہوا، جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلامی فرمائی تھی۔ یہ رحمت درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی جانے والی نبوت تھی۔ ساعیر سے مراد فلسطین ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کے نزول کی صورت میں رحمت خداوندی جلوہ گر ہوئی تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا شمار اولوالعزم انبیاء میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور فضل کا ظہور متعدد مقامات پر ہوا ہے، چونکہ بہت سے حضرات تجلی اور ظہور کے مفہوم میں فرق ملحوظ نہ رکھ سکے، اس لئے انہیں اس مقام کے سمجھنے میں مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تجلی سے مراد ان کی والدہ کے رحم میں خدائی روح کا پھونکا جانا ہے، جبکہ فاران کی پہاڑیوں پر اللہ تعالیٰ کی صفت احدیت اور فردیت کا ظہور ہوا۔ فاران مکہ

میں ہے، کیونکہ تورات میں ہی ایک دوسرے مقام پر مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام کو فاران نامی مقام پر چھوڑا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات میں مذکور فاران سے مکہ معظمہ مراد ہے، لہذا مذکورہ بالا آیت میں بالترتیب حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی بشارتوں کا ذکر ہے۔

اس آیت کا بقیہ حصہ یوں ہے: [ومعه ألوف الأطهار، في يمينه سنة النار[21]] [22]
''اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔''

اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اُس نبی کو جہاد کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی جائے گی۔

سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وحی کے نزول سے پہلے غارِ حراء میں اعتکاف بیٹھ کر غور وفکر اور عبادت کیا کرتے تھے، چنانچہ پہلی وحی کا نزول بھی اسی غار میں ہوا تھا۔[23]

اگر تورات میں مذکور فاران سے مکہ کا فاران مراد نہیں تو پھر کونسی جگہ مراد ہے؟ اور کون سی جگہ سے دین اسلام کی طرح روشنی کا ظہور ہوا ہے، جو مشرق ومغرب میں پھیل گئی ہو؟ لہذا چونکہ مکہ کے علاوہ دنیا کے کسی حصے میں مذکورہ بالا اوصاف نہیں پائے جاتے، اس لئے تورات میں مذکور فاران کا مصداق مکہ کے علاوہ کوئی اور مقام نہیں ہوسکتا، نیز جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ کتابِ استثناء کے باب ۳۳ کی آیت ۲ اور کتابِ پیدائش کے باب ۲۱ کی آیت ۲۱ یعنی [وسكن برية فاران] ''اور فاران کے بیابان میں رہتا تھا۔'' میں اُس مقام کی طرف اشارہ ہے، جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے سکونت اختیار کی تھی۔ یہ فاران سے مکہ معظّمہ مراد ہونے کی واضح، قطعی اور ناقابل تردید دلیل ہے۔ اس دلیل پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بالکل سطحی اور جاہلانہ قسم کے ہیں۔ خاص طور پر آیت کا آخری حصہ جس میں نبی کریم ﷺ کے صحابہ اور آپ ﷺ کے مکلّف بالجہاد ہونے کی طرف اشارہ ہے، اس آیت سے رسول اللہ ﷺ کے مراد ہونے کے بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔

ب: وہ نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ہوگا

تورات کی ایک اور آیت میں مذکور ہے: [وسوف أقيم لهم نبياً مثلك من بين

اخوتهم،وأجعل كلامي في فمه،ويكلمهم بكل شيء آمربه](استثناء:۱۸:۱۸) ''میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔''

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کی طرف ان کے بھائیوں میں سے تمہاری طرح کا ایک نبی بھیجوں گا، جسے اپنا کلام عطا کروں گا تا کہ وہ ان تک میرے احکام پہنچائے۔

آیت نمبر ۱۹ جو اس آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے، میں مذکور ہے:[ومن لم يطع كلامه الذي يتكلم به باسمي فأناأكون المنتقم من ذلك] ''اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔''

اس آیت میں بنی اسرائیل کے بھائیوں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے آنے والے نبی کی طرف اشارہ ہے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے آنے والے واحد نبی حضرت محمد ﷺ ہیں، مزید برآں آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نبی کی شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی طرح ہوگی۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نبی موعود امی ہوگا۔

آیت میں مذکور نبی کی اطاعت نہ کرنے والوں سے انتقام لینے سے حدود و تعزیرات کی طرف اشارہ ہے، جو صرف دین اسلام میں موجود ہیں۔ تورات کی اس بشارت کا مصداق حضرت یوشع یا حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ یہ دونوں نبی بنی اسرائیل میں سے تھے، نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام عام طور سے نئے احکامات یا شریعت نہیں لائے تھے، بلکہ اکثر احکامات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہی کی پیروی کرتے تھے۔

حضرت یوشع علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عدمِ مشابہت بالکل واضح ہے، کیونکہ وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے، نیز آیت مبارکہ: ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا﴾ [المزمل:۱۵]''(اے اہل مکہ) جس طرح ہم نے فرعون کے پاس (موسیٰ کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا تھا (اسی طرح) تمہارے پاس بھی (محمد) رسول بھیجے ہیں جو تمہارے مقابلے میں گواہ ہوں گے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کے

درمیان پائی جانے والی مشابہت کی طرف مشیر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

ج: دیگر اوصاف

حضرت عبداللہ بن عمرو، عبداللہ بن سلام اور کعب احبار رضی اللہ عنہم کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پہلی آسمانی کتابوں کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ ان سے مروی ہے کہ جب تورات میں حالیہ تحریفات نہیں ہوئی تھیں اس وقت اس میں درج ذیل آیت بھی موجود تھی: [یاأیھا النبی انا أرسلناك شاھداً و مبشراً و نذیراً و حرزاً للأمیین، أنت عبدی و رسولی، سمیتك المتوکل، لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب فی الأسواق، ولا یدفع بالسیئة السیئة، ولکن یعفو و یغفر ولن یقبضه الله حتیٰ یقیم به الملة العوجاء بأن یقولوا لااله الاالله][24] (اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، (عذابِ الٰہی) سے ڈرانے والا اور امی لوگوں کی حفاظت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ میرے بندے اور رسول ہیں۔ میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے۔ وہ نبی نہ تو سخت مزاج اور بداخلاق ہوگا اور نہ ہی بازاروں میں شوروغل کرنے والا۔ وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے گا، بلکہ عفوودرگزر سے کام لے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک اس کے ذریعے سے ایک بگڑی ہوئی قوم کی زبانوں سے ''لااله الاالله'' کہلوا کر اسے درست نہ فرما دیں۔)

آیئے دیکھتے ہیں کہ تورات میں مذکوران اوصاف سے کون مراد ہے؟ یہ بات کسی گہرے تجزیئے کی محتاج نہیں کہ اس آیت کے مضمون کا تعلق کسی آنے والے نبی سے ہے، جو نبی کریم محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا، کیونکہ آپ ﷺ کو تمام جہانوں اور پوری انسانیت کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، گویا اس آیت کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''اے نبی! ہم نے آپ کو جہان والوں کی طرف درست اور سیدھی راہ کی خوشخبری سنانے والا اور ٹیڑھے راستوں کے راہیوں کو انجامِ بد سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ لوگوں کو جہنم میں گرنے سے بچانے کے لئے ہر قسم کے شرور وفتن اور گناہوں کے سیلاب کے سامنے بند باندھ دیں گے اور ٹیڑھی راہوں کی تاریکیوں میں سرگرداں لوگوں کی جنت اور رضائے الٰہی کی طرف راہنمائی کرنے کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوں گے۔

ہم نے آپ کو دورِ جاہلیت میں امی لوگوں کے لئے حفاظت اور جائے پناہ بنا کر بھیجا ہے، چنانچہ جب تک وہ آپ کی پیروی اور آپ پر اعتماد کرتے رہیں گے اس وقت تک حفظ وامان کے ساتھ رحمتِ الٰہیہ اور فضل خداوندی کے سائے میں رہیں گے۔ آپ میرے بندے اور رسول ہیں (یہی وجہ ہے کہ ہم نماز کے دوران تشہد میں ہمیشہ آپ ﷺ کی عبدیت اور رسالت کی گواہی دیتے ہیں) میں نے آپ کا صفاتی نام ''متوکل'' رکھا ہے، لہٰذا اگر پوری دنیا بھی آپ کے خلاف ہو جائے، آپ کی دشمنی پر کمر بستہ اور آپ کے خلاف آمادہ جنگ ہو جائے تب بھی خوف سے آپ کا ایک بال بھی نہ کھڑا ہوگا۔ یقیناً ہر نبی کو توکل کا ایک مقام حاصل ہوتا ہے، لیکن چونکہ آپ کو اس بارے میں خصوصی مقام حاصل ہے، اس لئے میں نے آپ کا نام "المتوکل" رکھا ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ مخاطب کی بجائے غائب کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وہ نبی چیخنے چلانے والا، ہر وقت غصے کی حالت میں رہنے والا، سخت مزاج اور بداخلاق نہ ہوگا، بلکہ وہ باادب، بااخلاق، باوقار اور انتہائی سنجیدہ انسان ہوگا، نیز وہ بازاروں میں سب وشتم کرے گا اور نہ ہی شور وغل، کیونکہ اس قسم کے اسلوب کے ذریعے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا شخصیت کی کمزوری اور غرور کی علامت ہے، لہٰذا وہ نبی اس قسم کے تمام برے اوصاف سے کنارہ کش رہے گا۔''

وہ برائی کا بدلہ برائی کی صورت میں نہیں دے گا... چنانچہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بدوی آتا ہے اور آپ کی چادر مبارک کو زور سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہتا ہے: ''مجھے میرا حق دو!'' صحابہ کرام کو اس درشت رویے پر سخت غصہ آتا ہے، لیکن آپ ﷺ محض مسکرا دیتے ہیں اور صحابہ سے فرماتے ہیں کہ اسے اس کا حق دے دو۔[25] بلکہ آپ ﷺ بڑے سے بڑے گناہ سے بھی درگزر فرما دیتے تھے، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پامال نہ کیا گیا ہو۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ کے اہل مکہ کے ساتھ عفو و درگزر اور بردباری کے برتاؤ کو ملاحظہ فرمائیے کہ جنہوں نے آپ ﷺ کو سالہا سال تک ایذائیں پہنچائیں تھیں آپ ﷺ نے ان پر پوری طرح قدرت رکھنے کے باوجود یہ فرمایا: ''جاؤ! تم سب آزاد ہو۔''[26]

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اس وقت تک اُس نبی کو وفات نہیں دے گا جب تک باطل کی تاریکیوں میں سرگرداں اہل جاہلیت کو اس نور کے ذریعے ہدایت نہیں عطا کر دے گا، جو وہ نبی کو دے

کر بھیجے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ پورا فرما دیا اور آپ اُس وقت تک رفیق اعلیٰ سے نہیں ملے جب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل، اپنی نعمت کا اتمام اور ایسے صحابہ کرام اور متبعین کی جماعت تیار نہ کر دی، جو اس دین کو بہترین طریقے سے پیش کرتے تھے، چنانچہ ان تمام مراحل کی تکمیل پر چونکہ آپ ﷺ کی ذمہ داری پوری اور فریضہ ادا ہو گیا تھا اس لئے اب آپ ﷺ لوگوں کو الوداع کہہ کر اپنے حقیقی دوست کے پاس جا سکتے تھے۔ حاصل یہ کہ آپ ﷺ نے دنیا میں اپنی رسالت کا حق ادا فرما دیا۔

یہ تورات کے بیان کردہ اوصاف ہیں، جو تمام کے تمام آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں پائے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تورات میں مذکور پیش گوئیاں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ وہ کون سا برگزیدہ پیغمبر ہے، جس کا تورات میں ذکر ہے؟ کیا تاریخ میں کوئی اور ایسی شخصیت گزری ہے، جس کی زندگی اوپر ذکر کردہ بشارتوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو؟ ایسی کوئی اور شخصیت نہیں، لہٰذا ان پیش گوئیوں کا مصداق صرف اور صرف محمد ﷺ ہیں۔

۳: انجیل کی بشارتیں

الف: فارقلیط

انجیل یوحنا میں لکھا ہے: [قال المسیح: اننی ذاهب الی ربی وربکم لکی یرسل لکم فارقلیط الذی سیاتی الیکم بالتاویل] (۷:۱۶) ''میں اپنے اور تمہارے پروردگار کے پاس جا رہا ہوں تاکہ تمہاری طرف فارقلیط بھیج دیا جائے، جو عنقریب تمہارے پاس تاویل لے کر آئے گا۔''

فارقلیط کا معنی روح الحق ہے، جو حق اور باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرتی ہے۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ ہی روح الحق ہیں، کیونکہ مردہ دلوں میں صرف اسی حق کے ذریعے حیاتِ نو پیدا ہوتی ہے، جو آپ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ آپ ﷺ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے ہر طریقہ استعمال کیا اور پوری جدوجہد کی۔ اسی جدوجہد اور محنت کے نتیجے میں حق وباطل کے درمیان امتیاز پیدا ہوا، لہٰذا خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد ﷺ کی صورت میں وہ فارقلیط آ چکے، جن کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خوشخبری سنائی تھی۔

انجیل یوحنا کے باب ۱۴ آیت ۱۵ تا ۱۶ میں مذکور ہے: [ان کنتم تحبوننی أطعمتم أوامری، أما أنا فسأبتهل الی الرب لیرسل لکم معیناً آخر وروح الحقیقة "فارقلیط" لکی یبقی معکم علی الدوام] "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں پروردگار سے درخواست کروں تو وہ تمہیں دوسرا مددگار یعنی روح الحق اور فارقلیط بخشے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔" ذرا درج آیات پر بھی غور فرمایئے: [فارقلیط هو الروح القدس الذی سیرسله الرب باسمی أی نبیاً مثلی، سیعلمکم کل شئی، و سیذکرکم بما قلته لکم] (یوحنا: ۱۴: ۲۶) "لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے پروردگار میرے نام سے بھیجے گا یعنی وہ نبی مجھ سا ہوگا۔ وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔"

[عندما یاتی فارقلیط سیشهدلی، و ستشهدون أنتم لی] (یوحنا: ۱۵: ۲۶-۲۷) "لیکن جب فارقلیط آئے گا تو وہ میری گواہی دے گا اور تم بھی گواہی دو گے۔)"

[ولکننی أقول لکم الحق من الأفضل لکم أن أذهب، لأنی ان کنت لاأذهب لایاتی فارقلیط الیکم، ولکننی ان ذهبت، أرسله الیکم] (یوحنا: ۱۶: ۷) "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

[وعندما یاتی فارقلیط یبکت العالم علی الخطیئة] (یوحنا: ۱۶: ۸) "اور جب فارقلیط آئے گا تو دنیا کو گناہ کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔"

انجیل کی اصل زبان عبرانی تھی پھر اس کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ہمارے ہاں موجود عربی تراجم یونانی زبان سے ترجمہ شدہ ہیں۔ فارقلیط کا لفظ یونانی زبان میں ہونے والے پہلے ترجمہ میں موجود ہے۔ ہمیں عبرانی زبان میں اس کے مدمقابل اصل لفظ کا علم نہیں۔ فارقلیط اس یونانی لفظ کا عربی ترجمہ ہے، یعنی یہ لفظ عربی زبان میں تعریب ہو کر شامل ہوا ہے، تاہم ہم اپنے موضوع میں صرف اسی لفظ پر اکتفا نہیں کریں گے، بلکہ انجیل میں ذکر کردہ نبی ﷺ کی تمام صفات اور ان کی رسول اللہ ﷺ کی صفات کے ساتھ مطابقت کا جائزہ لیں گے۔

بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع کا آغاز نبی کریم ﷺ کے ایک عاشق کے الفاظ سے کریں۔ مولانا جلال الدین رومی نے کیا خوب بات کہی ہے:

بود در انجیل نعت مصطفیٰ　　　آن سر پیغمبراں بحر صفا
بود ذکر حلیہا و شکل او　　　بود ذکر غزو صوم او اکل او

یعنی حضرت مصطفیٰ ﷺ کی خوشخبری انجیل میں موجود ہے۔ وہ تمام انبیاء کا رئیس اور ان کے صاف ستھرے سمندر کا بھید ہے۔ آپ ﷺ کے اوصاف، شمائل، غزوات، روزے اور کھانے پینے کے بارے میں معلومات انجیل میں موجود ہیں۔

ب: سردارِ جہاں

انجیل یوحنا کے باب ۱۴ آیت ۳۰ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد مذکور ہے: ''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔'' اور زبور کے باب ۷۲ کی آیت ۸ و مابعد میں مذکور ہے: ''اس کی سلطنت سمندر سے سمندر تک ہوگی۔ بیابان کے رہنے والے اس کے آگے جھکیں گے اور اس کے دشمن خاک چاٹیں گے، ترسیس کے اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گزاریں گے۔ سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدیے لائیں گے، بلکہ سب بادشاہ اس کے سامنے سرنگوں ہوں گے۔ کل قومیں اس کی مطیع ہوں گی، کیونکہ وہ محتاج کو جب وہ فریاد کرے اور غریب کو جس کا کوئی مددگار نہیں چھڑائے گا۔ وہ غریب اور محتاج پر ترس کھائے گا اور محتاجوں کی جان کو بچائے گا۔ وہ فدیہ دے کر ان کی جان کو ظلم اور جبر سے چھڑائے گا اور ان کا خون اس کی نظر میں بیش قیمت ہوگا۔ وہ جیتے رہیں گے اور سبا کا سونا اس کو دیا جائے گا۔ لوگ برابر اس کے حق میں دعا کریں گے۔ وہ دن بھر اسے دعا دیں گے۔ زمین میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اناج کی افراط ہوگی۔ ان کا پھل لبنان کے درختوں کی طرح جھومے گا اور شہر والے زمین کی گھاس کی مانند ہرے بھرے ہوں گے۔ اس کا نام ہمیشہ قائم رہے گا۔ جب تک سورج ہے اس کا نام رہے گا اور لوگ اس کے وسیلے سے برکت پائیں گے۔ سب قومیں اسے خوش نصیب کہیں گی۔''

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کے لئے ہم نے اس موضوع کو ضمناً شروع کر دیا ہے، ورنہ اس کی تفصیلات میں جانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا، تاہم یہاں ہم یہ کہے

بغیر نہیں رہ سکتے کہ ماضی وحال کے حددرجہ بدیانت اور حاسد یہود و نصاریٰ کی تمام تر جدوجہد اور تحریفات کے باوجود موجودہ تورات اور انجیل رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بارے میں بہت سی بشارتوں اور اشارات سے بھر پڑی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے خوش قسمت مؤرخین کی کاوشوں سے ہم تورات، زبور اور انجیل کے نسبتاً کم محرف نسخوں تک رسائی حاصل کرلیں گے، جس کے نتیجے میں ہر ایک حتیٰ کہ عوام بھی ان کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے متعلق ایسے صریح اور واضح اشارات دیکھ لیں گے، جو کسی تفسیر یا تاویل کے محتاج نہ ہوں گے۔ شاید احادیث میں عیسائیت کے اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آنے سے اسی طرف اشارہ ہے۔[27]

نیز یہ تو قرآن کریم اور سنت نبویہ سے بھی ثابت ہے کہ تورات اور انجیل میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی طرف اشارے ملتے ہیں، لہٰذا اس کا انکار کرنا کفر و گمراہی کے مترادف ہے۔[28]

ہ: وہ جس کی آمد کا ایک زمانے سے انتظار تھا

اس نبی کا انتظار کرنے اور اس کی خوشخبری سنانے والے صرف دو چار انسان نہ تھے، بلکہ بہت سے لوگ تھے۔ ان میں سے ایک زید بن عمرو بن نوفل بھی تھے، جو عشرہ مبشرہ صحابہ میں سے سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے والد اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی تھے۔ انہوں نے بتوں کی عبادت چھوڑ کر دین حنیف کو اختیار کر لیا تھا۔ وہ بتوں کو نفع و نقصان کا مالک نہیں سمجھتے تھے، تاہم نبوت کے ظہور سے کچھ ہی عرصہ پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان سے بہت سی بشارات منسوب ہیں۔ ان کا یہ قول سب سے اہم ہے: ''مجھے یقین ہے کہ ایک نئے دین کا ظہور ہونے والا ہے، لیکن مجھے نہیں خبر کہ میں اس کا دور پا سکوں گا یا نہیں؟''

وہ ہوا کا ایک جھونکا تھا یا القائے ربانی جس نے زید کے دل کو چھوا اور قبولِ حق کے لئے ان کے دل کے تمام دریچے کھول دیئے۔ وہ ایک اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان رکھتے اور اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے، لیکن جس معبود پر وہ ایمان رکھتے تھے وہ اسے جانتے تھے اور نہ ہی اس کی عبادت کرنے کے طریقے سے واقف تھے۔

ایک صحابی عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ زید بن عمرو بن نوفل نے مجھ سے کہا تھا: ''میں بنو عبدالمطلب کے واسطے سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں ایک نبی کے ظہور کا منتظر ہوں، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میں اس کا زمانہ پا لوں گا۔ میں اُس پر ایمان رکھتا ہوں، اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کے نبی ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ اگر تمہیں لمبی عمر ملے اور تمہاری اُس سے ملاقات ہو تو اسے میرا اسلام پہنچانا۔ میں تمہیں اس کی صفات بتاتا ہوں تاکہ تم پر کوئی بات مخفی نہ رہے۔'' میں نے کہا: ''ضرور بتایئے۔'' انہوں نے کہا: ''وہ نہ تو دراز قامت ہوگا اور نہ کوتاہ قد۔ ان کے بال نہ تو گھنگھریالے ہوں گے اور نہ ہی سیدھے۔ اس کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ اس کا نام احمد ہوگا۔ یہ شہر اس کی جائے پیدائش اور مقامِ بعثت ہوگا۔ اس کی قوم اس کے پیغام کو ناپسند کرے گی اور اسے اِس شہر سے نکال دے گی۔ وہ یثرب کی طرف ہجرت کرے گا جہاں اسے کامیابی حاصل ہوگی۔ تم ہرگز دھوکا نہ کھانا۔ میں نے دین ابراہیمی کی تلاش میں شہر شہر چھان مارا ہے۔ میں جس یہودی، عیسائی یا مجوسی سے بھی دریافت کرتا وہ مجھے بتاتا کہ یہ دین تمہارے بعد آنے والا ہے۔ وہ اس کے وہی اوصاف بتاتے جو میں نے تمہارے سامنے بیان کیے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتے کہ اس کے علاوہ اب کوئی نبی نہیں۔''

عامر بن ربیعہ کہتے ہیں کہ جب میں نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ کو زید بن عمرو کی باتیں بتائیں اور آپ ﷺ کو ان کا سلام پہنچایا۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا، ان کے لئے رحمت کی دعا کی اور فرمایا: ''میں نے انہیں جنت میں دامن گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔''(29)

ورقہ بن نوفل ایک عیسائی عالم تھے۔ وہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی

تھے۔ وہ عبرانی زبان میں تحریر لکھتے اور عبرانی میں انجیل میں سے جتنی مقدار اللہ کو منظور ہوتی لکھتے۔ وہ بہت بوڑھے تھے اور بینائی کھو چکے تھے۔

جب نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو حضرت خدیجہ آپ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور ان سے کہا: ''اے چچازاد بھائی! اپنے بھتیجے کی بات سنیے۔'' ورقہ نے آپ سے کہا: ''اے بھتیجے کیا بات ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے بارے میں بتا دیا۔ اس پر ورقہ نے آپ سے کہا: ''یہ وہی وحی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی۔ کاش میں اس وقت زندہ اور نوجوان ہوتا جب تمہاری قوم تمہیں (تمہارے شہر) سے نکال دے گی۔'' رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟'' ورقہ نے کہا: ''ہاں! جو شخص بھی تمہاری طرح کی تعلیم لایا ہے اسے لوگوں کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑا ہے، اگر مجھے تمہارا دور دیکھنے کا موقع ملا تو میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔''(30)

عبداللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے۔ ان کے قبولِ اسلام کا واقعہ انہی کی زبانی سنتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مدینے تشریف لائے تو لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ جب میں نے آپ ﷺ کا چہرہ دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے جو پہلی بات آپ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنی وہ یہ تھی: ''اگر تم سلام پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو اور جب لوگ سو رہے ہوں اس وقت نماز پڑھو گے تو سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''(31)

حضرت عبداللہ بن سلام بڑی اہم شخصیت تھے۔ آپ کے بارے میں ابن حجر الاصابۃ میں لکھتے ہیں: ''آپ ایک نمایاں شخصیت تھے اور آپ کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کی نسل سے تھا۔''(32) قرآن کریم نے آپ کی گواہی کی تعریف فرمائی اور اسے کفار کے خلاف بطور دلیل کے پیش کیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ [الاحقاف: 10] ''کہو کہ بھلا دیکھو تو اگر یہ (قرآن) خدا کی طرف سے ہو اور تم نے اس سے انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اسی طرح کی ایک (کتاب) کی گواہی دے چکا اور ایمان لے آیا اور تم نے سرکشی کی (تو تمہارے ظالم ہونے میں کیا شک ہے) بے شک خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اس آیت مبارکہ میں مذکور بنی اسرائیل کے گواہ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہیں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت کے مکی ہونے کی بنا پر اس آیت میں مذکور گواہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا ہے، لیکن زیادہ درست رائے یہ ہے کہ اگرچہ سورۃ الأحقاف مکی ہے، لیکن یہ آیت مدنی ہے اور اس میں حضرت عبداللہ بن سلام کی طرف اشارہ ہے۔

و: اہل کتاب ایمان کیوں نہ لائے؟

باوجود اس کے کہ یہود و نصاریٰ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، لیکن حسد و بغض کی وجہ سے آپ ﷺ پر ایمان نہ لا سکے۔ آپ ﷺ کے بارے میں ان کی معلومات اس قدر واضح اور تفصیلی تھیں کہ ان کا رسول اللہ ﷺ کو ایک بار دیکھ لینا ہی آپ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہونا چاہیے تھا، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی صورت، اوصاف اور عادات سے بخوبی واقف تھے۔ قرآن کریم بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقاً مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [البقرة:٦ ١٤] ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ ان (پیغمبر آخر الزماں) کو اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں نبی کریم ﷺ کے نام کی بجائے غائب کی ضمیر استعمال کی ہے، جس سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ تمام اہل کتاب خاتم النبیین محمد ﷺ کو جانتے تھے، لہذا جب ضمیر کے ذریعے آپ ﷺ کا ذکر کیا گیا تو انہیں معلوم تھا کہ اس سے وہی نبی مراد ہے، جس کا نام احمد اور محمد علیہ الصلاۃ والسلام کی صورت میں تورات اور انجیل میں موجود ہے، کیونکہ وہ آپ ﷺ کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ اچھی طرح جانتے تھے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: ''کیا آپ محمد ﷺ کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹے کو پہچانتے تھے؟'' حضرت عبداللہ بن سلام نے جواب دیا: ''جی ہاں! بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ آپ ﷺ کے اوصاف ایک امانت دار ذات نے آسمان سے دنیا کی ایک امانت دار شخصیت تک پہنچائے، جن کی بنیاد پر میں نے آپ ﷺ کو پہچان لیا، جبکہ اپنے بیٹے کے بارے میں مجھے اُس کی ماں سے متعلق پوری صورتِ احوال کا علم نہیں۔''(33)

ا: بغض اور حسد

وہ رسول اللہ ﷺ کو اچھی طرح پہچانتے تھے، لیکن پہچان اور چیز ہے اور ایمان بالکل مختلف چیز ہے۔ وہ آپ ﷺ کو پہچانتے تو تھے، لیکن آپ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ حسد اور غیرت ان کے

آپ پر ایمان لانے کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ [البقرة:۸۹] ''اور جب خدا کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی (آسمانی) کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے اور وہ پہلے (ہمیشہ) کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہو گئے پس کافروں پر خدا کی لعنت۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہودیوں کے آپ ﷺ پر ایمان نہ لانے کی حقیقی وجہ کی وضاحت فرمائی ہے۔ ان کے آپ ﷺ پر ایمان نہ لانے کی بنیادی وجہ خاتم النبیین ﷺ کا غیر یہودی ہونا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا تعلق یہودی نسل سے ہوتا تو یقیناً ان کا ردِ عمل مختلف ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''یا رسول اللہ! یہود بہت بہتان طراز قوم ہے۔ اگر انہیں میرے قبولِ اسلام کی خبر ہو گئی تو وہ آپ کے سامنے مجھ پر بہتان طرازی کریں گے۔'' چنانچہ یہود آپ ﷺ کے پاس آئے اور ان کے ہمراہ عبداللہ بن سلام بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم میں سے عبداللہ بن سلام کون ہے؟'' انہوں نے جواب میں کہا: ''وہ ہم میں سے سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا ہے۔ سب سے بہتر اور سب سے بہتر کا بیٹا سلام اسلام لے آئے تو تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہو گی؟'' انہوں نے کہا: ''خدا اُس کی اِس سے حفاظت فرمائے۔'' اسی دوران حضرت عبداللہ بن سلام ان کے سامنے آئے اور کہا: [أشهد أن لا اله الا الله و أشهد أن محمداً رسول الله] ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' یہود نے یہ سنا تو کہنے لگے: ''وہ ہم میں سے بدترین ہے اور بدترین کا بیٹا ہے''۔ اور پھر آپ رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی کرنے لگے۔(34)

اس واقعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہود رسول اللہ ﷺ سے بے خبر نہ تھے، بلکہ آپ ﷺ کو پہچانتے تھے، لیکن ان کی ضد اور ہٹ دھرمی آپ پر ایمان لانے کی راہ میں رکاوٹ تھی۔

اس موضوع پر صرف حضرت سلمان فارسی کی شخصیت ہی بہت کافی دلیل ہے: ''آپ ابتدا میں مجوسی تھے، لیکن آپ کے دل میں دینِ حق کو پانے کی آتشِ شوق موجود تھی، چنانچہ پہلے آپ نے عیسائیت کو اختیار کیا اور گرجا گھر میں سکونت اختیار کرلی۔ جس راہب سے وہ منسلک تھے جب اس کی وفات کا وقت

قریب آیا تو سلمان فارسی نے اس سے کسی اور راہب کے بارے میں پوچھا۔ اس راہب نے انہیں ایک دوسرے راہب کا پتہ بتادیا۔ اس طرح وہ یکے بعد دیگرے ایک راہب سے دوسرے راہب کے پاس جاتے رہے اور بہت سے راہبوں کی صحبت اٹھائی۔ آخر کار آپ نے ایک راہب سے اس کی زندگی کے آخری لمحات میں یہی سوال کیا تو عیسائی عالم نے کہا: ''میرے بیٹے: خدا کی قسم! میں آج کسی ایسے ہم مذہب انسان کو نہیں جانتا، جس کے پاس تمہیں جانے کا کہوں، لیکن دیکھو! ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب آگیا ہے، جو دین ابراہیمی کے ساتھ مبعوث ہوگا اور سرزمینِ عرب سے اس کا ظہور ہوگا۔ اس کی ہجرت کا مقام دو سیاہ پتھریلی زمینوں کے درمیان ہوگا جہاں کھجور کے درخت بکثرت ہوں گے۔ اس کی چند واضح علامات ہیں، مثلاً وہ ہدیہ کی چیز کھائے گا، لیکن صدقہ کی چیز نہ کھائے گا۔ اس کے شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ اگر تم سے ہو سکے تو اس شہر کی طرف چلے جاؤ۔'' سلمان فارسی کہتے ہیں: ''اس کے بعد اس راہب کا انتقال ہوگیا اور اسے دفنا دیا گیا۔ جتنا عرصہ خدا کو منظور تھا میں عمودیہ میں ٹھہرا رہا۔ ایک دفعہ قبیلہ کلب کے کچھ تاجروں کا میرے پاس سے گزر ہوا۔ میں نے ان سے کہا: ''مجھے اپنے ساتھ سرزمینِ عرب لے چلو۔ اس کے عوض میں تمہیں اپنی گائیں اور بکریاں دے دوں گا۔'' انہوں نے اسے منظور کرلیا۔ چنانچہ میں نے اپنی گائیں اور بکریاں ان کے حوالے کر دیں اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ جب وہ وادی القریٰ پہنچے تو انہوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا اور مجھے ایک یہودی کے ہاتھ غلام بنا کر فروخت کر دیا، چنانچہ میں اس کے ساتھ رہتا رہا۔ میں نے وہاں کھجور کے درخت بھی دیکھے، جس کی وجہ سے مجھے امید تھی کہ شاید یہ وہی جگہ ہو، جو مجھ سے راہب نے بیان کی تھی، لیکن مجھے پورا یقین نہ تھا۔ اس دوران مدینہ سے میرے آقا کا چچازاد بھائی اُس کے پاس آیا، جس کا تعلق بنوقریظہ سے تھا۔ وہ مجھے میرے آقا سے خرید کر اپنے ساتھ مدینے لے آیا۔ خدا کی قسم! جوں ہی میں نے اسے دیکھا تو راہب کی بیان کردہ علامات کی بنیاد پر اسے پہچان گیا، چنانچہ میں وہاں ٹھہرا رہا۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور مکہ میں قیام پذیر رہے، لیکن غلامی کی مشغولیوں کی وجہ سے مجھے آپ کے بارے میں علم نہ ہوا پھر آپ ﷺ نے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی۔ خدا کی قسم! اُس دن میں اپنے آقا کے باغ میں کھجور کے ایک درخت کی چوٹی پر چڑھ کر کوئی کام کر رہا تھا اور میرا آقا درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اُس کا چچازاد بھائی آیا اور اس کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگا: ''خدا بنوقیلہ کو برباد کرے۔ خدا کی قسم! ابھی وہ قبا میں مکہ سے آنے والے ایک شخص کے گرد جمع ہیں، جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ نبی ہے۔''

جب میں نے یہ بات سنی تو مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں اپنے آقا پر گر نہ

پڑوں۔ میں کھجور کے درخت سے اترا اور اپنے آقا کے چچازاد بھائی سے پوچھنے لگا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اس پر میرے آقا کو غصہ آ گیا اور مجھے ایک زوردار گھونسا رسید کر کے کہا: ''تمہیں اس سے کیا غرض؟ اپنے کام سے کام رکھو۔'' میں نے کہا: ''مجھے تو کچھ غرض نہیں، میں تو یوں ہی اس بات کی توثیق چاہتا تھا۔''

میں نے کچھ مال جمع کر رکھا تھا۔ جب شام ہوئی تو میں وہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ابھی قبا میں ہی قیام پذیر تھے۔ میں نے آپ سے عرض کی: ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نیک آدمی ہیں اور آپ کے ساتھ کچھ احباب غریب الدیار اور ضرورت مند بھی ہیں۔ میرے پاس صدقہ کی کچھ چیز ہے۔ میں آپ لوگوں کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حق دار پاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے وہ چیز آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''اسے کھالو۔'' لیکن اپنا ہاتھ روک لیا اور خود نہ کھایا۔ میں نے دل میں سوچا: ''پہلی نشانی تو پوری ہوئی۔'' اس کے بعد میں واپس لوٹ آیا اور کچھ اور مال جمع کیا۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ مدینے منتقل ہو گئے تھے۔ میں دوبارہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: ''میں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کی چیز نہیں کھاتے۔ میں یہ ہدیہ آپ ﷺ کے اکرام کے لئے لایا ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے تناول فرمایا اور اپنے صحابہ کو بھی شرکت کی دعوت دی، چنانچہ انہوں نے بھی اس میں سے کھایا۔ میں نے اپنے جی میں کہا: ''دو نشانیاں پوری ہو گئیں۔''

پھر ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ اپنے ایک صحابی کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے بقیع الغرقد[35] میں تھے کہ میں آپ کے پاس حاضر ہوا۔ میرے بدن پر دو موٹی چادریں تھیں۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ میں بیٹھے تھے۔ میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور پھر آپ کی پشت مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے پیچھے آیا تا کہ راہب کی بیان کردہ مہر نبوت کو دیکھ سکوں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا تو جان گئے کہ میں کسی بات کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی پشت مبارک سے چادر ہٹا دی۔ میں نے مہر نبوت کو دیکھتے ہی اسے پہچان لیا اور آپ ﷺ سے لپٹ کر رونے اور آپ کے بوسے لینے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سامنے آ جاؤ!'' چنانچہ میں اٹھ کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور آپ کو اپنی ساری سرگزشت سنائی۔'' رسول اللہ ﷺ کو صحابہ کرام کا میری بات سننا اچھا لگا۔[36]

۲: مسابقت کا جذبہ

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ سے میرا سب سے پہلے تعارف

یوں ہوا کہ میں اور ابوجہل مکہ کی کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے ہمارا آمنا سامنا ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوجہل سے فرمایا: ''اے ابوالحکم! میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ کیا اللہ اور اس کے رسول کو ماننے میں تمہیں کوئی رغبت ہے؟'' اس کے جواب میں ابوجہل نے کہا: ''کیا آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے باز آجائیں گے؟ آپ یہی چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی تبلیغِ رسالت کی گواہی دے دیں تو ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ بخدا! اگر مجھے آپ کی سچائی کا یقین ہوتا تو میں آپ کی پیروی کرلیتا۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے گئے اور ابوجہل میری طرف متوجہ ہوکر کہنے لگا: ''مجھے پختہ یقین ہے کہ آپ ﷺ کی بات ہی سچی ہے، لیکن ایک چیز میرے ایمان لانے کی راہ میں رکاوٹ ہے وہ یہ کہ بنوقصی نے کہا کہ منصب حجابہ (حاجیوں کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری) وہ لیں گے۔ ہم نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' پھر انہوں نے کہا کہ منصب سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری) وہ لیں گے۔ ہم نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا کہ دارالندوۃ کا اہتمام اُن کے پاس ہوگا۔ ہم نے کہا: ''ایسے ہی سہی۔'' پھر انہوں نے کہا کہ لواء (جنگ میں علم برداری کی ذمہ داری) کا منصب بھی انہی کے پاس رہے گا۔ ہم نے اسے بھی تسلیم کرلیا۔ پھر جب انہوں نے کھانا کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا یہاں تک کہ جب صحیح مقابلہ شروع ہوا تو وہ کہنے لگے کہ نبی بھی اُنہی میں سے ہوگا۔ خدا کی قسم! میں ایسے نہ ہونے دوں گا۔''(37)

ایک دوسری روایت میں یہی مضمون یوں آیا ہے کہ ابوجہل نے کہا: ''خاندانی اعزازات میں ہمارا اور بنوعبد مناف کا مقابلہ ہوا۔ انہوں نے فقراء کو کھانا کھلایا تو ہم نے بھی انہیں کھانا کھلایا۔ انہوں نے غریبوں کو سواری فراہم کی تو ہم نے بھی انہیں سواریاں فراہم کیں۔ انہوں نے مہمان نوازی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا تو ہم نے بھی سخاوت و مہمان نوازی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے خیرات دی تو ہم نے بھی خیرات دی، لیکن جب صحیح برابر کا مقابلہ شروع ہوا تو وہ کہنے لگے کہ ہماری نسل میں ایسا نبی ہے، جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اب اس فضیلت کو ہم کہاں پہنچ سکتے ہیں؟ اس لئے خدا کی قسم! ہم ہرگز آس پر ایمان نہ لائیں گے۔''(38)

اس واقعے کے بعد سردارانِ قریش نے متفقہ فیصلہ کیا کہ عتبہ بن ربیعہ جس کا شمار قریش کے دانا اور صفِ اول کے لوگوں میں ہوتا تھا اور وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور مالداری میں معروف تھا، کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ آپ ﷺ سے بات چیت کرکے آپ کو اپنی دعوت سے دستبردار ہونے پر آمادہ کرے، چنانچہ عتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور زبانی چالبازی کے ارادے سے

آپ ﷺ سے کہنے لگا: ''اے محمد! یہ تو بتائیے کہ آپ افضل ہیں یا آپ کے والد عبداللہ؟'' آپ ﷺ اس پر خاموش رہے۔ عتبہ نے دوبارہ کہا: ''آپ بہتر ہیں یا آپ کے دادا عبدالمطلب؟'' آپ ﷺ نے اس پر بھی کچھ جواب ارشاد نہ فرمایا، کیونکہ شاید اس بے وقوف کے لئے آپ ﷺ کی خاموشی ہی مناسب جواب تھا۔ پھر عتبہ کہنے لگا: ''اگر آپ اپنے والد اور دادا کو اپنے سے بہتر خیال کرتے ہیں تو جن معبودوں کی میں عبادت کرتا ہوں وہ بھی انہی کی عبادت کیا کرتے تھے اور اگر آپ اپنے آپ کو ان سے بہتر تصور کرتے ہیں تو اپنی بات کہیے تاکہ ہم بھی سنیں۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اے ابوالولید! کیا تم اپنی بات کر چکے ہو؟'' اس نے کہا: ''ہاں۔'' اس پر آپ ﷺ نے اس کے سامنے سورت فصلت پڑھنی شروع کی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿حم () تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ () كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ () بَشِيراً وَنَذِيراً فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ () وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ () قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ () الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ () إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ () قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَاداً ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ () وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ () ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعاً أَوْ كَرْهاً قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ () فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظاً ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ () فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ()﴾ (فصلت: ۱:۱۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''حم (یہ کتاب خدائے) رحمٰن و رحیم (کی طرف) سے اتری ہے۔ (ایسی) کتاب جس کی آیتیں واضح (المعانی) ہیں (یعنی) قرآنِ عربی ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں جو بشارت بھی سناتا ہے اور خوف بھی دلاتا ہے، لیکن ان میں سے اکثروں نے منہ پھیر لیا اور وہ سنتے ہی نہیں اور کہنے

لگے جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں پر بوجھ (یعنی بہرا پن) ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے تو تم (اپنا) کام کرو ہم (اپنا) کام کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم (ہاں) مجھ پر یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے تو سیدھے اسی کی طرف متوجہ رہو اور اسی سے مغفرت مانگو اور مشرکوں پر افسوس ہے، جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے بھی قائل نہیں۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے (ایسا) ثواب ہے جو ختم ہی نہ ہوگا۔ کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو، جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور (بتوں کو) اس کا مدمقابل بناتے ہو وہی تو سارے جہان کا مالک ہے اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامانِ معیشت مقرر کیا۔ (سب) چار دن میں (اور تمام) طلب گاروں کے لئے یکساں، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اُس نے اُس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ (خواہ) خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس (کے کام) کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے مزین کیا اور (شیطانوں سے) محفوظ رکھا۔ یہ زبردست (اور) خبردار کے (مقرر کیے ہوئے) اندازے ہیں پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو کہہ دو کہ میں تم کو (ایسی) چنگھاڑ (کے عذاب) سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر چنگھاڑ (کا عذاب آیا تھا)۔''

آپ ﷺ تلاوت فرماتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے تو عتبہ بخار میں مبتلا شخص کی طرح کانپ اٹھا اور آپ ﷺ کے ہونٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر خدا کا واسطہ دیتے ہوئے کہنے لگا: ''اے محمد! خدارا خاموش ہو جایئے۔''

عتبہ جب اپنے لوگوں کی طرف لوٹ کر گیا تو وہ آپس میں کہنے لگے۔ اللہ کی قسم! عتبہ کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے۔ جب وہ سب عتبہ کے گرد جمع ہو گئے تو اُس سے پوچھنے لگے: ''اے ابوالولید تم نے کیا دیکھا؟'' اس پر عتبہ نے کہا: ''بخدا میں نے ایسا کلام سنا ہے جس کی مثل پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ یہ کلام شعر و شاعری ہے اور نہ ہی جادوگروں کی گفتگو۔ اے قریش کے لوگو! اگر میری بات مانو تو اس شخص کو اپنے حال پر چھوڑ دو، کیونکہ میں نے اس سے جو بات سنی ہے اللہ کی قسم! وہ ضرور کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ اگر عرب اس پر غلبہ حاصل کر لیں تو تمہیں کسی اور چارہ جوئی کی ضرورت نہ پڑے گی اور اگر اسے عربوں پر فتح حاصل ہو جائے تو اس کی بادشاہت تمہاری بادشاہت ہے اور اس کی عزت تمہاری عزت۔ اس کی

وجہ سے تمہارے نصیب جاگ اٹھیں گے۔" عتبہ کے اس تبصرے پر قریش کہنے لگے: "اے ابوالولید! اس نے اپنے کلام سے تجھ پر بھی جادو کر دیا ہے۔" عتبہ نے کہا: "میرا تو تمہیں یہی مشورہ ہے۔ باقی تمہاری مرضی۔"(39)

۳: دیگر اسباب

آپ ﷺ کی سچائی کا اعتراف صرف چند ایک نے ہی نہیں کیا، بلکہ تمام قریش آپ ﷺ کو دعوئ نبوت میں سچا سمجھتے تھے، لیکن جاہ و مرتبے کے چھن جانے کا خوف، مال و منصب کی لالچ اور آپ ﷺ سے بغض و عناد ان کے ایمان لانے کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ کی نبوت کا یقین ہو جانے کے باوجود وہ آپ پر ایمان لانے سے گھبراتے تھے۔ قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ان کے اس طرزِ عمل کو یوں بیان فرمایا ہے: ﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ [الأنعام: ٣٣] "ہم کو معلوم ہے کہ ان (کافروں) کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں (مگر) یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے، بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔"

یعنی اپنی نفسانی خواہشات کے اسیر اور ان سے شکست خوردہ کافر آپ کو پریشان کرنے کے لئے آپ پر طرح طرح کی بہتان طرازیاں کرتے ہیں، لیکن آپ کو چاہیے کہ آپ ان کی باتوں سے غمگین و پریشان نہ ہوں۔ آپ ان کی اس حماقت کو تو دیکھئے کہ پہلے آپ کو "صادق و امین" تسلیم کرتے تھے اور اب آپ پر جھوٹ بولنے کی تہمت لگا کر خود اپنی ہی پہلی بات کو جھٹلا رہے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ غمگین ان کافروں کو ہونا چاہیے، جو دنیا و آخرت کی کامیابیوں کی ضامن ہستی کی دشمنی کے درپے ہیں اور آفتابِ ہدایت کے پاس ہونے کے باوجود ہدایت سے محروم ہیں۔

ز: ایک نیا پہلو اور ایک نئی جہت

آپ ﷺ ایسی فقید المثال شخصیت ہیں، جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی، چونکہ آپ ﷺ کو منفرد اور امتیازی صلاحیتوں سے نواز کر اس دنیا کے نظام کو نئے سرے سے مرتب کرنے اور انسانیت کے سامنے نئے درخشاں آفاق کھولنے کے لئے مبعوث کیا گیا تھا، اس لئے آپ کی عظمت کا اندازہ لگانا ہماری استطاعت اور ہمارے معیاروں کے لئے ممکن نہیں۔ لیکن آج کے بے چارے انسان کا جو اقدار کے بہت سے معیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نقطہ نظر، طرزِ عمل اور طرزِ فکر بالکل معکوس صورتِ حال اختیار کر چکا ہے، حالانکہ کسی بشری معیار کے ذریعے آپ ﷺ کی عظمت کا اندازہ لگانا درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی آپ کی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کرے، آپ کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتا، اسی لئے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے سب سے زیادہ واقف حضرت حسان بن ثابت نے کہا تھا:

وما مدحت محمداً بمقالتی ولکن مدحت مقالتی بمحمد

''میں نے اپنے کلام سے محمد ﷺ کی تعریف نہیں کی، بلکہ محمد ﷺ کے صدقے میرا کلام قابل تعریف بن گیا۔''

کسی کلام کو خوبی اور حسن آپ ﷺ کے مبارک تذکرے سے حاصل ہوتا ہے وگرنہ ہمارے کلام میں تو ایسی کوئی بات نہیں، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کے مرتبے میں کچھ اضافہ ہو۔ مشہور عرب شاعر فرزدق نے بھی اسی مفہوم کو تھوڑے سے مختلف پیرائے میں بیان کیا تھا، نیز دورِ حاضر کے عظیم مفکر بدیع الزمان سعید النورسی نے قرآن کریم کی تعریف میں یہی الفاظ کہے ہیں:

وما مدحت القرآن بکلماتی ولکن مدحت کلماتی بالقرآن[40]

''میں نے اپنے کلمات سے قرآن کی تعریف نہیں کی بلکہ قرآن کریم کے صدقے میرے کلمات کی تعریف ہوئی۔''

صحابی رسول اور عصر حاضر کے عظیم مفکر کے کلام میں اشتراک ایک حد تک فکری ہم آہنگی کا نتیجہ ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ سب الہامات کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ صرف تعبیر کا فرق ہے۔ ایک نے جس بات کو اجمالاً بیان کیا، دوسرے نے اسے قدرے تفصیل سے ذکر کیا اور کسی تیسرے نے اسے اشعار کی صورت میں ڈھال دیا۔

؎ یعنی سب ایک ہی محور کے گرد گھوم رہے ہیں

اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ ﷺ کا امتی بنا کر بہت ہی عظیم نعمت سے نوازا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دل کی گہرائیوں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں اس عظیم انعام پر شکر بجالائیں کہ انہوں نے ہمیں اس عظیم نعمت کا مستحق سمجھا۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں اپنے فضل سے نوازتے ہیں۔ فضل خداوندی ایک ایسا بے کنارا سمندر ہے، جسے کسی معیار پر نہیں اتارا جاسکتا۔

لیکن اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں، وہ یہ کہ کیا ہمارے دل دلوں کے بادشاہ کی تشریف آوری کے لائق ہیں؟ کیا دلوں کا بادشاہ ہمارے دلوں میں اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے؟ کیا ہمارے دل ہمہ وقت اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں؟ کیا ہمارا طرزِ زندگی، ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور سونا جاگنا آپ ﷺ کی سنت کے مطابق ہے؟ کیا ہم زندگی کے تمام شعبوں میں آپ ﷺ کی تعلیمات کی پیروی کرتے ہیں؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نظریات وافکار آپ ﷺ کی سیرت کے حسن وجمال سے مزین ہیں اور ہم صحیح معنی میں آپ ﷺ کے امتی کہلانے کے مستحق ہیں۔ جو انسان بھی آپ ﷺ کی سیرت کی روشنی میں اپنے اخلاق سنوارے گا وہ دنیا میں توازن کو برقرار رکھنے کا باعث بنے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج دنیا میں توازن نہ ہونے کی صرف یہی وجہ ہے کہ ہم نے مطلوبہ حد تک سیرتِ نبوی کو نہیں اپنایا۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خصوصی طور پر دستِ قدرت سے پیدا فرمایا۔ دنیا میں انسان کی حیثیت سے آپ کی تشریف آوری انسانوں کی انتہائی خوش نصیبی ہے، کیونکہ آپ کی تشریف آوری کو جنت الفردوس بھی باعث صد افتخار سمجھتی ہے۔ آپ کے شایانِ شان آپ کی تعریف بیان کرنا ہماری اہم ترین ذمہ داری ہے۔ انسانیت اس وقت تک مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی جب تک آپ ﷺ کو کماحقہ سمجھ کر آپ کے نقش قدم پر نہ چلے۔ میں نے اپنی نااہلی کے باوجود آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو سمجھنے اور اسے اجاگر کرنے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔ میرے بس میں میرے پرخلوص ارادوں کے سوا کچھ نہیں۔ ایک عرصے تک میں اپنے آپ کو سگِ رسول اللہ ﷺ کہہ کر تسلی دیتا رہا، لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ میری یہ امید دم توڑتی گئی پھر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں نبی کریم ﷺ کے بدن کا ایک بال ہوتا تاکہ مجھے اُس ہستی کا قرب حاصل ہوتا جو اللہ تعالیٰ کے خصوصی لطف وکرم کا مظہر ہے، لیکن جوں جوں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں میری معرفت میں اضافہ ہوتا گیا توں توں مجھے یقین ہوتا گیا کہ میں اس امید کے

پورے ہونے کا بھی اہل نہیں، اس لئے اب میری صرف یہی خواہش ہے کہ مجھے آپ ﷺ کی امت میں شامل کر لیا جائے، کیونکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی امت کے کسی بھی فرد کو آپ ﷺ کی شفاعت سے محروم نہ فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل فرما کر ارشاد فرمائیں گے: (هم القوم لا يشقى بهم جليسهم) ''وہ ایسے لوگ جن کا ہم نشیں بھی نامراد نہیں رہتا۔''(41)

آپ ﷺ کی شخصیت کو اجاگر کرنے کی اس کاوش کے نتیجے میں نئی نسل کے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت کی ایک چنگاری بھی جل پڑے تو یہ میری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ اگر چہ مجھ میں اس کی اہلیت کہاں؟ تاہم میری مثال اس بارے میں اس کمزور چیونٹی کی سی ہے، جس نے حج کا ارادہ کیا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی کمزور ٹانگیں اس طویل مسافت کو طے نہ کر سکیں گی، لیکن وہ اس وجہ سے خوش اور پرامید تھی کہ اور نہیں تو حج کے سفر میں اسے موت تو نصیب ہوگی۔ میری بھی بس یہی آرزو ہے کہ مجھے بھی اسی راستے میں موت آئے۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہر چیز سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کی عظمت تک رسائی کسی کے بس میں نہیں۔ ہماری ذمہ داری بس یہ ہے کہ آپ کی عظمت کے مقابلے میں اپنی عاجزی اور چھوٹے پن کا سوچیں اور آپ کی پیروی میں لگے رہیں یہاں تک کہ عالم تصور میں ہمیں محسوس ہو کہ آپ ﷺ براہ راست ہمارے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں اور ہمارا بال بال آپ ﷺ سے محو گفتگو ہے۔ آپ ﷺ نے جس جماعت کی راہنمائی فرمائی اور جس معاشرے کا بندوبست سنبھالا وہ بڑے گہرے غور و فکر اور بلند مقاصد کا حامل اور رشک ملائکہ بن گیا، بلکہ اس کی تمام خوبیوں اور اوصاف کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ شاید کسی کو یہ باتیں خلافِ واقع معلوم ہوں۔ اگر واقعتاً ایسے ہی ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے، کیونکہ یہ سب کچھ محال نہیں، بلکہ نورانی کیفیات کے حامل کچھ نوجوان آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے روزانہ روحانی برکات حاصل کرتے ہیں بلکہ بعض اولیاء اللہ نے عالم تخیل سے باہر آ کر عالم مشاہدہ میں بھی آپ ﷺ کے فیوض کو محسوس کیا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کی ذات روحانی طور پر ہمارے درمیان موجود ہے اور بعض کے لئے تو آپ ﷺ اپنے جسد نورانی کے ساتھ جلوہ فرما ہوتے ہیں جیسا کہ امام سیوطی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے کئی مرتبہ آپ ﷺ سے ملاقات اور گفتگو کی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ پر اس قسم کی موت طاری نہیں ہوئی جس طرح کی عام انسان پر طاری ہوتی ہے، بلکہ صرف آپ کی زندگی کی کیفیت اور حیثیت بدلی ہے، اس لئے آپ ﷺ کی

وفات کو کسی عام انسان کی موت کی طرح سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب قرآنِ کریم میں شہداء کو جو انبیائے کرام سے دو درجے کم مرتبہ ہوتے ہیں، کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ جو افضل الانبیاء ہیں، عام انسانوں کی طرح موت سے متاثر ہو کر مردہ ہو گئے ہوں اور آپ کو ''میت'' کہنا جائز ہو؟ ہاں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ آپ ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے جن لوگوں کو روحانی کیفیات کے ذریعے اُس جہاں تک رسائی حاصل ہوتی ہے وہ آپ ﷺ کا دیدار و مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ایسے مقرب بندے جو دنیوی خواہشات ولذات کے قفسِ عنصری سے نجات حاصل کر کے روحانی وقلبی زندگی پا لیتے ہیں، ان کے لئے تمام زمانے ماضی، حال اور مستقبل برابر ہو جاتے ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنہیں سید المرسلین اور امام الملائکہ ہونے کا شرف حاصل ہے کو ایسی قوتِ باطنیہ کیونکر حاصل نہ ہوگی۔

سطورِ بالا میں ذکر کردہ حقائق میری گفتگو کی اساس اور بنیاد ہیں، کیونکہ انبیائے کرام خصوصاً نبی کریم ﷺ کے بارے میں نقطہ نظر کا تعین بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں یعنی اولیا، اصفیاء، ابرار اور مقرب ہستیوں کے مقام ومرتبے کو سمجھنے کے لئے دلی پاکیزگی کی ضرورت ہوتی ہے تو انبیائے کرام کی عظمت کو اس مادی دنیا کے حجاب اور پردے کے پیچھے سے کیونکر جانا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ان کے مقام کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمیں اپنی تمام قلبی وروحانی صلاحیتوں کے ساتھ پورے اہتمام اور یکسوئی سے ان کی طرف متوجہ ہونا ہوگا اور نبی کریم ﷺ کی شخصیت کے فہم کے لئے اس سے کئی گنا زیادہ اہتمام اور یکسوئی کی ضرورت ہے، نیز یہ بھی یاد رہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا فہم وادراک اس کی قلبی صلاحیتوں کے تابع ہوتا ہے، تاہم آپ ﷺ کی شخصیت کو پوری طرح سمجھ لینا یا اس کا مکمل احاطہ کرنا کسی کے بس میں نہیں، چنانچہ بوصیری کہتے ہیں:

وکیف یدرك حقیقته قوم نیام تسلّوا عنه بالحلم

''آپ ﷺ کی حقیقت کو خوابِ غفلت میں مبتلا قوم کیسے پہچان سکتی ہے، جو آپ ﷺ کے بارے میں محض خوابوں پر مطمئن ہے۔''

حصہ اول

انبیاء ورسل

پہلا باب
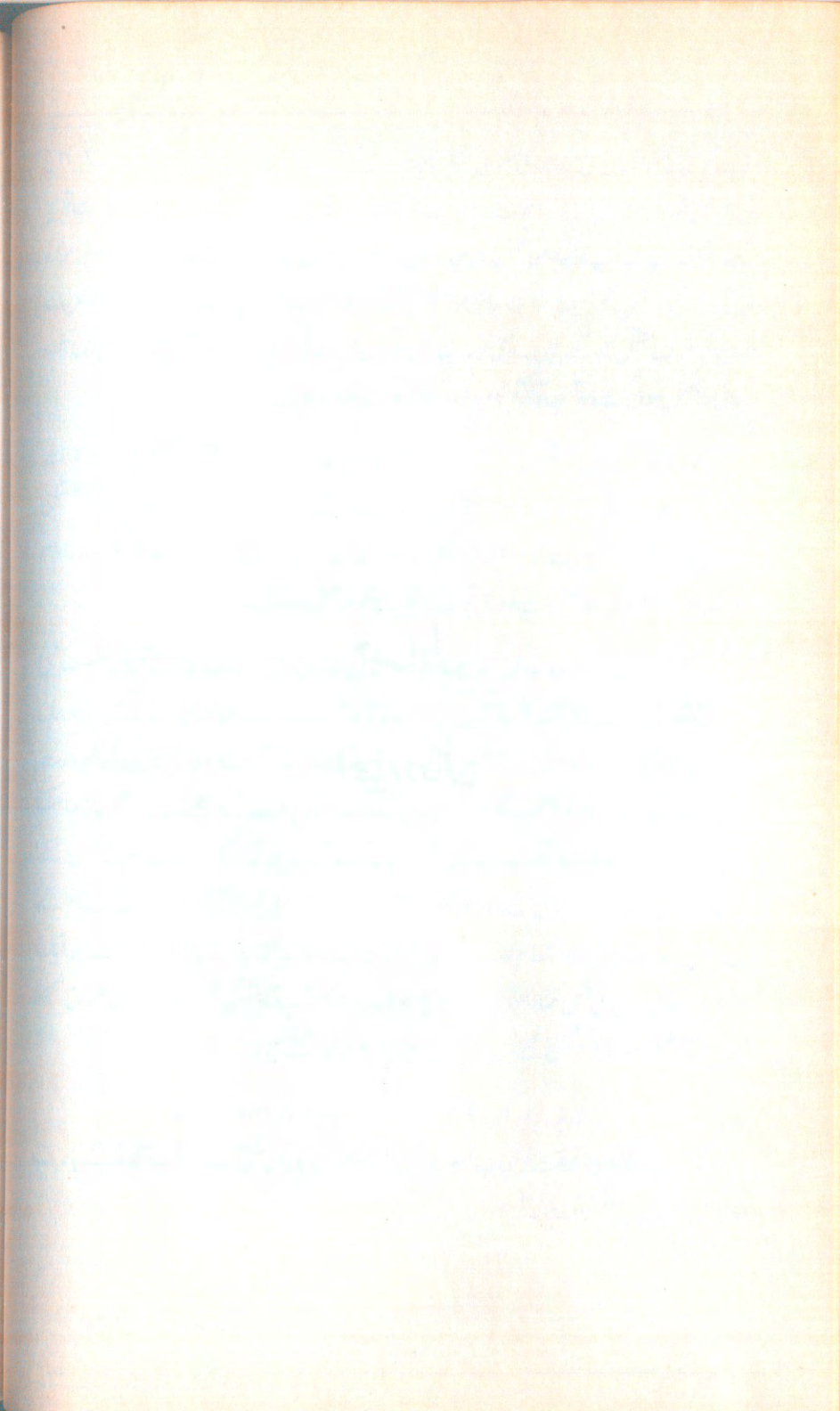
بعثت انبیاء کے مقاصد

انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے چنیدہ بندے ہوتے ہیں۔انہیں مراتب اور درجات کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فضیلت تو حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ سب کے سب وحی الٰہی کے نزول کے لئے منتخب کیے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی تعلیم وتربیت کا خصوصی انتظام ہوتا ہے۔ انہیں تمام اہل جہاں پر فضیلت وفوقیت حاصل ہوتی ہے اور توحید وللّٰہیت اور تعلق مع اللہ کا ایسا مقام حاصل ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

یہ تو وہ صفات ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ہر نبی ہی متصف ہوتا ہے۔ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ ان تمام صفات کے جامع تو تھے ہی ان کے ساتھ ساتھ آپ کو تعلق مع اللہ میں سب انبیائے کرام سے بڑھ کر ایسا مقام حاصل تھا کہ جب سے آپ نے دنیا میں آنکھ کھولی تب سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے۔کوئی اور چیز آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرا سکی اور جب آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا اس وقت بھی آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات جاری تھے:[اللھم الرفیق الأعلیٰ] ''اے اللہ میں رفیق اعلیٰ کی ملاقات کا خواہش مند ہوں۔'' چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:'' آپ ﷺ اپنے مرض الوفات میں معوذات پڑھ کر اپنے اوپر دم فرمایا کرتے تھے۔جب آپ ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو میں معوذات پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی اور برکت کی خاطر آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک کو آپ کے جسم پر پھیرتی، لیکن جب مرض مزید شدید ہو گیا تو میں نے پہلے کی طرح یہ عمل دوہرانے کے لئے آپ ﷺ کے دست مبارک کو پکڑا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ سے چھڑا لیا اور ارشاد فرمایا:[اللھم اغفرلی واجعلنی مع الرفیق الأعلی] ''اے اللہ میری بخشش فرما دیجئے اور مجھے رفیق اعلیٰ یعنی اپنے ساتھ ملا لیجئے۔''(42)

جب یہ حقیقت ہے کہ تمام انبیائے کرام بالخصوص ہمارے نبی کریم ﷺ کو دنیا کی بجائے اللہ رب العزت کی ذاتِ عالیہ سے ملاقات کا شوق تھا تو وہ کیا اہداف ومقاصد تھے، جن کے پیش نظر ان ارواح قدسیہ کو دنیا میں مبعوث کیا گیا؟

اس سوال کا جواب دو وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے:

اول: بعثت انبیاء کے مقاصد کے علم سے مبعوث کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے، جو انبیائے کرام کو عام انسانوں کی طرح تصور کرتے ہیں۔

دوم: بعثت انبیاء کے مقاصد کی واقفیت سے انبیائے کرام کے اس راستے اور طریق کار کی نشاندہی ہو جاتی ہے، جس پر چلنا اور اس سے واقف ہونا نائبینِ انبیاء کے لئے نہایت ضروری ہے۔

چونکہ یہ موضوع ایسا ہے کہ اسے جہاں سے بھی شروع کیا جائے اس کی اہمیت میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی اس لئے بعثت انبیاء کے مقاصد کو ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے اہم اور پھر کمتر اہم کی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

الف: عبادتِ خداوندی

جس طرح ایک عام انسان کی تخلیق کا مقصد عبادتِ خداوندی ہے، اسی طرح انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کریں۔ قرآن کریم میں اس مقصد کی طرف درج ذیل الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاريات: ٥٦] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ہماری پیدائش کا مقصد دنیا کا مال واسباب جمع کرنا اور دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا نہیں، بلکہ ہماری تخلیق کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کو پہچان کر اس کے حق عبودیت کو صحیح طور پر ادا کرنا ہے۔ یہ درست ہے کہ دنیا کا ساز وسامان انسان کی فطری ضرورت ہے، لیکن اسے انسانی تخلیق کا مقصد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دنیا میں جتنے بھی انبیاء ورسل تشریف لائے انہوں نے اسی بات کی تبلیغ کی اور انسانیت کو اس کے مقصد تخلیق کے بارے میں بتایا، چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ خدا کی ہی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو تو ان میں بعض ایسے ہیں، جن کو خدا نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوئی سو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام اور رسولوں کو انسانیت کے لئے اسوۂ

حسنہ بنا کر بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو غیر اللہ کی عبادت سے روک کر ایک اللہ کی عبادت و بندگی کی طرف بلائیں۔

یہ تو وہ مقصد ہے، جس کی تمام انبیائے کرام نے دعوت دی اور آپ ﷺ کو بھی اس مقصد کی تکمیل کے لئے رسالت سے نوازا گیا، لیکن چونکہ آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا، اس لئے آپ ﷺ کی رسالت جہاں انسانوں کے لئے تھی وہیں جنوں کو بھی آپ ﷺ کی رسالت کا مخاطب بنایا گیا تا کہ آپ ﷺ انسانوں اور جنوں سب کو شرک سے روک کر ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلائیں، چنانچہ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''میں نے ایک رات حجون مقام پر جنوں کے ایک وفد کو قرآن سناتے گزاری۔''(43)

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنا پیغام جن وانس تک پہنچا کر اپنی نبوت کی ذمہ داری کو نبھا دیا تو آپ ﷺ جان گئے کہ اب رفیق حقیقی یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس جانے کا وقت آ گیا ہے، چنانچہ ہم آپ ﷺ کو دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیوی زندگی کو پسند کرے یا آخرت کے عیش و آرام کو تو اس نے اللہ تعالیٰ کے پاس موجود آخرت کے عیش و آرام کو پسند کر لیا۔'' وہ بندہ جسے اختیار دیا گیا تھا خود رسول اللہ ﷺ تھے۔''(44)

ب: تبلیغ دین

بعثت انبیاء کا دوسرا اہم ترین مقصد تبلیغ دین ہے۔ انبیاء اور رسولوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات اور منہیات بندوں تک پہنچائے۔ اگر انبیائے کرام مبعوث نہ ہوتے تو ہمیں دین کے فرائض وواجبات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کا علم ہوتا اور نہ ہی منہیات مثلاً شراب جوا، زنا، ذخیرہ اندوزی اور سود وغیرہ کا حکم معلوم ہوتا؟ انبیائے کرام کے ذریعے ہمیں اس بارے میں علم ہوا۔ انبیائے کرام کی اس ذمہ داری کو ہم اختصار کے ساتھ فریضہ رسالت کا نام دے سکتے ہیں، جو تمام انبیاء اور رسولوں کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔(45)

قرآن کریم نے انبیاء اور رسولوں کے اس اجتماعی مقصد اور ذمہ داری کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَداً إِلَّا اللَّهَ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيباً﴾[الأحزاب:٣٩] ''جو خدا کے پیغام (جوں کے توں) پہنچاتے اور اس سے ڈرتے اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور خدا ہی حساب کرنے کو کافی ہے۔''

انبیائے کرام نے اپنے اس فریضے اور مقصد کو ہر حال میں پورا کیا۔ اس کی انجام دہی سے انہیں ان کی راہ میں کھڑی کی گئی رکاوٹیں روک سکیں اور نہ ہی وقت کے فرعون ان کی راہ میں حائل ہو سکے۔ ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہو بھی کیسے سکتی تھی؟ کیونکہ ان کے دل تو صرف خوفِ خدا سے معمور رہتے۔ اس کے سوا انہیں کسی کا خوف نہ تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾[مائدة:٦٧] ''اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوتے ہیں سب لوگوں تک پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فریضہ ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ بیشک خدا منکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔''

چونکہ آپ ﷺ کی ذمہ داری تمام انسانیت کو گمراہی کے راستے سے ہٹا کر راہِ ہدایت پر لانا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ آپ سے فرما رہے ہیں کہ اے نبی ﷺ اگر آپ نے اپنا پیغام پوری انسانیت تک پہنچانے میں کوتاہی برتی تو اس کا نقصان صرف آپ کی ذات تک محدود نہ رہے گا، بلکہ اس کے برے اثرات پوری انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر پڑیں گے۔

آپ ﷺ کو اپنی رسالت کی اہمیت کا پوری طرح احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کو یہ عظیم ذمہ داری سونپی گئی اور آپ نے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پوری زندگی وقف کر دی اور اس کے لئے ہر ممکن کی کوشش کی۔

ابتدا میں آپ ﷺ کی تبلیغی کوششوں کا ردِعمل لاپرواہی اور قطع تعلقی کی صورت میں سامنے آیا پھر اس نے استہزاء اور مذاق کی صورت اختیار کر لی اور آخری مرحلے میں تشدد اور طاقت کا استعمال کیا گیا۔ آپ ﷺ کے مخالفین نے آپ ﷺ کو ایذا پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، چنانچہ آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے۔ جب آپ ﷺ نماز میں مصروف ہوتے تو آپ ﷺ کے سر مبارک پر گندگی ڈال دی جاتی۔ غرض آپ ﷺ کی اہانت وتحقیر کے کسی طریقے سے دریغ نہ کیا گیا، لیکن چونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ تبلیغ رسالت ہی آپ کی بعثت کا مقصد ہے، اس لئے آپ کبھی مایوس ہوئے اور نہ آپ کے ارادے متزلزل ہوئے۔ آپ ﷺ ہمہ تن سب تک اپنا پیغام بار بار پہنچاتے رہے، جن میں آپ کے سخت ترین دشمن بھی شامل تھے۔ نہ معلوم آپ ﷺ کتنی مرتبہ ابوجہل اور ابولہب جیسے دشمنانِ اسلام کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں دین حق کی دعوت دی۔ آپ گلی گلی کوچہ کوچہ اس امید سے پھرتے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی کے نصیب میں ہدایت ہو، لیکن ہر امید کو ٹوٹتے دیکھ کر بھی آپ نے اپنی محنت جاری رکھی یہاں تک کہ جب اہل مکہ سے مایوسی ہونے لگی تو آپ ﷺ نے طائف کا رخ کیا جو باغات میں گھرا ہوا ایک خوب صورت شہر تھا۔ خدا کی نعمتوں کی کثرت نے اس شہر کے باسیوں کو سرکش بنا دیا تھا، چنانچہ دعوتِ حق کے انکار میں وہ اہل مکہ سے بھی بڑھ گئے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو اپنے ہاں سے نکال دیا۔ اہل طائف کے بچے اور شریر لوگ جمع ہو گئے اور آپ ﷺ کی ذاتِ انور جو فخرِ اولین وآخرین ہے اور جس کے سامنے فرشتے بھی نگاہ اٹھانے سے شرماتے ہیں پر سنگ ریزی کرنے لگے۔ آپ ﷺ کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے جسم سے رسول اللہ ﷺ کی طرف پھینکے گئے پتھروں سے آپ ﷺ کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے رہے، آپ ﷺ کا جسم مبارک پتھر لگنے سے لہولہان ہو گیا۔ اس مشکل گھڑی میں آپ ﷺ نے ایک باغ میں درخت کی چھاؤں تلے پناہ لی۔ اسی اثناء میں جبرئیل امین آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمانے لگے کہ اگر آپ حکم فرمائیں تو وہ پہاڑ کو اٹھا کر ان وحشی لوگوں کے سروں پر الٹ دیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انتہائی تکلیف کے عالم میں بھی یہ سوچ کر اس پیشکش کو مسترد کر دیا کہ ہوسکتا ہے ان کی آئندہ نسلوں میں سے کوئی ایمان قبول

کر لے پھر آپ ﷺ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے اپنے ہاتھ بلند فرمائے اور یوں دعا کی: (اللھم الیك أشکو ضعف قوتی وقلة حیلتی وھوانی علی الناس، یاارحم الراحمین أنت رب المستضعفین وأنت ربی، الی من تکلنی؟ الی بعید یتھجمنی ام الی عدو ملکته أمری، ان لم یکن بك غضب علی فلا أبالی، ولکن عافیتك ھی أوسع لی، أعوذ بنور وجھك الذی أشرقت له الظلمات و صلح علیه أمر الدنیا والآخرة من أن تنزل بی غضبك أو یحل علی سخطك، لك العتبیٰ حتی ترضی ولا حول ولا قوة الا بك) ''اے اللہ! میں اپنی کمزوری، ضعفِ تدبیر اور لوگوں میں اپنی بے وقعتی کی شکایت آپ سے کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! آپ کمزوروں کو ترقی پر پہنچانے والے اور میری پرورش کرنے والے ہیں۔ آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟ (کیا) ایسے دور والے کے جو مجھ سے ترش رو ہو کر پیش آتا ہے یا ایسے دشمنوں کے جو میرے معاملے کے مالک بنادیئے گئے ہیں؟ اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ مگر آپ کی عافیت میرے لئے بہت وسیع ہے۔ میں آپ کے چہرے کے اس نور کی پناہ لیتا ہوں، جس سے اندھیرے دور ہوتے ہیں اور دنیا و آخرت کے معاملات سدھرتے ہیں، اس بات سے کہ مجھ پر آپ کا غضب نازل ہو یا مجھ پر آپ کی خفگی ہو (مجھے) آپ کی رضامندی کی طلب ہے یہاں تک کہ آپ راضی ہو جائیں اور آپ کے سوا کسی میں ضرر دور کرنے کی قوت ہے اور نہ نفع حاصل کرنے کی۔''

جب عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ نے آپ ﷺ کی حالت دیکھی تو انہیں آپ ﷺ پر ترس آ گیا اور اپنے ایک عیسائی غلام عداس سے کہا: ''پلیٹ میں انگوروں کا ایک خوشہ رکھ کر اس آدمی کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ اسے کھالے۔'' چنانچہ عداس نے ایسے ہی کیا اور انگور آپ ﷺ کے سامنے رکھ کر کھانے کے لئے کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے انگور کھاتے ہوئے اللہ کا نام لیا۔ اس پر عداس نے حیرت سے آپ کے چہرہ انور کو دیکھا اور کہنے لگا: ''بخدا! یہ کلام اس شہر کے لوگ تو نہیں پڑھتے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''اے عداس! تم کس شہر کے رہنے والے ہو اور کس دین کے پیروکار ہو؟'' عداس نے جواب دیا کہ میں عیسائی ہوں اور نینوی شہر کا باشندہ ہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو تم اللہ کے برگزیدہ بندے یونس بن متی کے شہر کے ہو؟'' عداس نے آپ ﷺ سے پوچھا: ''آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یونس بن متی میرے بھائی ہیں۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔'' یہ سن کر عداس آپ کے سامنے جھک گیا اور آپ کے سر اور ہاتھ پاؤں کو بوسے دینے لگا۔ ربیعہ کے بیٹوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا: ''اس شخص

نے تمہارے غلام کو بھی بگاڑ دیا ہے۔" جب عداس واپس آیا تو وہ اس سے کہنے لگے: "تیرا ناس ہو! تو اس شخص کے سر اور ہاتھ پاؤں کو کیوں بوسے دے رہا تھا؟" عداس نے کہا: "میرے آقا! روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ اس نے مجھے ایسی بات بتائی ہے، جس کا علم نبی کے علاوہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔"(46)

عداس کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے آپ ﷺ خوش ہو گئے۔ اگر عداس کے قبولِ اسلام کا واقعہ پیش نہ آتا تو آپ ﷺ رنجیدہ اور شکستہ دل ہو کر طائف سے واپس لوٹتے۔ اہل طائف کی سخت دلی اور عداوت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ آپ کو اپنی دعوت پہنچانے کا موقع نہیں دیا گیا، لیکن عداس کے اسلام لانے سے آپ کا سارا غم اور رنج زائل ہو گیا۔ اگر یہ تعبیر درست ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ یمامۃ الانبیاء (انبیاء کے کبوتر) تھے، جو ہمیشہ ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت کے حامل پاکیزہ نفوس اور دلوں کی تلاش میں رہتے اور جہاں کہیں بھی آپ کو ایسے دل ملتے آپ ان میں جاگزیں ہو جاتے اور ان میں اپنی الہامی دعوت اتار کر چھوڑتے۔ اس طرح شمعِ اسلام کے پروانے آپ ﷺ کے گرد جمع ہوتے رہے اور جیسے جیسے آپ کے گرد اُن کا حلقہ پھیلتا اور بڑھتا گیا، ویسے ویسے اہل کفر کے غیض وغضب میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ اسلام دشمنی میں دیوانگی کی حد تک پہنچ گئے جیسا کہ آج بھی ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ پوری عالم میں ملت اسلامیہ کی بیداری پر عالم کفر کس طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر غم وغصے کا اظہار کر رہا ہے۔ اہل کفر یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ نورِ ہدایت کی شمع کو بجھا سکتے ہیں... لیکن یہ ان کی بھول ہے، کیونکہ ان کی یہ کوششیں ایسی ہی ہیں جیسے کوئی سورج کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کرے۔ سورج کا ذکر تو محض تمثیل کے طور پر کیا گیا ہے، ورنہ نورِ اسلام تو نورِ خدا ہے، جو ایک آفتاب کیا کئی آفتابوں سے بڑھ کر ہے، جسے بجھانا کسی کے بس میں نہیں۔ قرآن کریم کفار کی اس مضحکہ خیز حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿يُرِيدُونَ أَن يُطْفِؤُوا نُورَ اللّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّهُ إِلاَّ أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾[التوبة: ٣٢] "یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔"

دورِ حاضر میں ہم مشیت ایزدی سے ایک بار پھر دورِ نبوی کی یاد تازہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ امت مسلمہ کے دلوں میں شمع نبوت سے چنگاریاں چمکنے لگی ہیں اور شمع نبوت کے لاکھوں پروانے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھے آپ ﷺ کے پیغام کو عام کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں، جن کے

سامنے کفر کی کوئی طاقت ٹھہر سکتی ہے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی تدبیر وسازش کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اخلاص کے بوئے ہوئے بیج جلد یا بدیر پھوٹنے ہی والے ہیں، لہذا آپ ﷺ کے نورِ نبوت کو کوئی بھی نہیں بجھا سکتا۔

سفر طائف سے لوٹنے کے بعد جب مکہ میں کامیابی نہ ہوئی تو آپ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کا رخ کیا تا کہ مدینے میں نورِ ہدایت کے پھیلانے کے کام کو جاری رکھا جا سکے، لیکن مدینہ منورہ میں بھی آپ ﷺ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جاتے ہی مدینے کے منافقین اور یہودیوں کی سازشوں سے واسطہ پڑا، کفار کے خلاف جنگی معرکے ہوئے یہاں تک کہ غزوہ احد میں آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور آپ کا چہرہ انور خون آلود ہوا۔ آپ نے اتنی بھوک اور پیاس برداشت کی کہ اکثر آپ کے شکم مبارک پر پتھر بندھے رہتے، لیکن ان تمام آزمائشوں سے گزرتے ہوئے آپ ﷺ اپنے راستے پر گامزن رہے اور دعوت دین کی ذمہ داری کو نبھانے میں لمحہ بھر بھی توقف نہ کیا۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران دوسری سلطنتوں کے ساتھ سفارتی مصروفیات کے باوجود آپ نے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت میں کسی قسم کی کمی گوارا نہ کی، تبلیغ دین کی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا اور تمام دینی امور کی خوب وضاحت کر کے پیچیدگیوں کو دور کیا۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے آپ ﷺ سے ایک ایسا مسئلہ پوچھا جسے آپ ﷺ اس سے پہلے کئی بار بیان کر چکے تھے، لیکن آپ نے ناگواری کا اظہار کرنے کی بجائے بہت خوشی اور محبت سے اس کے سامنے اس مسئلے کی وضاحت کی۔

بلاشبہ تبلیغ تمام انبیائے کرام خصوصاً سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا راز ہے۔ تبلیغ نام ہے اس صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کا جسے جاننا ہر مؤمن کے لئے ضروری ہے۔ صراط مستقیم پر چلنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب مسلمان دن میں تقریباً چالیس مرتبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے صراط مستقیم پر چلنے کی دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں انبیائے کرام، صدیقین اور شہداء کے راستے پر چلائے اور انہی کی طرح کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے۔

صراط مستقیم کے مفہوم میں بہت وسعت ہے اور چونکہ آپ ﷺ تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لئے آپ کی رحمت سے ہر ایک کو صراط مستقیم میں سے مقررہ حصہ ملتا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کی رحمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَـا أَرْسَلْنَـاكَ إِلَّا

رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾[الأنبياء:۱۰۷] ''اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

ایک دوسری آیت میں آپ کے گواہ ہونے، خوشخبری دینے اور عذابِ خداوندی سے ڈرانے والا ہونے کا تذکرہ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِيراً﴾ [الاحزاب:٤٥] ''اے پیغمبر! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

ہمارے پیغمبر ﷺ نے تیئس سال تک بار نبوت اٹھایا اور اپنے فریضے کی انجام دہی میں ایسی بے مثال کامیابی حاصل کی جو کسی دوسرے داعی کے حصے میں نہ آئی۔ آپ ﷺ محبت الہیہ کے احساسات وجذبات سے سرشار اپنے ہدف کی طرف بڑھتے رہے اور بالآخر شاندار کامیابی سے سرفراز ہوئے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری حج حجۃ الوداع ادا فرمایا، جسے حج اکبر بھی کہتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے اس سفر حج میں حج اور عمرہ دونوں کی ادائیگی فرمائی تھی۔(47)

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہوئے اور دین کے ضروری احکام دوبارہ لوگوں کو بتائے۔ قتل وفدیہ کے احکام، عورتوں کے حقوق، سود کے احکام، تعلقاتِ عامہ کے حدود وقیود وہ بڑے بڑے موضوعات تھے، جن سے متعلق احکامات کا تذکرہ آپ ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔ اس موقع پر آپ ﷺ مسلمانوں کی ایک ایک جماعت کی طرف متوجہ ہوتے اور پوچھتے: ''ألا هل بلغت؟'' ''کیا میں نے دین پہنچا دیا؟'' جس پر سب جواب دیتے: ''ہم گواہ ہیں کہ آپ نے اللہ کے دین کو پہنچا دیا، اپنے فریضے کو ادا کر دیا اور امت کی خیر خواہی فرما دی۔'' اس کے بعد آپ ﷺ اپنی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ فرماتے اور پھر لوگوں کی طرف پھیرتے ہوئے تین مرتبہ فرماتے: ''أللهم أشهد أللهم أشهد'' ''اے اللہ آپ گواہ رہیے اے اللہ آپ گواہ رہیے۔''(48)

اپنی ذمہ داری بخوبی نبھانے اور حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد آپ ﷺ مطمئن ہو گئے اور اپنے پروردگار سے ملنے کی تیاری کرنے لگے۔ آپ ﷺ اپنے نفس کی نگرانی کے معاملے میں بہت حساس تھے، جس کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نے تمام عمر اسی فکر میں گزاری اور اپنے آپ سے ہمیشہ پوچھتے رہتے: ''کیا میں نے اپنے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہے؟ کیا جس مقصد اور ہدف کے حصول کے لئے میرے پروردگار نے مجھے لوگوں کی طرف بھیجا تھا میں نے اسی میں اپنی زندگی صرف کی ہے؟''

ج: اسوۂ حسنہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام کو اپنی اپنی امتوں کے لئے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجنا بھی مقاصد بعثت انبیاء میں سے ایک اہم مقصد ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿أُولَـئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ﴾[الأنعام: ۹۰] ''یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی تھی تو تم انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ایک ایک کر کے چند انبیائے کرام کے نام ذکر کیے اور پھر آپ ﷺ کو ان کی پیروی کرنے کا حکم فرمایا۔

ایک دوسری آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ ﷺ کی امت سے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً﴾[الأحزاب: ۲۱] ''تم کو پیغمبر خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے، (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روزِ قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔''

ان دونوں آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام اپنی امتوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہوتے ہیں۔ جس طرح نماز میں ہم اپنے امام کی اقتداء کرتے ہیں اسی طرح زندگی کے تمام امور میں انبیائے کرام ہمارے پیشوا ہیں۔ ہمیں ان کی پیروی میں زندگی گزارنی چاہیے، کیونکہ انبیائے کرام کی زندگی ہی ہمارے لئے اسوہ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمر بھر رسول اللہ ﷺ کی مکمل پیروی کی، جس کے نتیجے میں انہیں وہ مقام حاصل ہوا، جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث میں ہے: ''ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جہاد کے لئے نکلے گی تو ان سے پوچھا جائے گا: ''کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے، جس نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہو؟'' تو وہ اثبات میں جواب دیں گے۔ اس کے نتیجے میں وہ جہاد میں فتح یاب ہوں گے، پھر ایک جماعت جہاد کے لئے نکلے گی ان سے پوچھا جائے گا: ''کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے، جس نے رسول اللہ ﷺ کے کسی صحابی کی

زیارت کی ہو؟'' وہ لوگ اثبات میں جواب دیں گے۔ اس کی برکت سے انہیں بھی جہاد میں فتح نصیب ہوگی۔ اس کے بعد پھر ایک زمانے میں لوگوں کی ایک جماعت جہاد کے لئے نکلے گی تو ان سے بھی پوچھا جائے گا: ''کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے، جس نے کسی تابعی کی زیارت کی ہو؟'' تو وہ لوگ اثبات میں جواب دیں گے اور جنگ میں فتح یاب ہوں گے۔(49)

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے بارے میں فرماتے ہیں: ''بہترین لوگ میرے زمانہ کے ہیں پھر ان کے بعد آنے والے اور پھر ان کے بعد آنے والے۔''(50)

ان دونوں احادیث مبارکہ سے زمانۂ نبوت سے قریب تر دور کے لوگوں کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کے دلوں میں فکری اور عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کی سیرت وسنت کو اپنانے کے جذبات شدت سے موج زن تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجے جانے والے رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے مشابہت اختیار کرنا عظیم ترین مقصد تھا، جسے انہوں نے حقیقتاً حاصل کر کے دکھایا۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت اور سیرت کی صحیح معنی میں پیروی اور اتباع کی بدولت امت محمدیہ کو یہ مقام حاصل ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس امت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: [جمیع قدسیہ فی یدك] (التثنیة۔الباب: ۳۳، الایة: ۳) ''اس کے سارے مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں۔''

اسی طرح ایک ضعیف حدیث میں ہے: [علماء أمتی كأنبیاء بنی اسرائیل](51) ''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہوں گے۔''

حق تو یہ ہے کہ ان تین ادوار کے لوگ زندگی کے ہر معاملے میں آپ ﷺ کی پیروی میں اس درجے تک پہنچے کہ جس کے بعد نبوت کے علاوہ کوئی مقام نہیں۔ اس کی ایک روشن مثال حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شخصیت کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، انہوں نے آپ ﷺ کی صحبت سے اپنے آپ کو ایسے سنوارا کہ جب ملک کے ملک آپ کے سامنے

سرنگوں ہو گئے ، بازنطینی سلطنت کے دروازے آپ کے لئے کھل گئے اور اقوام عالم نے آپ ﷺ کی اطاعت اختیار کر لی تب بھی آپ کی طرز زندگی میں ذرہ برابر تبدیلی نہ آئی۔ بیت المقدس جس کا آج یہودیوں کے قبضہ میں ہونا عالم اسلام کے چہرے پر بدنما داغ ہے، حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ہوا تھا، لیکن شہر کے پادریوں اور مذہبی راہنماؤں نے مسلمانوں کے فتح یاب ہو جانے کے باوجود یہ کہتے ہوئے شہر کی چابیاں ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم تم میں اس ہستی کے اوصاف نہیں دیکھ پائے ، جس کے حوالے اس شہر کی چابیاں کرنا ضروری ہیں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو آپ نے بیت المال سے ایک اونٹنی عاریۃً لی اور اپنے ایک غلام کے ساتھ قدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر امیر المومنین اور ان کا غلام باری باری اونٹنی پر سوار ہوتے رہے یہاں تک کہ بیت المقدس پہنچ گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جلالت شان دیکھئے کہ جب شہر میں داخل ہونے کا وقت آیا تو چونکہ اونٹنی پر سوار ہونے کی باری ان کے خادم کی تھی، اس لئے امیر المومنین خادم کے اصرار کے باوجود اونٹنی سے اتر آئے اور خادم کو اونٹنی پر سوار کر کے خود اونٹنی کی نکیل پکڑے شہر میں داخل ہوئے۔

ذرا سوچئے وہ کیسا منظر ہوگا... یہ منظر دیکھ کر عیسائی ہکا بکا رہ گئے، ان کے اوسان خطا ہو گئے اور انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ آخر کار انہوں نے یہ کہتے ہوئے شہر کی چابیاں آپ کے حوالے کر دیں کہ ہماری کتابوں میں مذکور شخص کی یہی صفات ہیں۔

دوسری طرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی زندگی کے ان لمحات کے بارے میں سوچئے جب زندگی کے آخری ایام میں ایک مجوسی کے نیزہ مارنے سے آپ رضی اللہ عنہ زخمی ہیں اور چادر اوڑھے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر خاموش زمین پر لیٹے ہوئے ہیں، جو کچھ کھاتے پیتے ہیں وہ زخم کے راستے سے نکل جاتا ہے۔ آپ کا خادم آکر کھانے پینے کے بارے میں پوچھتا ہے تو آپ آنکھ کے اشارے سے انکار فرما دیتے ہیں۔ اس دوران حضرت مسور بن مخرمہ آپ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لاتے ہیں اور حالت دیکھ کر حاضرین سے فرماتے ہیں کہ آپ کو نماز کے لئے جگاؤ، کیونکہ آپ کے نزدیک نماز سے زیادہ قابل توجہ کوئی چیز نہیں، چنانچہ حاضرین نے جب آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے نماز کا تذکرہ کیا تو آپ فوراً متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے: ''خدا کی قسم! جس شخص نے

نماز کو چھوڑا اس کا اسلام میں کچھ حصہ نہیں۔" اس کے بعد آپ نے اس حال میں نماز ادا فرمائی کہ خون زخم سے بہہ رہا تھا۔(52)

اس سے ثابت ہوا کہ انبیائے کرام اور رسولوں کو اپنی امتوں کے لئے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجنا ان کی بعثت کا اہم ترین مقصد تھا۔

د: دنیا و آخرت کے درمیان توازن کی ضمانت

انبیائے کرام دنیا اور آخرت کے درمیان توازن و اعتدال کا پیغام لے کر تشریف لائے۔ یہ پیغام انسانیت کو صراطِ مستقیم پر چلنے اور افراط و تفریط سے حفاظت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

دین میں نہ تو راہبوں کی طرح دنیا سے کٹ کر عبادت گاہوں میں محصور ہو جانا ضروری ہے اور نہ ہی دنیا میں منہمک ہو کر بندۂ حرص و ہوس اور اسیرِ دنیا بننے کی اجازت ہے، بلکہ بہترین راستہ وہ اعتدال اور میانہ روی ہے، جس تک پہنچنے کا ذریعہ صرف وحی ہے۔ محض عقل و وجدان کے ذریعے اس توازن کا حصول ممکن ہے اور نہ ہی سائنس اس بارے میں راہنمائی دیتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اسی راہِ اعتدال کو یوں بیان کیا ہے: ﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ﴾[القصص:۷۷] ''اور جو (مال) تم کو خدا نے عطا فرمایا اس سے آخرت کی (بھلائی) طلب کیجئے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلائیے اور جیسی خدا نے تم سے بھلائی کی ہے (ویسی) تم بھی (لوگوں) سے بھلائی کرو اور ملک میں طالبِ فساد نہ ہو، کیونکہ خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

ایک دوسری آیت کریمہ: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾[الضحیٰ:۱۱] ''اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا۔'' میں جن حقائق سے پردہ اٹھا گیا ہے اگر انہیں خدائی ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں آیت کریمہ ﴿ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾[التکاثر:۸] ''پھر اس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی۔'' میں دنیوی نعمتوں کی ناشکری پر مذکور تہدید کو رکھ دیا جائے تو صحیح معنیٰ میں توازن قائم کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا معیار کے تحت ہمیشہ توازن و اعتدال برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ باقی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو اپنا سارا مال راہِ خدا میں خرچ کر ڈالا تھا اور اہل و عیال کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا تھا اسے بے اعتدالی نہ سمجھا جائے، کیونکہ ان کے مقامِ صدیقیت کا یہی تقاضا تھا۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک دفعہ پانی مانگا تو ایک برتن میں پانی اور شہد پیش کیا گا۔ آپ

رضی اللہ عنہ نے جب برتن منہ کے قریب کیا تو اتنا روئے کہ سب حاضرین بھی رونے لگے پھر آپ خاموش ہوئے تو حاضرین بھی خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ برتن اپنے منہ کے قریب لایا تو پھر رو پڑے یہاں تک کہ حاضرین کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ آپ سے اس بارے میں کیسے پوچھیں پھر آپ کو کچھ افاقہ ہوا اور آپ نے اپنے چہرے کو صاف کیا۔ حاضرین نے پوچھا کہ آپ اتنا کیوں روئے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ایک دفعہ میں حضور ﷺ کے ہمراہ تھا کہ آپ ﷺ اپنے سے کسی چیز کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگے اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمانے لگے: ''مجھ سے دور ہو جا... مجھ سے دور ہو جاؤ....'' جب میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے ساتھ اور کوئی نہیں ہے تو میں نے پوچھا: ''یارسول اللہ! آپ کس چیز کو اپنے سے دور کر رہے ہیں، حالانکہ آپ کے پاس تو کوئی بھی نہیں۔'' آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''دنیا بمع اپنی نعمتوں کے میرے سامنے پیش ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ مجھ سے دور ہو جا۔ اس پر وہ پیچھے ہٹ کر کہنے لگی: ''خدا کی قسم! آپ تو مجھ سے بچ گئے ہیں، لیکن آپ کے بعد والے مجھ سے نہ بچ سکیں گے۔'' اسی اندیشے نے مجھے رلا دیا کہ کہیں میں دنیا کے فریب میں تو نہیں آ گیا۔ (53)

اگرچہ دنیا اُمڈ کر صحابہ کرام کے قدموں میں آ پڑی تھی لیکن انہوں نے اپنے راہبر و راہنما حضور ﷺ کی پیروی میں نہایت اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کی۔

٥: اتمامِ حجت

انبیائے کرام کی بعثت کا ایک اہم مقصد لوگوں پر اتمامِ حجت کرنا بھی تھا تا کہ قیامت کے دن کوئی پیغامِ حق کے نہ پہنچنے کا عذر پیش نہ کر سکے۔ قرآنِ کریم نے اس مقصد کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿رُسُلاً مُّبَشِّرِینَ وَمُنذِرِینَ لِئَلاَّ یَکُونَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَکَانَ اللّٰهُ عَزِیزاً حَکِیما﴾[النساء: ١٦٥] ''سب پیغمبروں کو (خدا نے) خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر بھیجا تھا) تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو خدا پر الزام کا موقع نہ رہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔''

انبیائے کرام اور رسولوں کے علاوہ کوئی ایسا قائد اور راہنما نہیں جو امتوں اور قوموں کو مسلسل لمبے عرصے تک اپنے افکار پر مطمئن رکھ سکا ہو۔ اگر اسے کچھ کامیابی حاصل ہوئی بھی تو وہ عارضی تھی، کیونکہ مرورِ زمانہ سے اس کے نظریات بوسیدہ ہو کر خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھر گئے۔

لیکن انبیائے کرام اور رسولوں کا حال اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے، کیونکہ انہیں پہلے سے اس مقصد کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور دنیا میں تشریف آوری سے پہلے ہی نبوت و رسالت کے لئے چن لیا جاتا ہے۔ ان کی زندگی ساز و سر سے معمور اور ان کی گفتگو شعر کی مٹھاس سے بھرپور ہوتی ہے۔ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو پوری کائنات خاموش ہو جاتی ہے اور ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کر ان کی بات سنتا ہے۔

انبیائے کرام کی انہی صفات کا نتیجہ تھا کہ کتنے ہی معاملات محض ان کی تشریف آوری سے درست ہو گئے، کتنے ہی صاحبِ دل لوگ اپنے دل ان کے سپرد کر کے ان کی پیروی کرنے لگے اور کتنے ہی قوانینِ فطرت ان کی خاطر یا ان کے کہنے پر نہ صرف رک گئے، بلکہ خلافِ معمول چلنے لگے۔

مثال کے طور پر سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کو دیکھئے کہ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو حیوانات و جمادات سب ہی نے آپ کے ساتھ نسبت پیدا کرنے اور آپ کی رسالت و نبوت کی تصدیق کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جیسا کہ بوصیری نے کہا ہے:

جاء ت لدعوته الأشجار ساجدةً[54]

''آپ ﷺ کے بلانے پر درخت بھی سجدہ ریز ہو کر حاضرِ خدمت ہوئے۔''

آپ ﷺ کی تشریف آوری سے ہر ایک نے اپنے مقصد حیات کو پہچانا اور دنیا نے بدنظمی اور افراتفری سے نجات حاصل کی۔ بوصیری دراصل قرآنِ کریم ہی کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے: ﴿وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ [الاسراء: ٤٤] ''اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اسی کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔'' گویا آپ ﷺ نے ہی ہر موجود شے کو حیاتِ نو بخشی، ہم نے ہر چیز آپ ہی سے سیکھی اور آپ ہی کے ذریعے اشیاء کی حکمتیں ہم پر آشکار ہوئیں۔(55-1) ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو بے فائدہ پیدا کیا گیا ہے اور نہ ہی اسے بے مہار چھوڑا گیا ہے۔(55-2)

ہر نبی بہت سے معجزات لے کر آیا تاکہ اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو اور ایمان قبول نہ کرنے پر کسی کے پاس عذر باقی نہ رہے، لیکن سید المرسلین ﷺ کو سابقہ تمام انبیائے کرام کے معجزات دیئے گئے۔ سابقہ امتوں میں سے ہر امت نے صرف اپنے ہی نبی کا معجزہ دیکھا جبکہ ہم نے اپنے نبی ﷺ کے ہزاروں معجزات سنے اور قرآن مجید کی صورت میں ایک لازوال معجزہ سدا ہمارے سامنے موجود رہے گا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان سے متعلق تمام حقائق اپنے نبی محمد ﷺ کے ذریعے پوری طرح آشکار کر دیئے ہیں اور پوری انسانیت پر اتمام حجت کر دیا ہے، اس لئے اب کسی کا کوئی عذر قبول ہے اور نہ کسی کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔

یہی اتمام حجت انبیائے کرام اور رسولوں کی بعثت کا مقصد ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ [الاسراء: ١٥] ''اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔'' چونکہ اب انبیائے کرام اور رسولوں کو بھیجا جا چکا ہے، اس لئے جب قیامت کے دن میزانِ عمل قائم ہوگا تو کسی کے لئے بھی عذر کی گنجائش نہ ہوگی۔(56)

دوسرا باب

انبیائے کرام کی خصوصیات اور صفات

الف: للّٰہیت

انبیائے کرام میں سے کسی بھی نبی نے نہ تو اپنی ذاتی سوچ وفکر کی بنیاد پر اور نہ ہی اپنے طور پر کسی نظام یا فلسفے کو صحیح خیال کر کے اپنی دعوت کا آغاز کیا، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود ہی لوگوں میں سے کسی شخص کو وظیفہ رسالت کے لئے منتخب فرماتے اور پھر مناسب وقت پر اسے نبوت و رسالت سے نواز دیتے، جس کے بعد وہ شخص اعلانِ نبوت کرتا۔ وحی کسی بھی نبی کی زندگی کا ایسا ہی بنیادی اور لازمی حصہ ہوتی ہے جیسے ہوا، پانی اور خوراک ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت انبیائے کرام کی روحانی غذا ہوتی ہے۔ ان پر فیوضِ الٰہیہ کی بادِ نسیم چلتی رہتی ہے۔ وہ صرف اس وقت تک لوگوں کے درمیان رہنا گوارا کرتے ہیں جب تک بادِ صبا کے یہ جھونکے چلتے رہتے ہیں اور جوں ہی یہ سلسلہ بند ہوتا ہے وہ شوقِ لقاء میں اپنے پروردگار سے جا ملتے ہیں یا ہمہ وقت اسی انتظار میں رہنے لگتے ہیں۔ انبیائے کرام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم ہوتے ہیں۔ وہ کوئی بات بھی اپنی طرف سے نہیں کہتے، بلکہ جو کچھ بتاتے اور جس طرح بتاتے ہیں وہ سب اللہ کی مشیت اور ارادے سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام نے جو تعلیمات بھی پیش کیں وہ سب اللہ کی طرف سے تھیں، ان کا کام صرف اسے لوگوں تک پہنچانا ہوتا تھا۔

انبیائے کرام کی ذمہ داری صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ واضح الفاظ میں پیغامِ حق لوگوں تک پہنچا دیں چاہے لوگ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ انبیائے کرام لوگوں کی ہدایت کے مکلّف نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین جو کچھ بھی کہیں یا کریں وہ اپنے فریضے کی ادائیگی سے دستبردار نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مخالفین سے کہا تھا: ''اگر وہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ پر رکھ دیں اور یہ مطالبہ کریں کہ میں اسلام کی تبلیغ چھوڑ دوں تب بھی میں اسے کبھی نہ چھوڑوں گا، بلکہ اس کی خاطر جان بھی قربان کر دوں گا۔[57]

ب: خلوت اور یادِ الٰہی

انبیائے کرام اپنے فریضہ نبوت کی ادائیگی کے عوض کسی مادی یا روحانی منفعت کے منتظر نہیں ہوتے، بلکہ ان کا ایک ہی آوازہ ہوتا ہے، جس کا تذکرہ قرآنِ کریم نے بہت سے انبیاء اور رسولوں کی زبانی متعدد آیات میں کیا ہے، مثلاً: ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللهِ﴾ [یونس:۷۲،ھود:۲۹] ''میرا معاوضہ تو خدا کے ذمے ہے۔'' اگر ہم کسی مادی بدلے کی توقع نہ بھی رکھیں تو روحانی بدلے کے منتظر رہتے ہیں، لیکن انبیائے کرام ہر کام اللہ کا حکم سمجھ کر کرتے ہیں، وہ اس پر کسی قسم کے مادی یا روحانی بدلے کے منتظر نہیں رہتے۔ اگر بالفرض انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کا انجام جہنم ہوگا تو بھی انہیں لحہ بھر کے لئے اپنے فریضے کی ادائیگی میں تردد ہوگا اور نہ ہی وہ اپنے مقصد سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹیں گے۔

انبیائے کرام ایسی بلند پایہ ہستیاں ہوتی ہیں، جو اپنی دعوت کی خاطر ہر مادی و روحانی منفعت کو قربان کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ اس مشکل ترین ذمہ داری کی انجام دہی کا محرک جنت کا شوق ہوتا ہے اور نہ ہی جہنم کا خوف، بلکہ اللہ کے دربار میں خوشنودی اور قبولیت سے سرخرو ہونا ان کا اعلیٰ ترین مقصد ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نبی کا قول و فعل اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہوتا ہے، لیکن ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کو اخلاص کا اعلیٰ ترین مقام حاصل تھا۔ آپ ﷺ نے دنیا میں بھی اپنی امت کی نجات کی فکر کی اور اسے پکارا اور قیامت کے دن میدانِ حشر میں بھی آپ ﷺ کی زبان مبارک پر ''امتی! امتی!'' کے الفاظ ہوں گے۔(58)

آپ ﷺ کے اخلاص کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جنت کے دروازے آپ کے استقبال کے لئے کھلے پڑے ہوں گے، لیکن آپ ﷺ جنت کے عیش و آرام کو پس پشت ڈال کر میدانِ حشر کے ہولناک ماحول میں نہ صرف اپنے عزیز و اقارب بلکہ پوری امت کے بارے میں فکر مند ہوں گے۔

یقیناً انبیائے کرام کی نظریں ہر طرف سے ہٹ کر صرف ایک ہی مقصد یعنی رضائے الٰہی کی جستجو اور حصول پر لگی رہتی ہیں۔

عصرِ حاضر میں جن لوگوں نے بھی انبیائے کرام والی دعوت و تبلیغ کو سرانجام دینے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے انہیں اخلاص کا خاص اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ کلام کی تاثیر کا مدار صرف گفتگو کی فصاحت

و بلاغت پر نہیں ہوتا ہے، بلکہ متکلم کے اخلاص وللّٰہیت کا بھی اس میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔قرآنِ کریم میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ﴿اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُم مُّهْتَدُونَ﴾[یٰس: ۲۱] ''اے میری قوم! پیغمبروں کے پیچھے چلو ایسوں کے جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔''یعنی ان انبیائے کرام کی اتباع کیجئے جو رشد و ہدایت اور اخلاص وللّٰہیت کی معراج پر پہنچے اور کسی دنیوی منفعت کے طلبگار نہ ہوئے۔

آپ کو چاہیے کہ خوب غور و فکر کے بعد کسی ایسے شخص کو اپنا پیشوا بنایئے جو دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ کش، یادِالٰہی میں مستغرق اور رات دن خدمت دین میں منہمک ہو نیز آئندہ نسلوں کی کامیابی کی فکر اسے ہمیشہ دامن گیر رہے اور اس کا دل یادِ الٰہی سے معمور اور دنیا کی زیب وزینت اور محبت کی آلائشوں سے پاک ہو۔راہنمائی و قیادت کے لئے ایسی ہستی کو تلاش کر کے اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو یادِ الٰہی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔آپ نے زندگی بھر جو کی روٹی بھی سیر ہو کر نہ کھائی۔بسا اوقات کئی کئی ہفتے بلکہ مہینے آپ ﷺ کے گھر چولہا نہ جلتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:''ایک دفعہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔آپ ﷺ بیٹھ کر نماز ادا فرما رہے تھے۔میں نے دریافت کیا:''یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کو بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں کیا آپ بیمار ہیں؟'' آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ بھوک نے نڈھال کر دیا ہے۔مجھے یہ سن کر رونا آ گیا۔اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے ابو ہریرہ! روؤ نہیں، کیونکہ جو شخص دنیا میں ثواب کی نیت سے بھوک برداشت کرتا ہے قیامت کے دن اس پر حساب و کتاب کی سختی نہ ہوگی۔''

اسی طرح حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:''ایک انصاریہ خاتون میرے پاس آئی۔جب اس نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا بستر مبارک صرف ایک دوہرے چوغے پر مشتمل ہے تو واپس لوٹ کر آپ ﷺ کے لئے ایک اونی بستر بھیج دیا۔جب رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لائے تو مجھ سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی:''یا رسول اللہ ﷺ! فلاں انصاریہ خاتون میرے پاس آئی تھیں۔جب اس نے آپ کا بستر مبارک دیکھا تو میرے پاس یہ بستر بھیج دیا۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسے واپس کر دو، لیکن چونکہ مجھے اسے اپنے گھر میں رکھنا پسند تھا، اس لئے میں نے اسے واپس نہ کیا۔آپ ﷺ نے تین مرتبہ اسے لوٹانے کے لئے فرمایا اور آخری بار تو

یہاں تک ارشاد فرمایا: ''عائشہ! اسے واپس کردو بخدا! اگر میں چاہتا تو اللہ تعالیٰ سونے چاندی کے پہاڑ میرے ساتھ ساتھ چلادیتے۔''(59) یقیناً اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے تو پرتعیش اور پرسکون زندگی بسر کرسکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اسے پسند نہ فرمایا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف فرما تھے۔ انہوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک فرشتہ آسمان سے نیچے اتر رہا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ فرشتہ اپنی تخلیق کے بعد سے آج تک کبھی زمین پر نہیں اترا۔ اس فرشتے نے نیچے اتر کر نبی کریم ﷺ سے عرض کی کہ آپ ﷺ کے پروردگار نے مجھے آپ کے پاس یہ پوچھنے کے لئے بھیجا ہے کہ آپ ﷺ کو بادشاہت و نبوت سے سرفراز ہونا پسند ہے یا عبدیت و رسالت کے مرتبے پر فائز ہونا؟ جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کو مشورہ دیا کہ آپ اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی اختیار کیجئے، چنانچہ آپ ﷺ نے رسالت و عبدیت کے امتزاج کو پسند فرمایا۔(60)

اس واقعے کے بعد وفات تک آپ ﷺ کو کبھی ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ قدرے بلند جگہ پر بیٹھے ثرید تناول فرمارہے تھے کہ مردوں سے فحش کلامی کرنے والی ایک عورت آپ کے پاس سے گزری اور آپ کو دیکھ کر کہنے لگی: ''اسے دیکھو! غلاموں کی طرح بیٹھتا اور انہی کی طرح کھاتا پیتا ہے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھ سے بڑھ کر کون بندگی کرنے والا ہوگا؟''(61)

اخلاص وللّٰہیت کی مثالوں سے آپ ﷺ کی مبارک زندگی بھرپڑی ہے۔ اس موضوع پر درجنوں کتابیں موجود ہیں۔ تمام انبیائے کرام خصوصاً ہمارے رسول ﷺ نے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ انہوں نے اپنے آپ کو راہِ خدا کے لئے وقف کردیا اور اپنی خدمات کے عوض کسی دنیوی یا اخروی بدلے کی خواہش نہ کی۔

یہی وہ راز ہے، جو انبیائے کرام کی قوتِ تاثیر اور قائل کرنے کی صلاحیت کے پیچھے کار فرما ہوتا ہے۔ آج بھی جو شخص اپنی گفتگو کو پراثر و پرکشش بنانا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنی خدمات پر کسی قسم کے بدلے کا طلبگار یا منتظر نہ رہے۔

ج: اخلاص

اخلاص سے مراد یہ ہے کہ ہر کام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے کیا جائے۔ انبیائے کرام ابتدا سے ہی اخلاص کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ ممکن ہے مجاہدات کے بعد اخلاص کے کسی خاص مرتبے تک پہنچ جائیں، تاہم بالآخر وہ جس مقام پر بھی پہنچیں گے وہ انبیائے کرام کے اخلاص کی ابتدا ہوگی، چونکہ انبیائے کرام اخلاص کی حقیقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اس لئے انہیں مخلصین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی مرتبے کو بیان کرتے ہوئے بطور مثال چند انبیائے کرام کا تذکرہ کیا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَى إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصاً وَكَانَ رَسُولاً نَبِيّاً﴾[مریم: ٥١] ''اور کتاب میں موسیٰ کا بھی ذکر کرو بے شک وہ (ہمارے) برگزیدہ اور پیغمبر مرسل تھے۔'' حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ﴾[یوسف: ٢٤] ''بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔'' اور بظاہر رسول اللہ ﷺ سے خطاب کی صورت میں آپ ﷺ کی امت سے خطاب کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّينَ﴾[الزمر: ٢] ''(اے پیغمبر) ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف سچائی کے ساتھ نازل کی ہے تو خدا کی عبادت کرو (یعنی) اس کی عبادت کو (شرک سے) خالص کر کے۔'' ایک دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ سے یوں مطالبہ کیا گیا ہے: ﴿قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصاً لَّهُ دِينِي﴾[الزمر: ١٤] ''کہہ دو کہ میں اپنے دین کو (شرک سے) خالص کر کے اس کی عبادت کرتا ہوں۔'' اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا اللہ کا حکم ہے، جس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے اور اس کا بدلہ آخرت میں دیا جائے گا، اسی بندگی سے حیاتِ انسانی کی نشوونما تکمیل پاتی ہے، جس کے اثرات انسان کے تمام تصرفات پر ظاہر ہوتے ہیں۔''

مفکرِ عصر اخلاص کا تعارف پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اے نفس! اگر تجھے بے وقوف کہلانا پسند نہیں تو ہر کام اللہ کی خوشنودی کے لئے کیا کر۔ اگر کوئی چیز دے تو اللہ کی خاطر دے۔ اگر کوئی چیز لے تو اس کی رضا مطلوب ہو۔ اگر کسی کام کا آغاز کر تو اللہ کا نام لے کر اس کی خوشنودی کی خاطر کر... والسلام۔ (62)

اخلاص راہِ راست پر چلنے والے انسان کی پہچان ہے۔ مخلص انسان کبھی راہِ حق سے نہیں بھٹکتا۔ اس کی روحانی زندگی ہر قسم کی کج روی سے پاک اور ہمیشہ ترقی اور بلندی کی طرف محو پرواز رہتی ہے۔ یہ حضرات جس اخلاص سے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اس کی پاکیزگی کی عمر بھر حفاظت کرتے ہیں، تاہم ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس پوری تاریخ انسانیت میں واحد ہستی ہے، جس نے اخلاص کے اعلیٰ ترین مقام تک پرواز کی اور اس افق سے بھی پار چلی گئی، جس کے بعد کوئی افق نہیں، یہی وجہ تھی کہ دعوت کے آغاز سے لے کر فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخلے تک آپ کی تواضع اور اخلاص میں بال برابر بھی فرق نہ آیا۔ سوائے چند ایک واقعات کے مکہ کی فتح صلح کے ذریعے ہوئی۔ اس موقع پر فخرِ کائنات حضرت محمد ﷺ کئی سالوں کے بعد اس مبارک شہر میں داخل ہوئے تو فاتح سپہ سالار اور راہنما کے انداز میں داخل ہونے کی بجائے اس قدر تواضع سے داخل ہوئے کہ عاجزی سے آپ ﷺ کا سر مبارک کجاوے کی لکڑی پر لگنے کا اندیشہ تھا۔(63)

مدینہ منورہ میں بھی آپ کا طرزِ عمل نہ بدلا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ ﷺ کی تشریف آوری پر احتراماً کھڑے ہو جایا کرتے اور انہیں کھڑا ہونا بھی چاہیے تھا، لیکن جب آپ ﷺ کا گزر کسی جنازے کے پاس سے ہوتا تو آپ ﷺ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ باوجود اس کے کہ آپ ﷺ ہر قسم کی عزت و احترام کے مستحق تھے، آپ ﷺ صحابہ کرام کے اپنے لئے احتراماً کھڑے ہونے کو ناپسند فرماتے اور انہیں تنبیہ فرماتے کہ میرے احترام میں عجمی لوگوں کی طرح کھڑے نہ ہوا کرو۔(64)

بلاشبہ آپ ﷺ نے جس نہج پر اپنے عظیم مقصد کا آغاز کیا اسی نہج پر اس کی تکمیل کی۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی موسیقی کی ہم آہنگ دھنوں کی طرح میانہ روی سے گزری۔ آپ ﷺ نے جس کام کا آغاز کیا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ ایک ایسی کامیابی ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یوں لگتا ہے کہ آپ ﷺ نے پرسکون انداز میں خدائی موسیقی کی دھنوں سے آغاز کیا اور جلد ہی ان کی آواز بلند ہوئی تو ان سے زمین و آسماں جھوم اٹھے۔

آپ ﷺ نے اپنی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لئے وقف کر دی تھی۔ آپ ﷺ کے قلب اطہر سے معرفت الٰہیہ کے چشمے پھوٹ پڑے۔ آپ ﷺ نے اپنے اخلاق و عظمت کی روشنی میں صحابہ کرام کی تربیت فرمائی۔ آپ کی روح روحانی لذتوں سے سرشار تھی۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سراپا اخلاص وللّٰہیت تھی، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کبھی بھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہوئے۔ صفت احسان کے احساس نے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں ایک اور جہت کا اضافہ کر دیا تھا، جس کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: ''اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے تو اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔''(65)

د: موعظہ حسنہ

انبیائے کرام دعوت وتبلیغ کی ادائیگی کے دوران لڑائی جھگڑے سے اجتناب کرتے ہیں اور دانشمندی اوراحسن طریقے سے وعظ ونصیحت کر کے لوگوں کے دل جیت لیتے ہیں۔قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کواس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتا ہے:﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[النحل:۱۲۵] ''(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ آپ مختلف چیزوں کی حکمتوں اور مخلوقات میں موجود اسرار ورموز کو آسان انداز میں ایسی خوش اسلوبی سے پیش کریں کہ مخاطبین کی فکری ضروریات پوری ہوجائیں اوران کے جذبات کوٹھیس بھی نہ پہنچے۔

انبیائے کرام نے ہمیشہ لڑائی جھگڑے اور مناظرے سے اجتناب اور فلسفیانہ اندازِ بیان سے گریز کیا ہے، کیونکہ اس قسم کے اسلوب بیان سے ماضی وحال میں کسی شخص کو فائدہ پہنچا اور نہ ہی ہدایت نصیب ہوئی۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انبیائے کرام کو ایسے فضول اور بے فائدہ کاموں سے محفوظ رکھا۔انہوں نے حکمت اور احسن انداز سے وعظ ونصیحت کی ذمہ داری کو سرانجام دیا۔

انسان صرف عقل وفکر کا حامل نہیں، بلکہ قلب وروح بھی انسان کے جزو لازم ہیں۔انسان میں بہت سے اسرار ورموز پنہاں ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی تسکین کا تقاضا کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام فریضہ دعوت کی انجام دہی کے دوران تمام انسانی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے انسانی جذبات کی تسکین کی کوشش کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں تمام انسانی شبہات دور ہوجاتے ہیں اور بالآخر انسان اپنے مقصد تخلیق یعنی توحید باری تعالیٰ کو پالیتا ہے۔

انبیائے کرام کے تیار کردہ افراد منفرد ایمانی قوت کی حامل ہوتے ہیں۔وہ ظاہری بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی نعمت سے بھی سرفراز ہوتے ہیں، جس کی بدولت وہ دوسرے انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ امور کا ادراک کرلیتے ہیں۔اگر ساری دنیا شکوک وشبہات سے بھر جائے تو بھی اس سے ان کے ایمان پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا، بلکہ اس سے ان کے دلوں میں مزید شفقت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔شکوک وشبہات ان کے معرفت الہیہ اور ایمان سے لبریز دلوں تک راہ نہیں پاسکتے۔اللہ تعالیٰ ان کے علم میں برکت دیتے اور انہیں نئے نئے علوم عطا کرتے ہیں۔(66)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بادِ نسیم کے جھونکوں سے ان کے دل ہر دم شاد اور یادِ الٰہی سے ہر لحظہ آباد رہتے ہیں اور جب وہ اپنے علم پر عمل کرتے ہیں تو "کلمة طيبة" کی بدولت روحانی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں۔(67)

اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب ان میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جیسی شخصیات پیدا ہوتی ہیں، جنہیں یقین کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ اگر ان کے سامنے سے پردہ غیب اٹھا دیا جائے تو اس سے ان کے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا،(68) کیونکہ وہ ایمان و یقین کے اعلیٰ ترین مقام تک پہلے ہی پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس قسم کی بات تحدیث بالنعمت کے طور پر فرمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہ کو اللہ کے حکم سے قیامت تک کے لئے "ابو الاولیاء" کے لقب سے نوازا، آپ رضی اللہ عنہ کی تربیت و پرورش اپنی نگرانی میں کی اور پھر آپ کو افضل اور دانا ترین خاتون، باغِ نبوت کی گل سر بد اور جنت کی حورِ عین سے بڑھ کر خوبصورت اپنی بیٹی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کیا، جس کے نتیجے میں جنت کے دو پھولوں حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما نے جنم لیا اور اسی مبارک نسل سے تمام اولیاء و اقطاب تشریف لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح ان کی نسل کا ہر خاندان اور ہر فرد تاریخ میں شجاعت و بہادری کی مثال سمجھا جاتا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو جو مقام حاصل تھا، اس تک صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں، جنہیں اپنے ایمان و اسلام میں مقام احسان حاصل ہو، جو لوگ اس مقام کو پا لیتے ہیں وہ دنیا میں ہی ارشاد خداوندی: ﴿فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ [ق:٢٢] "آج ہم نے تجھ سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔" کا مصداق بن جاتے ہیں۔

سطور بالا میں جس فراست کا ذکر ہے اہل مغرب اسے Sihashsti کہتے ہیں۔ جب یہ فراست انسان کے باطن میں فعال کردار ادا کرنے لگتی ہے تو اس پر داخلی الہام اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کا عالم خارجی کے محرکات سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے، چونکہ اسے داخلی عالم میں حقیقت تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے اُسے عالم خارجی میں حقیقت کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نبی کریم ﷺ نے موعظہ حسنہ کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا اور اس کے مطابق انسانیت کی تعمیر کی، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کی تیار کردہ جماعت مذکورہ بالا بلند ترین مقام پر فائز ہوئی۔(69)

نبوی تعلیم وتربیت اور موعظہ حسنہ کا تذکرہ جس اختصار اور جامعیت سے زیرنظر آیت کریمہ میں ہے اس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں: ﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة: ۱۵۱] ''جس طرح (منجملہ اور نعمتوں کے) ہم نے تم میں تمہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کرسناتے ہیں اور تمہیں پاک بناتے اور کتاب (یعنی قرآن) اور دانائی سکھاتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ''موعظہ حسنہ'' کا جس قدر اہتمام فرمایا گزشتہ صفحات میں مثالوں کے ذریعے اس کی وضاحت کی جاچکی ہے۔اس موضوع کو مزید طول دینے کی ضرورت نہیں، تاہم چند جملوں میں اس موضوع کا خلاصہ بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

آپ ﷺ انتہائی پرحکمت انداز میں ہر شخص سے اس کی ذہنی اور نفسیاتی سطح کے عین مطابق گفتگو فرماتے، جس کا یہ اثر تھا کہ جب وہ شخص آپ کی مجلس سے اٹھتا تو اس کا دل اطمینان اور ایمان سے لبریز ہوتا۔

ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عتبہ بن ربیعہ وغیرہ جیسے بہت سے لوگ تکبر اور بغض وعناد کے سبب یا مال وجاہ کے چھن جانے کے خوف سے ایمان نہ لائے، وگرنہ آپ ﷺ کی دعوت وتبلیغ میں کوئی کمی نہ تھی۔اسی طرح بعض لوگ اعشیٰ شاعر جیسے بھی تھے، جنہوں نے اسلام کی ہر بات کو تسلیم کرلیا، لیکن چونکہ زمانۂ جاہلیت کی عادات کو ترک کرنے کی اپنے اندر ہمت نہ پاتے تھے، اس لئے آپ ﷺ سے مزید مہلت مانگتے تھے۔ان میں سے جو لوگ ایمان لائے بغیر مرگئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تقدیر میں یہی فیصلہ لکھا جاچکا تھا، وگرنہ آپ ﷺ نے دعوتِ ایمان اور تبلیغ رسالت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

ہ: توحید کی دعوت

تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور وحدانیت کی دعوت دی۔ قرآن کریم نے انہی کی زبانی اس کا تذکرہ یوں کیا ہے: ﴿یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ﴾ [هود: ٨٤] ''اے قوم! خدا ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔'' تمام انبیاء کی دعوت کا آغاز اسی سے ہوا اور اسی کا پرچار کرتے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انبیائے اکرام علیہم السلام کے زمانۂ بعثت اور مقامِ بعثت کے اختلاف کے باوجود سب کا اللہ کی وحدانیت کی دعوت دینا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ توحید کی دعوت ان کی اپنی فکر کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ یہ ان کی طرف خدا کا پیغام تھا، جسے لوگوں تک پہنچانے پر وہ مامور تھے، کیونکہ مختلف ادوار اور علاقوں میں رہنے والے مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد کے افکار کے درمیان اس قدر ہم آہنگی کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اگر آج آپ کسی بھی فلسفیانہ یا فکری نظام کا بغور جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک ہی زمانے اور ایک ہی علاقے کے ایک ہی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے افکار میں بھی چھوٹے چھوٹے مسائل پر واضح اختلافات پائے جاتے ہیں۔

آج انسانی فکر کے رجحانات میں پائے جانے والے اختلافات اور انبیائے کرام کا وحی الٰہی سے ماخوذ خدائی نظام پر اتفاق اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انسانی افکار کا سرچشمہ خواہشات ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام کے پیش کردہ نظام کی بنیاد وحی ہے۔

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا عقیدہ توحید کی دعوت پر اتفاق مقام نبوت کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں نے اور مجھ سے پہلے انبیائے کرام نے جو سب سے افضل بات کہی وہ ''لا اله الا الله وحده لا شريك له'' ہے۔''[70]

تیسرا باب

انبیائے کرام کے اوصاف

پہلی فصل: سچائی

سچائی نبوت کا مرکز و محور ہوتی ہے۔ نبی کی ہر بات سچائی پر مبنی ہوتی ہے، جو کبھی خلافِ حقیقت نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم انبیائے کرام علیہم السلام کے فضائل بیان کرتے ہوئے اسی صفت کی طرف درج ذیل الفاظ میں اشارہ کرتا ہے: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقاً نَّبِيّاً﴾[مریم: ٤١] ''اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو۔ بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔'' یعنی آپ ﷺ قرآن مجید جو لوحِ محفوظ کی نقل اور اس میں موجود حقائق کا پرتو ہے، میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ دیکھئے جو اپنے قول و فعل میں پیکرِ صدق تھے: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولاً نَّبِيّاً﴾[مریم: ٥٤] ''اور کتاب میں اسماعیل کا بھی ذکر کرو۔ وہ وعدے کے سچے اور (ہمارے) بھیجے ہوئے نبی تھے۔'' ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقاً نَّبِيّاً ()وَرَفَعْنَاهُ مَكَاناً عَلِيّاً﴾ [مریم:٥٦-٥٧] ''اور کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کرو۔ وہ بھی نہایت سچے نبی تھے۔''

جب حضرت یوسف علیہ السلام قید خانے میں بند تھے تو ان کے قید خانے کے ساتھی ان سے یوں خطاب کرتے ہیں: ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾[یوسف:٤٦] ''(وہ یوسف کے پاس آیا اور کہنے لگا) یوسف! اے بڑے سچے یوسف۔'' انبیائے کرام علیہم السلام سراپا صدق کیوں نہ ہوتے، جبکہ اللہ تعالیٰ تو عام مؤمنین سے بھی صدق کو اپنانے کا مطالبہ کررہے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَكُونُواْ مَعَ الصَّادِقِينَ﴾[التوبة:١١٩] ''اے اہل ایمان! خدا سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔''

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کو سچائی کی صفت کے ساتھ موصوف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ [الحجرات:١٥]

''مؤمن تو وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے اور خدا کی راہ میں جان اور مال سے لڑے۔ یہی لوگ (ایمان کے) سچے ہیں۔''

سچے لوگ تعریف کے مستحق

قرآن کریم سچے لوگوں کی تعریف میں کہتا ہے: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيْلًا﴾ [الأحزاب:۲۳] ''مومنوں میں سے کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انہوں نے خدا سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے (اپنے قول) کو ذرا بھی نہیں بدلا۔''

آگے بڑھنے سے پہلے اس آیت کریمہ کی مناسبت سے کچھ معروضات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے خادم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ابھی دس سال کی عمر کے تھے کہ انہیں ان کی والدہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائیں اور عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ انس آپ کی خدمت کیا کرے گا۔''[71] ''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت مبارکہ میرے چچا حضرت انس بن نضر اور ان جیسے دیگر صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی۔

بیعت عقبہ کے موقع پر جب حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو آپ ﷺ کی محبت آپؓ کے دل میں گھر کر گئی، لیکن بوجوہ آپ رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ غزوہ بدر کو ایک امتیازی شان اور اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو باقی صحابہ میں ایک امتیازی مقام تو حاصل ہے ہی، اس میں شریک فرشتوں کو بھی دیگر فرشتوں میں امتیازی مقام حاصل ہے، جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا جو خود اس معرکے میں شریک فرشتوں کی قیادت کر رہے تھے۔[72]

حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے چچا کے بارے میں بیان فرماتے ہیں: ''میرے چچا جن کے نام پر میرا نام رکھا گیا تھا، غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شریک نہ ہو سکے۔ یہ بات ان پر بہت ناگوار گزری۔ وہ اکثر کہا کرتے: ''(کتنے افسوس کی بات ہے کہ) میں سب سے پہلے غزوے میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شریک نہ ہو سکا۔ اگر آئندہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کسی غزوے میں شرکت کا موقع عطا فرمایا تو (ان شاء اللہ) اللہ تعالیٰ دیکھیں گے کہ میں کیسے شرکت کرتا ہوں۔'' انہوں نے اس کے علاوہ کوئی اور بات کہنا مناسب نہ سمجھی، چنانچہ غزوہ احد کے موقع

پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شرکت کی۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے ان کا سامنا ہوا تو انہوں نے حضرت سعدؓ سے فرمایا: ''اے ابو عمرو! آپ کہاں جا رہے ہیں۔ جنت کی خوشبو کیا خوب ہے۔ مجھے تو یہ احد کی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کفار پر ٹوٹ پڑے یہاں کہ شہید ہو گئے۔ (73)

غزوہ احد کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم اس اندوہناک حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اس معرکے میں ستر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید ہوئے۔ شاید اسی سبب سے رسول اللہ ﷺ نے ''جبل احد'' کے سامنے سے گزرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ''جبل احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔'' تاکہ ہمارے دلوں میں جبل احد کے بارے میں کوئی کدورت پیدا نہ ہو۔

جبل احد ایک دشوار گزار پہاڑ ہے... لیکن غزوہ احد اس سے کہیں زیادہ دشوار تھا... بعض صحابہ کرام نے ان جگہوں کو چھوڑ دیا تھا جہاں رسول اللہ ﷺ نے انہیں مختصر سے عرصے کے لئے مقرر فرمایا تھا... چونکہ صحابہ کرام کی یہ تبدیلی جنگی حکمت عملی کے تحت تھی، اس لئے اسے شکست نہیں کہنا چاہیے، نیز صحابہ کرام کے ادب واحترام کا بھی یہی تقاضا ہے۔

اس غزوے میں رسول اللہ ﷺ زخمی ہوئے۔ آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور آپ ﷺ کے چہرۂ انور میں خود کی دو کڑیاں چبھ گئیں، جس سے آپ کا چہرہ مبارک خون آلود ہو گیا، لیکن اس کے باوجود چونکہ آپ ﷺ اللہ کے رسول اور رحمت للعالمین تھے، اس لئے آپ نے دونوں بازوؤں کو پھیلایا اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی ''اللھم اغفر لقومی فانھم لایعلمون'' ''اے اللہ میری قوم جانتی نہیں، اسے معاف فرما دے۔''

اس معرکے میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ ادھر ادھر گھومتے پھرتے، حملہ آور ہوتے اور گزشتہ سال رسول اللہ ﷺ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ جلد ہی ان کا جسم تلواروں اور نیزوں کے زخموں سے بھر گیا اور وہ خون میں لت پت زمین پر گر پڑے.. وہ آخری سانس لے رہے تھے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے حضرت سعد سے مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا: ''جنت کی خوشبو کیا خوب ہے! مجھے تو یہ احد کی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔''

اس معرکے میں حضرت حمزہؓ، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عبداللہ بن جحش اور حضرت انس

بن نضر جیسے بہت سے شہداء کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کے شاید صرف انگلیوں کے پورے ہی زخمی ہونے سے بچ گئے تھے، جن کے ذریعے ان کی بہن نے انہیں پہچان لیا۔

اب آگے ہم حضرت انس بن مالک کی روایت کا بقیہ حصہ ذکر کرتے ہیں۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں: ''میرے چچا حضرت انس بن نضر لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کے جسم پر اسی سے زائد تلواروں، نیزوں اور تیروں کے زخم دیکھے گئے۔ ان کی بہن اور میری پھوپھی حضرت ربیع بنت نضر کہتی ہیں کہ میں نے اپنے بھائی کو انگلیوں کے پوروں کے ذریعے پہچانا۔ اس موقعہ پر آیت کریمہ: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾ [الاحزاب:۲۳] ''مومنوں میں سے کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انہوں نے خدا سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں سے بعض ایسے ہیں، جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے (اپنے قول) کو ذرا بھی نہیں بدلا۔'' نازل ہوئی۔ صحابہ کرام کا خیال تھا کہ یہ آیت حضرت انس بن نضر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔''

زیر نظر آیت آپ رضی اللہ عنہ کی شرافت اور خودداری کو بیان کر رہی ہے... آپ رضی اللہ عنہ نے لڑتے لڑتے شہید ہونے کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ موت بھی انہیں ایفائے عہد سے باز نہ رکھ سکی۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا۔ آیت کریمہ میں آپ رضی اللہ عنہ جیسے شہداء کی تعریف کے ذریعے انہیں ہر کلمہ گو مسلمان کے لئے اسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے تا کہ وہ بھی ان کی پیروی میں دین کو ضائع ہونے، ایمان کو سرنگوں ہونے اور احکام خداوندی کو پامال ہونے سے بچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

حضرت انس اور ان کے ساتھیوں نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ چونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی درسگاہ میں تربیت پائی تھی، اس لیے آپ ﷺ کی طرح وہ بھی صداقت و امانت کے علم بردار تھے۔

سچائی اور رسول اللہ ﷺ

الف: زمانۂ رسالت سے پہلے آپ ﷺ کی امانت داری

آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں امین کے لقب سے مشہور تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اہل مکہ آپ ﷺ کو نام کی بجائے اس لقب سے پکارتے اور بلاتے تھے۔ ہم کس قدر خوش قسمت ہیں کہ صبح و شام درج ذیل الفاظ میں آپ ﷺ کا تذکرہ کرتے ہیں: "لاالہ الااللہ الحق المبین، محمدرسول اللہ صادق الوعدالأمین."

ایک دفعہ سیلاب کی وجہ سے بیت اللہ کی عمارت بوسیدہ ہوگئی، جب اہل مکہ بیت اللہ کی تعمیر نو کی طرف متوجہ ہوئے تو حجر اسود جسے ہم حجر اسعد (خوش قسمت پتھر) بھی کہتے ہیں، کو واپس اپنی جگہ نصب کرنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ قبائل نے تلواریں سونت لیں۔ ہر قبیلہ اس سعادت کو حاصل کرنے کا خواہش مند تھا، جس کی وجہ سے قریب تھا کہ بہت بڑا فتنہ برپا ہو جاتا، لیکن اہل مکہ کا سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہونے والے شخص کو ثالث بنانے پر اتفاق ہوگیا، جس سے فتنے کی چنگاریاں بجھ گئیں، چنانچہ سب کی نظریں بیت اللہ کے دروازے پر لگ گئیں کہ کون سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہوتا ہے، جیسے ہی رسول اللہ ﷺ اپنے مبارک اور نورانی چہرے کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو سب خوشی سے پکار اٹھے: [ھذاالأمین... رضینا... ھذا محمد !][74] "یہ محمد (ﷺ) امین ہیں، ہم ان کی ثالثی پر راضی ہیں۔"

تاہم جب رسول اللہ ﷺ حرم میں تشریف لائے تھے تو آپ ﷺ کو اس معاملے کی کچھ خبر نہ تھی۔ اہل مکہ نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ انہیں آپ ﷺ پر مکمل اعتماد تھا، حالانکہ ابھی تک آپ ﷺ نبوت سے سرفراز نہ ہوئے تھے، لیکن چونکہ آپ ﷺ میں انبیائے کرام کی صفات پائی جاتی تھیں، اس لئے لوگوں کو آپ ﷺ پر اعتماد تھا۔

کمال تو وہ ہے، جس کی مخالفین بھی گواہی دیں، چنانچہ جب ابوسفیان آپ ﷺ کے سخت ترین دشمن تھے، اس وقت بھی وہ آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد ایک دفعہ وہ تجارتی قافلے کے ساتھ ملک شام میں تھے کہ ہرقل نے انہیں بلانے کے لئے قاصد بھیجا۔ تمام اہل قافلہ

"ایلیاء" (بیت المقدس) کے مقام پر ہرقل کے پاس پہنچے تو اس نے شرفائے روم کی موجودگی میں اہل قافلہ کو اپنے دربار میں بلایا اور اپنے ترجمان کے ذریعے ان سے پوچھا: تم میں سے اس مزعومہ نبی کا سب سے قریبی رشتے دار کون شخص ہے؟ ابوسفیان نے جواب میں کہا: "میں نسب کے اعتبار سے اس کا سب سے قریبی رشتے دار ہوں۔" اس پر ہرقل نے کہا: "اسے میرے نزدیک لے آؤ اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے کھڑا کر دو۔" پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا: "انہیں بتاؤ کہ میں تمہارے سردار سے نبوت کا دعوی کرنے والے شخص کے بارے میں پوچھوں گا اگر یہ مجھ سے غلط بیانی کرے تو وہ اس کی تکذیب کر دیں۔" ابوسفیان کہتے ہیں کہ بخدا اگر مجھے اپنے جھوٹے کہلائے جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں آپ ﷺ کے بارے میں دروغ گوئی سے کام لیتا۔" اس کے بعد ہرقل نے آپ ﷺ کے بارے میں پہلی بات پوچھتے ہوئے کہا: "اس کا حسب ونسب کیسا ہے؟" میں نے جواب دیا: "وہ عالی النسب ہے۔" ہرقل نے پوچھا: "کیا اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے اس قسم کا دعوی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا: "نہیں۔" ہرقل نے پوچھا: "کیا اس شخص کے آباواجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ ہرقل نے پوچھا: "شرفائے قوم اس کی پیروی کرتے ہیں یا کمزور ونادار لوگ؟" میں نے جواب دیا: "کمزور لوگ اس شخص کی پیروی کرتے ہیں۔" ہرقل نے پوچھا: "اس کے پیروکاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟" میں نے جواب دیا: "ان میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔" ہرقل نے پوچھا: "کیا کسی شخص نے اس دین کو قبول کرنے کے بعد ناپسندیدگی کی بنا پر اسے ترک کیا ہے؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ ہرقل نے پوچھا: "کیا دعوی نبوت سے پہلے تم نے کبھی اسے جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟" میں نے جواب میں کہا: "نہیں" ہرقل نے پوچھا: "کیا اس نے کبھی دھوکا بازی کی ہے؟" میں نے جواب دیا: "نہیں، البتہ آج کل ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ وہ اس بارے میں کیا کرے گا۔" ابوسفیان کہتے ہیں کہ اس ایک جملے کے سوا میں آپ ﷺ کے بارے میں کوئی منفی بات نہ کہہ سکا۔ ہرقل نے پوچھا: "کیا اس سے کبھی تمہاری لڑائی ہوئی ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ہرقل نے پوچھا: "تمہارے درمیان لڑائیوں کی کیا صورت حال رہی؟" میں نے بتایا کہ ہماری لڑائیاں کنویں کے ڈول کی مانند تھیں۔ کبھی ہمیں نقصان اٹھانا پڑا تو کبھی اسے۔ ہرقل نے پوچھا: "وہ تمہیں کیا کام کرنے کا کہتا ہے؟" میں نے بتایا کہ وہ کہتا ہے: "ایک خدا کی عبادت کرو۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے آباواجداد کی پیروی چھوڑ دو، نیز وہ ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پاکدامنی اختیار کرنے اور صلہ رحمی کرنے کا بھی کہتا ہے۔" اس کے بعد ہرقل نے ترجمان سے کہا کہ اسے (یعنی مجھے) بتاؤ: "میں نے تم سے نبوت کے دعویدار شخص کے نسب کے بارے میں پوچھا تو تم نے بتایا کہ وہ عالی النسب ہے تو رسول اسی طرح اپنی

قوم کے نسب میں مبعوث ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو تم نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر اس سے پہلے کسی اور نے ایسا دعویٰ کیا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ شخص بھی اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس کے آباؤاجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے تو تم نے بتایا کہ ایسا نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ شخص اپنے آباؤاجداد کی بادشاہت کا طلبگار ہے۔ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا تم نے نبوت کے دعوے سے پہلے اسے کبھی جھوٹ بولتے دیکھا ہے تو تم نے بتایا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا تو اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص لوگوں کے بارے میں جھوٹ بولنے سے تو بچے لیکن اللہ کے بارے میں جھوٹ بولنے لگے.. الخ [75]

یہ ایک طویل حدیث ہے، تاہم ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس روایت میں آپ ﷺ کی صداقت کی دو دلیلیں خاص طور پر قابل توجہ اور اہمیت کی حامل ہیں:

پہلی دلیل ہرقل شہنشاہ روم کا مذکورہ بالا تبصرہ ہے۔

دوسری دلیل ابوسفیان کا وہ جواب ہے جس میں انہوں نے مسلمان نہ ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا برملا اعتراف کیا ہے۔ ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا اعتراف تو کیا، لیکن حکومت کے لالچ میں ابدی اور حقیقی زندگی کو کھو کر یہ سنہری موقع گنوا بیٹھا۔ وہ ایمان لا کر دائرہ اسلام میں تو داخل نہ ہوا، تاہم اس نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے مکتوب گرامی کا احترام کیا، بہرحال اس کا نبی کریم ﷺ کی صداقت کا اعتراف کرنا ہمارے لئے باعث مسرت ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہرقل کی بات اپنے دامن میں بڑے گہرے معانی و مطالب سمیٹے ہوئے ہے... کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص جس نے چالیس سال تک کبھی عام لوگوں سے مذاق میں بھی خلافِ واقع بات نہ کی ہو وہ ادھیڑ عمر میں قبر کے قریب پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولے؟ یہ قطعاً ناممکن ہے۔

ایک دفعہ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بیٹے عمار رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ محمد ﷺ کی طرف جا رہا ہوں۔"
یہ جواب بالکل کافی تھا؟ کیونکہ آپ ﷺ امین تھے... اہل مکہ اسی حیثیت سے آپ کو پہچانتے تھے... لہٰذا جب آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو یقیناً آپ ﷺ اس دعوے میں سچے تھے، کیونکہ کسی نے کبھی بھی آپ ﷺ کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ صرف چند ایک لوگوں کا خیال نہ تھا، بلکہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے جو بھی آپ ﷺ کو جانتا تھا اس کی آپ ﷺ کے بارے میں یہی رائے تھی۔

ب: ہمیشہ سچائی کا درس دینے والا

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے خود سچائی کے ساتھ زندگی بسر کی، اسی طرح آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی ہمیشہ سچ بولنے کا درس دیا۔ یہاں برکت کے لئے آپ ﷺ کی چند وصیتوں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم مجھے چھ چیزوں پر عمل کرنے کی ضمانت دو تو میں تمہارے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔ وہ چیزیں یہ ہیں: جب بولو تو سچ بولو، وعدہ کرو تو پورا کرو، تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو اسے ادا کرو، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو، اپنی نظروں کو پست رکھو اور اپنے ہاتھوں کو (غلط کاموں سے) روکے رکھو''۔(76)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی روشنی کی کرن کی مانند مستقیم اور ہر کجی سے محفوظ تھی۔ آپ ﷺ استقامت کی تمام ممکن الحصول بلندیوں کو چھو کر اس معراج تک پہنچے، جس کے بعد صرف خدائی صداقت ہی تھی، گویا آپ ﷺ صداقت کے جہان میں ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى﴾ [النجم:۹] ''تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم'' کے افق تک پہنچے۔ یہ پرواز ایک طرف اگر امکان کی حد میں تھی تو دوسری طرف دائرۂ امکان سے متجاوز بھی تھی، جیسا کہ قاضی عیاض نے آپ ﷺ کی معراج کے بارے میں لکھا ہے: ''آپ ﷺ سفر معراج میں اس مقام تک پہنچے کہ آپ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اپنے قدم کہاں رکھیں، چنانچہ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ اپنے ایک قدم کو دوسرے قدم پر رکھ دیں۔'' یہ بات صحیح ہے کہ آپ ﷺ ہر اعتبار سے بشر تھے، لیکن سچائی نے آپ ﷺ کو اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بھی اسی سچائی اور استقامت کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر تم مجھے سچائی اختیار کرنے اور جھوٹ سے اجتناب کرنے کی ضمانت دے دو تو میں تمہارے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔''

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو چیز تمہیں شک میں مبتلا کرے اسے چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کرو، جس میں تمہیں شک نہ ہو کیونکہ سچ اطمینان اور جھوٹ شک کا باعث ہے۔''(77) آپ ﷺ مزید فرماتے ہیں: ''اگرچہ تمہیں سچائی میں بربادی دکھائی دیتی ہے، لیکن درحقیقت اسی میں کامیابی اور نجات ہے۔''(78) یعنی اگرچہ تمہیں دکھائی دے کہ سچ تمہارے لیے ہلاکت کا باعث بنے گا پھر بھی سچ بولو، کیونکہ حقیقت میں سچ تمہیں کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ آپ ﷺ مزید فرماتے ہیں: ''تم سچ کو لازم پکڑو، کیونکہ سچ نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچاتی ہے۔ ایک

آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ بالآخر اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ''صدیق'' لکھ دیا جاتا ہے۔ تم جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ برائی تک پہنچاتا ہے اور برائی جہنم تک پہنچادیتی ہے۔ ایک آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ بولنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ بالآخر اسے اللہ کے ہاں ''کذاب'' لکھ دیا جاتا ہے۔''(79)

نجات اور کامیابی سچائی میں ہی ہے۔ اگر انسان سچائی کے سبب نقصان اٹھاتا ہے تو اسے ایک ہی دفعہ نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن جھوٹ کے سبب ہلاکت میں پڑنے والے کو ہر جھوٹ پر ہلاکت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''سچ بولنے کی وجہ سے ہی مجھے نجات ملی۔''

سچائی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے تذکرے سے احتراز ممکن نہیں۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ صاحب زبان اور قادر الکلام صحابی تھے۔ آپ نے شاعری کے ذریعے کفار کی زبانیں بند کردیں۔ آپ کا شمار ان انصار صحابہ میں ہوتا ہے، جو بالکل شروع میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے، لیکن آپ غزوہ تبوک جیسے مشکل غزوے میں شریک نہ ہوسکے، جس میں مٹھی بھر اہل ایمان تپتے صحراء میں بازنطینی سلطنت کے ساتھ نبرد آزمائی کے ارادے سے روانہ ہوئے، بہادری کا مظاہرہ کیا اور ثواب حاصل کیا، تاہم جنگ کی نوبت نہ آئی۔

امام بخاری، مسلم اور احمد نے امام زہری کے واسطے سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

''غزوہ تبوک کے سوا کسی اور غزوہ میں ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شریک نہ ہوا ہوں، البتہ غزوہ بدر میں بھی شریک نہ ہوا تھا، لیکن جو لوگ غزوہ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے ان کے متعلق آنحضرت ﷺ نے کسی قسم کی خفگی کا اظہار نہ فرمایا تھا، کیونکہ آپ ﷺ اس موقع پر صرف قریش کے قافلے کے تعاقب میں نکلے تھے، لیکن مشیت ایزدی سے اتفاقاً دشمن سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں لیلۃ عقبہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ وہی رات تھی، جس میں ہم نے حمایت اسلام کا عہد کیا تھا۔ مجھے اس موقع پر شرکت غزوہ بدر میں شرکت سے زیادہ عزیز ہے، اگرچہ لوگوں میں غزوہ بدر کا زیادہ چرچا ہے۔ میرا واقعہ یہ ہے کہ میں زندگی بھر کبھی اتنا صاحب استطاعت اور صاحب مال نہ

ہوا جتنا اس موقع پر تھا جب میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ غزوہ تبوک میں شریک نہ ہو سکا۔ خدا کی قسم! اس سے پہلے کبھی میرے پاس دو اونٹ جمع نہیں ہوئے تھے، لیکن اس موقع پر میرے پاس دو اونٹ موجود تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کسی غزوے کے لئے تشریف لے جایا کرتے تو آپ ﷺ اس کے لئے ذو معنیین الفاظ استعمال کیا کرتے تھے، لیکن چونکہ اس غزوے کے موقعے پر گرمی بڑی سخت تھی، سفر بھی بہت لمبا تھا، صحرائی راستہ اور دشمن کی فوج کی کثرت اس پر مستزاد تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو اس غزوے سے متعلق تفصیل کے ساتھ بتا دیا تھا تاکہ وہ اس کے لئے پوری طرح سے تیاری کر لیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس سمت کی بھی نشاندہی کر دی جدھر آپ ﷺ کا جانے کا ارادہ تھا۔ مسلمان بہت بڑی تعداد میں آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ کسی دیوان میں ان کا ریکارڈ موجود نہ تھا۔ کوئی بھی شخص اس غزوے میں شریک نہ ہونا چاہتا تو وہ یہ خیال کر سکتا تھا کہ جب تک اس سے متعلق وحی نازل نہ ہوئی اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کو اس کی غیر حاضری کا پتہ نہ چلے گا۔ حضور اکرم ﷺ جب اس غزوے پر تشریف لے جا رہے تھے تو پھل پکنے کا زمانہ تھا اور سائے میں بیٹھنا آدمی کو بہت اچھا لگتا تھا۔ آنحضرت ﷺ اور دیگر مسلمان سفر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں بھی ہر صبح اس ارادے سے نکلتا، لیکن خالی لوٹ آتا اور کچھ نہ کر پاتا۔ میں اپنے دل میں کہتا کہ میں کسی بھی وقت تیاری کر سکتا ہوں۔ (ایسی جلدی کیا ہے؟) یوں وقت گزرتا گیا اور بالآخر لوگوں نے محنت و مشقت سے اپنی تیاریاں مکمل کر لیں اور ایک صبح آنحضرت ﷺ مسلمانوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے، لیکن میں نے اس وقت تک کوئی تیاری نہ کی تھی۔ اس موقع پر بھی میں اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتا رہا کہ دو ایک دن میں تیاری کر کے لشکر سے جا ملوں گا۔ کوچ کے دوسرے دن میں نے تیاری کا سوچا، لیکن اس دن بھی کوئی تیاری نہ کی۔ تیسرے دن بھی بغیر تیاری کے لوٹ آیا۔ یوں وقت گزرتا رہا اور اسلامی لشکر بہت آگے بڑھ گیا۔ غزوے میں شرکت خواب و خیال کی بات لگنے لگی۔ ایک دفعہ پھر میں نے روانہ ہو کر لشکر سے جا ملنے کا ارادہ کیا۔ کاش! میں نے ایسا کر لیا ہوتا، لیکن یہ میرے نصیب میں نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں باہر نکلتا تو مجھے بڑا رنج ہوتا، کیونکہ یا تو مجھے ایسے لوگ نظر آتے، جن کے چہروں پر منافقت کی ظلمت چھائی ہوئی ہوتی یا پھر ایسے لوگ دکھائی دیتے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے معذور اور کمزور قرار دے دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے راستے میں میرے بارے میں کسی سے نہ پوچھا، لیکن جب آپ ﷺ تبوک پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے ایک مجلس میں میرے بارے میں دریافت فرمایا۔ بنو سلمہ کے ایک صاحب نے کہا: ''یا رسول اللہ! خوشحالی اور اچھے لباس نے اسے آنے نہ دیا۔'' اس پر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بولے: ''تم نے بری بات کہی۔ یا رسول

ﷺ! بخدا ہمیں اس کے متعلق خیر کے سوا کچھ معلوم نہیں۔'' تاہم آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر مزید کچھ نہ فرمایا۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھے فکر دامن گیر ہوئی اور میرا ذہن کوئی ایسا جھوٹا بہانہ تلاش کرنے لگا، جس سے میں کل آنحضرت ﷺ کی خفگی سے بچ سکوں۔ میں نے اپنے گھر کے ہر عقلمند آدمی سے اس بارے میں مشورہ لیا، لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ مدینے کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں تو سارے غلط خیالات میرے ذہن سے نکل گئے اور مجھے یقین ہوگیا کہ اس معاملے میں جھوٹ بول کر میں اپنے آپ کو کسی طرح محفوظ نہیں کر سکتا، چنانچہ میں نے سچی بات کہنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ صبح کے وقت آنحضرت ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ سفر سے واپسی پر پہلے مسجد میں تشریف لے جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے اور پھر لوگوں کے ساتھ ملاقات کے لئے بیٹھتے، چنانچہ جب آپ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو غزوے میں شریک نہ ہونے والے لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں آنے لگے اور قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنے عذر بیان کرنے لگے۔ ایسے لوگوں کی تعداد اسی سے متجاوز تھی۔ آپ ﷺ نے ان کے ظاہر کو قبول فرمایا، ان سے بیعت لی، ان کے لئے مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد میں حاضر ہوا میں نے سلام کیا تو آپ ﷺ مسکرائے، لیکن آپ ﷺ کی مسکراہٹ میں خفگی کے آثار تھے۔ آپ نے فرمایا: ''آگے آجاؤ۔'' میں چند قدم چل کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم غزوہ میں کیوں شریک نہ ہوئے؟ کیا تم نے سواری نہ خریدی تھی؟'' میں نے عرض کی: ''یقیناً میرے پاس سواری موجود تھی۔ خدا کی قسم! اگر میں آپ کے سوا کسی دنیادار شخص کے سامنے بیٹھا ہوتا تو کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر اس کی خفگی سے بچ سکتا تھا، کیونکہ مجھے خوبصورتی کے ساتھ گفتگو کرنے کا سلیقہ معلوم ہے، لیکن خدا کی قسم! مجھے یقین ہے کہ اگر آج میں آپ کے سامنے کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے آپ کو راضی کر لوں تو جلد ہی اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کر دیں گے اور اس کے برعکس اگر میں آپ سے سچی بات بیان کر دوں تو یقیناً مجھے آپ کی خفگی کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن مجھے اللہ سے معافی کی پوری امید ہے۔ خدا کی قسم! مجھے کوئی عذر نہ تھا۔ اس موقع سے پہلے میں کبھی بھی اتنا صاحب استطاعت اور فارغ البال نہ تھا، لیکن پھر بھی میں آپ کے ہمراہ غزوے میں شریک نہ ہو سکا۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس نے سچی بات بتا دی۔ اچھا اب جاؤ۔ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ خود کوئی فیصلہ فرمائیں گے۔'' جب میں وہاں سے اٹھا تو بنو سلمہ کے کچھ لوگ میرے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے کہنے لگے: ''بخدا! ہم نے اس سے پہلے تمہیں کبھی گناہ کا ارتکاب کرتے نہیں دیکھا۔ تم نے بھی

غزوے میں شرکت نہ کرنے والے دوسرے لوگوں کی طرح آنحضرت ﷺ کے سامنے کوئی عذر کیوں نہ پیش کردیا؟ تمہارے گناہ کے لئے آنحضرت ﷺ کا استغفار ہی کافی تھا۔" خدا کی قسم! ان لوگوں نے مجھے اتنی ملامت کی کہ مجھے خیال ہوا کہ واپس جا کر آنحضرت ﷺ کے سامنے کوئی جھوٹا عذر پیش دوں، تاہم میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میرے علاوہ کسی اور نے بھی مجھ جیسا عذر پیش کیا ہے؟ انہوں نے بتایا: "ہاں! دو حضرات اور ہیں، جنہوں نے تمہاری طرح کی معذرت کی اور انہیں بھی وہی جواب ملا جو تمہیں ملا ہے۔" میں نے ان کے نام پوچھے تو انہوں نے مجھے مرارہ بن ربیع عمری اور ہلال بن امیہ واقفی رضی اللہ عنہما کے نام بتائے۔ چونکہ انہوں نے غزوہ بدر میں شرکت کرنے والے دو نیک صحابہ کا نام لیا، اس لئے ان کا طرزِ عمل میرے لئے نمونہ بن گیا، چنانچہ میں یہ سن کر گھر چلا آیا اور آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو ہم تینوں سے بات چیت کرنے سے ممانعت کر دی۔ لوگ ہم سے دور دور رہنے لگے اور ہمارے لئے اپنے بھی غیر بن گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ساری دنیا ہی بدل گئی ہے۔ پچاس دن تک ہم اسی طرح رہے۔ میرے دونوں ساتھیوں نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا اور گھر میں بیٹھے روتے رہتے، لیکن میں چونکہ ان کی بہ نسبت نوجوان اور باہمت تھا، اس لئے میں باہر نکلتا، مسلمانوں کے ساتھ نمازوں میں شریک ہوتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا، تاہم کوئی بھی مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ جب آپ ﷺ نماز کے بعد مجلس میں بیٹھتے تو آپ ﷺ کو سلام کرتا اور دیکھتا کہ میرے سلام کے جواب میں آنحضرت ﷺ کے ہونٹ مبارک ہلے یا نہیں پھر آپ ﷺ کے قریب ہی نماز پڑھنے لگ جاتا اور آپ ﷺ کو کنکھیوں سے دیکھتا رہتا۔

جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو آنحضرت ﷺ میری طرف دیکھتے، لیکن جونہی میں آپ ﷺ کی طرف دیکھتا آپ ﷺ رخ مبارک پھیر لیتے۔ آخر جب لوگوں کی بے رخی بڑھتی ہی چلی گئی تو ایک دن میں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ وہ میرے چچازاد بھائی تھے اور مجھے ان سے بہت زیادہ گہرا تعلق تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا، لیکن خدا کی قسم! انہوں نے میرے سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے کہا: "اے ابوقتادہ! میں تمہیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کتنی محبت ہے؟" انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دوبارہ یہی سوال کیا تو انہوں نے اتنا کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ میں واپس پلٹا اور دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔

ایک دن میں مدینہ منورہ کے بازار میں جا رہا تھا کہ شام کا ایک کاشتکار جو غلہ بیچنے مدینے آیا تھا لوگوں سے میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا تو وہ میرے پاس آیا اور غسانی بادشاہ کا خط مجھے دیا۔ میں نے خط کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا: ''اما بعد! مجھے خبر پہنچی ہے کہ تمہارے صاحب (یعنی آنحضرت ﷺ) نے تم پر ظلم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلیل پیدا نہیں کیا کہ تمہارا حق ضائع کیا جائے۔ تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ بہتر سلوک کریں گے۔'' جب میں نے خط پڑھا تو دل میں کہا: ''یہ ایک اور آزمائش ہے۔'' میں نے اس خط کو تندور میں جلا دیا۔ جب چالیس دن گزر چکے تو رسول اللہ ﷺ کا قاصد میرے پاس آیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا ہے کہ تم اپنی بیوی کے قریب نہ جاؤ۔ میں نے پوچھا: ''میں اسے طلاق دے دوں یا پھر مجھے کیا کرنا ہے؟'' اس نے بتایا کہ نہیں، صرف اس سے جدا رہو، اس کے قریب نہیں جانا۔ میرے دونوں ساتھیوں کو بھی آپ ﷺ کی طرف سے اسی قسم کا حکم ملا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اپنے میکے چلی جائے اور اس وقت تک وہیں رہے جب تک اللہ تعالیٰ اس معاملے کا کوئی فیصلہ نہیں فرما دیتے۔ ہلال بن امیہ کی بیوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! ہلال بن امیہ بہت بوڑھے اور کمزور ہیں۔ ان کے پاس کوئی خادم بھی نہیں ہے۔ اگر میں ان کی خدمت کر دیا کروں تو کیا آپ ﷺ اسے ناپسند فرمائیں گے؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدمت میں کوئی حرج نہیں، لیکن وہ تم سے صحبت نہ کریں۔'' اس نے عرض کی: ''خدا کی قسم! وہ تو کسی کام کے لئے حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ جب سے انہیں اس خفگی کا سامنا ہوا ہے اس دن سے ان کے آنسو تھمتے ہی نہیں۔'' میرے گھر کے بعض افراد نے مجھے مشورہ دیا کہ جس طرح آنحضرت ﷺ نے ہلال بن امیہ کی بیوی کو ان کی خدمت کرنے کی اجازت دی ہے، تم بھی اپنی بیوی کے لئے آنحضرت ﷺ سے اس قسم کی اجازت لے لو۔ میں نے کہا: ''خدا کی قسم! میں اس کے لئے آنحضرت ﷺ سے اجازت نہیں لوں گا، میں تو نوجوان ہوں۔ نہ جانے میں اجازت لینے جاؤں تو آنحضرت ﷺ کیا ارشاد فرمائیں؟'' اس طرح دس دن اور گزر گئے اور جب سے آنحضرت ﷺ نے ہم سے بات چیت کرنے کی ممانعت فرمائی تھی اس کے بعد پچاس دن پورے ہو گئے۔ پچاسویں رات کی صبح میں فجر کی نماز پڑھ کر اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور میرا حال ویسا ہی تھا جیسا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ میرا دم گھٹا جا رہا تھا اور زمین اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود میرے لیے تنگ ہوتی جا رہی تھی کہ اچانک میں نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی، جو جبل سلع پر چڑھ کر بلند آواز سے کہہ رہا تھا: ''اے کعب بن مالک! تمہیں خوشخبری ہو۔'' یہ آواز سنتے ہی میں سجدے میں گر پڑا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب فراخی کا وقت آ پہنچا ہے۔ فجر کی نماز کے بعد رسول

اللہ ﷺ نے اللہ کی بارگاہ میں ہماری توبہ کی قبولیت کا اعلان فرمایا تھا۔لوگ میرے پاس مبارک باد دینے کے لئے آنے لگے اور میرے دونوں ساتھیوں کو بھی جا کر مبارک باد دی۔ اِدھر ایک صاحب (زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ) نے میرے پاس آنے کے لئے گھوڑے کو ایڑ لگائی، اُدھر قبیلہ اسلم کے ایک صحابی نے پہاڑی پر چڑھ کر آواز دی۔ آواز گھوڑے سے پہلے پہنچ گئی۔ جن صحابی نے (جبل سلع سے) آواز دی تھی، جب وہ میرے پاس مبارک باد دینے آئے تو میں نے خوشی میں اپنے دونوں کپڑے اتار کر انہیں دے دیئے۔ خدا کی قسم! اس وقت ان دو کپڑوں کے سوا میرے پاس دینے کے لائق کوئی چیز نہ تھی۔ پھر میں نے ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے کپڑے مانگ کر پہنے اور آنحضرت ﷺ کی طرف چل پڑا۔ لوگ جوق در جوق مجھ سے ملتے اور توبہ کی قبولیت پر مبارک باد دیتے۔ بالآخر میں مسجد میں داخل ہوا۔ حضور اکرم ﷺ تشریف فرما تھے۔ چاروں طرف صحابہ کا مجمع تھا۔ طلحہ بن عبیداللہ دوڑ کر میری طرف بڑھے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ خدا کی قسم! ان کے سوا وہاں موجود مہاجرین میں سے کوئی بھی میرے آنے پر کھڑا نہ ہوا۔ میں طلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔

جب میں نے آنحضرت ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی اور مسرت سے تمتما رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہیں مبارک ہو۔ یہ تمہاری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔“ میں نے عرض کی: ”یارسول اللہ ﷺ! یہ بشارت آپ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔“ جب آنحضرت ﷺ کسی بات پر خوش ہوتے تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک چاند کی طرح روشن ہو جاتا تھا۔ آپ ﷺ کی مسرت کا اندازہ ہم چہرہ مبارک دیکھ کر لگا لیتے تھے۔ جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو میں نے عرض کی: ”یارسول اللہ ﷺ! میں اپنی توبہ کی قبولیت کی خوشی میں اپنا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بہتر ہے کہ کچھ مال اپنے پاس بھی رکھ لو۔“ میں نے کہا: ”تو میں خیبر کا حصہ اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔“ پھر میں نے عرض کی: ”یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے مجھے سچ بولنے کی وجہ سے نجات دی ہے۔ اب میں اپنی توبہ کی قبولیت کی خوشی میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گا سچ کے سوا کوئی بات زبان پر نہ لاؤں گا۔“ خدا کی قسم! جب سے میں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ عہد کیا ہے، میں کسی ایسے مسلمان کو نہیں جانتا، جسے اللہ تعالیٰ نے سچ بولنے کی وجہ سے اتنا نوازا ہو، جتنا مجھے نوازا ہے۔ جب سے میں نے آنحضرت ﷺ سے یہ عہد کیا اس وقت سے آج تک میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بقیہ زندگی میں بھی مجھے اس سے محفوظ رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بارے میں اپنے رسول ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی تھی: ﴿لَقَد

تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ () وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ () يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴾[التوبة:۱۱۷-۱۱۹] ”بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین اور انصار پر جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل جلد پھر جانے کو تھے مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ رہے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور انہوں نے جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔ بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے اہل ایمان! خدا سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔“ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کے لئے ہدایت کے بعد میری نظر میں آنحضرت ﷺ کے سامنے اس سچ سے بڑھ کر اللہ کا مجھ پر کوئی اور انعام نہیں ہوا کہ میں نے دوسرے جھوٹ بولنے والوں کی طرح جھوٹ بول کر اپنے آپ کو ہلاک نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے نزول وحی کے زمانے میں جھوٹ بولنے پر جتنی شدید وعید نازل فرمائی اتنی شدید وعید کسی دوسرے عمل پر نہیں فرمائی۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ إِذَا انقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ () يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِن تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضَى عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾[التوبة:۹۵-۹۶] ”جب تم ان کے پاس لوٹ کر جاؤ گے تو تمہارے روبرو خدا کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو سو ان کی طرف التفات نہ کرنا۔ یہ ناپاک ہیں اور جو کام یہ کرتے رہے ہیں ان کے بدلے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ یہ تمہارے آگے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے خوش ہو جاؤ، لیکن اگر تم ان سے خوش ہو جاؤ گے تو خدا تو نافرمان لوگوں سے خوش نہیں ہوتا۔“

چنانچہ ہم تینوں ان لوگوں کے معاملے سے جدا رہے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے قسمیں کھائی تھیں جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے ان کی بات مان لی تھی اور ان سے بیعت لے کر ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائی تھی۔ ہمارے معاملے کو آنحضرت ﷺ نے مؤخر کر دیا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کا فیصلہ فرمایا۔ ارشادِ خداوندی ﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا﴾

[التوبة:۱۱۸] ''اوران تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا'' سے یہی مراد ہے کہ ہمارا معاملہ ملتوی اور مؤخر کر دیا گیا۔ یہاں جہاد سے پیچھے رہنا مراد نہیں، بلکہ ان لوگوں سے پیچھے رہنا مراد ہے، جنہوں نے قسمیں کھا کر اپنے عذر پیش کئے تھے اور آنحضرت ﷺ نے ان کے عذر قبول کر لئے تھے۔(80)

بلاشبہ قصر نبوت کی عمارت سچائی اور درستی پر قائم ہے۔ ہر نبی پیکر صدق وصفا ہوتا ہے اور یہ ضروری بھی ہے، کیونکہ نبی ایسی ہستی ہوتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے احکامات لوگوں تک پہنچاتی ہے۔ اگر اس سے تبلیغی ذمہ داری میں کسی قسم کی لغزش کے امکان کو تسلیم کر لیا جائے تو دین کی کسی بات پر اعتماد باقی نہ رہے گا۔ یہ ایسا نازک موضوع ہے، جس میں ذرہ برابر بھی لغزش یا شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ () لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ () ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ () فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ﴾ [الحاقة:٤٤-٤٧] ''اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنا لاتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

احکام خداوندی کی تبلیغ کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ مردہ بدست زندہ کی مثال تھے حتیٰ کہ قربِ الٰہی کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے کے بعد بھی آپ کی ہر حرکت وسکون اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق ہوتی تھی۔

تبلیغ احکام کے بارے میں آپ نے شدید احتیاط اور حساسیت (Sensitivity) کے باعث کسی معمولی سی بات کے پہنچانے میں بھی کوتاہی نہ برتی... یہ احساس آپ ﷺ کی رگ وپے میں دوڑ کر آپ کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔

آپ ﷺ ہمیشہ وعدے کا ایفا فرماتے۔ بعثت سے پہلے کی چالیس سالہ زندگی میں بھی آپ ﷺ نے کبھی وعدہ خلافی کی اور نہ ہی کسی نے آپ ﷺ کو خلافِ واقع بات کرتے دیکھا... حضرت عبداللہ بن ابی الحمساء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آپ ﷺ کے ساتھ خرید وفروخت کا ایک معاملہ کیا۔ میرے ذمے کچھ ادائیگی باقی رہ گئی، میں نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ میں اس کی ادائیگی کچھ دیر تک اسی جگہ کر دوں گا، لیکن پھر میں بھول گیا۔ تین دن بعد مجھے یاد آیا اور اس جگہ گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ اسی جگہ تشریف فرما ہیں۔ مجھے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''نوجوان! تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ میں یہاں تین دن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''(81)

ج: آپ ﷺ کی گفتگو آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل

آپ ﷺ دنیا میں تشریف آوری کے وقت سے ہی صداقت اور امانت داری میں نمایاں تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے نبوت کے بعد جو کچھ فرمایا لوگ اس پر فوراً ایمان لے آئے، گویا سارا جہاں پکار رہا تھا: ''اے اللہ کے رسول! آپ نے سچ فرمایا۔'' آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی صرف انسانوں نے ہی نہیں دی، بلکہ ہر مخلوق نے زبانِ حال سے اور معجزات کی صورت میں آپ ﷺ کی صداقت کو تسلیم کیا۔

مناسب ہوگا کہ میں اس جگہ ایک اہم موضوع کی وضاحت کرتا چلوں:

قرآنی آیات اور نبی کریم ﷺ کے نورانی ارشادات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات کے درمیان موجود تعلق کو جس باریک بینی اور دقت نظری سے بیان کیا گیا ہے اسے فلاسفہ اپنی نارسا عقلوں اور اولیائے کرام اپنی روحانی وقلبی قوتوں کے ذریعے کما حقہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس بلند مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔

البتہ جن اولیائے کرام کو وصول الی اللہ کا مقام حاصل ہے انہیں اپنے روحانی تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ جس قدر انہیں روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے اسی قدر قرآنِ کریم اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی صداقت وحقانیت ان پر واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔

اہل علم حضرات الوہیت سے متعلق نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو تسلیم کر کے انہیں مزید تحقیقات کے لئے بنیاد اور اساس قرار دے سکتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے الوہیت، بعث وحشر اور تقدیر جیسے حساس موضوعات پر اس قدر توازن واعتدال اور باریک بینی سے گفتگو کی ہے کہ اگر آپ ﷺ ان موضوعات پر روشنی نہ ڈالتے تو کسی اور کے لئے اس بارے میں ایک حرف بھی کہنا ممکن نہ ہوتا۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد منبر پر تشریف لے جا کر خطبہ ارشاد فرمایا یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا چنانچہ آپ ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے، نماز ادا کی اور پھر منبر پر تشریف لے جا کر خطبہ ارشاد فرمانے لگے یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا، آپ ﷺ نے منبر سے نیچے تشریف لا کر نماز ادا کی اور پھر منبر پر تشریف لے جا کر غروبِ آفتاب تک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس دن آپ ﷺ نے ہمیں ماضی اور مستقبل کی بہت سی باتیں بتائیں، جنہیں ہم نے یاد کر لیا۔(82)

یقیناً آپ ﷺ نے تاریخ کے تمام دریچوں کو کھولا، حضرت آدم علیہ السلام سمیت تمام انبیائے کرام کے حالات بتائے اور ان کی صفات وعادات بیان کیں پھر مستقبل کی طرف متوجہ ہوئے اور میدانِ حشر، جنت اور دوزخ کے بارے میں ہر بات کی وضاحت فرمائی۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہی دنیا و آخرت کے ان علوم سے نوازا، جنہیں اللہ تعالیٰ ہی بتا سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو دورِ حاضر کے دانشور بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی ایک اور دلیل ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ انبیائے کرام کے اوصاف اور ان کے چہرے کے خدوخال بیان فرماتے تو یوں لگتا گویا آپ ایک ماہرفن کی طرح حقیقی نقش ونگار بنا رہے ہیں۔ اہل کتاب آپ ﷺ کی باتیں سن کر اعتراض کرنے کی بجائے آپ ﷺ کی تصدیق کرتے کہ ان کی کتابوں میں انبیائے کرام کی صفات بعینہٖ اسی طرح مذکور ہیں۔(83)

کیا یہ ایک ایسے آدمی کی نبوت کی صداقت کی دلیل نہیں جس نے کسی پہلی کتاب مثلاً تورات اور انجیل وغیرہ کو پڑھے بغیر سابقہ انبیائے کرام کی صفات تفصیل سے بیان کیں اور اس وقت کے اہل علم نے اس کی تصدیق کی؟

جس موضوع کی میں نے ابھی ایک جھلک دکھائی ہے اسے کماحقہ بیان کرنا میرے لیے ممکن ہے اور نہ ہی قارئین کے لئے سمجھنا، تاہم سلوک وولایت کے اعلیٰ مقام پر فائز اولیائے کرام، صوفیائے عظام اور بحرِ بےکراں کی مانند علم ومعرفت کے حامل علماء وفلاسفہ کے اقوال اور گواہی کی بنیاد پر ہم اتنا جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو ہر معاملے میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات آپ ﷺ کی صداقت اور درستی کا ایک اور پہلو ہے۔ مذکورہ بالا ممتاز اور نمایاں شخصیات کی تصدیق اس بات کی کافی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی خلافِ حقیقت بات نہیں کہی، کیونکہ آپ ﷺ کی ہر بات وحی الٰہی پر مبنی ہوتی تھی جس میں کسی قسم کی خلافِ حقیقت بات کی گنجائش نہ ہوتی۔(84) اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ دنیائے کلام کے بادشاہ قرار پائے۔

اس موقع پر ہم آپ ﷺ کے غیب سے متعلق وہ ارشادات نقل کرنا چاہتے ہیں جن کی صداقت چودہ سو برس کے دوران ظاہر ہوئی۔ یہ آپ ﷺ اور آپ کی نبوت کی ایک اور دلیل ہے، تاہم اس موضوع کو شروع کرنے سے پہلے غیب کے مفہوم سے متعلق چند مسائل کو ان کی ضرورت اور افادیت کے پیشِ نظر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لفظ غیب قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مختلف مفاہیم میں استعمال ہوا ہے۔ایک جگہ ارشاد ہے:﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ [الانعام:۵۹] ''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اسے جنگلوں اور دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے اور کوئی پتا نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ اور کوئی ہری یا سوکھی چیز نہیں ہے مگر کتابِ روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔''

اس مقام پر لفظ غیب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، جس کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں... یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے رسول محمد ﷺ کو بھی اس کا علم نہیں۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ آپ یوں کہیے:﴿قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾[الانعام: ۵۰] ''کہہ دو کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے (خدا کی طرف سے) آتا ہے۔کہہ دو کہ بھلا اندھا اور آنکھ والا برابر ہوتے ہیں؟ تو پھر تم غور (کیوں) نہیں کرتے؟۔''

ایک دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:﴿قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعاً وَلَا ضَراً إِلَّا مَا شَاء اللَّهُ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَاْ إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾[الاعراف:۱۸۸] ''کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔میں تو مومنوں کو ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔''

سورت جن میں ارشادِ خداوندی ہے:﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَداً () إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَداً () لِيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَداً﴾[الجن:۲۶-۲۸] ''(وہی) غیب (کی بات) جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے تو اس (کو غیب کی باتیں بتادیتا اور اس) کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے تا کہ معلوم فرمائے کہ انہوں نے اپنے

پروردگار کے پیغام پہنچائے ہیں اور (یوں تو) اس نے ان کی سب چیزوں کو ہر طرف سے قابو کر رکھا ہے اور ایک ایک چیز گن رکھی ہے۔"

ان آیات مبارکہ کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ نبی کریم ﷺ مطلقاً عالم الغیب تھے وہ افراط میں مبتلا ہے اور جو آپ ﷺ کے مطلقاً عالم الغیب نہ ہونے کا قائل ہے وہ تفریط میں مبتلا ہے۔ آپ ﷺ بذاتِ خود غیب کی باتیں نہ جانتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو غیب کی باتیں بتاتے تھے۔ آپ ﷺ قیامت تک آنے والے اہم واقعات یوں بیان فرماتے تھے گویا آپ ٹیلی ویژن کی اسکرین کے سامنے بیٹھے انہیں دیکھ رہے ہوں۔ یہاں علم غیب سے ہماری مراد اسی قسم کا علم غیب ہے۔ آپ ﷺ نے غیب کی جو باتیں بتائیں وہ آپ نے اپنی طرف سے بیان نہیں کیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے ان پر مطلع کیا۔ چونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی غیب جانتے ہیں، اس لئے نہ صرف انبیائے کرام اور ہمارے نبی ﷺ اس قسم کے غیب کی باتیں جانتے تھے، بلکہ وصول الی اللہ کے مقام پر فائز بعض اولیائے کرام بھی کرامت کے طور پر اس قسم کے غیب پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "سابقہ امتوں میں "محدّثون" ہوا کرتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی محدّث ہے تو عمر بن خطاب ہیں۔" ابن وہب رحمہ اللہ نے "محدّثون" کی وضاحت صاحب الہام حضرات سے کی ہے۔[85] یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ایک لشکر کو گھات میں بیٹھے دشمنوں سے بچانے کے لئے اپنے خطبے کے دوران ہی پکار اٹھے: "اے ساریہ! پہاڑ کی طرف ہو جاؤ۔" مسلمانوں کے لشکر کے سپہ سالار نے حضرت عمر کی آواز سن کی اپنے لشکر کو گھات میں بیٹھے دشمنوں سے بچا لیا۔

حضرت محی الدین بن عربی، مولانا جلال الدین رومی، امام ربانی، مشتاق افندی رحمہم اللہ اور ان جیسے دیگر اولیائے کرام نے غیب سے متعلق بہت سی باتیں بتائیں، جنہیں زمانے نے سچ ثابت کر دکھایا۔ ان حضرات کے دل اپنے رسول محمد ﷺ کے ساتھ منسلک ہوتے اور چراغ نبوت سے فیض یاب ہوتے۔

جب آپ ﷺ کے بعض شاگردوں کا یہ حال ہے کہ انہیں اللہ رب العزت کی رحمت کی بادِ نسیم اور لطف و عنایت کا اس قدر قرب اور غیب کی بعض باتوں کا علم حاصل ہے تو اندازہ لگایئے کہ خود رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہو گا جو ساری امت پر بھاری ہیں، لہٰذا بطور معجزہ آپ ﷺ کا غیب کی بہت سی باتوں پر مطلع ہونا کچھ بعید نہیں۔

معتبر کتب حدیث میں آپ ﷺ کے تین سو کے قریب معجزات مذکور ہیں۔ آپ ﷺ کی بیان کردہ اکثر پیش گوئیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ اس مقام پر غیب سے متعلق تمام خبروں کی بجائے چند ایک کو بطور نمونے کے بیان کیا جائے گا۔ مذکورہ بالا غیب کی خبروں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- دورِ نبوی سے متعلق پیشین گوئیاں

۲- مستقبل قریب یا بعید سے متعلق پیش گوئیاں

۳- ایسی باتیں جن کی آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی، لیکن جدید علوم کی روشنی میں ان کو سمجھا گیا

پہلی قسم: دورِ نبوی سے متعلق غیب کی خبریں

۱- زیرِ نظر حدیث متعدد کتب حدیث خاص طور پر صحیحین میں مذکور ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگ نبی کریم ﷺ سے بار بار سوال پوچھتے۔ ایک دن نبی کریم ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: ''تم مجھ سے جو بات بھی پوچھو گے میں تمہیں اس کے بارے میں بتا دوں گا۔'' میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو تمام حاضرین مجلس منہ چھپائے رو رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک آدمی نے جسے اس کے باپ کی بجائے کسی اور کی طرف منسوب کیا جاتا تھا پوچھا: ''اے اللہ کے نبی! میرا باپ کون ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہارا باپ حذافہ ہے۔'' اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہیں۔ ہم فتنوں کی برائی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔'' اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''خیر و شر کے حوالے سے آج کا دن بالکل منفرد ہے، آج جنت و دوزخ میرے سامنے لائی گئیں یہاں تک کہ میں نے انہیں دیوار سے بھی قریب دیکھا۔'' (86)

۲- امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام نسائی نے حضرت انس سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر میں قتل ہونے والے کفار کے قتل ہونے کی جگہیں ہمیں جنگ سے ایک دن پہلے ہی دکھا دی تھیں۔ آپ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: ''کل ان شاء اللہ اس جگہ فلاں کافر قتل ہوگا...'' اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے وہ کافر نبی کریم ﷺ کی بیان کردہ جگہوں پر ہی قتل ہوئے۔ (87)

چنانچہ جو کفار اپنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لائے تھے ان کے جسم غزوہ بدر کے دن آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے رہے تھے۔ آپ ﷺ کی پیش گوئیاں سو فیصد درست ثابت ہوتی تھیں۔

۳- امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی مسند میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے درج ذیل واقعہ نقل کرتے ہیں: "... جب میں مدینے کے قریب پہنچا تو میں نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا، اپنے صندوق میں سے کپڑوں کا جوڑا نکال کر پہنا اور پھر مدینے میں داخل ہوا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو لوگ مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے اپنے ہمنشیں سے پوچھا: "اے اللہ کے بندے! کیا رسول اللہ ﷺ نے میرا تذکرہ کیا ہے؟" اس نے کہا: "آپ ﷺ نے تمہارا بہت ہی اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ خطبے کے دوران آپ ﷺ ارشاد فرمانے لگے: "اس دروازے سے یا آپ نے ارشاد فرمایا اس درے سے یمن کا بہترین شخص داخل ہوگا، جس کی صورت فرشتوں جیسی ہوگی۔"(88)

۴- ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں درج ذیل واقعہ نقل کیا ہے:

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے آگے آگے چلے آ رہے تھے۔ ابوسفیان نے آپ ﷺ کو دیکھ کر دل میں سوچا: "اگر میں ایک بار پھر اس شخص سے لڑائی کروں تو کیسا رہے گا؟" رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور ارشاد فرمایا: "تب اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کر دیں گے۔" اس پر ابوسفیان نے کہا: "میں اپنے خیال پر اللہ کے حضور توبہ واستغفار کرتا ہوں۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فتح مکہ کے بعد ایک دن ابوسفیان بن حرب بیٹھے تھے کہ ان کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر میں محمد کے خلاف لشکر کشی کروں تو کیسا ہے؟ وہ یہ بات سوچ ہی رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے کندھوں کے درمیان ہاتھ مارا اور ارشاد فرمایا: "تب اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کر دیں گے۔" انہوں نے سر اٹھایا تو رسول اللہ ﷺ کو اپنے سامنے پایا۔ یہ دیکھ کر کہنے لگے: "مجھے ابھی تک آپ کے رسول ہونے کا یقین نہ آیا تھا۔"(89)

اس موقع پر عمیر بن وہب کا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں، جنہیں دورِ جاہلیت میں "شیطان" اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد "راہب الاسلام" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس واقعے کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن عمیر مکہ مکرمہ میں صفوان بن امیہ کے پاس بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان یہ طے ہوا کہ عمیر بن وہب مدینے جا کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں گے اور موقع ملتے ہی (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیں گے، جس کے عوض صفوان انہیں اونٹوں کی ایک خاص مقدار ادا کرے گا۔

عمیر نے اپنی تلوار تیز کی اور مدینے کی راہ لی۔ جب وہ مدینے پہنچے تو انہوں نے صحابہ کرام سے کہا میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ صحابہ کرام انہیں مسجد نبوی میں لے گئے، تاہم صحابہ کرام کو ان پر اطمینان نہ تھا اور انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں عمیر رسول

اللہ ﷺ کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں، اس لئے وہ رسول اللہ ﷺ کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے عمیر سے مدینے آنے کی غرض پوچھی تو انہوں نے کہا کہ میں اسلام قبول کرنے لئے حاضر ہوا ہوں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصدیق نہ کی اور فرمایا کہ میں تمہیں تمہارے آنے کی غرض بتاتا ہوں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں ان کے اور صفوان کے درمیان طے ہونے والے معاملے کے بارے میں بتایا، یہ سن کر عمیر ششدر رہ گئے اور آپ ﷺ کے قدموں میں گر کر صدقِ دل سے اسلام لے آئے۔[90] اس کے بعد انہوں نے عبادت اور مجاہدہ نفس میں وہ مقام حاصل کیا کہ انہیں ''راہب الاسلام'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

عمیر اور صفوان کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی تھی۔

دوسری قسم۔ مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں

الف: مستقبل قریب کے بارے میں پیش گوئیاں

بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے اپنی ایک ران پر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دوسری ران پر بٹھاتے اور پھر ہم دونوں کو اپنے سینے سے لگا کر فرماتے: ''اے اللہ! ان پر رحم فرما کیونکہ میں بھی ان پر شفقت کرتا ہوں۔[91]

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب جوان ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی زندگی کے آخری ایام میں رومیوں سے جنگ کے لئے تیار کئے گئے لشکر کی قیادت سونپی۔ رسول اللہ ﷺ آپ کو اس سرزمین کی طرف بھیج رہے تھے، جہاں چند سال پہلے ان کے والد زید بن حارثہ شہید ہوئے تھے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی بیماری کو دیکھا تو مدینے میں ہی انتظار کرنے کو ترجیح دی اور آپ ﷺ کی وفات تک روانہ نہ ہوئے۔[92]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے مدینے کے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا: ''کیا جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں تم بھی دیکھ رہے ہو؟ مجھے تمہارے گھروں پر بارش کے قطروں کی طرح گرنے والے فتنے دکھائی دے رہے ہیں۔''[93]

رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مدینے کے گلی کوچے فتنوں سے بھر گئے۔ حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم

انہیں فتنوں کے نتیجے میں شہید ہوئے، گویا یہ فتنے زبانِ حال سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے رہے تھے۔

۱۔ فتنے

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تمام عمر فتنوں سے خائف رہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسجد میں صحابہ کی جماعت کے ہمراہ تشریف فرما تھے کہ آپ نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا: ''فتنوں سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی حدیث تم میں سے کسے اچھی طرح یاد ہے؟'' میں نے اپنا نام پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم بہت دلیر ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں کیا ارشاد فرمایا تھا؟'' میں نے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آدمی کی آزمائش (فتنہ) اس کی ذات، اہل وعیال، مال واسباب اور پڑوسیوں کی وجہ سے ہوتی ہے، جس کا کفارہ نماز، روزے، زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے اعمال کے ذریعے ہو جاتا ہے۔'' یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے اس قسم کے فتنوں کے بارے میں نہیں پوچھا۔ میرا مقصود تو ایسے فتنوں کے بارے میں پوچھنا ہے، جو سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں ماریں گے۔'' میں نے جواب میں کہا: ''اے امیر المؤمنین! آپ کو ان فتنوں سے کیا اندیشہ؟ کیونکہ آپ کے اور ان کے درمیان ایک بند دروازہ حائل ہے۔'' حضرت عمرؓ نے پوچھا: ''یہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا۔'' میں نے کہا: ''نہیں، بلکہ توڑا جائے گا۔'' اس پر آپ نے فرمایا: ''ایسے دروازے کا ہمیشہ بند نہ رہنا ہی بہتر ہے۔''

راوی کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت حذیفہ سے پوچھا: ''کیا حضرت عمر جانتے تھے کہ دروازے سے کون مراد ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا: ''ہاں وہ اس بارے میں ایسے جانتے تھے جیسے رات سے پہلے دن ہوتا ہے۔ میں نے انہیں کوئی مبہم اور پیچیدہ حدیث تو نہیں سنائی تھی۔'' راوی کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھنا چاہا کہ دروازے سے کون مراد تھا؟ اس مقصد کے لئے ہم نے مسروق کا انتخاب کیا۔ انہوں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: ''دروازے سے حضرت عمر ہی مراد تھے۔''(94)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ آپ کے کان فتنوں سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی حدیث پہلے ہی سن چکے تھے۔ جب اس فتنے کا وقت مقرر آیا تو یہ رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی

کے عین مطابق ظاہر ہوا۔ فارس کے ایک مجوسی نے حضرت عمر کو شہید کر دیا۔ اس واقعے سے ملت اسلامیہ کی وحدت کو شدید نقصان پہنچا۔ یوں لگتا ہے کہ دشمنانِ اسلام نے بڑے غور و خوض کے بعد اپنے ہدف کا تعین کیا تھا اور پھر اس ہدف کو پوری طرح حاصل بھی کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سرزمینِ اسلام پر فتنوں کا طوفان امڈ آیا۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کے واقعات مسلمانوں کے لئے بہت بڑی آزمائش اور مصیبت تھے، لیکن اگر ایک اور پہلو سے دیکھیں تو یہ نبی کریم ﷺ کی صداقت کی گواہی اور دلیل بھی ہیں۔

۲- نصرتِ خداوندی

بخاری اور سنن ابی داؤد میں خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کعبے کے سائے میں چادر اوڑھے بیٹھے تھے۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے شکوے کے انداز میں عرض کی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے مدد و نصرت کی دعا کیوں نہیں فرماتے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں کو زمین میں گڑھے کھود کر ان میں گاڑ دیا جاتا اور ان کے سر پر آرا چلا کر ان کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ دین کو نہ چھوڑتے تھے، نیز لوہے کے کنگھوں سے ان کے گوشت پوست کو ہڈیوں سے جدا کر دیا جاتا، لیکن وہ دین سے دستبردار نہ ہوتے۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے وعدۂ نصرت کو ضرور پورا فرمائیں گے یہاں تک کہ ایک مسافر صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے سوائے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اپنی بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کے اندیشے کے کوئی فکر دامن گیر نہ ہوگی، لیکن تم جلد باز لوگ ہو۔''(95) آپ ﷺ کی یہ پیش گوئی بھی سو فیصد درست ثابت ہوئی۔

۳- تم مجھ سے سب سے پہلے ملو گی

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام کو یاد کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''ایک دفعہ تمام ازواجِ مطہرات نبی کریم ﷺ کے پاس موجود تھیں۔ اسی دوران حضرت فاطمہ اندر داخل ہوئیں۔ وہ بالکل رسول اللہ ﷺ کے انداز سے چلتی تھیں۔ جب آپ ﷺ نے انہیں دیکھا تو انہیں خوش آمدید کہہ کر اپنی دائیں طرف بٹھایا۔(96) آپ ﷺ نے ان کے کان میں کوئی بات کہی جس پر وہ رونے لگ پڑیں پھر آپ ﷺ نے دوبارہ ان کے کان میں کوئی بات کہی جس پر وہ ہنسنے لگیں۔ جب ہم نے حضرت فاطمہؓ سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے پہلے مجھے بتایا کہ اس بیماری میں میری روح قبض ہو جائے گی۔ یہ سن کر میں رو پڑی پھر آپ ﷺ نے مجھے بتایا کہ میرے اہل بیت میں سے سب سے پہلے تم مجھ سے آملو گی تو میں اس پر خوشی سے ہنس پڑی۔(97)

گویا حضرت فاطمہ کی آہ و بکاہ میں آپ ﷺ کی وفات کے بعد کا غم پوشیدہ تھا:

ماذاعلى من شم تربة أحمدا | ألا يشم مدى الزمان غواليا

صبت على مصائب لو أنها | صبت على الأيام عدن لياليا(98)

''جس نے احمد (ﷺ) کی قبر مبارک کی خوشبو سونگھ لی اگر وہ عمر بھر کوئی خوشبو نہ سونگھے تو اسے کوئی پرواہ نہیں۔ مجھ پر غموں کے اتنے پہاڑ ٹوٹے کہ اگر وہ دنوں پر ٹوٹتے تو وہ بھی رات میں تبدیل ہو جاتے۔''

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد چھ ماہ کے قلیل عرصے میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ سے جاملیں۔ ان کی وفات رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی صداقت کی دلیل تھی۔(99)

۴- صلح

صحاحِ ستہ کے اکثر مصنفین نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ ممبر پر تشریف فرما تھے کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرما کر ارشاد فرمایا: ''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح فرمائیں گے۔''(100)

یقیناً حضرت حسنؓ خود بھی شریف النفس انسان تھے اور شریف النفس انسان کے بیٹے اور رسول اللہ ﷺ کے نواسے تھے۔ جب آپ خلیفہ بنائے گئے تو امت مسلمہ کو انتشار سے بچانے کے لئے خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ آپؓ نے اپنے کردار سے ثابت کر دکھایا کہ آپؓ خود بھی سردار ہیں اور سردار کی اولاد ہیں، چنانچہ ابھی پچیس تیس سال بھی نہ گزر پائے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد امویوں نے حضرت حسنؓ کو اپنے مدمقابل پایا، لیکن چونکہ آپ صلح جو اور امن پسند انسان تھے، اس لئے آپ مسلمانوں کے دو لشکروں کے درمیان صلح کرانے اور مسلمانوں کو بہت بڑے فتنے سے بچانے کے لئے اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو گئے۔(101)

شاعر نے آپ کے بارے میں بجا طور پر کہا ہے:

كريم بن كريم بن كريم | و جده خير الأنام

''آپ شریف بن شریف بن شریف ہیں اور آپ کے نانا جان افضل المخلوقات ہیں۔''

جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ ناسمجھ بچے تھے۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی مراد سمجھی ہوگی اور نہ ہی اشارہ، یعنی آپ نے بعد میں جو کردار ادا کیا وہ اس لئے نہیں ادا کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا تھا، بلکہ چونکہ رسول اللہ ﷺ آپ کے مستقبل کے کردار سے واقف تھے، اس لئے آپ ﷺ نے اس کی پیش گوئی فرمائی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے کردار کے ذریعے اپنے نانا جان کی بات کو سچ ثابت کر دکھایا اور زبانِ حال سے آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی دی۔

۵- وہ ایک صدی جیئے گا

حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے سر پر دست شفقت رکھا اور ارشاد فرمایا: "یہ لڑکا ایک صدی جیئے گا۔" چنانچہ وہ پورے سو سال زندہ رہے۔ ان کے چہرے پر بڑا سا تل تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب تک اس کے چہرے پر تل رہے گا اس وقت تک اسے موت نہ آئے گی۔" صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ وہ سو سال زندہ رہے اور ان کے چہرے سے تل ختم ہوگیا۔(102)

جس طرح نبی کریم ﷺ آیت مبارکہ ﴿وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ﴾ [الضحیٰ: ٤] "اور آخرت تمہارے لئے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے۔" کے بموجب ہر لحظہ روحانی ترقی کے مدارج طے کرتے رہتے اور آپ ﷺ کا ہر آنے والا دن آپ کے گزشتہ دن سے بہتر ہوتا کیونکہ آپ ایک دن میں سو سو بار استغفار کرتے،(103) اسی طرح جوں جوں زمانہ مستقبل کے بارے میں آپ ﷺ کی پیش گوئیوں کی صداقت سے پردہ اٹھاتا جا رہا ہے توں توں آپ ﷺ پر امت مسلمہ کے ایمان اور آپ ﷺ کے بارے میں اس کی آگہی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور وہ زبانِ حال سے آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے رہی ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم نبی کریم ﷺ کی چند ایسی پیش گوئیوں کا تذکرہ کریں گے جن کا ظہور ہمارے دور سے قریب تر زمانے میں ہوا ہے یا ابھی تک ہمیں ان کے ظہور کا انتظار ہے۔

۶- غزوہ خندق کے موقع پر آپ ﷺ کی پیش گوئیاں

حدیث کی تقریباً تمام کتابیں مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنے کے دوران پیش آنے والے واقعے کا تذکرہ کرتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ خندق کی کھدائی میں حصہ لیتے اور درج ذیل شعر پڑھتے:

اللهم لاعيش الاعيش الآخرة فاغفر للأنصار والمهاجرة(104)

اے اللہ زندگی تو بس آخرت ہی کی زندگی ہے، انصار و مہاجرین سب کی مغفرت فرمادے۔

اس کے جواب میں صحابہ کرام کہتے:

والله لو لا أنت ما اهتدينا و لا تصد قنا و لا صلينا

فأنزلن سكينة علينا و ثبت الأقدام ان لاقينا(105)

''خدا کی قسم! اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ہدایت نہ پاتے، زکوۃ ادا کرتے اور نہ نماز قائم کرتے۔ (اے اللہ) ہم پر سکینہ نازل فرما اور دشمن سے سامنے کے وقت ہمیں ثابت قدم رکھنا۔''

حضرت براء بن عازب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خندق کھودنے کا حکم ارشاد فرمایا تو خندق کھودتے ہوئے ایک بہت بڑی اور سخت چٹان راستے میں آگئی، جس پر کدال کی ضرب کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر دی۔ جب آپ ﷺ نے اسے دیکھا تو کدال ہاتھ میں لی اور بسم اللہ پڑھ کر اس پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کا تیسرا حصہ ٹوٹ گیا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے شام کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئیں ہیں۔ خدا کی قسم! میں شام کے سرخ محلات دیکھ رہا ہوں۔'' اس کے بعد آپ نے دوسری ضرب لگائی تو چٹان کا ایک اور تہائی حصہ ٹوٹ گیا۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے ملک فارس کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئی ہیں۔ خدا کی قسم! میں مدائن کے سفید محل کو دیکھ رہا ہوں۔'' اس کے بعد آپ نے بسم اللہ پڑھ کر تیسری چوٹ لگائی جس سے چٹان کا بقیہ حصہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے یمن کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئیں۔ خدا کی قسم! میں اس وقت یہاں سے صنعاء کے دروازے دیکھ رہا ہوں۔''(106)

اس پیش گوئی کے کچھ ہی سال بعد اللہ تعالیٰ نے سعد بن ابی وقاص اور خالد بن ولید جیسے سپہ سالاروں کے ذریعے ان تمام علاقوں کو فتح کرا دیا اور ان کی چابیاں معنوی طور پر رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی ایک اور دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کو پورا ہونا ہی تھا اور اگر بالفرض رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی پوری نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تکذیب سے بچانے کے لئے اس پیش گوئی کو پورا فرما دیتے... اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اپنے ایک صحابی حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے

میں ارشاد فرماتے ہیں: ''اگر یہ اللہ کی قسم اٹھالے تو اللہ اس کی قسم کو پورا فرمادیں گے۔''(107)

یعنی اگر حضرت براء بن مالک کسی مشکل کام کی قسم اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرمادیں گے، یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام فتح کی خاطر حضرت براء کو لشکر میں آگے آگے رکھتے۔(108) جب ایک صحابی کو یہ مقام حاصل ہے تو رسول اللہ ﷺ کو کیونکر حاصل نہ ہوگا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان علاقوں کی فتح کا یقینی علم رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمادیا تھا، جس کی بنیاد پر آپ نے پیش گوئی فرمائی۔

۷- امن وامان اور تونگری کو خوشخبری

حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے (عدی حاتم طائی گے فرزند تھے وہ پہلے عیسائی تھے جن کی ملاقات حضور ﷺ سے ہوئی انہوں نے نجات پائی) کہ ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھا کہ ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور فقر وفاقہ کی شکایت کی پھر ایک دوسرا شخص آیا اور ڈاکہ زنی کی شکایت کرنے لگا۔ آپ ﷺ نے مجھے مخاطب کرکے ارشاد فرمایا: ''اے عدی! تم نے حیرہ دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کی: ''نہیں! لیکن مجھے اس کے بارے میں علم ہے۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں لمبی عمر دی تو تم دیکھو گے کہ ایک پردہ نشین عورت حیرہ سے چلے گی اور کعبہ کا طواف کرے گی، لیکن اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔'' میں نے دل میں سوچا کہ اس وقت قبیلہ طے کے ڈاکو کہاں چلے جائیں گے، جنہوں نے ہر طرف فتنہ وفساد برپا کررکھا ہے۔ آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: ''اگر تمہاری زندگی نے وفا کی تو تم کسریٰ کے خزانوں کو فتح ہوتے دیکھو گے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا: ''کیا آپ کی مراد کسریٰ بن ہرمز سے ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! کسریٰ بن ہرمز اور اگر زندگی نے تمہارا ساتھ دیا تو تم دیکھو گے کہ ایک آدمی ہاتھ میں سونا چاندی لے کر نکلے گا لیکن اسے کوئی ایسا شخص نہ ملے گا جو اسے اس سے قبول کرلے۔''

ابن عدی کہتے ہیں: ''میں نے اس پردہ نشین عورت کو دیکھا ہے، جس نے حیرۃ سے چل کر کعبہ کا طواف کیا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا اور میں ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانوں کو فتح کیا تھا اور اگر تمہاری زندگی نے ساتھ دیا تو تم ابوالقاسم رسول اللہ ﷺ کی تیسری پیش گوئی کو بھی پورا ہوتا ہوا ضرور دیکھو گے۔''(109)

حضرت عدی نے تیسری پیش گوئی کو پورا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، تاہم حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ خلافت میں یہ پیش گوئی بھی پوری ہوگئی۔ اس وسیع وعریض سلطنت میں تقسیم دولت

کا نظام اس قدر عادلانہ اور منظم تھا کہ اس میں ایک بھی فقیر باقی نہ رہا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ دورِ حاضر میں امریکہ اور مغربی ممالک کا معیارِ زندگی اس سلطنت کے معیارِ زندگی سے بدرجہا کم تر ہے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا، مزید برآں ان ممالک میں تقسیمِ دولت کا نظام قطعاً غیر منصفانہ اور غیر متوازن ہے، کیونکہ ان میں ایک طرف انتہائی امیر خاندان ہیں تو دوسری طرف انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں زندگی گزارنے والے طبقات بھی موجود ہیں، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ خلافت میں تقسیم دولت کا غیر متوازن اور ظالمانہ نظام موجود نہ تھا۔(110)

۸- حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت

مسلمان مسجد نبوی کی تعمیر میں مصروف تھے۔ ہر ایک کام میں لگا ہوا تھا۔ بعض لوگ اینٹیں بنا رہے تھے، کچھ لوگ انہیں منتقل کر رہے تھے اور دیگر بعض تعمیر کا کام کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے ساتھ کام میں شریک تھے۔ باقی لوگ ایک ایک اینٹ اٹھا رہے تھے، لیکن حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما دو اینٹیں اٹھائے رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''تم نے دو اینٹیں کیوں اٹھائی ہوئی ہیں؟'' حضرت عمار نے عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں ثواب کا امیدوار ہوں۔'' اس پر آپ ﷺ ان کے کندھوں اور کمر سے مٹی جھاڑتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''سنو عمار! تمہیں باغی جماعت قتل کرے گی۔''(111) یا یوں ارشاد فرمایا: ''خوش ہو جاؤ! تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔''(112) نبی کریم ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب کو بتا دیا تھا کہ عمار ایک باغی گروہ کے ہاتھوں شہید ہوں گے۔

جنگِ صفین میں حضرت عمار حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی فوج کی صفوں میں شامل تھے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی اس شہادت کو فریق مخالف کے باغی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔(113) یہ درست ہے کہ اس معرکے میں ایک جلیل القدر صحابی شہید ہوئے، لیکن ان کے خون کا زمین پر گرنے والا ایک ایک قطرہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے رہا تھا۔

معزز قارئین! اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر کوئی انسان ایسی باتوں کے بارے میں کیسے بتا سکتا ہے...؟ آج کل مستقبل کے بارے میں بعض تصوراتی فلمیں بنائی جا رہی ہیں، لیکن یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں، کیونکہ ایسی فلمیں بنانے والوں کے پاس مقدمات اور ابتدائی معلومات ہوتی ہیں، جنہیں تخمین و اندازے سے واقعات کے ساتھ مربوط کر کے اور آپس میں ملا کر کچھ نہ کچھ پیش گوئیاں کی

جاسکتی ہیں، لیکن حضور ﷺ نے جن امور کے بارے میں پیش گوئیاں کی تھیں ان کے مقدمات تھے اور نہ ہی ابتدائی معلومات۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی عبقری کیوں نہ ہو اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئیوں کے عشرِ عشیر کی بقدر پیش گوئی کرنا بھی ممکن نہیں۔ چونکہ عقل کا ایک دائرہ کار ہوتا ہے، جس سے باہر نکل کر وہ کام نہیں کرسکتی، اس لئے اس قسم کی معلومات کا علم وحی اور غیبی الہام کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کو خود بخود علم نہ ہوتا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے یہ معلومات حاصل ہوتیں، اسی لئے زمانہ رسول اللہ ﷺ کی ہر پیش گوئی کی تصدیق کرتا چلا آرہا ہے۔

۹- دائرہ اسلام سے نکلنے والی جماعت

ایک دن رسول اللہ ﷺ مالِ غنیمت تقسیم کررہے تھے کہ آپ کے پاس ایک ایسا شخص آیا، جس کی آنکھیں دھنسی ہوئیں، پیشانی ابھری ہوئی، داڑھی گھنی، رخسار ابھرے ہوئے اور سر منڈھا ہوا تھا گویا وہ مستقبل کے کسی گروہ کا نقشہ پیش کررہا تھا۔ اس نے بڑی بے حیائی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرکے کہا: ''اے محمد! انصاف قائم کرو۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا تیرا ناس کرے! اگر میں انصاف نہ کروں گا تو پھر کون کرے گا؟ اگر میں انصاف نہ کروں گا تو تو ناکام و برباد ہوجائے گا۔''(114)

روایت میں مذکور الفاظ ''خبت و خسرت'' کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے:

الف: مخاطب کے صیغے کے ساتھ: ''خبتَ و خسرتَ''

دوم: متکلم کے صیغے کے ساتھ: ''خبتُ و خسرتُ''

پہلی روایت کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ اگر کسی امت کا نبی انصاف پسند نہ ہو تو امت کیسے انصاف سیکھے گی؟ ایسی قوم ظالمانہ ماحول میں پروان چڑھے گی، جو سراسر ناکامی و بربادی ہے۔

دوسری روایت کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ میں نبی، رسول اور رحمت للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس لئے یہ ممکن نہیں کہ میں انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کروں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آدابِ گفتگو سے ناآشنا اس شخص کی تادیب کی غرض سے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''آپ مجھے اس کی گردن اڑانے کی اجازت دیجئے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے چھوڑ دو۔ اس کے ایسے ساتھی پیدا ہوں گے، جن کی نماز روزے کے مقابلے میں تم اپنی نماز روزے کو ہیچ سمجھو گے۔ وہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ وہ دین

سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے پار ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے پھل کو دیکھا جائے تو اس پر کوئی چیز نظر نہ آئے گی پھر اس کے پٹھے کو دیکھا جائے تو وہاں بھی کچھ نہ ملے گا، اگر اس میں لگائی جانے والی لکڑی کو دیکھا جائے تو وہاں بھی کوئی چیز نظر نہ آئے گی اور اگر اس کے پر کو دیکھا جائے وہاں بھی کچھ نہ ملے گا، حالانکہ وہ تیز گندگی اور خون میں سے گزر چکا ہے۔ ان کی علامت ایک سیاہ شخص ہوگا، جس کا ایک بازو عورت کے پستان یا گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہوگا اور حرکت کر رہا ہوگا۔ وہ لوگ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کے زمانے میں نکلیں گے۔'' (115)

ابوسعید خدری فرماتے ہیں: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی اور حضرت علی بن ابی طالب نے ان سے جنگ کی اور میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا صفات کے حامل شخص کی تلاش کا حکم دیا، چنانچہ اسے تلاش کر کے لایا گیا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ بالکل رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ اوصاف کے مطابق تھا۔ (116) چنانچہ خوارج دین سے تیر کی طرح نکل گئے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جہاد کیا۔ (117)

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''تم میں سے بعض لوگ قرآنِ کریم کی تفسیر کی بنیاد پر ایسے ہی جہاد کریں گے جیسے میں نے قرآن کریم کی تنزیل کی بنیاد پر جہاد کیا۔'' (118)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب مجھ پر قرآن نازل ہوا تو لوگ میرے خلاف کھڑے ہو گئے جس کے نتیجے میں میں نے ان کے خلاف جہاد کیا، اسی طرح ایک دور ایسا آئے گا جب قرآنِ کریم کی غلط تفسیر و تشریح کی جائے گی اس وقت تم (حضرت علیؓ) ان لوگوں کے خلاف جہاد کرو گے، چنانچہ کتب سیرت میں ذکر کردہ مذکورہ بالا پیش گوئی کے مطابق واقعات پیش آئے۔

یوں لگتا ہے کہ دھنسی ہوئی آنکھوں اور ابھری ہوئی پیشانی والے شخص کی تخلیق اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدسلوکی کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا اظہار تھا... لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اسے اس پر ثواب ملے گا، کیونکہ جس طرح شیطانی وساوس کا مقابلہ کر کے مؤمن ثواب پاتا ہے، اگرچہ اس کا سبب شیطان بنتا ہے، لیکن اسے اس پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملتا اسی طرح چونکہ وہ شخص رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے اظہار کا سبب ایک ناپسندیدہ اور غیر مؤدب طریقے سے بنا ہے، اس لئے اسے بھی اس پر کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا۔

۱۰- حضرت ام حرامؓ اور بحری سفر

حضرت ام حرام بنت ملحان رسول اللہ ﷺ کی رضاعی خالہ تھیں اور ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ کی والدہ کی قریبی رشتہ دار تھیں، اس اعتبار سے بھی وہ آپ ﷺ کی خالہ ہی ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ اکثر ان سے ملنے جایا کرتے اور بعض اوقات ان کے ہاں آرام بھی فرماتے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ ان کے ہاں آرام فرما کر اٹھے تو مسکرا رہے تھے۔ حضرت ام حرام نے آپ ﷺ سے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میرے سامنے میری امت کے ایسے لوگ پیش کئے گئے جو اس سبز سمندر پر شاہانہ انداز میں جا رہے تھے۔'' حضرت ام حرام نے عرض کی: '' آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل فرما دے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی اور دوبارہ سو گئے اور پھر پہلے کی طرح بیدار ہو کر مسکرائے اور خواب بیان کیا۔ حضرت ام حرام نے پھر دعا کی درخواست کی۔ اس دفعہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم پہلے گروہ میں سے ہو۔''(119)

چنانچہ حضرت ام حرام اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حضرت معاویہ کی قیادت میں مسلمانوں کے پہلے بحری لشکر کے ساتھ جزیرہ قبرص کی طرف روانہ ہوئیں۔ جنگ سے واپسی پر آپ شام کے ساحل پر اتریں آپ کے پاس سواری لائی گئی، لیکن آپ اس پر سے گر پڑیں اور انتقال کر گئیں۔(120)

مسلمان اس وقت سے آج تک ان کی قبر پر جاتے ہیں اور زار و قطار روتے ہوئے ان کے لئے دعا کرتے ہیں، لیکن ان کی قبر پر بہایا جانے والا ایک ایک آنسو رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے رہا ہے۔ زمانے اور واقعات نے آپ ﷺ کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ جزیرہ قبرص اور حضرت ام حرام کی قبر رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے شاہد عدل ہیں۔

جب بھی مناسب وقت آتا ہے زمانہ رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئیوں کی صداقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے، اسی لئے ہم ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت و امانت کی گواہی دیتے ہیں اور ہمارے جسم کا ذرہ ذرہ پکارتا ہے: ''یا رسول اللہ ﷺ آپ نے سچ فرمایا۔''

ہمارے الفاظ ان جذبات کو کماحقہ تعبیر کرنے سے عاجز ہیں، لیکن یہ ہر مومن کے ضمیر کی آواز ہے، جو اس قدر بلند ہے کہ اسے نہ سننا یا اس کی طرف بے التفاتی انکار کے مترادف ہے۔

ب: مستقبل بعید سے متعلق پیش گوئیاں

۱۔ بنوقنطوراء

رسول اللہ ﷺ نے خبر دار کیا تھا کہ عنقریب ایک ایسی قوم کا ظہور ہوگا، جو سارے عالم اسلام پر غالب آ جائے گی۔ حدیث نبوی میں ہے: ''قیامت کے نزدیک بنوقنطوراء کا ظہور ہوگا، جن کے چہرے چوڑے، آنکھیں چھوٹی اور ناک چپکے ہوئے ہوں گے۔''(121)

کتب تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم تاتاری تھے۔ درحقیقت عالم اسلام کو ماضی میں دو المناک حادثات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک حادثہ اندلس میں فرڈینیڈ (Ferdinand) کے ہاتھوں پیش آیا، جو مغربی بربریت کی شرمناک مثال ہے۔ اس حادثے میں انسانوں کو قتل اور کتب خانوں کو جلا دیا گیا۔ دوسرا حادثہ تاتاریوں کی یلغار کی صورت میں پیش آیا، جس کے اثرات اناطولیہ، شام اور مصر تک پہنچے۔ اس یلغار نے ان ممالک کی تہذیب و تمدن کے تمام نشانات مٹا کر انہیں کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے بارے میں بہت فکر مند رہتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اسے اس قسم کے حادثوں سے پہلے ہی باخبر کر دیا تھا۔ گویا آپ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: ''جب یہ امت سزا کی مستحق ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کی سرزنش کے لیے اس پر ظالم لوگ مسلط کر دیں گے۔ وہ ظالم لوگ خدائی کوڑے کا کام دیں گے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس امت کو سزا دیں گے، لیکن پھر خدا ان ظالموں سے بھی انتقام لے گا، یعنی ظالموں کو خوش نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ابتدا میں انہیں مسلمانوں پر مسلط فرماتے ہیں، لیکن پھر ان کی زبردست گرفت بھی فرماتے ہیں۔'' چونکہ آپ ﷺ سراپا رحمت و شفقت تھے، اس لیے آپ ﷺ نے انجام بد اور قہر خداوندی کا موجب بننے والے کاموں سے اپنی امت کو خبر دار کیا۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں آپ ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور زمانے نے آپ ﷺ کی سچائی اور نبوت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

۲۔ فتح استنبول (قسطنطینہ)

حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو بتا دیا تھا کہ وہ عنقریب قسطنطنیہ کو فتح کرے گی، چنانچہ حدیث نبوی میں ہے: ''تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کرو گے۔ اس کا امیر کیا خوب امیر ہوگا اور وہ لشکر کیا خوب لشکر ہوگا۔''(122)

اس بشارت کا مصداق بننے کے لیے ہر دور کے نامور حکمرانوں اور سپہ سالاروں نے استنبول کو فتح کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ استنبول تک آ کر ناکام واپس لوٹ جاتے۔ جلیل القدر صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ جن کی قبر استنبول کی سرزمین کے لیے سرمایۂ افتخار ہے، بہت سے لوگوں کے استنبول کی فصیل تک آنے اور پھر ناکام لوٹ جانے پر گواہ ہیں۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ مجھے بعض ایسی باتیں بار بار دہرانی پڑتی ہیں، جنہیں سبھی جانتے ہیں۔ میں اسے وقت کا ضیاع سمجھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں یہاں دو باتوں کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں۔

''اولو باطلہ حسن'' جو فتح استنبول کے دن اس کی فصیل پر چڑھ گئے تھے، کوئی عام سپاہی نہ تھے، بلکہ ''مدرسہ اندرون'' کے فاضل تھے، جس کا شمار اس دور کے اعلیٰ ترین مدارس میں ہوتا تھا، نیز وہ ''سلطان محمد فاتح'' کے ہم سبق بھی تھے۔ استنبول کے پہلے قاضی ''خضر جلبی''، ''اولو باطلی حسن'' اور ''الفاتح الکبیر محمد الثانی'' تینوں نے اکھٹے تعلیم پائی، اکھٹے پروان چڑھے اور ایک ہی حلقہ درس میں شرکت کی تھی۔

''اولو باطلہ حسن'' استنبول کی فصیل پر چڑھ گئے اور زخموں سے چھلنی ہونے کے باوجود فصیل پر عثمانی پرچم لہرانے میں کامیاب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد محمد بھی ان کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ زمین پر پڑے اس عظیم ہیرو کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ رہی ہے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا: ''حسن! تمہارے ہونٹوں پر یہ مسکراہٹ کیسی ہے؟'' انہوں نے جواب میں کہا: ''رسول اللہ ﷺ یہاں ٹہل رہے تھے، میں نے آپ ﷺ کا حسین چہرہ دیکھا ہے... یہی میری خوشی کا باعث ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس فتح کی نو صدیاں پہلے پیش گوئی فرمائی تھی... اور اس فتح کے موقع پر اس فاتح لشکر کے بہادروں کے درمیان ٹہل رہے تھے۔ اس واقعے کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ چار شخص بھی اخلاصِ قلب اور خلوصِ نیت سے خدمت دین پر کمر بستہ ہو جائیں تو وہ ضرور رسول اللہ ﷺ کی روحانیت اور برکت سے فیض یاب ہوں گے۔

استنبول کی فتح اور جلیل القدر صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اس سے پہلے شہادت رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی ایک اور دلیل اور گواہی ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری اس شہر کی فتح کی سب سے پہلے خوشخبری سننے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے جہاد کی خاطر مدینہ منورہ کو چھوڑا، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، اس دور دراز شہر تک پہنچے اور اس کی فصیل کے قریب مدفون ہونے کی وصیت کی۔ (123)

۳- وہن

رسول اللہ ﷺ نے ہمارے دور سے قریب کے واقعات و حوادث سے متعلق بھی پیش گوئیاں فرمائی تھیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''عنقریب اقوام عالم تمہارے خلاف اس طرح ایک دوسرے کو بلائیں گی جیسے کھانے والے لوگ کھانے کے برتن کی طرف ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔'' پوچھنے والے نے پوچھا: ''کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس وقت تمہاری تعداد بہت ہوگی، لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے خس و خاشاک کی مانند ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا خوف نکال دیں گے اور تمہارے دلوں میں وہن ڈال دیں گے۔'' پوچھنے والے نے پوچھا: ''وہن کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت کی ناپسندیدگی۔''(124)

اس حدیث مبارک پر سرسری غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عنقریب ایک ایسا دور آئے گا جب اقوام عالم ہمارے خلاف متحد ہو کر ایک دوسرے کو دعوت دیں گی، ہماری ظاہری و باطنی دولت و ثروت کو لوٹیں گی اور ہمارے وسائل پر پوری ڈھٹائی سے ہاتھ صاف کر کے آپس میں تقسیم کر لیں گی، ہم خود ان کے سامنے اپنا دسترخوان لگائیں گے، ان کے منہ میں نوالے دیں گے اور وہ دسترخوان پر موجود ہر چیز کو صاف کر دیں گی، لیکن ان کی بھوک پھر بھی نہ مٹے گی۔ یہ سب کچھ اس لیے پیش آئے گا کہ ہم اس وقت بلند و بالا درخت کی مانند مضبوط امت کی بجائے اس جھاگ اور میل کچیل کی مانند ہوں گے، جسے سیلاب بہا کر لے جاتا ہے۔ ایک طرف فکری اور مزاج کے اختلافات نے ہماری وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے تو دوسری طرف دنیوی منفعت اور مصالح نے ہمارے دشمنوں کی صفوں میں وحدت پیدا کر کے انہیں ہمارے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے، جس کے نتیجے میں وہ ہم پر غالب آ گئے اور ہمیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔

ماضی میں دشمن ہم سے ڈرتے تھے، کیونکہ ہم ان کی طرح موت سے نہیں ڈرتے تھے، بلکہ موت کو ہنسی خوشی گلے لگا لیتے تھے، دنیا کو بے وقعت سمجھتے تھے اور آخرت کے مقابلے میں اسے کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، لیکن اب ہم موت سے ڈرتے ہیں، دنیا سے محبت کرتے ہیں اور دنیوی زندگی کے کافروں سے بڑھ کر گرویدہ ہیں۔ وہ ہماری اس کمزوری سے واقف ہیں اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارا بری طرح استحصال کر رہے ہیں۔

سرسری نظر سے یوں لگتا ہے کہ یہ حدیث شریف صلیبی جنگوں سے متعلق ہے، لیکن اگر اس پر ذرا گہرائی سے غور و فکر کیا جائے تو یہ دورِ حاضر کے واقعات پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔

جناب ''رائف قرۃ داغ'' نے ''عاصفۃ البترول'' (پٹرولیم کی آندھی) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس کی پاداش میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس کتاب میں انہوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں ترکوں سے کیے جانے والے مکروفریب اور ان کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کیا ہے۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ دشمن کس طرح سلطنت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس کے ظاہری و باطنی مال و دولت پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ پر یہ حملہ صلیبی جنگوں سے بڑھ کر بربریت کا نمونہ تھا۔ اقوام عالم نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک دوسرے کو دعوت دی اور اس کے مال و دولت کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

ایک خاص فرقے کے لوگ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں خفیہ طور پر حکومت کا تختہ الٹنے میں مصروفِ عمل رہے، جس کے نتیجے میں وہ پاکیزہ اور درخشاں عہد خون آلود ہو گیا۔ انہی لوگوں کی ذریت نے آلِ عثمان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا اور عالم اسلام کو واحد قیادت وسیادت سے محروم کر دیا۔ وہ ہم پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے کوئی انتہائی پرتکلف دسترخوان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ شاعر محمد عاکف نے ان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"بلایا مختلفة
بعضهم من الهنود
وبعضهم من آكلي لحوم البشر
وبلایا أُخری لاأعرفها."

''مختلف قسم کی مصیبتیں ہیں،
بعض ہندوؤں کی طرف سے ہیں،
اور بعض آدم خور لوگوں کی طرف سے ہیں،
اور بعض ایسی بھی ہیں جن کا مجھے علم نہیں۔''

ان مصیبتوں نے اکٹھے ہو کر سلطنت عثمانیہ کے جسم کو نوچ ڈالا اور اس کے حصے بخرے کر کے اس کے مال و دولت کو لوٹ لیا۔ ماضی میں بھی صلیبیوں نے ایک خاص فکر سے متاثر ہو کر ہم پر حملہ کیا تھا۔ یہ اقدام یورپ کے لوگوں کے سادہ پن اور حماقت کا عکاس تھا، کیونکہ یورپ کے سادہ لوح اور دھوکے

میں مبتلا عوام یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ حضرت مریم علیہا السلام کی قبر کی حفاظت کی خاطر عالم اسلام پر لشکر کشی کر رہے ہیں، انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہم حضرت مریم علیہا السلام کی عزت و احترام ان سے بڑھ کر کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ جنت میں رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ ہوں گی، گویا ہم انہیں ام المؤمنین کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔(125) یہی وجہ ہے کہ اگر حضرت مریم علیہا السلام باحیات ہوتیں تو ہم ان کا برا چاہنے والے ہر شخص سے ان کی حفاظت کرتے۔ میری رائے یہ ہے کہ احادیث نبویہ میں موجود اشارات ایک غلط فکر اور عقیدے کی بنیاد پر وقوع پذیر ہونے والی صلیبی جنگوں کی بجائے ماضی قریب اور دورِ حاضر میں وقوع پذیر ہونے والے ان ہولناک واقعات کی طرف ہیں، جن کی تلخی آج بھی پوری شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ یورپ آج بھی ہمارے خلاف متحد ہے اور عالم اسلام آج بھی ان کے لیے تر نوالہ بنا ہوا ہے، لہٰذا چودہ سو سال پہلے کی گئی پیش گوئی پوری طرح سچی ثابت ہو رہی ہے اور ہم اس کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔

۴۔ فتنۂ اشتراکیت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مشرق کی طرف رخ کر کے ارشاد فرمایا: ''خبردار! اس طرف سے فتنہ برپا ہوگا، جہاں سے شیطان کا ''قرن'' طلوع ہوتا ہے۔''(126)

اس بات کا قوی امکان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس حدیث میں اُس فتنے کی طرف اشارہ فرما رہے ہوں جو ظالم یورپ کے متبادل کے طور پر مشرق سے ابھرا ہے۔ حدیث مبارک میں مذکور لفظ ''قرن'' کا معنی جانور کا ''سینگ'' یا ''زمانہ'' ہے۔ میرے نزدیک حدیث میں دوسرا معنی ہی مراد ہے، لہٰذا ''قرن الشیطان'' سے مراد شیطان کا زمانہ ہے، جو زمانہ نبوت کی ضد ہے۔ اشتراکی نظام کی بنیاد بے دینی، اباحیت اور ان تمام شیطانی مفاسد پر ہے، جو نفس امارہ کے ذریعے دل کی ویرانی کا باعث بنتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی ناجائز اولاد سمجھا جانے والا اشتراکی نظام، اگرچہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ دین، مقدسات اور تاریخی روایات کا سخت دشمن ہے اور ابھی تک ایک ہولناک خطرہ ہے۔(127) مجھے یقین ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی عہد کو ''شیطانی زمانہ'' قرار دیا ہے، جس میں اشتراکی نظام دنیا کے ایک بڑے حصے پر غالب آ گیا تھا۔ آپ نے اپنی امت کو اس مصیبت سے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔

۵- دریائے فرات کا خزانہ

ارشادِ نبوی ہے: "عنقریب دریائے فرات سونے کا خزانہ (یا آپ نے ارشاد فرمایا سونے کا پہاڑ) اُگلے گا، جو اس موقع پر موجود ہو وہ اس میں سے کوئی چیز نہ لے۔"(128)

دریائے فرات کے قریب بڑی بڑی جنگیں ہو چکی ہیں۔ ماضی قریب کی تاریخ میں جھانک کر دیکھیں تو عراق اور ایران کے درمیان ہونے والی خون ریز جنگ بھی دریائے فرات کے قریب ہی ہوئی تھی نیز ۱۹۵۸ء میں دریائے فرات کے نزدیک قتل عام ہوا، جس میں آلِ رسول کا خون بہا۔

تاہم ان دونوں حادثوں کو مذکورہ بالا حدیث کا مصداق قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس حدیث میں یقینی طور پر مستقبل کے کسی ایسے واقعے کی طرف اشارہ ہے، جو یہاں پیش آئے گا۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں کبھی فرات کا پانی سونے کی طرح مہنگا ہو جائے اور حدیث شریف میں مجازاً اس طرف اشارہ ہو یا اس پر بند اور ڈیم تعمیر ہو جانے کے بعد اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سونے کی طرح قیمتی ہو جائے یا دریائے فرات کا پانی مکمل طور پر خشک ہو جائے اور اس کے نیچے سے تیل کے چشمے یا سونے کی کانیں دریافت ہو جائیں۔ چاہے کوئی بھی مطلب ہو اتنی بات یقینی ہے کہ دریائے فرات کا علاقہ ٹائم بم کی طرح کسی بھی وقت عالم اسلام کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

یہ حوادث ابھی تک پیش نہیں آئے، بلکہ مستقبل میں وقوع پذیر ہوں گے اور جو لوگ اس وقت موجود ہوں گے اور اس پیش گوئی کا مشاہدہ کریں گے وہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے کر اپنے ایمان کو تازگی بخشیں گے۔

۶- عیسائیت کا اپنی اصل حالت کی طرف لوٹنا

سرورِ دوجہاں رسول اللہ ﷺ نے پیش گوئی کی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب مسیحیت ختم ہو کر دینِ اسلام میں ضم ہو جائے گی۔(129)

یوں لگتا ہے کہ جب بے دین قوتیں مسلمانوں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گی تو فضائی قوت سے لیس لوگ اذنِ خداوندی سے مسلمانوں کی مدد کو آئیں گے اور بے دینوں کی شان و شوکت کو توڑ دیں گے۔ اس عالمی جنگ میں روئے زمین لاشوں سے بھر جائے گا اور گِدھیں روئے زمین پر پھیلی ہوئی ان لاشوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمت سرانجام دیں گی۔ اس حدیث میں گِدھوں سے ایک خاص ادارے کی طرف اشارہ ہے اور یہ اپنے اندر ایک مخصوص معنی رکھتی ہے۔

۷۔ زرعی اصلاحات

عنقریب زراعت کے میدان میں حیرت انگیز ترقی ہوگی، جس کے نتیجے میں ایک انار کا حجم اتنا بڑا ہو جائے گا کہ وہ بیس آدمیوں کے لیے کافی ہوگا اور اس کے چھلکے کی چھاؤں میں ایک آدمی بیٹھ سکے گا، اسی طرح گندم کے دانوں کا حجم بھی بہت بڑا ہو جائے گا۔ ابھی تک ایسا ہوا نہیں ہے، لیکن مستقبل میں یہ پیش گوئی ضرور پوری ہوگی اور آنے والا وقت آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی دے گا، جس سے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق اور آپ ﷺ پر ایمان میں اضافہ ہوگا۔(130)

ہم پردہ غیب سے پیدا ہونے والے اس مستقبل کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس مستقبل میں ہمیں صرف ''نورِ محمدی'' ہی دکھائی دے گا۔ اگر یہ نور مٹ گیا تو زندگی دائمی تاریکی میں ڈوب جائے گی۔

۸۔ دورِ حاضر کا عدم توازن

احادیث نبویہ میں دورِ حاضر سے متعلق پیش گوئیاں اور اشارات ملتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''قیامت سے پہلے صرف خاص خاص افراد کو سلام کیا جانے لگے گا اور تجارت عام ہو جائے گی یہاں تک کہ تجارتی معاملات میں عورت اپنے خاوند کا ہاتھ بٹائے گی، رشتہ داروں کے ساتھ قطع رحمی کی جائے گی، جھوٹی گواہی دی جائے گی، سچی گواہی چھپائی جائے گی اور قلم کا استعمال عام ہو جائے گا۔(131)

یہ حدیث دورِ حاضر کا اتنی وضاحت کے ساتھ نقشہ کھینچ رہی ہے کہ مزید کسی تشریح وتوضیح کی ضرورت نہیں، یعنی عنقریب تجارت میں اس قدر ترقی ہوگی کہ اس میں اربوں کھربوں ڈالرز کی سرمایہ کاری کی جائے گی، چنانچہ لاکھوں ڈالر تو صرف تشہیر پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر تشہیر میں عورت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات عورتیں براہِ راست کاروبار میں شریک ہوتی ہیں اور بازاروں میں آتی ہیں۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں تجارت کا مخالف ہوں۔ میرا مقصود صرف حدیث میں ذکر کردہ پیش گوئی کی صداقت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

رشتہ داروں کے ساتھ قطع تعلق کیا جائے گا۔ ماں، باپ اور عزیز واقارب کے حقوق کا خیال رکھنے کی بجائے انہیں پامال کیا جائے گا۔ جب والدین بوڑھے ہو جائیں گے اور دیکھ بھال اور محبت بھرے رویے کے مستحق ہوں گے اس وقت انہیں اس خیال سے اولڈ ہاؤس میں بھیج دیا جائے گا کہ انہیں وہاں وہ توجہ مل سکے، جس سے وہ اپنے گھر میں محروم تھے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے حقوق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا ذکر کیا ہے۔(132) لیکن احکاماتِ خداوندی کو پس پشت ڈال دیا جائے گا اور کوئی

بھی انہیں لائق التفات نہ سمجھے گا۔ والدین کے ساتھ وحشیانہ اور ہتک آمیز سلوک کیا جائے گا۔ یہ ساری باتیں دورِ حاضر پر سچی ثابت ہوتی ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

قلم یعنی تحریر و تالیف کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ طباعت خانے ہزاروں کی تعداد میں اخبارات، رسالہ جات اور کتابیں شائع کرنے کے لیے رات دن کام کریں گے۔ کتابیں اور دوائر المعارف شائع کیے جائیں گے۔ کتب خانوں کی الماریاں ہزاروں قسم کی کتابوں سے بھر جائیں گی۔ تحریر و تصنیف ایک معزز پیشے کی صورت اختیار کرلے گی۔ مصنفین اور صاحب قلم حضرات کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جھوٹ اور جھوٹی گواہی عام اور سچی گواہی ناپید ہو جائے گی۔ معاشرہ جھوٹ پیدا کرنے اور اسے رواج دینے والے کارخانے کا روپ دھار لے گا اور اجتماعی زندگی کی عمارت جھوٹ، جعل سازی اور خیانت پر استوار ہوگی۔

یہ ساری باتیں اتنی واضح ہیں کہ بسا اوقات بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی آپ ﷺ نے یہ پیش گوئیاں ارشاد فرمائی تھیں۔

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے کہ یہ حدیث تیرہ صدیاں پہلے لکھی گئی اور اس وقت سے آج تک کتب احادیث میں موجود ہے۔ اگر یہ باتیں حضور ﷺ نے نہیں ارشاد فرمائیں تو پھر کس نے کہی ہیں؟ آپ ﷺ کے علاوہ اور کون صدیوں بعد پیش آنے والے حالات و واقعات کو اس یقین اور تفصیل سے بیان کر سکتا ہے، نیز اگر یہ باتیں کسی اور شخص کی طرف منسوب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی طرح مستقبل پر نورانی نظر رکھتا تھا، لیکن کیا تاریخ میں آپ ﷺ کی مثل کوئی شخص گزرا ہے، جس کی طرف ان پیش گوئیوں کو منسوب کیا جا سکے؟ اس کا جواب قطعی طور پر نفی میں ہے۔ یہ غیب کی خبریں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اور آپ نے ہمیں بتائی ہیں، لہٰذا دورِ حاضر میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات آپ ﷺ کی صداقت کی کھلی دلیل ہیں۔

۹۔ علم عام ہو جائے گا۔

ایک حدیث قدسی میں ارشادِ خداوندی ہے: ''قیامت کے نزدیک میں علم کو اس قدر عام کر دوں گا کہ ہر مرد و زن، آزاد و غلام اور چھوٹے بڑے کو اس تک رسائی حاصل ہوگی۔''(133)

دورِ حاضر میں لوگ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مختلف سطح کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ حصولِ علم کیلئے مسابقت کی فضا قائم ہے۔ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی کثرت، ذرائع ابلاغ کی

ترقی اور تعلیم کے شعبے میں ان کا استعمال اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے منسوب اس حدیث قدسی میں علم و معرفت کے دور کی طرف اشارہ ہے۔ اس میدان میں حاصل کی جانے والی ترقی اس پیش گوئی کی تائید و تصدیق کرتی ہے، گویا یہ علمی ادارے زبانِ حال سے آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں، بلکہ اگر علوم کو صحیح رُخ پر ڈال دیا جائے تو وہ خود یہ گواہی دیں گے۔

۱۰- قرآنی تعلیمات سے فرار اختیار کیا جائے گا۔

ایک اور حدیث جو دورِ حاضر کا نقشہ پیش کرتی ہے، میں ہے: ''اُس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی جب تک قرآن کریم کو باعث عار اور اسلام کو نامانوس نہ سمجھا جانے لگے گا۔''(134)

دورِ حاضر میں کافر اپنے کفر کا کھلم کھلا اعلان کرتا پھرتا ہے، لیکن مسلمان اپنے مسلمان ہونے پر شرمندہ دکھائی دیتا ہے اور بڑی مشکل سے اس کا اظہار کر پاتا ہے۔ کفار اپنے افکار، مطبوعات اور کتابوں کی سرعام تشہیر کرتے ہیں، لیکن مسلمان سب کے سامنے قرآن پاک کھول کر اس کی تلاوت بھی نہیں کر پاتے۔ نفسیاتی دباؤ اس قدر شدید ہے کہ کسی مخالف قانون کی عدم موجودگی میں بھی کوئی انسان بلا جھجک قرآن کریم کے حامی ہونے کا اظہار نہیں کرسکتا۔ کیا آج کوئی انسان اس حقیقت کا انکار کرسکتا ہے؟ کیا یہ دورِ حاضر کے مسلمان کی زندگی کا المیہ نہیں ہے؟ کیا اسلام ہمارے لیے نامانوس نہیں ہو گیا؟

ان المناک حالات کی منظر کشی کے اختتام پر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے صدیوں پہلے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی خبر دے دی تھی اور جب بھی کسی پیش گوئی کا وقت آتا ہے تو وہ جزوی تفصیلات میں بھی پوری طرح سچی ثابت ہوتی ہے۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم نبی کریم ﷺ کی بیعت کی تجدید کریں۔

۱۱- زمانے کا مفہوم

ایک حدیث نبوی ہے: ''جب تک قرآن کریم کو باعث عار نہ سمجھا جانے لگے گا اور زمانہ جلدی جلدی گزرنے اور اس کے گوشے سمٹنے نہ لگیں گے اس وقت تک قیامت برپا نہ ہوگی۔''(135)

حدیث مبارک میں مذکور لفظ ''تــقـــارب'' کا معنی دو چیزوں کا ایک دوسرے کے قریب ہونا ہے۔ اس میں جہاں زمانے کی اضافی (Relative) حیثیت کی طرف اشارہ ہے، وہیں اس بات کی

طرف بھی اشارہ ہے کہ ماضی میں جن کاموں کے لیے طویل وقت درکار ہوتا تھا، مستقبل میں وہ انتہائی کم مدت میں سرانجام پا جائیں گے۔ آج یہ بات بچہ بچہ جانتا ہے کہ صنعت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز تیزی آئی ہے۔ یہ حدیث ذرائع نقل وحمل کی سرعت رفتار کی طرف بھی مشیر ہے، جس سے فاصلے سمٹ جائیں گے۔ یہاں میں آپ کی توجہ ایک اور نقطے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ علم فلکیات اور فلکیاتی فزکس کے ماہرین جانتے ہیں کہ زمین مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بتدریج بیضوی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، جس کے اثرات غیر محسوس طور پر زمانے اور ہمارے اوقات پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں ایک اور نکتہ بھی ہے، وہ یہ کہ اضافی (Relative) حقیقت ہونے کے باوجود زمانہ ہر جگہ زمانہ ہی ہوتا ہے، لہٰذا اگر آپ برج ثور میں داخل ہوں اور وہاں سے ایک ایسے بادل کا مشاہدہ کریں جو آپ سے چالیس ملین نوری سال کی مسافت پر ڈیڑھ لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہو تو آپ کو مختلف زمانوں کا ادراک ہوگا۔ اگر کبھی انسان نظام شمسی کی حدود سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے لیے زمانے کی حقیقت بالکل بدل جائے گی۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے "تقارب الزمان" کے دو مسحور کن الفاظ کے ذریعے مستقبل میں زمانے کے مفہوم میں وقوع پذیر ہونے والے تغیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمان و مکان کے خالق کے بتائے بغیر کوئی انسان از خود ایسے حقائق سے پردہ اٹھا سکتا ہے؟ خالقِ ارض وسماء کے سوا ان حقائق کو کون جانتا تھا؟ کیا ایک ناخواندہ معاشرے میں پروان چڑھنے والے ایک اُمی شخص کے لیے از خود ایسے حقائق تک رسائی ممکن تھی؟ ہرگز نہیں، بلکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ علوم عطا فرمائے اور آپ ﷺ نے انہیں لوگوں تک پہنچایا۔

زمانہ گزرتا جا رہا ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی حیرت انگیز طور پر ترقی کر رہی ہے، لیکن جب بھی وہ کسی مقام پر پہنچتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان حقائق سے ہمیں صدیوں پہلے مطلع کر دیا ہوتا ہے، لہٰذا کوئی بھی سائنس دان اس پر اپنی حیرت کو نہیں چھپا سکتا اور دل سے آپ ﷺ کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔

۱۲- سودی لین دین عام ہو جائے گا۔

ایک زمانہ ایسا آئے گا جب سود اس قدر عام ہو جائے گا کہ سودی لین دین سے احتراز کرنے والے لوگوں تک بھی اس کے اثرات پہنچیں گے۔ سود دورِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ ہے، جو کینسر کی طرح بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس بارے میں ارشادِ نبوی ہے: "ایک دور ایسا آئے گا جب صرف سود کھانے والے ہی باقی رہ جائیں گے، جو شخص سود نہیں کھائے گا اس تک اس کا گرد وغبار تو ضرور پہنچے گا۔"(136)

اس حدیث مبارک میں دو باتیں خصوصیت سے قابل غور ہیں:

اوّل: چونکہ ریاست کا سارا سرمایہ اور نقو دسود کے مرہونِ منت ہوتے ہیں اور تمام سودی و غیر سودی بینک اور مالیاتی ادارے ایک دوسرے سے معاملات کرتے ہیں، اس لیے کوئی شخص خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتے اس تک زندگی کے ہر مظہر پر چھائی ہوئی اس بیماری کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور پہنچیں گے۔ نیت کی پاکیزگی کے سوا اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

دوم: حدیث میں مذکور تعبیر "أصابه من غباره" کا عربی زبان میں ایک اور مفہوم بھی ہوتا ہے، یعنی بعض لوگ تو سود کھائیں گے، لیکن جو لوگ سود نہیں کھائیں گے انہیں اس کا گرد و غبار پہنچے گا۔ سرمایہ دار سودی کاروبار کے ذریعے بہت زیادہ مال و دولت اکٹھی کرلیں گے، جبکہ دوسری طرف مزدوروں کی حالت زارا سی نسبت سے بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی، جس کے نتیجے میں دونوں طبقوں کے درمیان شدید تصادم اور معرکہ برپا ہوگا، گرد و غبار اڑے گا اور پورا معاشرہ ایک نہ ختم ہونے والے بحران کی لپیٹ میں آجائے گا۔ معاشرے کا کوئی بھی فرد اس بحران کے برے اثرات سے محفوظ نہ رہے گا۔ میری رائے میں یہ صورت حال پیش آچکی ہے اور دورِ حاضر پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ معاصر انسان حدیث مبارک میں ذکر کردہ دونوں پیش گوئیوں کا مشاہدہ اور سامنا کر رہا ہے۔ دورِ حاضر میں کوئی بھی ایسا ادارہ نہیں جو کسی نہ کسی درجے میں سودی لین دین میں ملوث نہ ہو۔ ساری بین الاقوامی تجارت سودی لین دین کے ذریعے ہوتی ہے۔ سودی لین دین کو نقود کے تبادلے کی حیثیت سے ہر جگہ قبول کیا جاتا ہے۔

دورِ حاضر کا انسان جس بحران کا شکار ہے، حضور اکرم ﷺ نے صدیوں پہلے اپنی امت کو اس کے بارے میں خبردار کردیا تھا اور اسے سود کے گندے جوہڑ سے دور رہنے کا کہا تھا، لیکن باوجود اس کے کہ سود کے خلاف اسلام کا اعلانِ جنگ ہے،(137) مسلمان اس سے بچنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے۔

اگر مسلمان اس قرآنی وعید کا تھوڑا سا بھی ادراک کر لیتے تو سود کے قریب جاتے اور نہ ہی دنیا میں سب سے زیادہ بدحال ہوتے۔

۱۳- اہلِ ایمان کے روپوش ہونے کا زمانہ

ایک دوسری حدیث میں دورِ حاضر کی منظر کشی درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے: "ایک دور ایسا آئے گا جب معاشرے میں اہل ایمان یوں چھپتے پھریں گے جیسے آج منافقین چھپتے پھرتے ہیں۔"(138)

یعنی اہل ایمان اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کے لیے وہی ذرائع اور اسباب اختیار کریں گے، جو منافقین دورِ نبوی میں اختیار کیا کرتے تھے۔ وہ مصائب و آلام سے بچنے کے لیے اپنی عبادات

کو چھپائیں گے، کیونکہ برے اور شریر گروہ کبھی بھی ایسے لوگوں کا اپنے درمیان رہنا پسند نہیں کرتے، ان پر روزگار کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور انہیں اہم حکومتی عہدوں سے دور رکھا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ معاشرے میں ذلت و رسوائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایک اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ''عنقریب ایک ایسا فتنہ برپا ہوگا، جس میں آدمی اپنے باپ اور بھائی سے جدا ہو جائے گا، بعض لوگوں کے دل قیامت تک فتنے میں مبتلا رہیں گے، حتی کہ اہل ایمان کو نماز پڑھنے پر ایسے ہی عار دلائی جائے گی جیسے زانیہ عورت کو زنا پر عار دلائی جاتی ہے۔''(139) دورِ نبوی میں زنا بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا اگرچہ دورِ حاضر میں اسے بہت برا نہیں سمجھا جاتا، بلکہ بعض معاشروں میں تو اسے ایک پیشے کا درجہ حاصل ہے۔

ماضی کے بعض ادوار میں نماز کی وجہ سے اہل ایمان کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا جاتا رہا ہے، لیکن اگر ان واقعات سے صرف نظر بھی کر لی جائے تب بھی عنقریب ایسا دور آنے والا ہے، جس میں ظالم و جابر حکمرانوں کی جانب سے اہل ایمان کو حقیر اور نماز پڑھنے کو معیوب سمجھا جائے گا، جس کے نتیجے میں مسلمان اپنی نمازیں اور عبادتیں چھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

۱۴- طالقان میں تیل کی دریافت

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''طالقان میں خدا کے ایسے خزانے ہیں، جو سونے چاندی کی جنس میں سے نہیں۔''(140)

عربی زبان میں ''ویـــــح'' کا لفظ بعض ایسی بشارتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جنہیں کڑوی مسکراہٹ کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے، حضرت عمار بن یاسر کو شہادت کی بشارت دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے: ''ویحكَ یا عمار!''(141) طالقان(142) قزوین میں تیل سے مالا مال ایک علاقے کا نام ہے۔ اس علاقے میں یورینیم اور ہیروں کی صورت میں دیگر معدنیات بھی دریافت ہوئی ہیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے خزانوں کی پیش گوئی فرمائی ہے، جو سونے چاندی کی جنس میں سے نہیں ہوں گے اور دورِ حاضر میں اس علاقے سے ایسے خزانوں کی دریافت ہو چکی ہے، لہٰذا طالقان میں تیل کی دریافت زبانِ حال سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے رہی ہے۔

۱۵- اہل کتاب کی پیروی

رسول اللہ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی ہے کہ عالم اسلام عنقریب پہلی امتوں یعنی یہود و نصاریٰ کی تقلید کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلے گا حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنا سر گوہ کے سوراخ میں ڈالا تو مسلمان بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے ایسا ہی کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ اس کی وضاحت کرتے ہوئے بڑے بلیغ انداز میں ارشاد فرماتے ہیں: ''تم ضرور قدم بقدم پہلی امتوں کے نقش پا پر چلو گے حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے تو تم بھی ان کی پیروی میں ایسا ہی کرو گے۔'' صحابہ کرام نے پوچھا: ''کیا آپ ﷺ کی مراد یہود و نصاریٰ سے ہے؟'' تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اور کون لوگ مراد ہو سکتے ہیں؟''(143)

آج عالم اسلام کی صورت حال کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ہم اپنی شخصیت کھو چکے ہیں اور شخصیت کے فقدان کے بحران کا شکار ہیں۔ ہماری حالت اس بکری کی طرح ہے، جو دو ریوڑوں کے درمیان سرگرداں ہو۔ ماضی میں جو حالات کسی بھی سلطنت کے زوال کے لیے کافی ہوتے تھے وہ اوکٹوپس (Octopus) کی طرح ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، لیکن بیدار اور ہوشیار ہونے کی بجائے ہم موت کے جال کو تمدن کی علامات و شرائط تصور کیے بیٹھے ہیں۔ دنیا میں کبھی بھی کسی نے مغرب کی ایسی تقلید نہیں کی جیسی ہم نے کی ہے، بلکہ اب تو یہ مرضِ کہن کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ مغرب میں کسی بھی نئی چیز کا ظہور ہوتا ہے تو ہم بغیر تحقیق کے اسے قبول کر لیتے ہیں اور بسا اوقات اس معاملے میں بہت سی مغربی اقوام پر بھی سبقت لے جاتے ہیں، حالانکہ رسول ﷺ بہت سے فرعی اور ثانوی نوعیت کے مسائل میں بھی اہل کتاب کی مخالفت فرمایا کرتے تھے۔(144)

چونکہ یہ ہماری بحث کا موضوع نہیں، اس لیے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے، تاہم قابل توجہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس صورت حال سے ہمیں صدیوں پہلے باخبر کر دیا تھا اور اپنے وقت پر یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ بشارت یا وعید کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والی کوئی بھی پیش گوئی جب اپنے وقتِ مقرر پر پوری ہوتی ہے تو وہ زبانِ حال سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دیتی ہے۔

تیسری قسم: مختلف علوم سے متعلق پیش گوئیاں

اس فصل میں ہم آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل کے طور پر مختلف علوم سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات مختصر انداز میں پیش کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک بات ارشاد فرمائی پھر اس پر چودہ صدیاں گزر گئیں اور انسانی علوم ومعارف نے حیرت انگیز طور پر ترقی کر لی، لیکن اس کے باوجود سائنس کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے سائنس دان سائنس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ آپ ﷺ کی کوئی بھی بات کبھی بھی جھوٹی یا غلط ثابت نہ ہوئی۔ تیزی سے ترقی کرتی سائنس وٹیکنالوجی سائنس دانوں سے رُخ پھیر کر دربارِ رسالت میں خشوع وخضوع سے کھڑے کہہ رہی ہے: "یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے بالکل بجا فرمایا۔" ایسا کیوں نہ ہوتا؟ آپ ﷺ رسولِ خدا جو تھے۔

آئندہ صفحات میں ہم چند باتیں بطور مثال کے ذکر کریں گے اور ان کا علمی تجزیہ اس موضوع کے اختصاصی رسائل اور کتابوں کے لیے چھوڑ دیں گے۔

الف- ہر بیماری کی دوا ہے۔

امام بخاری اور ابن ماجہ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے ساتھ اس کا علاج بھی پیدا فرمایا ہے۔"(145)

آپ ﷺ کے اس جامع اور مختصر ارشاد مبارک سے بڑھ کر سائنس اور خاص طور پر طبی علوم کے حصول کے لیے حوصلہ افزائی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہر بیماری کے لیے کوئی نہ کوئی دوا ضرور ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت سے ہر بیماری کا علاج دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے: "ہر بیماری کے لیے دوا ہے۔"(146) ایک بار آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "علاج معالجہ کیا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے کے سوا ہر بیماری کا علاج پیدا فرمایا ہے۔"(147)

اگر ڈاکٹر حضرات انسان کی درازی عمر یا وقتی طور پر موت کی تاخیر کا کوئی راستہ دریافت کر لیں تو بھی انسان کو اس کے مقررہ انجام اور طے شدہ راستے سے نہیں روک سکتے، جو عالم ارواح سے شروع ہوتا ہے اور بچپن، جوانی، بڑھاپے، قبر اور حشر سے ہوتا ہوا جنت یا جہنم پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس راستے کو بند کرنا قطعاً ناممکن ہے، لہٰذا انسان کا پیدا ہونا، جوان ہونا، بوڑھا ہونا اور پھر مرنا ناگزیر ہے، لیکن اس

دائرے سے باہر ہر بیماری کی دوا اور علاج موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسے تلاش اور دریافت کیا جائے۔

ایسی احادیث کے ذریعے رسول اللہ ﷺ تمام سائنس دانوں، اہلِ تحقیق اور باصلاحیت حضرات کو اپنی تمام صلاحیتیں ادویہ سازی اور آلاتِ علاج کی دریافت کے لیے وقف کر دینے کی دعوت دے رہے ہیں، اس لیے آپ کو چاہیے کہ اپنے مال وزر کا وافر حصہ اس قسم کے تحقیقی مراکز کے قیام کے لیے مختص کریں اور بچپن سے لے کر موت کے دہانے تک پھیلے ہوئے زندگی کے میدان کو اپنی تحقیق کی جولان گاہ بنائیں۔ قرآن کریم نے علم کے حصول کی دعوت وترغیب دی ہے اور انبیائے کرام کے معجزات کو اس بارے میں اعلیٰ ترین مونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ یقیناً جس طرح انبیائے کرام انسانیت کو ٹیڑھے میڑھے راستوں سے بچا کر سیدھے راستے پر چلانے کے لیے روحانی اور بلند تصورات کے حامل ہونے کی حیثیت سے اسوۂ حسنہ تھے، اسی طرح وہ انسانی عقل کے دائرہ کار میں آنے والے خالص سائنسی علوم کے میدان میں بھی راہبر و راہنما تھے، لہٰذا ہر نبی تمام علوم میں معلم، مرشد اور راہنما کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ انسانیت نے مادی وروحانی ہدایت کی تمام کنجیاں انبیائے کرام سے حاصل کی ہیں۔ قرآن کریم نے انبیائے کرام کے معجزات کی وضاحت کرتے ہوئے انسانیت کو اس بات کی دعوت وترغیب دی ہے کہ وہ ان آخری حدود تک پہنچنے کی کوشش کریں، جنہیں انبیائے کرام نے اپنے معجزات کے ذریعے مقرر کیا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن کریم کی تصریح کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام نے اذنِ خداوندی سے مردوں کو زندہ کیا، لیکن یہ انسانی صلاحیتوں کی آخری حد ہے، کیونکہ قوانین فطرت یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد خرقِ عادت امور کا دائرہ کار شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی ارادہ، قدرت اور صلاحیت فطری قوانین کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ انسانی علم اور ٹیکنالوجی خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے وہ معجزات کی حدود کو عبور نہیں کر سکتی، کیونکہ معجزات کی حدود میں صرف انبیائے کرام کو داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ انسانی علم کی رسائی صرف ان حدود تک ممکن ہے، جہاں سے آگے معجزات کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان کو انہی حدود تک پہنچنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

قرآن کریم حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کے ضمن میں ہم سے مخاطب ہے کہ دیکھو تمہارے سامنے موت کے دہانے تک علاج معالجے کا راستہ کھلا ہے۔ وہ بیماریاں مثلاً کینسر اور ایڈز وغیرہ جنہیں تم لاعلاج سمجھتے ہو ان کی دوا اور علاج موجود ہے، صرف سنجیدگی کے ساتھ انہیں تلاش کرنے کی ضرورت

ہے، کتنی ہی بیماریاں ہیں، جنہیں ماضی میں تم لاعلاج سمجھتے تھے، لیکن اب ان کا علاج دریافت ہو چکا ہے، لہٰذا تمہیں ان کی دریافت کی کوشش جاری رکھنی چاہیے، ان شاء اللہ تمہیں ضرور کامیابی نصیب ہوگی۔

ایک اور مثال لیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے میں انسانیت کے لیے یہ سبق پوشیدہ ہے کہ کسی اہم اور متعین ذمہ داری کو سرانجام دینے کے لیے جمادات کو مسخر کرنا ممکن ہے، اس بارے میں دورِ حاضر کے سائنس دانوں کو کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے، تاہم عصا پھینک کر اسے جیتے جاگتے سانپ میں تبدیل کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اس قسم کا واقعہ معجزات اور خرقِ عادت امور کے دائرے میں داخل ہے، جبکہ ہم صرف روئے زمین پر جاری قوانین فطرت کے دائرے میں رہتے ہوئے سعی و کوشش کر سکتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں قرآنِ کریم کے اعجاز پر بھی کچھ گفتگو کروں۔ قرآن کریم ادب و بلاغت کا ایک ایسا معجزہ ہے، جس کے افق تک کسی کے لیے رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ تمام تر سحر انگیز اشعار اور ادبی شاہپارے صرف قرآنِ کریم کی چوکھٹ کے قریب تک آسکتے ہیں، جو بلاغت کی آخری حد ہے اور لبید وغیرہ جیسے ادباء اس سے پہلے ہی رک جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی بلاغت معجزہ ہے، جبکہ انسانی کلام فطری قوانین کی حدود عبور نہیں کر سکتا۔

یہاں ہم اس موضوع کو طوالت نہیں دیں گے، کیونکہ ہم اس موضوع پر اسی کتاب کے ایک دوسرے مقام پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

حاصل یہ کہ انبیائے کرام کے معجزات انسانی علم کے لیے حدود اور آفاق کا تعین کرتے ہیں... قرآن کریم ان معجزات کا ذکر کر کے انسان کو ان معجزات کی حدود تک پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔(148) اس لیے انسان پر ان معجزات کی حدود کے قریب تر پہنچنے کی سعی و کاوش کرنا لازم ہے اور اگر بالفرض اس نے معجزات کی حدود سے پرے ایک قدم بھی رکھ دیا تو وہ ان آفاق میں داخل ہو جائے گا جہاں سے معجزات کے ثمرات کا ظہور ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ انسان میڈیکل سائنس میں اس قدر ترقی کر لے کہ مردوں کو زندہ کرنے کی حدود کے قریب پہنچ جائے، تاہم وہ موت کے سامنے بے بس ہی رہے گا، کیونکہ موت بھی زندگی کی طرح خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ درج ذیل آیت مبارکہ ﴿الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ﴾ (الملك: ٢) ''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔'' میں اسی طرف اشارہ ہے۔

موت محض انقطاع، ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا نام نہیں، بلکہ یہ مشیت ایزدی اور اذنِ خداوندی

سے انسان میں ودیعت امانت الٰہیہ کو واپس لوٹانے سے عبارت ہے۔ انسانیت کی خدمت کی خاطر اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دینے کے لیے پُرعزم اصحابِ علم کی اس سے بڑھ کر کسی اور طریقے سے حوصلہ افزائی کرنا ممکن نہیں۔ نہ صرف طب بلکہ اس کے ایک انتہائی اہم شعبے ''طب وقائی'' (Preventive Medicine) کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ یہ بالکل فطری بات ہے، کیونکہ بیماری کا علاج بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اہم چیز انسانی صحت کی حفاظت اور اسے بیماری کا شکار ہونے سے بچانا ہے۔ حفظانِ صحت کا اہتمام بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے علاج سے کہیں آسان ہے، کیونکہ علاج دشوار، مہنگا اور طبیعت پر گراں ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے رسول ﷺ نے آغاز سے ہی حفظانِ صحت کا اہتمام فرمایا اور طب سے متعلق اپنے اکثر ارشادات کی بنیاد ''طب وقائی'' پر رکھی۔

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ دورِ نبوی میں مدینہ منورہ میں آنے والے عیسائی اطباء کو کوئی کام نہیں ملا، کیونکہ مسلمان حفظانِ صحت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشارات پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ لوگوں کے دلوں اور نفوس کی اصلاح فرماتے اسی طرح آپ ﷺ ان کی بدنی صحت کا بھی اہتمام فرماتے تھے، گویا آپ ﷺ اپنے پیروکاروں کی تمام نفسیاتی، روحانی اور جسمانی بیماریوں سے حفاظت کا انتظام فرماتے تھے۔

دورِ نبوی میں طاعون کا دور دورہ تھا اور کسی کے پاس بھی اس مہلک بیماری سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ اس دور میں یہ ایسی ہی خطرناک بیماری تھی جیسی آج کل ایڈز ہے، لیکن صحابہ کرام اس بیماری سے محفوظ تھے، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے مطابق صاف ستھرے شہر میں صاف ستھری زندگی گزارتے تھے، لیکن جب صحابہ کرام کو جنگی مہمات میں شام، حلب اور انطاکیہ وغیرہ کی طرف جانا پڑا تو ان علاقوں کے بازنطینی سلطنت سے ملحق ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کو بھی اس بیماری کا سامنا کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں عمواس کے مقام پر وبا پھیلی، جس میں پچیس ہزار مسلمان جاں بحق ہو گئے۔ (149)

حضرت ابوعبیدہ بن جراح بھی اس وقت عمواس مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہی وہ صحابی تھے، جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری ایام میں زخمی ہونے کے بعد ارشاد فرمایا تھا: ''اگر ابوعبیدہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ نامزد کر دیتا۔'' (150) اور جب رسول اللہ ﷺ کے پاس نجران سے وفد آیا تھا اور اس نے کسی قابل اعتماد اور امانت دار شخص کو اپنے ساتھ بھیجنے کی درخواست کی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ ابوعبیدہ بن جراح کو بھیجا تھا۔ (151) آپ عشرہ مبشرہ صحابہ میں سے تھے

اور ''أمین هذه الأمة'' کے لقب سے جانے جاتے تھے۔

طاعون کا یہ واقعہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں پیش آیا تھا۔ خلیفہ مفتوحہ علاقوں کا خود دورہ کرتے اور تمام معاملات کا قریب سے جائزہ لیتے۔ آپ کا عمواس جانا طے تھا، لیکن جب آپ کو وہاں طاعون کی وبا پھیلنے کی اطلاع ملی تو آپ نے واپسی کا ارادہ کرلیا۔ اس پر (ابن عباس کی روایت کے مطابق) ابوعبیدہ بن جراح نے فرمایا: ''کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: ''اے ابوعبیدہ! اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو مناسب ہوتا۔'' حضرت عمر ابوعبیدہ کی رائے کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر آپ نے فرمایا: ''ہم اللہ تعالیٰ کی ایک تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی دوسری تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔ آپ مجھے بتایئے اگر آپ کے پاس اونٹ ہوں اور آپ انہیں ایک ایسی وادی میں لے جائیں جس کا ایک حصہ سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا حصہ خشک اور بنجر، اگر آپ سرسبز حصے میں اپنے اونٹ چرائیں تو کیا آپ یہ کام تقدیرِ الٰہی سے نہ کریں گے؟''(152)

یہ تو حضرت عمرؓ کی فراست تھی، ورنہ کیا آپؓ کی رائے درست تھی اور آپ پر قیام ضروری تھا یا واپس لوٹ جانا؟ اس بارے میں یقینی خبر حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے پاس تھی۔ روایت کا بقیہ حصہ کچھ اس طرح ہے: ''اس گفتگو کے دوران حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ اپنے کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ جب آپؓ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ اس بارے میں مجھے علم ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اگر تمہیں کسی علاقے میں طاعون کے پھیلنے کی خبر ملے تو وہاں مت جاؤ اور اگر جس علاقے میں تم ہو وہاں طاعون پھیل جائے تو وہاں سے بھاگ کر مت نکلو۔'' اس پر حضرت عمرؓ نے شکرِ خداوندی ادا کیا اور واپس لوٹ گئے۔(153)

قارئین غور فرمائیں کیا یہ صحت کے بارے میں احتیاطی تدبیر نہیں، جس پر جدید میڈیکل سائنس بھی زور دیتی ہے؟ رسول ﷺ نے چودہ صدیاں پہلے اس کا حکم فرمایا تھا، لہٰذا آج میڈیکل سائنس بھی رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دینے پر مجبور ہے۔

ب- کوڑھ اور احتیاطی تدابیر

امام احمد اور امام بخاری سے مروی حدیث نبوی میں ہے: ''کوڑھی سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔''(154)

اس حدیث مبارک میں مذکور تمثیل کا کوڑھ کے جراثیم کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی کوڑھی کو

شیر سے تشبیہ دینا مقصود ہے۔ بعض حضرات نے غلط طور پر یہ مفہوم سمجھا ہے، کیونکہ اس طرح کا کوئی مفہوم پایا جاتا ہے اور نہ ہی رسول ﷺ کا یہ مقصود ہے۔ یہاں فرار کا لفظی معنی مراد نہیں، بلکہ شاید رسول اللہ ﷺ کا مقصد اس مہلک بیماری کا مقابلہ کرنے اور اس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر دریافت کرنے کی ترغیب دینا ہے، یعنی مسلمانوں کو حفظانِ صحت کے اصولوں پر کاربند رہنا چاہیے اور اس بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، گویا جس طرح انسان شیر کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے اسی طرح اسے اس مرض میں مبتلا ہونے سے محتاط رہنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کی تمام احادیث اپنے اندر بڑے گہرے معانی لیے ہوتی ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے پوری سعی و کاوش کریں۔

ج- کتے کا جھوٹا

امام مسلم اور دیگر ائمہ حدیث سے ارشادِ نبوی مروی ہے: ''اگر تمہارے برتن کو کتا چاٹ جائے تو وہ سات دفعہ دھونے سے پاک ہوگا، جن میں سے پہلی دفعہ مٹی کے ساتھ دھویا جائے۔''(155)

چونکہ دورِ نبوی میں جراثیم کش ادویہ موجود نہ تھیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے مٹی کو بطور جراثیم کش دوا کے استعمال کرنے کا حکم فرمایا۔ بعد میں یہ بات ثابت ہوئی کہ مٹی بھی پانی کی طرح طہارت کا کام دیتی ہے۔ جب سائنس نے مزید ترقی کی تو معلوم ہوا کہ مٹی میں Tetralite اور Tetracycline کے اجزاء ہوتے ہیں، جو جراثیم کو ختم کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لہٰذا نبی کریم ﷺ نے پہلی دفعہ برتن کو مٹی سے صاف کرنے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ برتن پہلی دفعہ ہی جراثیم سے پاک ہو جائے۔

اس حدیث مبارک میں چند اور امور بھی قابلِ توجہ ہیں:

اول: اگر برتن کو مٹی سے صاف نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ کتوں کی بعض امراض جراثیم کے ذریعے انسانوں میں منتقل ہو جائیں۔ جدید میڈیکل سائنس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

دوم: کتے کا بول و براز اور لعاب انسانی صحت کے لیے مضر ہو سکتا ہے، اگر فوری طور پر احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو اس کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں کا علاج آسانی سے ممکن نہیں رہتا، اس لیے جراثیم کے خاتمے کا اہتمام ناگزیر ہے۔

سوم: حدیث میں برتن کو پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرنے کے بعد چھ یا سات مرتبہ پانی سے دھونے کا حکم ہے۔ برطانیہ اور جرمنی کے بعض تحقیقی رسائل میں اس موضوع پر تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی تائید کی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کتوں کے بارے میں انتہائی حساس واقع ہوئے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اجتہاد کی بنیاد پر کتوں کو ختم کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔(156) لیکن پھر آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے پہلے حکم پر عمل درآمد رکوا دیا کہ اگر کتے جانداروں کی ایک مستقبل نوع نہ ہوتے تو میں ان کی نسل کشی کا حکم دے دیتا۔(157)

یعنی اگر کتے انسانوں، نباتات اور جمادات وغیرہ کی طرح ایک مستقبل مخلوق نہ ہوتے اور ان کا وجود فطری ضرورت اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر نہ ہوتا تو جراثیم کے حامل ہونے کی وجہ سے میں ان کی نسل کشی کا حکم دے دیتا۔ نبی کریم ﷺ کا ماحولیاتی توازن کے پہلو کا لحاظ رکھنا بذاتِ خود ایک معجزہ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چودہ صدیاں پہلے ایک ایسے موضوع کی رعایت کی جو دورِ جدید کا موضوع کہلاتا ہے اور پھر اس کی بنیاد پر حیوانات حتیٰ کہ کتوں کو بھی ختم کرنے کو حرام قرار دے دیا۔ آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف جانوروں مثلاً مچھلیوں، ہاتھیوں اور گینڈوں وغیرہ کی نسل کی حفاظت ناگزیر ہے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے ایک ہزار برس سے زائد عرصہ پہلے کتوں کے مستقبل نوع ہونے کی بنیاد پر ان کی نسل کشی نہ کرنے کا حکم فرما کر ایک انتہائی اہم موضوع کو بہت پہلے موضوعِ بحث بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو تخلیق کر کے اس کی مخلوقات اور عناصر کے درمیان توازن قائم فرمایا ہے۔ آیت مبارکہ ﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ () أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ﴾ (الرحمان: ۷-۸) ''اور اسی نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو قائم کی کہ ترازو (سے تولنے) میں حد سے تجاوز نہ کرو۔'' میں اسی عمومی اصول کی طرف اشارہ ہے، چونکہ رسول اللہ ﷺ اعتدال پسند انسان تھے، اس لیے آپ ﷺ نے توازن برقرار رکھنے کے لیے کتوں کی نسل ختم کرنے سے منع فرما دیا۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں آپ کے اس مختصر مگر بلاغت کے شاہکار کلام کے اور بھی مخفی گوشے دریافت ہو جائیں۔ اگر کوئی شخص اتنا عرصہ پہلے اپنی پوری زندگی میں صرف یہی ایک جملہ کہہ دیتا تو یہ اسے مشاہیرِ عالم کی فہرست میں شامل کرانے کے لیے کافی ہوتا، چہ جائے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس قسم کی ہزاروں احادیث مروی ہیں، لہٰذا مجھے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرنے کی اجازت دیجیے کہ عبقریت بھی رسول اللہ ﷺ کی چوکھٹ کی سوالی تھی۔

ہم یہ بات بجا طور پر بغیر کسی مبالغے کے کہہ سکتے ہیں کہ حوادثِ زمانہ اور واقعات زبانِ حال سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت و امانت کی گواہی دے رہے ہیں اور جس قدر سائنس ترقی کرے گی اور اس کے انکشافات میں اضافہ ہوگا اسی قدر اس دعوے کی صداقت واضح ہوتی چلی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب پوری انسانیت اس حقیقت کو تسلیم کر لے گی۔

سائنس ہر چیز کی تہہ تک پہنچ کر اس کا تجزیہ و مطالعہ کر رہی ہے اور قرآن و سنت میں ذکر کردہ حقائق کو پرکھ رہی ہے۔ آئے روز رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی صداقت کا ظہور ہو رہا ہے اور انصاف پسند سائنس دان علی الاعلان اس کا اعتراف کر رہے ہیں۔

د۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا

جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مروی حدیث نبوی میں ہے: ''کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا برکت کا باعث ہے۔'' یعنی اگر تمہیں کھانے میں برکت، نظافت اور پاکیزگی پسند ہے تو کھانے سے پہلے اور اس کے بعد ایسے ہی ہاتھ دھویا کرو جیسے وضو میں دھوتے ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں نظافت کے ایک عمومی اصول کا تذکرہ فرمایا ہے، جس کی طرف شاید محض عقل سے توجہ نہ جاتی، خاص طور اس دور کے انسان کو اس بات کا قطعاً علم نہ تھا کہ اس کے ناخنوں میں لاکھوں جراثیم پائے جاتے ہیں، بلکہ آج کے دور کے انسان کو ہی لے لیجئے کتنے لوگ ہیں، جو اس مسئلے کے سائنسی پہلو سے واقف ہیں؟

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نظافت کا ایک اصول یہ بھی سکھایا ہے کہ ہم نیند سے بیدار ہو کر کسی برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اچھی طرح اپنے ہاتھ دھوئیں، کیونکہ نیند کی حالت میں انسان کو اپنے ہاتھوں کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ (158) رسول اللہ ﷺ ہاتھوں کی نظافت کا بہت اہتمام فرماتے، اسی لیے آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر ہاتھ دھونے کی تاکید فرمائی ہے۔

دورِ حاضر میں ماہرین طب پر آپ ﷺ کے اس فرمان کی حکمتیں واضح ہونے لگی ہیں۔ انسان کو نیند کی حالت میں معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھ پر کیا چیز لگی ہے۔ بعض اوقات انسان کے ہاتھ پر کوئی گندگی لگ جاتی ہے، ایسی صورت میں برتن یا منہ میں ہاتھ ڈالنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ کیا رسول ﷺ کے پاس خوردبین، ایکس ریز یا تجزیاتی تجربہ گاہیں تھیں جن کی مدد سے آپ ﷺ کو معلوم ہوا تھا کہ ہاتھ پر جراثیم لگ جاتے ہیں؟ ہر گز نہیں، آپ ﷺ کے پاس ان ذرائع میں سے کوئی بھی ذریعہ موجود نہ

تھا، لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک ذات ایسی تھی جو وحی متلو یا غیر متلو کے ذریعے آپ ﷺ کو یہ حقائق بتاتی تھی اور پھر آپ ﷺ ان حقائق کو اپنی امت تک پہنچاتے تھے، اسی لیے آپ ﷺ کی کسی بات کا غلط ثابت ہونا ممکن ہے اور نہ ہی خلافِ واقع ہونا۔

۵- مسواک: منہ اور دانتوں کی صفائی

صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں تقریباً چالیس صحابہ کرام سے درج ذیل حدیث مروی ہے جو متواتر کہلائے جانے کے لائق ہے: ''اگر مجھے اپنی امت پر گرانی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اسے ہر نماز کے لیے مسواک کرنے کا حکم دیتا۔''(159)

اپنی امت پر گرانی کے اندیشے سے نبی کریم ﷺ نے ہر نماز کے لیے مسواک کا حکم نہیں فرمایا، ورنہ وضو کی طرح مسواک بھی ہر نماز کے لیے ضروری ہوتا، لیکن چونکہ ہر جگہ ہر انسان کے لیے مسواک کا حصول دشوار ہوتا ہے، اس لیے یہ صورتِ حال آسانی پر مبنی دین اسلام کی روح (spirit) کے منافی ہوتی۔

مسواک فرض نہیں، بلکہ سنت ہے۔ علمائے سلف نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ دورِ حاضر کے بہت سے محققین نے بھی مسواک کے موضوع کو مختلف پہلوؤں سے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ مستقبل میں بھی اس قسم کی تحقیقات سامنے آتی رہیں گی۔

مسواک سے مراد دانتوں کی صفائی ہے، جس کے لیے مسواک ہی ضروری نہیں، بلکہ ہاتھ، نمک، معجون یا کسی اور چیز سے بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر انسان اپنی پسند کے طریقے سے اپنے دانتوں کی صفائی کر سکتا ہے، کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں، تاہم یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مسواک کی اپنی خصوصیات ہیں جو کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔

قارئین کرام! ذرا اس دین کی خوبیوں پر غور فرمائیے جس کے مبلّغ(160) ایک دن میں پانچ سے دس مرتبہ مسواک فرماتے تھے اور انہوں نے اسے اپنی امت کے لیے سنت قرار دیا، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلام نے نہ صرف دانتوں کی صفائی بلکہ سائنس کی اصطلاح میں دانتوں کی حفاظت جسے فرانسیسی زبان میں (Hygieniqui) کہتے ہیں کا سب سے پہلے اہتمام کیا ہے۔ عوام تو در کنار کوئی دانتوں کا ڈاکٹر بھی دن میں پانچ سے دس بار دانتوں کی صفائی کا اہتمام نہ کرتا ہوگا، جبکہ رسول اللہ ﷺ دن میں کم از کم پانچ سے دس بار مسواک فرمایا کرتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ رات کو کئی بار نماز کے لیے

اٹھتے اور ہر بار مسواک فرماتے۔[161] مزید برآں آپ ﷺ ہر وضو میں اور فجر، چاشت، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے پہلے اور کوئی بھی چیز کھانے کے بعد مسواک فرمایا کرتے تھے۔ اگر ان تمام مواقع کو شمار کیا جائے تو یہ تعداد اوپر ذکر کردہ تعداد سے بڑھ جاتی ہے۔

و۔ کھانے میں میانہ روی

حفظانِ صحت کے بارے میں ارشاد نبوی ہے: ''ابن آدم پیٹ سے زیادہ برے برتن کو نہیں بھرتا۔ انسان کو چند لقمے کافی ہیں، جن سے اس کی کمر سیدھی ہو جائے۔ اگر اس سے زیادہ کھانا ہی ہے تو پھر پیٹ کا ایک تہائی کھانے، ایک تہائی پانی اور ایک تہائی سانس کے لیے مقرر کر لے۔''[162]

دیگر بہت سی احادیث سے بھی اس حدیث کی تائید ہوتی ہے مثلاً ایک حدیث مبارک میں ہے: ''مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ اندیشہ بسیار خوری، نیند کی زیادتی، کاہلی اور ضعیف الاعتقادی کا ہے۔''[163]

اس حدیث میں ذکر کردہ تمام امور کا حاصل ایک ہی چیز ہے، وہ یہ کہ جو شخص غفلت کی زندگی گزارتا ہے اور اپنے نفس کی نگرانی نہیں کرتا وہ اپنا بیشتر وقت نیند اور کاہلی میں گزار دیتا ہے اور موٹاپے کا شکار ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ کھانے پینے کا اور زیادہ اہتمام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ کھاتا ہے اسی قدر اس کی غفلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص زیادہ کھاتا ہے وہ زیادہ سوتا ہے اور جو شخص زیادہ سوتا ہے وہ زیادہ ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا امور نبی کریم ﷺ کے لیے اپنی امت کے بارے میں تشویش کا باعث تھے۔ یہ کام میں ماہرین طب پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اس بارے میں اپنے علمی تجزیئے پیش کریں اور جب آپ ان کے تجزیئے پڑھیں یا سنیں گے تو آپ کو نبی کریم ﷺ کے صدیوں پہلے فرمائے ہوئے ارشادات کی صداقت کا اندازہ ہو جائے گا اور آپ انہیں کسی بھی صورت میں خلافِ واقع نہ پائیں گے۔

ز۔ سرمہ

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بہترین سرمہ اثمد ہے، جو نگاہ کو تیز اور بالوں کو اُگاتا ہے۔''[164] یعنی پلکوں کو لمبا کرتا ہے۔

ہمارے بعض ماہرین طب جن کی بصارت وبصیرت کو اللہ تعالیٰ نے روشن کیا ہے، کہتے ہیں کہ

سرمہ آنکھوں اور پلکوں کی نشو ونما کے لیے بہترین دوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ برسوں میں زیب و زینت کے لیے سب سے زیادہ استعمال سرمے کا ہی ہوگا۔ جلد کی حفاظت اور جراثیم کشی کی خصوصیات کے لحاظ سے مہندی بھی سرمے کی ہم پلہ ہے، (165) کیونکہ سائنسی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مہندی کی جراثیم کش صلاحیت آج کل استعمال ہونے والی Iodine اور مورفسیلون کی جراثیم کش صلاحیت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

ح- کلونجی

صحیح بخاری، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''موت کے سوا کلونجی میں ہر مرض کی شفا ہے۔'' (166)

''کل داء'' کی تعبیر سے عربی زبان میں کثرت کی طرف اشارہ ہوتا ہے، نیز اگر کلونجی کا دقت نظر سے سائنسی تجزیہ کیا جائے اور اسے سائنسی تجربات سے گزارا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔ حدیث مبارک میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے:

اوّل: کلونجی کے ذریعے علاج

دوّم: کلونجی کا موت کا علاج نہ ہونا

حسب سابق ہم اس موضوع کا سائنسی پہلو اس میدان کے اہل اختصاص کے لیے چھوڑ رہے ہیں اور دل پر وارد ہونے والے بعض نکات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

بیماری کے دوران نقاہت کو دور کرنے کے لیے پروٹینز کی دستیابی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وٹامنز سے بھرپور غذا بھی اشد ضروری ہوتی ہے، جس میں اعلیٰ درجے کی Colorine اور ہضم کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حضرات مریض کو طاقت و توانائی بہم پہنچانے اور نظام ہضم کو مشکلات سے بچانے کے لیے پروٹینز اور وٹامنز کے استعمال کی تاکید کرتے ہیں۔

سائنسی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ مذکورہ بالا تمام خصوصیات کلونجی میں پائی جاتی ہیں۔ اس موضوع پر بہت سی عملی مثالیں پیش کی سکتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بلا تحقیق کوئی بات ارشاد نہ فرماتے، بلکہ آپ ﷺ کی ہر بات زمینی حقائق پر مبنی ہوتی اور حقائق خود اس کی صداقت کی گواہی دیتے۔

ط- مکھی

اسی سلسلے میں ہم صحیح بخاری کی ایک اور حدیث بھی پیش کر سکتے ہیں، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے: ''اگر تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر پڑے تو اسے چاہیے کہ اسے مکمل طور پر ڈبو کر نکال لے، کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے پر میں شفا ہوتی ہے۔''(167)

اس حدیث میں کئی باتیں قابل غور ہیں:

اوّل: پہلی بات تو یہ ہے کہ اُس دور میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ مکھی جراثیم کی حامل ہوتی ہے۔ مکھی جب کسی مائع چیز میں گرنے لگتی ہے تو احتیاط کے پیش نظر اپنا ایک پر اوپر اٹھا لیتی ہے، دونوں پروں کو ایک ساتھ نہیں ڈبوتی، تا کہ برتن سے نکلنے کی صورت میں اڑنے کا امکان روشن رہے، تاہم مکھی کے کھانے پینے کی اشیاء میں گرنے کی وجہ سے بعض اوقات ان میں جراثیم منتقل ہو جاتے ہیں۔

دوم: ایسی صورت حال میں نبی کریم ﷺ نے پوری مکھی کو ڈبو کر پھینک دینے کا حکم فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مکھی کے ایک پر میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں اور دوسرے پر میں ایسے جراثیم ہوتے ہیں جو پہلے پر کے نقصان دہ اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔ جب انسان کا ہاتھ مکھی کی کمر سے چھوتا ہے تو اس میں سے جراثیم کش مواد خارج ہوتا ہے، جو پہلے پر کے جراثیم کو ختم کر دیتا ہے۔(168)

جن سائنس دانوں نے اس بارے میں تجربات کیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے مکھی کی پشت پر دباؤ ڈالا تو انہوں نے خوردبین کی مدد سے دیکھا کہ ایک خاص قسم کے جراثیم اس میں سے نکل کر دائیں بائیں پھیلنا شروع ہو گئے ہیں۔ بعد کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ جراثیم اینٹی بائیوٹک ہوتے ہیں۔

ی- ایک اہم طبی انکشاف

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ میں مستحاضہ عورت ہوں اور پاک نہیں ہوتی تو کیا میں نماز چھوڑ دیا کروں؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، یہ ماہواری نہیں، بلکہ رگ کا خون ہے، جب ماہواری شروع ہوا کرے تو نماز چھوڑ دیا کرو اور جب ماہواری ختم ہو جائے تو خون کو صاف کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔''(169)

صدیوں بعد علم طب کے ذریعے یہ ثابت ہوا ہے کہ ماہواری کے خون کا سرچشمہ رحم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ سائنسی حقیقت کیسے معلوم ہوئی؟ یقیناً آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ کو یہ حقائق عطا فرمائے تھے، جنہیں آپ ﷺ نے اپنی امت تک پہنچایا، لہٰذا مرورِ زمانہ سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت و شرف میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ آج کے سائنس دانوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جو شخص اس طرح کی باتیں بتائے وہ عام آدمی نہیں ہو سکتا، بلکہ یقیناً نبی ہے۔

ک- شراب میں شفا نہیں۔

حضرت طارق بن سوید سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شراب بنانے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے انہیں منع فرما دیا یا اسے ناپسند فرمایا۔ اس پر انہوں نے عرض کی کہ میں صرف دوا کی غرض سے بناؤں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ دوا نہیں، بلکہ بیماری ہے۔''(170)

ترکی سمیت دنیا کے مختلف حصوں میں شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کے بارے میں کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں، جن میں تمام اہل علم نے متفقہ طور پر یہ رائے دی ہے کہ شراب کا ایک قطرہ بھی انسان کے جسم، عقل اور روح کے لیے نقصان دہ ہوتا اور انسانی بدن میں مختلف قسم کی خرابیوں کا باعث بنتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بہت پہلے ہی اس بات کا ادراک کرتے ہوئے خود شراب کو بیماری قرار دے دیا تھا۔

ل- ختنہ

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''پانچ چیزیں امورِ فطرت میں سے ہیں، جن میں سے ایک ختنہ بھی ہے۔''(171)

معاصر سائنس دان اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا وہ بھی اسی نتیجے پر نہیں پہنچے؟ کیا وہ یہ نہیں کہتے کہ عضوِ تناسل کے غلاف میں جراثیم جمع ہو جاتے ہیں، جو بالآخر کینسر کا باعث بن جاتے ہیں اور اس کا واحد حل ختنہ ہے؟ اس بارے میں اہل مغرب کا رویہ ہمارے ہاں کے بعض بے وقوفوں سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مختون لوگوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے۔

اس وقت مجھے اس صدی کے مجدد کا درج ذیل فرمان یاد آ رہا ہے: ''یورپ کے پیٹ میں اسلام ہے، جسے وہ کبھی نہ کبھی جنم دے گا اور سلطنت عثمانیہ کے پیٹ میں یورپ ہے، جسے وہ کبھی نہ کبھی جنم دے گی۔''(172)

یہ فرمان اس صدی کے اوائل میں کہا گیا تھا، اس کا ایک حصہ حقیقت کا روپ دھار چکا ہے اور اب ہم بے تابی سے دوسرے حصے کے پورے ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ دردِ زہ شروع ہو چکی ہے اور ولادت کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب ہم نومولود کی خوشی و اُمید سے بھرپور آواز سنیں گے۔

اب تک ہم نے رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیائے کرام کی صداقت وللّٰہیت پر گفتگو کی ہے۔ ہر نبی صدق وللّٰہیت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھا۔ ان کی زندگیوں میں جھوٹ کا کبھی گزر نہیں ہوا۔ اگر ان کی زندگیوں میں تھوڑا سا بھی انحراف پایا جاتا تو وہ کبھی بھی لوگوں کو درستی اور سیدھی راہ کی دعوت نہ دے سکتے۔ ان کی بعثت کا مقصد ہی انسانیت کی نجات تک پہنچانے والے راستے کی طرف راہنمائی کرنا اور اسے اس راستے کی حقیقت بتانا تھا۔

اگر سچائی اور فضائل کوئی روپ دھاریں تو انبیائے کرام کی درخشاں اور معطّر عادات وشمائل کے سوا کسی اور صورت میں ان کا ظہور نہ ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ کی صداقت کے دلائل سے تو ازل سے لے کر ابد تک کا زمانہ بھرا پڑا ہے۔

ہم نے ان دلائل کو تین مجموعوں کے تحت ترتیب دیا ہے۔ یہ ترتیب ہمارے اپنے اجتہاد پر مبنی ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کو ہزاروں مجموعوں کے تحت ہزاروں دلائل کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع کو کسی دوسرے انداز سے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے اور اب مزید کسی اضافے کی گنجائش نہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ مرورِ زمانہ سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا اظہار ہوتا رہے گا اور ہر دور میں لوگ رسول اللہ ﷺ کے کلام کے نئے نئے پہلو اور آپ ﷺ کی صداقت کے نئے نئے دلائل دریافت کرتے رہیں گے اور قیامت کے دن تو رسول اللہ ﷺ کی صداقت سب پر عیاں ہو جائے گی اور ہر کوئی اپنی اپنی روحانی صلاحیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسمائے حسنیٰ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا مشاہدہ کر لے گا اور ہمارے سامنے جنت وجہنم، حور وغلمان اور رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی تمام غیبی باتیں من وعن ظاہر ہو کر زبانِ حال سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دیں گی۔

دوسری فصل: امانت داری

انبیائے کرام کی دوسری اہم صفت امانت داری ہے۔ لفظ ''امانت'' ایمان سے ماخوذ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''مؤمن'' وہ شخص کہلاتا ہے، جو ایمان اور امن پسند طبیعت کا حامل ہو۔ انبیائے کرام جس طرح ایمان کے بلند ترین مقام پر فائز ہوتے ہیں، اسی طرح انہیں امانت داری میں بھی خصوصی مقام حاصل ہوتا ہے۔ انبیائے کرام کی یہ صفت ہر کسی پر واضح ہے۔ قرآن کریم نے انبیائے کرام کی یہ صفت متعدد آیات میں بیان کی، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ()إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ()إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ()فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ﴾(الشعراء: ۱۰۵-۱۰۸) ''قوم نوح نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔'' حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے ارشاد فرما رہے ہیں کہ کیا تم میرے ڈرانے سے ڈرتے نہیں؟ میں تو تمہاری طرف ایسا امین بنا کر بھیجا گیا ہوں، جس نے خیانت کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ اس آیت میں ایک برگزیدہ رسول کی زبانی نبوت کے ایک وصف ''امانت داری'' کا ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: ﴿كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ (123)إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ (124) إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴾(الشعراء: ۱۲۳-۱۲۵) ''اور قوم عاد نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔'' ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ (160)إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ (161)إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (162)﴾۔(الشعراء: ۱۶۱-۱۶۲) ''اور قوم لوط نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے ان کے بھائی لوط نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں؟ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔''

اس موضوع سے متعلق اور بھی آیات ذکر کی جاسکتی ہیں، لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

لفظ ''المؤمن'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین رکھنے والوں کا ایک اہم نام مؤمنین ہے۔ ''المؤمن'' کے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اعتماد و یقین اور سکون و اطمینان کا سرچشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے ہمیں اعتماد و یقین کبھی قطرہ قطرہ کرکے اور کبھی بہتے آبشاروں کی طرح حاصل ہوتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ ہی انبیائے کرام کو صفت امانت داری سے نواز کر آراستہ کرتے ہیں۔ یہی ایمان وامانت داری کے اوصاف ہمیں انبیائے کرام سے اور انہیں اللہ تعالیٰ سے ملاتے ہے، جس سے خالق ومخلوق کے درمیان تعلق پیدا ہوتا ہے، اسی تعلق کا جاننا لفظ امانت کے اشتقاقی مادے سے حاصل شدہ تمام مفاہیم ومطالب میں سب سے اہم ہے۔

امانت داری جس طرح انبیائے کرام اور ہمارے نبی ﷺ کی اہم ترین صفت ہے اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اہم ترین صفت بھی امانت داری ہی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں ہے: ﴿مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ (التکویر: ۲۱) ''(جو) سردار (اور) امانت دار ہے۔'' یقیناً حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار اور اپنی ذمہ داری کی نوعیت کے پیشِ نظر امین ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امن واطمینان کا پیغام دینے والا کلام اپنے امانت دار پیامبر کے ذریعے اپنے نبی کے قلب اطہر پر اتارا، جو تمام امینوں کے سردار ہیں، تاکہ وہ اپنی منتخب امت کو امن کی تعلیم دے کر سب سے زیادہ پرامن بنا دیں۔

قرآن کریم کی برکت سب کو حاصل ہوئی اور ہر ایک نے اپنے اپنے مقام ومرتبے اور ظرف کی مطابق اس سے استفادہ کیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے استفادہ کرنے والوں میں سے تھے، کیونکہ آپ علیہ السلام نے ایک دن رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا: ''میں اپنے انجام کے بارے میں خوفزدہ رہتا تھا، لیکن جب اللہ نے اپنے اس ارشاد میں میری تعریف کی تو مجھے اطمینان ہوا۔'' وہ ارشادِ خداوندی یہ ہے: ﴿ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ () مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ (التکویر: ۲۰-۲۱) ''جو صاحب قوت، مالکِ عرش کے ہاں اونچے درجے والا سردار (اور) امانت دار ہے۔''(173)

امانت داری رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں

امانت داری رسول اللہ ﷺ کا نمایاں ترین وصف ہے۔ آپ ﷺ اُس پیغام خداوندی کے امین تھے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپ ﷺ سے اس امانت میں بال برابر بھی خیانت تصور نہیں کی جا سکتی۔ آپ ﷺ کی ذات تمام مخلوقات کے لیے امین تھی، آپ ﷺ کی امانت داری سب پر واضح تھی، جس کا نتیجہ تھا کہ ہر ایک کو آپ ﷺ پر اعتماد اور اطمینان تھا۔ آپ ﷺ نے اعتماد و یقین کی فضا قائم کی اور سب کے دلوں کو امن و اطمینان سے معمور کیا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف ہمیں امانت کی اہمیت اور ضرورت کا درس دیا، بلکہ ہمیں مکمل طور پر اس کا قائل بھی کیا۔

الف: پیغام خداوندی کے پہنچانے میں امانت داری

اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام بندوں تک پہنچانے کے لیے ایک ایسے امین شخص کا انتخاب کیا، جس نے عمر بھر امانت داری کو پیشِ نظر رکھا۔ آپ ﷺ کو امانت داری کا اس قدر احساس تھا کہ آپ ﷺ نزولِ وحی کے وقت اس بات کی پوری کوشش کرتے کہ کہیں وحی کا کوئی حصہ یاد کرنے سے رہ نہ جائے، اسی اندیشے کے پیشِ نظر ابھی جبرئیل امین ادائیگی وحی سے فارغ نہ ہوئے ہوتے کہ آپ ﷺ ان سے سنے ہوئے الفاظ یاد کرنے کی غرض سے بار بار دہرانے لگتے۔ آپ ﷺ کا یہ شوق و اضطراب اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہاً آپ ﷺ سے ارشاد فرمایا:

﴿لا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ () إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَه () فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَه () ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ (القيامة: ١٦-١٩) ”اور (اے محمد) وحی کے پڑھنے کے لیے اپنی زبان نہ چلایا کرو کہ اس کو جلد یاد کرلو۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے۔ جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اس کو سنا کرو اور) پھر اسی طرح پڑھا کرو پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔“

چونکہ قرآن کریم آپ ﷺ کے پاس امانت تھا، اس لیے اس مقدس امانت کے بارے میں آپ کو خدشہ لگا رہتا کہ کہیں اس میں خیانت نہ ہو جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ آپ فکرمند نہ ہوں، آپ اب بھی امین ہیں اور آئندہ بھی امین ہی رہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے تمام عمر اسی جوش وجذبے کے ساتھ بسر کی۔ آپ ﷺ کو اپنے کندھوں پر ڈالے جانے والی مقدس امانت کے بوجھ کا احساس تھا۔ آپ ﷺ انتہائی اخلاص کے ساتھ اس عظیم امانت کا حق ادا کرنے کے لیے حتی المقدور کوشش کرتے رہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ﷺ کو دنیا سے رحلت کے قرب کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: ”کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے؟“ آپ ﷺ کو علم تھا کہ کل قیامت کے دن صحابہ سے اس بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس کے جواب میں تمام حاضرین نے کہا: ”ہاں، آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا ہے۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اے اللہ! آپ اس پر گواہ رہیں۔“(174)

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس امانت کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ سے شروع ہو کر جبرئیل علیہ السلام سے ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ پر عائد ہوتی ہے اور پھر آپ ﷺ سے آپ کی امت کی طرف

منتقل ہو جاتی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے دوسری بار اپنی امت سے امانت رسالت کے پہنچانے پر گواہی لی اور پھر اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس تشریف لے گئے۔

معتبر کتب احادیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تبلیغ رسالت سے متعلق آپ ﷺ کی امانت داری کے بارے میں درج ذیل روایت مروی ہے: ''اگر محمد ﷺ اللہ کے نازل کردہ احکامات میں سے کسی چیز کو چھپانے والے ہوتے تو آپ اس آیت کو چھپاتے: ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِیٓ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِی فِی نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ﴾ (الأحزاب: ۳۷) ''اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا (یہ) کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور خدا سے ڈر اور تم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ کرتے تھے، جس کو خدا ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ خدا ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔''(175)

یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی خود تربیت فرمائی اور پھر اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا، جسے حضرت زینب بنت جحش نے رسول اللہ ﷺ کے فرمانے پر ناپسندیدگی کے باوجود قبول کر لیا، تاہم دونوں کے درمیان موافقت نہ ہو سکی، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جب زید زینب بنت جحش کو طلاق دے دیں تو آپ زینب سے نکاح کر کے انہیں اپنے حرم میں داخل کر لیں۔ یہ حکم آپ ﷺ کی طبیعت پر گراں گزرا، کیونکہ اہل عرب منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے اور اس کی بیوی کو حقیقی بیٹے کی بیوی کی طرح خیال کرتے تھے، نیز اس سے پہلے حضرت زینب بنت جحش کی والدہ اور آپ ﷺ کی پھوپھی رسول اللہ ﷺ کو حضرت زینب کے رشتے کی پیشکش کر چکی تھیں، جسے آپ ﷺ نے قبول نہ فرمایا تھا، لیکن اب چونکہ یہ حکم خداوندی تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو اس پر عمل کرنا ہی تھا۔ آیت مبارکہ کے اسی پس منظر کے پیش نظر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا: ''اگر محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات میں سے کسی حکم کو چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو چھپا لیتے۔'' لیکن چونکہ آپ ﷺ وحی کے امین تھے، اس لیے آپ ﷺ نے وحی کا ایک حرف بھی نہیں چھپایا۔

ایک دوسرا واقعہ جو غزوہ بدر کے موقع پر پیش آیا تھا آنحضرت ﷺ کی امانت داری کی کھلی دلیل

ہے۔ اس غزوے میں مسلمانوں نے بعض کفارِ قریش کو گرفتار کرلیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ لیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، جبکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ نہ صرف سب کو قتل کر دیا جائے، بلکہ مسلمانوں میں سے ہر ایک اپنے رشتے دار کو قتل کرے۔

رسول اللہ ﷺ کا رجحان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے طرف ہوا اور آپ ﷺ نے فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ اس واقعے کا بقیہ حصہ خود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے:

''... رسول اللہ ﷺ نے میرے مشورے کی بجائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو اختیار فرمایا۔ دوسرے دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیٹھے رو رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ اور آپ کے ساتھی کس سبب سے رو رہے ہیں؟ تاکہ اگر مجھے رونا آئے تو میں بھی روؤں اور اگر مجھے رونا نہ آئے تب بھی آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے بہ تکلف رونے کی کوشش کروں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تمہارے ساتھیوں کی طرف سے کفار سے فدیہ لینے کے مشورے پر رو رہا ہوں۔ ان پر آنے والا عذاب مجھے اِس درخت سے زیادہ قریب دکھایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (67) لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (68) فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (الأنفال: ٦٧-٦٩) ''پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔ اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو (فدیہ) تم نے لے لیا ہے، اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب (نازل) ہوتا۔'' ان آیات میں اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے لیے مالِ غنیمت کو حلال قرار دے دیا ہے۔''[176]

اگر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کتمانِ وحی کا کسی درجے میں بھی احتمال ہوتا تو آپ ﷺ ان آیات کو چھپا دیتے، لیکن آنحضرت ﷺ وحی کے بارے میں انتہائی امین تھے۔ آئندہ صفحات میں عصمت رسول اللہ ﷺ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ بالا آیات پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔

ب: ساری کائنات کے بارے میں امین

جس طرح نبی کریم ﷺ وحی خداوندی کے بارے میں امین تھے، اسی طرح آپ ﷺ ساری کائنات کے بارے میں بھی امین تھے، کیونکہ امانت داری آپ ﷺ کے رگ وپے میں رچی بسی ہوئی تھی۔

آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی درج ذیل واقعے کا ہمارے موضوع کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ امام زہریؒ بیان فرماتے ہیں: ''مجھے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے اور انہیں آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بتایا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں معتکف تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے لیے آئیں، کچھ دیر آپ ﷺ سے گفتگو کی اور پھر جب واپس آنے کے لئے اٹھیں تو نبی کریم ﷺ بھی کھڑے ہو کر ان کے ساتھ چل پڑے۔ جب وہ ام سلمہ کے گھر کے دروازے کے ساتھ والے مسجد کے دروازے کے پاس پہنچیں تو دو انصاری صحابی وہاں سے گزرے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''ذرا ٹھہرو، یہ عورت صفیہ بنت حیی ہے۔'' اس پر ان انصاری صحابہ کو حیرت ہوئی اور عرض کی: "سبحان الله یارسول الله" (بھلا آپ پر کسی کو بدگمانی ہو سکتی ہے؟) نبی کریم ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: ''شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے، اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہارے دلوں میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔''(177)

شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اور اس کے دل ودماغ میں کئی طرح کے خیالات اور وسوسے ڈال سکتا ہے۔ اگر ان دو آدمیوں کے دلوں میں ذرہ برابر بھی شبہ پیدا ہو جاتا کہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ یہ عورت کون ہے؟ تو العیاذ باللہ ان کی ابدی زندگی شدید خطرے میں پڑ جاتی اور ان کے دلوں میں ایمان کی شمع بجھ جاتی، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جو پیکر رحمت وشفقت ہیں، جلدی سے معاملے کی وضاحت فرما کر ایک طرف اپنی امانت کا اظہار فرماتے ہیں تو دوسری طرف اپنے صحابہ کے ایمان کو بچا لیتے ہیں۔

آپ ﷺ کو امن اور امانت داری کا اس قدر اہتمام تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیا آپ ﷺ کا نام بعثت سے پہلے ''امین'' نہ تھا؟(178) کیا آپ کے سخت ترین دشمن بھی آپ کی امانتداری کا اعتراف نہ کرتے تھے؟ آپ ﷺ اس قدر امین تھے کہ اگر آپ ﷺ کے سخت ترین دشمن ابوجہل سے پوچھا جاتا کہ وہ اپنی قیمتی ترین دولت بلکہ اپنی عزت وشرف کس کے پاس امانت رکھنا پسند کرے گا؟ تو وہ بلا تردد کہتا: ''اُمّی (یعنی رسول امین ﷺ) کے پاس۔''

یقیناً اس کے ذہن میں آپ ﷺ کے سوا کسی اور کا خیال بھی نہ آتا... یہ تھی رسول اللہ ﷺ کی امانت داری کی قدر و منزلت۔

آنحضرت ﷺ اس قدر امانت دار تھے کہ ایک دفعہ ایک عورت نے اپنے بچے کو یوں کہتے ہوئے بلایا: ''آؤ، میں تمہیں کوئی چیز دوں گی۔'' اس پر آنحضرت ﷺ نے اس عورت سے دریافت فرمایا: ''تمہارا اسے کیا دینے کا ارادہ تھا؟'' اس عورت نے بتایا: ''میں اسے کھجور دیتی۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اسے کچھ نہ دیتی تو تمہارے اعمال نامے میں جھوٹ لکھ دیا جاتا۔''(179)

چونکہ رسول اللہ ﷺ جھوٹ کو نفاق کی علامت سمجھتے تھے، اس لیے آپ ﷺ لوگوں کو اس سے بچانے کی ہر ممکن کوشش فرماتے۔ جھوٹ نفاق کی تین علامتوں میں سے ایک ہے۔ باقی دو علامتیں وعدہ خلافی کرنا اور امانت میں خیانت کرنا ہے۔(180) لہٰذا جس قدر رسول اللہ ﷺ نفاق سے دور تھے، اسی قدر آپ ﷺ امانت میں خیانت سے دور تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی امانت داری صرف انسانوں تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر مخلوق اس سے مستفیض ہوئی۔ اس کی وضاحت حضرت عبد الرحمٰن بن عبد اللہ کے والد سے مروی درج ذیل واقعے سے ہوتی ہے:

''ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپ ﷺ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے تو ہم نے ایک چھوٹا سا پرندہ دیکھا، جس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم نے اس پرندے کے بچوں کو پکڑا تو وہ آ کر پھڑ پھڑانے لگا۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو فرمایا: ''اسے اپنے بچوں کی وجہ سے کس نے تکلیف میں مبتلا کیا؟ اس کے بچے اسے لوٹا دو۔'' گویا رسول اللہ ﷺ یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ روئے زمین پر امن اور امانت داری کے علم بردار لوگوں کو اس قسم کے کام زیب نہیں دیتے۔

آپ ﷺ کے بابرکت صحابہ کرام جنھوں نے آپ ﷺ سے کسبِ فیض کیا، سب کے سب امین تھے۔ جب ابو عبیدہ بن جراحؓ جو حضرت عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں شام کے گورنر تھے، نے سنا کہ ہرقل شام کو واپس لینے کے لیے ایک لشکر جرار تیار کر رہا ہے اور آپؓ کے پاس صرف ایک چھوٹی کی جماعت تھی، جو دمشق شہر کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی تو آپؓ نے دمشق کے باشندوں کو جمع کر کے ان سے کہا: ''ہم نے تم سے شہر کی حفاظت کے عوض جزیہ لیا تھا، لیکن اب ہم ہرقل کے مقابلے میں تمہاری

حفاظت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم جزیے کا مال تمہیں واپس کر رہے ہیں، کیونکہ ہم بلا وجہ یہ مال اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔"

چنانچہ جزیے کی مد میں لئے گئے اموال مالکوں کو واپس کر دیئے گئے۔ یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر راہب اور پادری اپنی عبادت گاہوں کی طرف دوڑ پڑے اور اللہ تعالیٰ سے مسلمانوں کی نصرت اور بقا کی گڑگڑا کر دعا مانگی اور مسلمانوں کو الوداع کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "تم ان شاء اللہ جلد واپس آؤ گے اور ہمیں ہرقل کے ظلم و ستم سے نجات دلاؤ گے۔"(181)

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اس قدر امانت داری اور للّٰہیت کے ساتھ زندگی بسر کی کہ نصاریٰ کے دلوں کو جیت لیا۔ آج اگر اہل مغرب ہمیں اہمیت نہیں دیتے یا یورپ جانے والے مسلمانوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو اس میں ہمارا اپنا قصور ہے اور یہ ہمارے اپنے عیوب کا نتیجہ ہے۔ اعتماد، امن اور امانت داری جیسی اہم صفات ہم میں ناپید ہیں۔ اگر ہم اپنے اندر یہ صفات دوبارہ پیدا کر لیں تو انسانیت فوراً ایک قابل اعتماد ملت کو پا لے گی اور ہم دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

خلافت عثمانیہ کی وسیع اور عالمگیر حکومت کے تناظر میں بھی امن و امان کے قیام کی اہمیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جب عثمانی فوجیں جنگی مہمات کے دوران باغات کے پاس سے گزرتیں تو وہ جو پھل ان باغات سے توڑتیں ان کی قیمت درختوں کے ساتھ لٹکا دیتیں۔ انہی عظیم انسانی اعمال کی بدولت وہ بزورِ شمشیر شہر فتح کرنے سے پہلے شہر کے باشندوں کے دل جیت لیتے تھے۔ وگرنہ صلیبی بغض و کینہ کے ہوتے ہوئے یورپ کے کسی شہر کو فتح کرنا ممکن تھا اور نہ ہی فتح کو برقرار رکھنا، لیکن مسلمانوں نے بلقان اور یورپ میں چار سو سال تک حکومت کی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کی امانت داری پر قائم تھے، جس کا نتیجہ تھا کہ وہ بہت کم جانی نقصان اٹھا کر ویانا (Vienna) کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ اس سارے عرصے میں مسلمان امن اور سکون کا نمونہ تھے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ترکی میں جمہوریت کے قیام کے بعد امن قائم کرنے کے لیے جتنا خون بہا اتنا خون مختلف یورپی اقوام میں امن کے قیام کے لیے ان پانچ صدیوں کے دوران نہیں بہا...

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کی ابتدائی چھ صدیوں کی تمام جنگوں میں جتنے لوگ شہید ہوئے ان کی تعداد ان لوگوں سے بہت کم ہے، جو صرف آخری نصف صدی کی جنگوں میں کام

آئے۔ لہذا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ عثمانی فاتحین صرف اپنی عسکری قوت پر بھروسا کرتے تھے، کیونکہ اگر ہم اُس زمانے کے وسائل نقل وحمل کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس قدر وسیع وعریض سلطنت کا نظم ونسق صرف عسکری قوت کے بل بوتے پر چلانا قطعاً ناممکن تھا۔

دراصل ان کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ کسی علاقے کو فتح کرنے سے پہلے اس علاقے کے باشندوں کے دلوں کو فتح کیا کرتے تھے۔ اسی خوبی کی بدولت انہوں نے اتنے لمبے عرصے تک بغیر کسی بڑی مشکل کا سامنا کئے مختلف نسلوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک چھت اور ایک حکومت کے سائے تلے جمع رکھا۔ لوگوں کے دلوں کو جیت کر ان تک رسائی حاصل کرنا دورِ حاضر کے داعیانِ اسلام کی ذمہ داری ہے اور اس راستے پر چلنا ان پر لازم ہے۔

ج: امت کو امن کی دعوت

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے خود وحی خداوندی کی امانت کی حفاظت کی، اسی طرح آپ نے اپنی امت کو بھی امانت داری کی تلقین کی، لوگوں کے درمیان امین بن کر رہنے کی وصیت فرمائی اور خیانت کی معمولی سے معمولی صورت کو ممنوع قرار دیا، اسی لیے غیبت کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے۔

ایک عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور جب جانے کے لئے اٹھی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کو اس عورت کے کوتاہ قد ہونے کا اشارہ کیا، اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس عورت کی غیبت کی۔''(182)

حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ بدکاری میں مبتلا ہونے والی عورت کے رجم کے واقعے میں بھی نبی کریم ﷺ نے اسی قسم کی تنبیہ فرمائی تھی۔(183)

نبی کریم ﷺ ہمیشہ یہ دعا فرماتے اور اپنی امت کو بھی اس کی وصیت فرماتے: " اللّٰهم انی أعوذُبِكَ من الجوع ،فانه بئس الضجيع،وأعوذبك من الخيانة،فانها بئست البطانة." ''اے اللہ میں بھوک سے پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ وہ بری ہمخواب ہے اور خیانت سے بھی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ وہ بری ہمراز ہے۔''(184)

جس قدر آپ ﷺ امانت داری کا اہتمام فرماتے، اسی قدر صحابہ کرام کو خیانت کے ارتکاب سے بچانے کی کوشش فرماتے، کیونکہ ان دونوں باتوں کا باہم گہرا تعلق ہے۔ آپ ﷺ خیانت کرنے والوں کے انجام بد کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اولین و آخرین کو جمع فرمائیں گے تو ہر خیانت کرنے والے کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا: ''یہ فلاں ابن فلاں کی خیانت ہے۔''(185)

رسول اللہ ﷺ ہر خیر و بھلائی کا کام کرتے اور ہر برے کام سے محفوظ رہتے۔ آپ ﷺ کی تمام عمر امن و سکون کی فضا میں بھلائی کے کام کرتے گزری۔ انسانیت نے آپ ﷺ پر اطمینان اور مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور جس نے بھی آپ ﷺ سے دشمنی اختیار کر کے آپ سے منہ پھیرا اس نے نقصان اٹھایا۔ آپ ﷺ نے اپنی رحمت کی چادر ہر ایک کے لیے بچھائی اور جو بھی آپ ﷺ کی چوکھٹ پر حاضر ہوا آپ ﷺ نے اس کی دادرسی فرمائی۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ امین تھے ،اسی طرح آپ ﷺ امن، سکون اور خدا پر بھروسے کے جذبات سے سرشار تھے۔ آپ ﷺ کا توکل علی اللہ آپ ﷺ کی امن اور امانت داری کی صفات کی معراج اور آپ ﷺ کے رجوع الی اللہ کا مظہر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی کریم ﷺ کی ذات پرامانت داری کا نزول ہوتا اور پھر امن کی صورت میں آپ ﷺ کی شخصیت میں اس کا ظہور ہوتا اور جب اس کمان کی دونوں جانبیں باہم قریب آ کر ایک ہو جاتیں تو عمومی امن کا قیام عمل میں آتا۔

ہر نبی کو توکل علی اللہ کا امتیازی مقام حاصل تھا۔ یہ انبیائے کرام کی لازمی صفات اور ان کے اخلاق کریمہ کا حصہ تھا۔ قرآن کریم میں انبیائے کرام کے اس خلق کو متعدد آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ﴾ (یونس: ۷۱) ''اور ان کو نوح کا قصہ پڑھ کر سنادو جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم! اگر تم کو میرا تم میں رہنا اور خدا کی آیتوں سے نصیحت کرنا ناگوار ہو تو میں تو خدا پر بھروسا رکھتا ہوں۔ تم اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر ایک کام (جو میرے بارے میں کرنا چاہو) مقرر کرلو اور وہ تمہاری تمام جماعت (کو معلوم ہو جائے اور کسی) سے پوشیدہ نہ رہے پھر وہ کام میرے حق میں کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔''

حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد تھا، جس کی بنیاد پر آپ علیہ السلام کفار سے فرماتے ہیں:

''اگر تمہیں میری دعوت و تبلیغ پسند نہیں تو تم جو چاہو کرو۔ مجھے اپنے اللہ پر بھروسا ہے۔ اگرچہ تم زیادہ اور میں اکیلا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ مجھے ضائع نہیں کریں گے۔ تم میرے خلاف اکٹھے ہو کر مشورے کرلو، سازشیں بنالو، اپنے مددگاروں کو بھی بلالاؤ اور میرے خلاف جو کر سکتے ہو کرلو۔ میں تمہارے انتظار میں ہوں۔ تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔''

چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور حفاظت کے وعدے پر پختہ یقین تھا، اس لئے آپ علیہ السلام کفار کو مقابلے کے لیے بلاتے اور ان سے یہ سب باتیں کہتے۔ اگرچہ ہمیں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہونے والے افراد کی یقینی تعداد معلوم نہیں، لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ بہت سے انبیائے کرام جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہیں، حضرت نوح علیہ السلام

کی نسل اور اولاد میں سے تھے، چنانچہ قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت نوح علیہ السلام کی جماعت میں سے قرار دیا گیا ہے: ﴿وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ﴾ (الصافات: ۸۳) ''اور انہی کے پیرووں میں ابراہیم تھے۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے جو بات کہی تھی وہی بات حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے ارشاد فرمائی: ﴿قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ( ) مِن دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعاً ثُمَّ لاَ تُنظِرُونِ ( ) إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم مَّا مِن دَآبَّةٍ إِلاَّ هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (هود: ٥٤-٥٦) ''انہوں نے کہا کہ میں خدا کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جس کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو میں اس سے بیزار ہوں (یعنی جن کی) خدا کے سوا (عبادت کرتے ہو) تو تم سب مل کر میرے بارے میں (جو) تدبیر (کرنی چاہو) کر لو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میں خدا پر جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے بھروسا رکھتا ہوں۔ (زمین پر) جو چلنے پھرنے والا ہے وہ اس کی چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے۔ بے شک میرا پروردگار سیدھے رستے پر ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا کیا، جسے قرآنِ کریم درج ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَاؤُا مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَداً حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ رَّبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ (الممتحنة: ٤) ''تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء کی زندگیوں میں اسوۂ حسنہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں۔ (اور) تمہارے (معبودوں کے کبھی) قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کھلم کھلا عداوت اور دشمنی رہے گی۔ ہاں ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ (ضرور) کہا کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا اور خدا کے سامنے آپ کے بارے میں کسی چیز کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہمارا بھروسا ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ کر آنا ہے۔''

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حضرت ابرہیم علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں نے ہمیشہ کفار کے خلاف علم بغاوت بلند کیے رکھا اور انہیں یہ کہہ کر چیلنج کرتے رہے کہ جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو ہم ان

سے بری ہیں، ہم تمہیں پسند کرتے ہیں اور نہ تمہارے معبودوں کو اور جب تک تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے اس وقت تک ہمارے اور تمہارے درمیان مخالفت و دشمنی برقرار رہے گی۔

اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان یہ مخاصمت حضرت آدم علیہ السلام سے چلی آرہی ہے۔ ایمان اور کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں کا ایک جگہ پایا جانا ممکن نہیں۔ کفار نے ہمیشہ ایمان کی شمع بجھانے کی کوشش کی ہے، کیونکہ جس طرح چمگادڑیں روشنی میں نہیں رہ سکتیں اسی طرح اہل کفر ایمان اور اس کی روشنی سے تنگدل ہوتے ہیں۔ حضرت ابرہیم علیہ السلام کے پیروکار کفار سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اس وقت تک دشمنی بغیر کسی کمی کے قائم رہے گی جب تک تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اسی پر اعتماد و بھروسا نہ کرو گے۔

کفر اور ایمان کے تضاد کا باعث کفر کے بنیادی مفہوم میں پایا جانے والا سقم اور کج روی ہے۔ کافر ہر چیز کو مخالفت کی نظر سے دیکھتا ہے، جبکہ مؤمن انسانی اوصافِ کریمانہ سے آراستہ ہوتا ہے، اس کی نظر میں دنیا اخوت و بھائی چارے کا گہوارہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مؤمن شخص ہمیشہ دوسروں سے اتفاق اور مکالمے کی تلاش میں رہتا ہے، جبکہ کافر شخص کو دوسروں کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں لذت و راحت محسوس ہوتی ہے۔ سب انسانوں کا اللہ عزوجل پر ایمان لے آنا بین الاقوامی امن کی اساس و بنیاد ہے، جبکہ کافروں سے امن و امان کی توقع کرنا خام خیالی اور نادانی ہے، کیونکہ کفار کے پاس اقوام عالم کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکانے کے سوا انسانیت کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایمان و کفر کے درمیان صحیح معنی میں گفت و شنید ناممکن ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے جو گفتگو فرمائی تھی، باوجود اس کے کہ وہ گفتگو محض والد کی محبت سے پھوٹنے والی ایک خواہش کا نتیجہ تھی، قرآن مجید نے اسے ایک استثنائی صورت قرار دیا ہے، نیز حضرت ابرہیم علیہ السلام نے یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ وہ اللہ کے ہاں اپنے والد کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ پر اپنے اسی بھرپور اعتماد اور بھروسے کا اظہار کرتے ہوئے آپ علیہ السلام نے فرمایا تھا ﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ (الممتحنة: ٤) ''اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہمارا بھروسا ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے رہیں اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ کر آنا ہے۔''

اگر انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات زندگی کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو ان کا اللہ تعالیٰ

کی ذات پر اعتماد و یقین اور توکل کھل کر سامنے آجائے گا۔ ان کا توکل عام لوگوں یا کسی فرد کے توکل کی مانند نہ تھا۔ جب عام انبیائے کرام کے توکل علی اللہ کی یہ شان ہے تو سید الانبیاء خاتم النبیین ﷺ کے توکل کا کیا مقام ہوگا؟

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو "حسبی اللہ" (اللہ مجھے کافی ہے) کہنا سکھایا، جس کے بعد آپ ﷺ نے ساری زندگی اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین اور بھرپور اعتماد کے ساتھ گزاری۔ آپ ﷺ کے اللہ تعالیٰ پر اعتماد و یقین کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ جیسے بہادر شخص آپ ﷺ کے بارے میں فرماتے ہیں: ''جنگ بدر میں ہم آپ ﷺ کے پیچھے پناہ لیتے پھرتے تھے۔ آپ ﷺ دشمن کے سب سے زیادہ قریب تھے اور سب سے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔''(186)

د: بے پناہ توکل

ہجرت کے موقع پر جب آپ ﷺ گھر سے روانہ ہوئے تو آپ کا گھر مبارک چاروں طرف سے ایسے لوگوں کے گھیرے میں تھا جو نعوذ باللہ آپ ﷺ کے قتل کا پختہ ارادہ کر چکے تھے، لیکن حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَجَعَلْنَا مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا﴾ (یٰس: ۹) ''اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنادی اور ان کے پیچھے بھی پھر ان پر پردہ ڈال دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے۔'' اور اس کے ساتھ ہی مٹھی بھر مٹی ان کافروں کے چہروں پر پھینکی اور بغیر کسی پریشانی کا اظہار کیے پورے اطمینان کے ساتھ ان کے نرغے سے باہر تشریف لے آئے۔(187)

آپ ﷺ کا دل پرسکون اور بہادرانہ جذبات سے معمور تھا۔ یہاں سے نکل کر آپ ﷺ غارِ ثور کی طرف تشریف لے گئے...غارِ ثور پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے، جس تک پہنچتے پہنچتے نوجوانوں کے دانتوں کو بھی پسینہ آجاتا ہے، (اس وقت حضور ﷺ کی عمر مبارک ۵۲ سال تھی) لیکن آپ ﷺ کی زندگی مصائب ومشکلات سے عبارت تھی اور یہ آخری مشکل تھی، گویا آپ ﷺ نے غارِ ثور کی دعوت قبول کرتے ہوئے اسے چند دنوں کی میزبانی کا شرف بخشا۔

کچھ دیر بعد مشرکین مکہ بھی غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ ایک میٹر یا اس سے بھی کم فاصلہ باقی رہ گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے قرار اور فکر مند ہوئے اور ان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا، کیونکہ وہ رسولِ خدا ﷺ کو اپنے پاس امانت سمجھتے تھے، انہیں یہ فکر کھائے جارہا تھا کہ اگر یہ امانت اپنی منزل تک نہ پہنچی تو کیا ہوگا؟ لیکن آپ ﷺ کے بارونق چہرے میں کچھ تغیر نہ ہوا۔ آپ ﷺ مطمئن اور پرسکون تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے فرما رہے تھے: ''اے ابوبکر! خوف زدہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں۔'' (التوبہ) آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''تمہارا ایسے دو شخصوں کے بارے میں کیا خیال ہے، جن کا تیسرا ساتھی خود حق تعالیٰ ہیں؟''(188)

غزوہ حنین کے آغاز میں ہی اسلامی لشکر دائیں بائیں بکھرنے لگا اور سب کو یقین ہوگیا کہ معرکے کا اختتام مسلمانوں کی شکست فاش کی صورت میں ہوگا، لیکن اس وقت بھی رسولِ خدا ﷺ اپنے گھوڑے جسے حضرت عباس رضی اللہ عنہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے کو دشمنوں کی صفوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بارعب آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے:

أنا النبي لا كذب   أنا ابن عبد المطلب (189)

''میں اللہ کا نبی ہوں، اس دعوے میں جھوٹ کا کوئی شائبہ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

آپ ﷺ کی یہی بہادری تھوڑے سے وقت میں اسلامی لشکر کے دوبارہ اکھٹے ہونے کا باعث بنی، جس کے نتیجے میں شکست فتح مبین میں بدل گئی۔

ایک اور موقع پر نبی کریم ﷺ غزوہ ذات الرقاع سے واپسی پر ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ غورث بن حارث نامی ایک کافر آپ کے پاس آیا، درخت کے ساتھ لٹکتی ہوئی آپ ﷺ کی تلوار اتاری اور آپ کی گردن مبارک کے قریب کر کے استہزا کے انداز میں کہنے لگا: ''آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟'' رسول اللہ ﷺ بالکل پریشان نہ ہوئے، کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ یقین تھا، آپ ﷺ نے اسے جواب میں صرف اتنا ارشاد فرمایا: ''اللہ'' یہ جواب سن کر اس شخص کے اوسان خطا ہو گئے اور پریشانی کے عالم میں تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

نبی کریم ﷺ نے تلوار اٹھالی اور اس سے فرمایا: ''اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟'' (190) یہ سن کر وہ کافر ہوا میں سوکھے پتے کی مانند کانپنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ کی آواز سن کر مسلمان دوڑے آئے اور یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اصل صورتِ حال جان کر ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے غورث کو معاف فرما دیا۔

معروف مغربی مفکر جارج برنارڈ شو (George Bernard Shaw) لکھتا ہے: ''محمد کی شخصیت کے بہت سے حیران کن اور عظیم پہلو ہیں۔ اس پراسرار انسان کو کماحقہ سمجھنا ممکن نہیں، خاص طور پر اس کا حق تعالیٰ پر کامل اعتماد ایک ایسا راز ہے، جسے سمجھنا کسی صورت ممکن نہیں۔''

آپ ﷺ کے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد کو عام معیاروں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ پر اسی کامل ایمان و یقین اور توکل کی وجہ سے آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا بلند مقام و مرتبہ حاصل تھا کہ آپ کی دعا سے رات دن میں، اندھیرا اجالے میں اور کوئلہ ہیرے میں بدل سکتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے دنیا بھر میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرنے کا درس دیا، اس لیے آپ ﷺ کی امت کو بھی امن اور اللہ کی ذات پر اعتماد کا داعی ہونا چاہیے۔ ایک آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ

النَّاسِ أَن تَحۡكُمُواْ بِالۡعَدۡلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعاً بَصِيراً(النساء:٥٨) ”خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔ بیشک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے۔“

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس آیت کا سببِ نزول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن طلحہ سے بیت اللہ شریف کی چابیاں لے کر خود خانہ کعبہ کو کھولا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے کعبے کی چابیاں مانگیں، لیکن چونکہ آپ ﷺ کو علم تھا کہ اس امانت کی حفاظت کرنے کے زیادہ حقدار حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے اس آیت کے نزول کے بعد بیت اللہ شریف کی چابیاں دوبارہ حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیں۔ (191)

تاہم آیت مبارکہ میں بیان کردہ حکم عام ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے امانت میں خیانت کرنے اور اس بارے میں غفلت برتنے کو قیامت کی علامات میں شمار کیا ہے۔ جب ایک بدوی نے آپ ﷺ سے قیامت کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب امانت میں خیانت کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو۔“ بدوی نے وضاحت چاہی کہ امانت میں خیانت سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب معاملات نااہل افراد کے سپرد کر دیے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو۔“ (192)

یقیناً امانت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ معاملات اہل افراد کے سپرد کرنا امانت کہلاتی ہے، جو نظامِ عالم کو برقرار رکھنے کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔ امانت میں خیانت نظامِ عالم کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔ جس دنیا میں بددیانتی عام اور بدنظمی کا دور دورہ ہو اس کا وجود اور عدم برابر ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: ”تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ حاکم نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ آدمی اپنے اہل خانہ کا نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ خادم اپنے آقا کے مال واسباب کا نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔“ (193)

اس جامع حدیث کے ضمن میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہر شخص دوسروں کے بارے میں امین ہے۔ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے پاس امانت ہے۔ قرآن کریم پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے

پاس امانت تھا پھر یہ رسولِ خدا ﷺ کے پاس امانت بنا اور اب تمام قرآنی تعلیمات اور آپ ﷺ کی نبوت امت مسلمہ کے پاس امانت ہے اور ساری امت اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس امانت ہے۔

زندگی کے اجزائے ترکیبی اور معاشرے کے لازمی عناصر باہم مربوط حلقوں کی مانند ہیں، جن میں سے کسی ایک کو بھی لاحق ہونے والی خرابی کے اثرات کئی گنا زیادہ ہو کر دوسرے حلقوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو اس بارے میں شک وشبہ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی ایک فرد میں موجود خرابی کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو بلاشبہ یہ خرابی بہت جلد ناقابل علاج خرابی اور کینسر کی صورت اختیار کر جائے گی۔ ہر قسم کی خرابیوں سے نجات کے لیے ہر حلقے پر لازم ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا کرے۔

حدیث شریف میں اسی باہمی تعلق اور رابطے کی طرف اشارہ ہے، جس کی روشنی میں اگر چوکیدار سے لے کر سربراہِ مملکت تک امت کے تمام افراد امانت کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لیں تو ایسے امانت دار افراد سے تشکیل پانے والا مثالی معاشرہ اس مثالی شہر کی مانند ہوگا، جس کا تصور بعض مفکرین نے پیش کیا ہے۔

امانت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جو شخص امانت دار نہیں وہ ایمان دار بھی نہیں۔''(194)

یعنی جو شخص اپنے پاس رکھی امانت کی حفاظت نہیں کرتا اس کا ایمان کامل نہیں، کیونکہ ایمان اور امانت میں سے ہر ایک کو دوسرے کے لیے سبب اور مسبب کی حیثیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے ہاں امانت داری کا پایا جانا بہت مشکل ہے۔

جس شخص کا ایمان کامل ہوتا ہے وہ امین بھی ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ امین نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا ایمان کامل نہیں۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ مؤمن کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مؤمن وہ شخص ہے، جس سے لوگوں کی جانیں اور مال محفوظ ہوں۔''(195)

میں اس مقام پر اس حدیث کو دوبارہ ذکر کرنا چاہوں گا جسے میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی بحث میں ذکر کر چکا ہوں، کیونکہ اس کا امانت کے موضوع کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم اپنے بارے میں مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دو میں تمہارے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔''(196)

۱- ''جب بات کرو تو سچ بولو۔'' یعنی تمہاری گفتار و کردار صداقت و استقامت کے ساتھ متصف ہونی چاہیے۔ تمہیں نیزے کی مانند راست باز ہونا چاہیے۔

۲- ''جب وعدہ کرو تو اسے پورا کرو۔'' وعدہ خلافی منافقت کی علامت ہے۔ اس کی مختصر تشریح گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

۳- ''تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو اسے ادا کرو۔'' یعنی اگر کوئی تمہیں امانت دار سمجھ کر تمہارے پاس امانت رکھوائے تو اپنے بارے میں اس کے گمان پر پورا اترو، بلکہ قیامت کے دن بھی اپنے بارے میں اس کے حسن ظن کو بدگمانی میں نہ بدلنے دو۔

۴- ''اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو۔'' یعنی اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرو اور دوسروں کی عزت کی حفاظت بھی ایسے ہی کرو جیسے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتے ہو۔ (''عفت'' کی بحث میں اس کی مزید تفصیل آئے گی)

۵- ''اپنی نظروں کو جھکائے رکھو۔'' یعنی جس چیز کے تم مالک نہیں اس پر نظر نہ کرو، کیونکہ حرام چیز کو دیکھنا دل کو برباد کر دیتا ہے، اسی لیے ایک حدیث قدسی میں ارشادِ خداوندی ہے: ''نگاہ ابلیس کے زہر آلود تیروں میں سے ایک تیر ہے، جس نے اسے میرے ڈر سے چھوڑا میں اسے ایسے ایمان سے بدل دوں گا، جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔''(197)

۶- ''اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو۔''(198) یعنی کسی کو تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ نہ اٹھاؤ۔

یہ وہ شرائط ہیں، جن کا کسی بھی انسان کے امین بننے کے لیے پایا جانا ضروری ہے۔ ایسا شخص لوگوں کے لیے اطمینان و سکون کا باعث ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں امین بن کر زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت کو محفوظ بنالیتا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ مذکورہ بالا شرائط کو پورا کرنے والے شخص کے لیے جنت کے ضامن ہیں۔

دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کے معاملات امانت دار لوگوں کے سپرد کیے جائیں، اگر عالم اسلام اپنے ذمے عائد ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے ادا کرے اور دنیا میں امن کا علم بردار بن جائے تو دنیا میں اعتدال و استحکام پیدا ہو سکتا ہے، بصورتِ دیگر نہ صرف ترکی، بلکہ پوری دنیا کے حالات ایسے کربناک ہو جائیں گے، جس کی شدت سے دل پھٹ جائیں گے۔

ہ: اے اُمید کی کرن

تم نے دوبارہ دنیا میں تعلیم دین کی ترویج واقامت کے لیے اٹھنا ہے۔۔تم ہی اس عظیم روشنی کے سرچشمے کی باقی ماندہ روشنی ہو، جس نے تاریکی میں ڈوبے عالم میں ہر سو اجالا کیا اور طوبیٰ کے درخت [199] کی مانند ایمان کا ایسا درخت پروان چڑھایا، جس نے اپنے پتوں اور پھولوں سے سارے عالم کو ڈھانپ لیا۔

عنقریب تم ہی توفیق خداوندی سے دنیا کو اِس تاریک دور سے چھٹکارا دلا کر اُس تابناک دور کو واپس لاؤ گے، جب بین الاقوامی معاملات میں امت مسلمہ کی ہر بات فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی۔ ہر ایک تم سے یہ امید وابستہ کیے ہوئے ہے۔ یہ امید نہ صرف روئے زمین پر بسنے والوں کی ہے، بلکہ زیرِ زمین مدفون لوگ بھی تم سے یہی توقع رکھتے ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ بھی تم سے یہی امید رکھتے ہیں، جو روحانی اعتبار سے تمہارے درمیان موجود ہیں اور تمہارے کندھوں پر تھپکیاں دیتے ہوئے تم پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، اگرچہ تم انہیں دیکھتے ہو اور نہ ہی انہیں محسوس کرتے ہو۔

اگر تم امانت دار رہو اور تمہارے پائے استقامت میں تزلزل نہ آئے تو تم دنیا میں امن وسکون پھیلا سکتے ہو، جس کے ذریعے انسانیت کے دل تمہارے لیے موم ہو جائیں گے اور تم دلوں پر ایسے ہی حکمرانی کرنے لگو گے، جیسے کبھی تمہارے آبا واجداد انسانیت کے دلوں پر حکمرانی کیا کرتے تھے، لیکن یہ کبھی نہ بھولنا کہ اس مقصد اور بلندی تک پہنچنے کی شرط یہ ہے کہ تم اپنے کندھوں پر ڈالی گئی ذمہ داری کو امانت داری سے ادا کرو۔ اگر ہم ایسی امت بننا چاہتے ہیں، جس کی بات کا بین الاقوامی معاملات میں وزن ہو اور جو بین الاقوامی توازن قائم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم حق، امن، انصاف اور استقامت کا مثالی نمونہ بنیں۔

تیسری فصل: تبلیغ

تبلیغ انبیائے کرام کی تیسری اہم صفت ہے۔ آپ اسے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ اور بیان کا نام دیں یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہیں دونوں کا حاصل ایک ہی ہے، دونوں صورتوں میں آپ نبوت سے متعلق ایک اہم حقیقت بیان کریں گے۔

تبلیغ ہر نبی کی بعثت کا مقصد ہے، جس کے بغیر انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت بے فائدہ و بے مقصد رہتی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو معبوث فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانِ عظیم کا اظہار فرمایا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیّت اور رحیمیّت انبیائے کرام کی زندگیوں میں ظہور پذیر ہوئی، جسے تبلیغ کے بغیر دوسروں تک پہنچانا ناممکن تھا۔ جس طرح سورج اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا مظہر ہے، جس سے ہر صبح روشن ہوتی ہے، حرارت کی ضرورت پوری ہوتی ہے، کھانے کی اشیاء اس کی تپش سے پکتی ہیں اور نقاش کے قلم کی مانند خوبصورت رنگوں سے رنگین حسن و جمال کی تختیاں تیار ہوتی ہیں، اسی طرح انبیائے کرام علیہم السلام بھی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا مظہر ہیں، خصوصاً ہمارے نبی ﷺ بنی نوعِ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیّت اور رحیمیّت کی تجلی کا بہترین نمونہ تھے، جن کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷) ''اور (اے محمد) ہم نے تم کو تمام جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اگر آپ ﷺ کی تشریف آوری نہ ہوتی اور آپ انبیائے سابقین کی دعوت کا احیائے نو نہ فرماتے تو ہم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی تجلی نہ ہوتی اور ہم کفر، گمراہی اور جہالت کے صحراؤں میں سرگرداں رہتے۔

جب انسانیت جہالت اور بے چینی کا شکار تھی تو اس وقت نبی کریم ﷺ کی حیات افروز آواز نے انسانیت کے کانوں پر دستک دی اور لوگوں کو انبیائے سابقین کی باتیں بتائیں، جس کے نتیجے میں یوں لگا گویا دنیا خوشگوار بہار اور ایسے سرسبز و شاداب باغ میں بدل گئی ہے، جس میں ہزاروں قسم کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہزاروں بلبلیں باغیچوں میں ٹہنیوں پر چہچہا رہی ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ کی آمد نہ ہوتی تو انسانیت بے چینی، حیرت اور تنہائی سے پاگل ہو جاتی۔

ہم کون ہیں؟ دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ اور کہاں جا رہے ہیں؟ جیسے محیر العقول سوالات سے

قریب تھا کہ ہمارے دماغ پھٹ جاتے۔ ہم ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات دینے سے عاجز تھے۔ عمر بھر ان مصائب کو سہتے رہنا ہمارا مقدر بن چکا تھا۔ جب ہم چشم تصور سے قبر میں اپنی ہڈیوں کو بوسیدہ ہوتے دیکھتے تو خوف سے ہمارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ یہ اس عدم کا خوف تھا، جس کی طرف ہم لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہے تھے۔ یہ خوف ہماری زندگیوں کو دائمی جہنم بنا چکا تھا، جن میں راحت وسکون کا نام ونشان نہ تھا۔

انبیائے کرام علیہم السلام نے آ کر ہمیں زندگی کا مقصد دیا اور موت کی حقیقت کے بارے میں بتایا، جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں ہماری آمد کا ایک مقصد ہے اور دنیا سے ہماری رحلت بھی حکمت پر مبنی ہے۔ موت کی حقیقت فنا یا عدم نہیں، بلکہ یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے اور ایک اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہونے سے عبارت ہے۔ قبر ایک انتظار گاہ اور آخرت کی پہلی منزل ہے۔ انبیائے کرام سے یہ باتیں سن کر ہمارا خوف دور ہوا اور اس کی جگہ انس اور مسرت نے لے لی۔

انبیائے کرام علیہم السلام اس قسم کے پیغامات لے کر مبعوث ہوئے، جنہیں لوگوں تک پہنچانا ان کا مقصد حیات تھا۔ ہم تبلیغ کو صرف ضروری سمجھتے ہیں، جبکہ انبیائے کرام علیہم السلام تبلیغ کو مقصد اور ہدف سمجھ کر سرانجام دیتے اور اسے دنیا میں اپنی آمد کی حکمت کا راز سمجھتے تھے، گویا انبیائے کرام علیہم السلام زبانِ حال سے فرما رہے ہیں: ”دنیا میں ہماری آمد کا مقصد اس کے سوائے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر سو ظلمت میں گھرے لوگوں کو تاریکی سے باہر لانے کے لیے مبعوث فرمایا تاکہ لوگ بغیر کسی انحراف کے صراط مستقیم پر چل سکیں، شیطان کو ان کے نفوس تک رسائی حاصل ہو سکے اور نہ ہی وہ انہیں سیدھے راستے سے بہکانے کی کوشش کر سکے۔“ ہماری اور انبیائے کرام کی تبلیغ میں ایک بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ ہم تبلیغ کو ایک ذمہ داری سمجھ کر کرتے ہیں، جبکہ انبیائے کرام علیہم السلام اسے اپنی زندگیوں کا مقصد اور تخلیق کا راز سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں۔

تبلیغ کے تین اصول

بلاشبہ ایک نبی کا پیغام نبوت دوسروں تک پہنچانا ایک عام انسان کے فریضہ تبلیغ کو سرانجام دینے سے بالکل مختلف ہے، ایک تو اس لیے کہ انبیائے کرام کے پیغام نبوت کو وصول کرنے کی نوعیت دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے، دوسرے وہ فریضہ تبلیغ کے دوران ہمیں تبلیغ کی حقیقت اور اسے ادا کرنے کا طریقہ سکھاتے ہیں، اس سے ان کے فریضہ تبلیغ کو ایک اور جہت حاصل ہوتی ہے۔

آیئے اب ہم اس مضمون کو تین قواعد کی صورت میں پیش کرتے ہیں:

۱- جامعیت وہمہ گیری

انبیائے کرام علیہم السلام پیغام خداوندی کی تبلیغ اہل علم اور اس شعبے کے متخصصین کی طرح اصول وقواعد کے مطابق صحیح طریقے سے کرتے ہیں، کیونکہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے ایک ناقابل تقسیم کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور پھر اسی مکمل فریم ورک میں انسان کے سامنے پیغام خداوندی بغیر کسی کمی بیشی کے پیش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وحی کے انوارات سے عقل، منطق، دل، احساسات اور شعور میں سے کوئی بھی محروم نہیں رہتا۔

وحی کے سامنے ہر نبی ایسے ہی ہوتا ہے جیسے مردہ غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، وحی جس طرف چاہتی ہے ان کا رخ پھیر دیتی ہے، حتی کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی مشیت ایزدی کی پیروی کرتے ہیں اور یہ انبیائے کرام کے لیے ناگزیر بھی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے کرام وحی کے بارے میں بہت محتاط اور حساس ہوتے ہیں۔

جو دعوت وتبلیغ انبیائے کرام علیہم السلام کے اسلوبِ دعوت سے ہم آہنگ نہ ہو وہ کامیاب نہیں ہوتی، مثلاً اگر دعوت وتبلیغ کے وقت عقلی پہلو کو نظر انداز کردیا جائے تو تبلیغ ثمرآور نہ ہوگی، یہی نتیجہ دوسرے حواس اور احساسات کو نظر انداز کرنے کی صورت میں نکلے گا۔ وحی کے دائرے سے نکلنے والوں سے دور رہیے، کیونکہ وہ کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ وحی الٰہی سے ہٹ کر جتنے انسانی نظام قائم ہوئے ان کا انجام دیکھئے اور ان کی ناکامیوں کا مشاہدہ کیجیے۔

اشتراکی نظام جسے بہت سے غریب اور دھوکے میں مبتلا لوگوں نے ایک عرصے تک گلے سے لگائے

رکھا اور جس کا خواب بہت سے غریب ملکوں نے دیکھا، تجدید و اصلاح کے بہت سے مراحل سے گزرنے کے باوجود اپنے آپ کو ناکامی سے نہ بچا سکا۔ اشتراکی نظام اور اس جیسے دوسرے نظاموں کے بانیوں نے اپنے آپ کو جھوٹے انبیاء کے طور پر پیش کیا تھا۔ جو لوگ انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کو رائج کرنے کی کوشش کریں گے وہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے اور جلد یا بدیر دھوکے میں مبتلا ہونے کا اعتراف کریں گے۔

نبی اپنے دعوتی مشن میں عقل و منطق اور جذبات کو ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے، وہ سڑکوں پر پرزور مظاہرے کروانے کے لیے عوام کے جذبات سے کھیلتا ہے اور نہ ہی ایک مفکر کی طرح ایک گوشے میں خلوت نشینی اختیار کر کے عوام کو عمومی اور مثبت سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکتا ہے۔ جس طرح وہ عوام میں بدامنی پھیلا کر سڑکوں کو بند نہیں کرتا اسی طرح وہ عوام کے جذبات کی بالیدگی و نمو کی راہ میں بھی رکاوٹ نہیں بنتا۔ وہ تو اپنے پروردگار کا پیغام ان کے دلوں میں جاگزیں کرتا ہے۔ ان میں کام اور نشاط کا جذبہ ابھارتا ہے اور انہیں آسمانِ انسانیت کی بلندیوں پر لے جا کر فرشتوں کی صف میں جا کھڑا کرتا ہے۔ قرآن کریم اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ﴿قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ (یوسف: ۱۰۸) ”کہہ دو میرا راستہ تو یہ ہے۔ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں (از روئے یقین و برہان) سمجھ بوجھ کر میں بھی (لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا ہوں اور میرے پیرو بھی۔“

یہ راستہ انبیائے کرام، عقل، منطق اور حکمت کا راستہ ہے، لیکن اس میں جذبات، دل اور وجدان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر ایک کو مناسب مقام حاصل ہے۔ انبیائے کرام اور ان کے پیروکار اس راستے کی پیروی کرتے ہوئے پوری بصیرت کے ساتھ راہِ حق کی دعوت دیتے ہیں۔

۲- دعوت بلا معاوضہ

نبی دعوت و تبلیغ کو اپنا مقصد اور ذمہ داری سمجھتا ہے اور کسی بدلے یا معاوضے کا منتظر نہیں رہتا۔ تمام انبیاء کا ایک ہی شعار ہے: ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (یونس: ۷۲؛ ہود: ۲۹) ”میرا اصلہ تو خدا کے ذمے ہے۔“(200)

۳- نتائج بہ سپردِ خدا

چونکہ انبیائے کرام علیہم السلام جانتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری صرف پیغامِ حق کی تبلیغ ہے، باقی انجام، قبولیت اور نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد ہیں، اس لیے وہ دعوت و تبلیغ کے نتائج و ثمرات کی فکر نہیں کرتے۔

دعوت و تبلیغ کے ان تین بنیادی اصولوں کو ذکر کرنے کے بعد اب، ہم نبوت کے حوالے سے دعوت و تبلیغ کا مفہوم پیش کریں گے، نیز ان اسالیب اور طریقوں پر بھی روشنی ڈالیں گے، جنہیں مبلغین حضرات کو دعوت و تبلیغ کے دوران ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ ذمہ داری اپنی مرضی کے مطابق نبھانے کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی ہمارے دلوں میں دعوت و تبلیغ کا شوق و جذبہ پیدا کیا ہے، اسی کے دست قدرت میں اسے سرانجام دینے کی توفیق ہے اور ہم اسی پر بھروسا اور اعتماد کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا کہ ہر نبی کی سوچ و فکر اور اپنی دعوت پر مرکوز ہوتی ہے۔ کتنے ہی انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی ساری زندگیاں دعوت کی خاطر جدوجہد میں صرف کیں، لیکن ان پر کوئی ایک نفس بھی ایمان نہ لایا،(201) لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن رہے، کیونکہ انہوں نے اپنی ذمہ داری بخوبی نبھادی تھی، چنانچہ عمر بھر ان کی زبان پر کوئی اعتراض آیا اور نہ ہی انہوں نے اس قسم کے سوالات کیے کہ میری دعوت کامیاب کیوں نہ ہوئی؟ مجھ پر کوئی ایمان کیوں نہ لایا؟ میری کوششیں اکارت کیوں گئیں؟ مجھے پے در پے ناکامیوں کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟ اس کی بجائے ہر نبی صرف اپنی دعوت کی فکر میں رہتا کہ لوگوں کو دعوت کیسے دے؟ اسی وجہ سے ہر نبی ہر قسم کے حالات کو اہمیت دیتے ہوئے ان کی روشنی میں اپنی ذمہ داری سرانجام دیتا تھا۔ دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں کامیابی انبیائے کرام علیہم السلام کی ذمہ داری میں شامل نہ تھی، بلکہ یہ معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد تھا، چنانچہ درج ذیل آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب کی صورت میں اسی چیز کی وضاحت کی گئی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ (القصص: ۵۶) ''(اے محمد) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔''

آیت کریمہ میں بیان کردہ معیار کے مطابق پیغام نبوت کا ایک خاص وصف ہوتا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نبی پر ایک انسان بھی ایمان نہ لائے تو بھی اس سے نہ تو اس کے جذبات ٹھنڈے پڑتے ہیں، نہ وہ پریشانی و بے چینی کا شکار ہوتا ہے اور نہ ہی وہ دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے فریضے اور ذمہ داری کی ادائیگی میں مگن رہتا ہے۔

مختلف قسم کے توہین آمیز سلوک کا سامنا کرنے کے باوجود انبیائے کرام علیہم السلام نے کبھی اپنے مشن میں سستی کا مظاہرہ نہ کیا۔ دعوت و تبلیغ کا یہ انداز صرف انبیائے کرام علیہم السلام کا ہی طرۂ امتیاز ہے۔ غیر نبی میں اس کا مکمل طور پر پایا جانا ناممکن ہے، کیونکہ عام طور پر غیر نبی میں ایسے مواقع پر کسی نہ کسی حد تک دل شکنی اور رنجیدگی دیکھنے میں آتی ہے۔ انبیائے کرام کے سوا دیگر مبلغین اور داعی حضرات جس قدر بھی پختہ

کار کیوں نہ ہوں، ان کے دل میں اپنی دعوت پر ثمرات کے مرتب ہونے کی خواہش ضرور ہوتی ہے اور جب دعوت کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوتے تو وہ کبیدہ خاطر اور ناامید ہو جاتے ہیں۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام کا ہی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ اس طرح کے احساسات سے محفوظ ہوتے ہیں۔

دیکھئے رسول اللہ ﷺ کو غزوہ احد میں المناک حادثات کا سامنا کرنا پڑا... آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے... خود کی کڑیاں آپ ﷺ کے چہرہ انور میں گھس گئیں، جنہیں نکالنے کی کوشش میں حضرت ابو عبیدہؓ کے دانت شہید ہو گئے،(202) آپ کا اس قدر خون بہا کہ چہرہ انور خون سے رنگین ہو گیا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کبیدہ خاطر ہوئے اور نہ ہی رنجیدہ، بلکہ آپ ﷺ نے اپنے لہولہان چہرے کے ساتھ اپنے ہاتھ بارگاہ الٰہی میں بلند فرما کر یہ دعا فرمائی: ﴿اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون﴾(203) ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت نصیب فرما، کیونکہ وہ جانتی نہیں۔''

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کے سامنے سرنگوں ہوئی تو اس نے اپنی جانیں آپ پر نچھاور کر دیں، مذکورہ بالا واقعہ اور اس جیسے دیگر واقعات رسول اللہ ﷺ کی وسعت ظرف پر گواہ ہیں۔

آپ ﷺ اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے، بلکہ رضائے الٰہی کی خاطر بغیر کسی شکایت اور ملامت کے تکالیف برداشت کرتے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ آپ نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الأعراف: ٦١) ''انہوں نے کہا: اے قوم مجھ میں کسی طرح کی گمراہی نہیں ہے، بلکہ میں پروردگارِ عالم کا پیغمبر ہوں۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بات اس وقت کہی جب انہوں نے آپ علیہ السلام پر گمراہی کا الزام لگاتے ہوئے کہا تھا: ﴿إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (الأعراف: ٦٠) ''ہم تمہیں صریح گمراہی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں۔''

دورِ حاضر میں مبلغین اور داعی حضرات پر جو گمراہی، رجعت پسندی اور تاریک دور میں رہنے کے الزامات لگائے جاتے ہیں یہ وہی پرانے الزامات ہیں، جن کا سامنا انبیائے کرام کو کرنا پڑا تھا۔

قرآنِ کریم میں ایک دوسرے مقام پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے اس الزام کا درج ذیل جواب دیا ہے: ﴿أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الأعراف: ٦٢) ''تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور مجھ کو خدا کی طرف سے ایسی باتیں معلوم ہیں جن سے تم بے خبر ہو۔''

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے فرما رہے ہیں کہ میں گمراہ نہیں... بلکہ تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہیں ان گمراہیوں سے نکالنا چاہتا ہوں، جن میں تم مبتلا ہو، کیونکہ میں پروردگارِ عالم کی جانب سے تمہاری طرف رحمت اور نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ تم تک اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاؤں اور تمہاری راہنمائی کروں، کیونکہ مجھے وہ باتیں معلوم ہیں، جو تمہیں معلوم نہیں۔

عرصہ دراز گزرنے کے باوجود اہل کفر میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ () أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾ (الأعراف: ٦٧-٦٨) ''انہوں نے کہا کہ میری قوم! مجھ میں حماقت کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ میں رب العالمین کا پیغمبر ہوں۔ میں تمہیں خدا کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔''

انبیائے کرام علیہم السلام کے جوابات میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ ہی ان کی اقوام کے الزامات میں کوئی تغیر آیا۔ صرف بعض کلمات اور جملوں کے فرق کے ساتھ وہی الزامات ہیں اور وہی جوابات۔

مذکورہ بالا عمومی قاعدے کے ضمن میں دیگر انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ہم روئے سخن سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی طرف پھیرتے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ()قُمْ فَأَنذِرْ ()وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ (المدثر: ١-٣) ''اے (محمد!) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو، اٹھو اور ہدایت کر دو اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو۔'' ﴿يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ()قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلاً ()نِصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلاً ()أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً﴾ (المزمل: ١-٤) ''اے (محمد!) جو کپڑے میں لپٹ رہے ہو، رات کو قیام کیا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔''

یعنی اے کپڑے میں لپٹنے والے! سونے کا زمانہ گزر گیا ہے۔ تاریکی میں چلنے والوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ اٹھو اور بھٹکے ہوؤں کو غلط راستے پر چلنے اور گمراہی وانحراف کے انجام سے ڈراؤ اور اپنے پروردگار کی اتنی بڑائی بیان کرو کہ زمین وآسمان جھوم اٹھیں اور ہر جن وانس کو تمہارے پروردگار کی کبریائی کا اندازہ ہو جائے۔

اے خلیل! اے رات کو اپنی چادر میں لپٹنے والے! بارِ نبوت کی صورت میں ایک بھاری ذمہ داری تمہارے انتظار میں ہے۔ اٹھیے اور اپنے پروردگار کی عبادت کیجیے۔ آپ کو اپنے پروردگار کی

تائید وحمایت کی ضرورت ہے، کیونکہ آپ نے بہت بڑی ذمہ داریاں سرانجام دینی ہیں۔آپ نے خدا کی بتائی ہوئی ہر بات لوگوں تک پہنچانی ہے۔ایسی مشکل ذمہ داری کو آپ تائید خداوندی کے بغیر سرانجام نہیں دے سکتے اور تائید خداوندی کا حصول عبادتِ خداوندی کے بغیر ممکن نہیں۔

ہمارے نبی ﷺ کی طرح ہر نبی نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی سے معاوضے کی امید رکھے بغیر تبلیغ کے لیے دنیا میں آیا ہے۔اس کا دل کسی چیز یا انسان میں اٹکا ہوا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی آنکھیں دنیا کے مال واسباب پر اٹھتی ہیں۔وہ بصارت کی طہارت سے محروم ہوتا ہے اور نہ ہی بصیرت کی پاکیزگی سے۔وہ وحی خداوندی کے ذریعے انسانیت کی مدد کرتا ہے۔اگر انبیائے کرام ان نورانی پیغامات کو مخلوقِ خدا تک نہ پہنچاتے تو انسانیت تاریکی میں ڈوبی رہتی اور جانوروں اور انسانوں میں کوئی قابل ذکر فرق نہ رہتا۔

اولادِ آدم کی تقدیر کا انبیائے کرام کی بعثت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔نبی کی بعثت سے پہلے کسی بھی امت سے اس کے بعض افعال پر باز پرس نہیں ہوتی،لیکن اگر نبی کی بعثت کے بعد وہ اسے ماننے سے انکار کردے اور اس کی باتوں پر کان نہ دھرے تو بلاشبہ اس کا محاسبہ ہوتا ہے۔قرآن کریم اسی فرمانِ خداوندی کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولاً ﴾ (الاسراء: ۱۵) ''اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔''

ایک دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَى حَتَّى يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولاً يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُون ﴾ (القصص: ۵۹) ''اور تمہارا پروردگار بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک ان کے بڑے شہر میں پیغمبر نہ بھیج لے، جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے مگر اس حالت میں کہ وہاں کے باشندے ظالم ہوں۔''

اللہ تعالیٰ پہلے انبیائے کرام کو بھیجتے ہیں، لیکن اگر انبیائے کرام کے فریضہ تبلیغ کی ادائیگی کے باوجود انسان انکار پر اصرار ہی کرتا چلا جائے تو ایسا انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

یہ بات ہر دور اور ہر عہد پر صادق آتی ہے۔اگر آج بعض لوگ عذابِ خداوندی میں مبتلا ہیں تو اس کا فریضہ تبلیغ کی کما حقہ ادائیگی یا عدم ادائیگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔جو لوگ دعوت کے پہنچنے کے بعد بھی عناد و سرکشی پر اصرار کرتے ہیں وہ بجا طور پر سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام نے بغیر کسی اکتاہٹ اور تھکاوٹ کے دعوت و تبلیغ کے لیے ہر ذریعہ اور اسلوب اختیار کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام قرآنِ کریم کی زبانی فرماتے ہیں: ﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ()فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ()وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ()ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ()ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ()فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا﴾(نوح:۵۔۱۰)"(نوح نے خدا سے) عرض کی کہ پروردگار میں اپنی قوم کو رات دن بلاتا رہا، لیکن میرے بلانے سے وہ اور زیادہ گریز کرتے رہے۔ جب میں نے ان کو بلایا کہ (توبہ کریں اور) تو ان کو معاف فرمائے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور کپڑے اوڑھ لیے اور اٹھ گئے اور اکڑ بیٹھے پھر میں ان کو کھلے طور پر بھی بلاتا رہا اور ظاہر اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا اور کہا کہ اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔"

ان آیات مبارکہ میں حضرت نوح علیہ السلام فریاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اے میرے پروردگار! میں نے رات دن اپنی قوم کو دعوت اور ان کے دروازوں پر دستک دی، لیکن میری دعوت کے نتیجے میں وہ مجھ سے اور دور بھاگے، سرکشی اختیار کی اور میری بات پر کان تک نہ دھرے، بلکہ انہوں نے میری آواز اپنے کانوں تک پہنچنے سے روکنے کے لیے طرح طرح کے طریقے ایجاد کر لیے۔ کبھی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تو کبھی سروں پر کپڑے اوڑھے میرے پاس سے ایسے گزر جاتے جیسے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔

ج: نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ کے تناظر میں تبلیغ کی اہمیت

الف: آپ ﷺ کی دعوت کے اہم اصول

دعوت وتبلیغ کے چند اہم اصول ہیں، جن میں سے بعض کا اوپر ذکر گزر چکا ہے۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ ان کا دوبارہ ذکر کریں گے تا کہ مزید اصول وضوابط کا ذکر کر کے اس بحث کی تکمیل کی جا سکے۔

اول: دعوت وتبلیغ کی ادائیگی کے دوران فراست سے کام لینا۔ آپ اسے ''نبوی منطق'' کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

دوم: دعوت کے لیے اچھا نمونہ بننا۔ صاحب دعوت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ہر پہلو اپنی دعوت کے مطابق ڈھالے اور دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے خود اس پر عمل کرے اور اس کے مطابق زندگی گزارے۔

سوم: دعوت کا مقصد صرف رضائے خداوندی کا حصول ہو، اس کے سوا کوئی اور مقصد حتی کہ جنت کا حصول بھی داعی کے پیش نظر نہیں ہونا چاہیے، دوسرے لفظوں میں داعی کو تمام مادی اور روحانی فوائد کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ا۔ باطنی فراست

رسولِ خدا ﷺ کی دعوت کا ایک پہلو فراست بھی ہے، لیکن یہاں فراست سے خشک منطقی اسلوب مراد نہیں، بلکہ ایسا منطقی اسلوب مراد ہے، جو ظاہر و باطن اور دنیا و آخرت پر محیط ہو۔ جس طرح انسان کی زندگی کا ایک جذباتی پہلو ہے، اسی طرح اس کی زندگی کا ایک پہلو منطقی طرزِ فکر بھی ہے۔ جو لوگ صرف انسانی جذبات واحساسات کو پیش نظر رکھ کر انسان کو مخاطب بناتے ہیں، انہیں بعض اوقات انسان کے منطقی طرز فکر کو نظر انداز کرنے کے باعث ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن نبی کریم ﷺ انسان کے حواس، عقل اور وجدان سب کو بیک وقت پیش نظر رکھتے تھے۔ آپ ﷺ انسان کو مخاطب کرتے وقت حسی اور مادی اشیاء کو نظر انداز کرنے کی بجائے انہیں اس کی روح تک پہنچنے کے ذریعے کے طور پر استعمال فرماتے۔ آپ ﷺ عقل کو استعمال فرماتے اور اس کے استعمال کی دعوت دیتے، نیز منطقی طرز استدلال اور عقلی دلائل کو اہمیت دیتے اور ان کے مطابق لوگوں کے ضمیروں کو

جھنجوڑتے۔ جس نے بھی اپنے وجدان میں آپ ﷺ کی گفتگو سنی وہ حقیقت تک ان لوگوں کی بہ نسبت پہلے پہنچ گیا، جو صرف وجدان کو ہی مخاطب بناتے ہیں، چنانچہ پاسکل (Pascal) اور برگساں (Bergson) جیسے فلاسفہ جنہوں نے وجدان (Intuition) کے ذریعے خدا تک پہنچنے کی کوشش کی، کا مقام نبی کریم ﷺ کے تربیت یافتہ شاگردوں سے بہت فروتر ہے، باوجود اس کے کہ یہ ان فلاسفہ کا اختصاصی شعبہ تھا، نیز شمائل و اخلاق کے اعتبار سے تو انہیں کسی ادنی مؤمن کے بھی مساوی قرار نہیں جا سکتا۔

جس طرح زندگی کے کسی دوسرے شعبے میں محمد عربی ﷺ کے مرتبے کو نہیں پہنچا جا سکتا، اسی طرح فراست کے معاملے میں بھی آپ ﷺ کی ہمسری ممکن نہیں۔ آپ ﷺ نے اپنی خداداد بصیرت کے ذریعے اپنے دشمنوں پر غلبہ پا کر انہیں اپنا مطیع وفرمانبردار بنایا، مثلاً آپ ﷺ بتوں کی طرف اپنی انگلی اٹھا کر فرماتے: ''تم لوگ ان پتھروں، لکڑیوں اور مٹی سے کیا توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہو؟'' آپ ﷺ اپنے مخاطب سے اس کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرنے کے بعد اسے غیر معمولی انداز میں اور بسا اوقات معجزاتی طور پر اپنے دل کے قریب لے آتے اور پھر دھیرے دھیرے اسے ایمان کے رنگ میں رنگ کر ایمان کی چاشنی چکھاتے یہاں تک کہ بالآخر اس میں ایک نئی شخصیت جنم لیتی، جس کا نصب العین صرف آخرت کی زندگی ہوتا۔

اس بات کی وضاحت کے لیے ہم حضرت عمرؓ کی روحانی سیرت کو پیش کر سکتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: ''مجھے نہیں معلوم کہ عمر جیسا عقلمند انسان ہدایت سے کیسے محروم رہ سکتا ہے؟ اور پتھروں اور بتوں سے کیا امیدیں لگائے بیٹھا ہے؟''

آپ ﷺ اس طرح کی گفتگو سے حضرت عمرؓ کی تعریف فرماتے، عقلی طرز فکر کے مطابق گفتگو فرماتے اور ان کے دل میں اپنی جگہ بنا کر انہیں اپنی مٹھی میں لے لیتے۔ آپ ﷺ کا انداز باعث اطمینان وسکون ہوتا۔ تیسرے مرحلے میں آپ ﷺ نے اپنی اعلیٰ درجے کی بندگی کی بدولت حضرت عمرؓ جیسے زبردست انسان کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ آپ کے سامنے ایسے دوزانوں ہو کر باادب بیٹھے جیسے کوئی شاگرد اپنے عظیم معلم کے سامنے باادب بیٹھتا ہے۔

دوسرے اصولوں پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ایک اور مخصوص مثال پیش کرنا مناسب معلوم ہوتی ہے۔

ایک نوجوان رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صحابہ کرام اس کا نام ذکر نہیں کرتے، لیکن اگر تمام روایات کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوان جلیبیبؓ تھے۔ اس نوجوان نے عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ! مجھے زنا کی اجازت دیجیے۔'' اس پر حاضرین مجلس اسے برا بھلا کہنے اور خاموش کرانے لگے، لیکن آپ ﷺ نے اسے قریب آنے کے لیے کہا، چنانچہ وہ آپ ﷺ کے قریب آکر بیٹھ گیا اور حضور ﷺ اور اس کے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا:

حضور ﷺ: کیا تم یہ بات اپنی والدہ کے لئے پسند کرتے ہو؟

جلیبیب: میری جان آپ پر قربان۔ خدا کی قسم! ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔ کیا تم یہ بات اپنی بیٹی کے لئے پسند کرتے ہو؟

جلیبیب: یارسول اللہ! میری جان آپ پر قربان ہو۔ ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔ کیا تمہیں یہ بات اپنی بہن کے لئے پسند ہے؟

جلیبیب: میری جان آپ پر فدا ہو۔ خدا کی قسم! ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی بہنوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔ کیا تم یہ بات اپنی پھوپھی کے لئے پسند کرتے ہو؟

جلیبیب: میری جان آپ پر قربان۔ خدا کی قسم! ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی پھوپھیوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔ کیا تم اپنی خالہ کے لئے یہ بات پسند کرتے ہو؟

جلیبیب: میری جان آپ پر فدا۔ خدا کی قسم! ہرگز نہیں۔

حضور ﷺ: دوسرے لوگ بھی اپنی خالاؤں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا اور دعا فرمائی: ''اے اللہ اس کے گناہ معاف فرما دیجیے، اس کے دل کو پاک کر دیجیے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرمائیے۔'' اس کے بعد وہ نوجوان کسی غلط طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ (204)

ایسی منطقی گفتگو کے ذریعے نبی کریم ﷺ نے نوجوان کے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر اسے اپنی منشا کے تابع کر لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس نوجوان کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھ کر یہ دعا فرمائی: ''اے اللہ! اس کے گناہ معاف فرما، اس کے دل کو پاک فرما اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما۔'' اس دعا کے نتیجے میں جلیبیبؓ پیکرِ عفت بن گئے، لیکن چونکہ ان کی گزشتہ زندگی سب کے سامنے تھی، اس لیے کوئی بھی ان کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے ذاتی دلچسپی لے کر ان کا رشتہ کرایا۔(205)

تاہم وہ شادی کے بعد پہلے ہی معرکے میں شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے اختتام پر دریافت فرمایا: ''کیا تم کسی کو گم پاتے ہو؟'' صحابہ کرامؓ نے عرض کی: ''جی ہاں، فلاں فلاں شخص موجود نہیں۔'' آپ ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: ''کیا تم کسی کو گم پاتے ہو؟'' صحابہ نے عرض کی: ''جی ہاں فلاں فلاں شخص بھی موجود نہیں۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے پھر پوچھا: ''ان کے علاوہ بھی کسی کو گم پاتے ہو؟'' صحابہ نے عرض کی: ''نہیں۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لیکن مجھے جلیبیب دکھائی نہیں دے رہا، اسے تلاش کرو۔'' چنانچہ صحابہ کرامؓ نے اسے شہداء میں تلاش کیا تو اسے سات مشرکین کے درمیان پایا، جنہیں قتل کرنے کے بعد خود بھی ان کے ہاتھوں شہید ہو گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور اس کے پاس کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا: ''اس نے سات آدمیوں کو قتل کیا اور پھر ان کے ہاتھوں قتل ہو گیا، یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں''۔(206)

دیکھیے کس طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی فراست سے گناہ کے کنارے پر کھڑے شخص کی دستگیری فرمائی اور پھر انتہائی مختصر وقت میں اسے کس قدر بلند مقام پر پہنچا دیا۔ یہ بات یقیناً خرد کے لیے بھی حیرانی کا باعث ہے۔

فرض کیجیے اگر سب کے سب ماہرین نفسیات و تربیت جزیرہ نمائے عرب چلے جائیں تو کیا وہ اتنی کم مدت میں اتنی اعلیٰ تربیت اور اخلاق سازی کا کام سرانجام دے سکتے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا ہے؟ اس کا جواب قطعی طور پر نفی میں ہے۔ وہ نہ صرف اس درجے کی اعلیٰ تربیت اور اخلاق سازی کرنے میں ناکام ہوں گے، بلکہ عملی تجربے سے ثابت ہے کہ اس درجے کی تربیت کے ابتدائی اہداف کو بھی نہ پا سکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہر قسم کی برائیاں عام ہو کر لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھیں، لیکن آپ ﷺ نے نہ صرف دلوں کو ان برائیوں سے پاک فرمایا، بلکہ انہیں عمدہ اور اعلیٰ ترین اخلاق سے

مزین بھی فرمایا۔ انسانیت نے اس قسم کے اخلاق پہلے کبھی دیکھے تھے اور نہ آئندہ کبھی دیکھے گی۔ اسلامی تاریخ اس کی صادق شاہد ہے، کیونکہ اس کے اوراق میں اس قسم کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ شاید دورِ حاضر میں بعض بری عادات کو چھڑانے کے لیے کی جانے والی کوششوں کی ناکامی بھی ہمارے اس دعوے کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مثال کے طور پر دورِ حاضر میں بعض ممالک اپنی پوری انتظامی قوت سے تمباکو نوشی کا سدِّ باب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سی وزارتیں اس کام پر کمر بستہ ہیں، سینکڑوں اہل علم اس مقصد کے لئے سیمینارز منعقد کرتے ہیں، طباعت خانے تمباکو نوشی کے نقصانات پر مشتمل کتابیں دھڑا دھڑ شائع کر رہے ہیں اور اعلانات، علامات اور پروپیگنڈے کے ذریعے اس کے نقصانات کی تشہیر کی جاتی ہے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود نتائج صفر ہیں۔

لیکن دوسری طرف ذرا رسول اللہ کی تربیت یافتہ جماعت کو دیکھئے۔ آپ ﷺ کے ارشادات کو کس قدر تیزی سے عملی زندگی میں نافذ کر دیا جاتا تھا، اس کی وضاحت درج ذیل مثال سے ہوتی ہے۔

حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں: ''...میں حضرت ابو طلحہ اور چند دیگر حضرات کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر کہا: ''کیا تمہیں خبر نہیں پہنچی؟'' لوگوں نے پوچھا: ''کونسی خبر؟'' اس نے کہا: ''یہی کہ شراب حرام ہوگئی ہے۔'' یہ سن کر حاضرین مجلس نے کہا: ''اے انس! شراب کے ان مٹکوں کو بہا دو۔'' اطلاع ملنے کے بعد انہوں نے دوبارہ شراب پی اور نہ ہی اس کے بارے میں پوچھا۔''(207)

آپ ﷺ نے یہ سب کچھ کر کے دکھایا۔ اگر کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو ہم اسے جزیرہ نمائے عرب آنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ وہ یہاں آپ ﷺ کی حاصل کردہ کامیابیوں کا لاکھواں حصہ حاصل کر کے دکھائے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ یہ کام کبھی بھی نہ کر سکے گا۔

۲- دعوت کو پہلے خود اپنانا

نبی کریم ﷺ کی دعوت کا ایک اہم اسلوب اپنی زندگی کو مکمل طور پر اپنے منصب کے مطابق ڈھالنا تھا۔ آپ ﷺ کی گفتار و کردار اور دعوت و عمل میں اس قدر ہم آہنگی تھی کہ آپ ﷺ کو دیکھنے والے کسی اور دلیل کا مطالبہ کیے بغیر ہی اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے۔ آپ کو ایک بار دیکھ لینا ہی آپ ﷺ کے پیغمبر خدا ہونے کی کافی دلیل تھی، چنانچہ حضرت عبداللہ بن رواحہ کہتے ہیں:

لولم تكن فيه آيات مبينة لكان منظره ينبئك بالخبر (208) ''اگر رسول اللہ ﷺ میں کوئی اور واضح نشانی نہ ہوتی تو بھی آپ ﷺ کی صورت ہی لوگوں کو آپ کے سچے ہونے کی خبر دے دیتی۔''

جو لوگ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے، آپ کی خدمت میں اپنے دل پیش کیے اور آپ کو یا رسول اللہ کہہ کر مخاطب کیا، اُنہی نے آپ ﷺ کے بعد زمانے بھر کی باگ ڈور سنبھالی۔ آپ ﷺ کو حاصل ہونے والی کامیابی آپ پر ایمان لانے والے چند ایک افراد تک محدود نہ تھی، بلکہ آپ پر ایمان لانے والوں میں ابوبکر، عمر، عثمان اور علی جیسی عظیم شخصیات شامل تھیں، جن میں سے ہر ایک زمانے بھر کی قیادت کی اہلیت رکھتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی شخصیت نہ تھی جو ہر آنے والے کی اطاعت قبول کر لیتی۔ اگر انہیں رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور سے واسطہ پڑتا تو وہ اس پر ایمان لاتے اور نہ ہی اس کی اطاعت قبول کرتے۔ میرے نزدیک حضرت علی بن ابی طالبؓ جیسے شخص کا رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا، جو کہتا ہو کہ اگر میرے سامنے سے پردہ غیب اٹھا دیا جائے تو اس سے میرے یقین میں اضافہ نہ ہو گا اور جو حق الیقین کے مقام پر فائز ہو، رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی ایک مستقل دلیل ہے۔ آپ ﷺ کی ہر ادا ہی انتہائی پرتاثیر اور مسحور کن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی عالم عبداللہ بن سلام نے آپ ﷺ کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہی فرمایا تھا: ''مجھے یقین ہے کہ یہ کسی جھوٹے شخص کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔''(209)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا محض دیدار ہی آپ ﷺ پر ایمان لانے کے لیے کافی تھا، جن لوگوں نے اپنی آواز اور افکار دوسروں تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگیاں فنا کر دیں وہ اس مقام کی مشکلات سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ آگاہ ہیں، کیونکہ یہ حضرات عمر بھر انتھک محنت کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں گنتی کے چند افراد کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، لیکن دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو دیکھئے، کیا آپ ﷺ جیسی کوئی اور شخصیت ہے، جو تقریباً ایک ارب افراد کے دلوں میں بستی ہو؟ کیا آپ کے سوا کوئی اور ایسا شخص ہے، جس کا نام اطراف عالم میں میناروں پر سے روزانہ پانچ مرتبہ پکارا جاتا ہو؟ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دشمن اداروں اور افراد کے آپ ﷺ کے خلاف سرگرم رہنے کے باوجود انسانیت نہ صرف آپ ﷺ سے محبت کرتی ہے، بلکہ اس محبت کا روزانہ پانچ مرتبہ اظہار بھی کرتی ہے۔

حاصل یہ کہ رسول ﷺ آج بھی لوگوں کے دلوں پر راج کر رہے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس بات کی لوگوں کو دعوت دی اسے پہلے اپنی زندگی میں اپنایا اور جن اصولوں کی طرف دوسروں کو بلایا خود ان کا عملی نمونہ بن کر دکھایا، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ کی گفتگو لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتی اور ان کی عملی زندگی میں اپنا مقام پیدا کر لیتی تھی۔

جب آپ ﷺ لوگوں کو عبادتِ خداوندی کی دعوت دیتے تو خود بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی کی اعلیٰ

ترین مثال قائم کرتے تھے، چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ، حضور ﷺ کے اپنے ہاں رات کے قیام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''چھوڑو! میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں۔'' میں نے عرض کی: ''جس طرح مجھے آپ کا قرب پسند ہے، اسی طرح یہ بھی پسند ہے کہ آپ اپنے پروردگار کی عبادت فرمائیں۔'' چنانچہ آپ ﷺ مشکیزے کے پاس گئے اور وضو فرمایا، لیکن وضو کرتے ہوئے پانی زیادہ نہیں بہایا، اس کے بعد کھڑے ہو کر نماز ادا فرمانے لگے اور اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی پھر آپ ﷺ نے سجدہ فرمایا اور سجدے میں اتنا روئے کہ زمین بھیگ گئی، پھر آپ پہلو کے بل لیٹ گئے اور روتے رہے یہاں تک کہ جب حضرت بلال آپ کو صبح کی نماز کے لیے بلانے آئے تو انہوں نے دریافت کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! آپ اس قدر کیوں رو رہے ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے گزشتہ اور آئندہ سب گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بلال! خدا تیرا ناس کرے، میں کیوں نہ روؤں جبکہ آج رات مجھ پر درج ذیل آیات نازل ہوئی ہیں: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۰) ''بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس شخص کے لیے ہلاکت ہے، جس نے ان آیات کو پڑھا، لیکن ان میں غور و فکر نہ کیا۔''(210)

آپ ﷺ اس قدر نماز پڑھتے کہ آپ کے قدم مبارک میں ورم آجاتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ سے عرض کی گئی کہ آپ کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف کردیئے گئے ہیں پھر آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''(211) چونکہ آپ ﷺ کے سامنے شکر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے، اس لیے آپ اتنی محنت فرماتے تھے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کو اپنے پاس نہ پایا تو مجھے خیال ہوا کہ کہیں آپ اپنی کسی دوسری بیوی کے پاس نہ چلے گئے ہوں، چنانچہ میں نے آپ کو تلاش کیا اور جب واپس لوٹی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپ ﷺ رکوع یا سجدے کی حالت میں ہیں اور ''سبحانك وبحمدك لا اله الا أنت'' پڑھ رہے ہیں۔ میں نے دل میں کہا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں آپ کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی اور آپ کس حالت میں ہیں؟''

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''ایک رات میں نے آپ ﷺ کو بستر پر موجود نہ پایا تو آپ کو تلاش کرنے لگی، اسی دوران میرا ہاتھ آپ ﷺ کے قدموں کی اندرونی حصے سے لگا، آپ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے، آپ ﷺ کے پاؤں کھڑے تھے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے: ''اللّٰھم اِنی أعوذ برضاك من سخطك و بمعافاتك من عقوبتك و أعوذبك منك لاأحصی ثناء علیك أنت کما أثنیت علی نفسك''(212) ''اے اللہ! میں آپ کی ناراضی سے آپ کی خوشنودی کی پناہ مانگتا ہوں، آپ کی سزا سے آپ کی معافی کی پناہ چاہتا ہوں اور آپ کی ذات سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ میں آپ کی اس قدر تعریف نہیں کرسکتا کہ جس قدر خود آپ نے اپنی تعریف فرمائی ہے۔''

اگر آپ ﷺ چاہتے تو بادشاہوں کی طرح عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ مکی دور میں دعوت سے دستبردار ہونے کی شرط پر اس قسم کی زندگی کی آپ ﷺ کو پیش کش ہوئی بھی تھی، لیکن آپ ﷺ نے اپنے دعوتی مقاصد کی خاطر تنگ دستی و تنگ حالی کی زندگی کو خوشحالی و مالداری کی زندگی پر ترجیح دی۔(213) آپ ﷺ نے ایسے بندے اور رسول والی زندگی کو جو بھوک کی حالت میں اپنے مالک کے حضور آہ وزاری کرتا ہو اور شکم سیری کی حالت میں شکر گزاری کرتا ہو بادشاہت کے مالک رسول کی زندگی پر فوقیت دی۔(214) آپ ﷺ کے سادہ اور معمولی طرز زندگی نے ہی لوگوں کو آپ ﷺ کے قریب کر دیا تھا۔

حضرت عمر بن خطابؓ انتہائی سادہ زندگی بسر کیا کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا طرز زندگی دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''(میں ایک دفعہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا)... آپ ﷺ ایک چٹائی پر بیٹھے تھے، جس پر کوئی چیز بچھی ہوئی نہ تھی۔ آپ کے سر کے نیچے چمڑے کا تکیہ تھا، جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ آپ کے پاؤں کی طرف سلم کے پتوں کا ڈھیر تھا اور آپ کے سرہانے ایک کھال لٹک رہی تھی۔ آپ کے بدن پر چٹائی کے نشانات دیکھ کر مجھے رونا آ گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیوں رو رہے ہو؟'' میں نے عرض کی: ''یارسول اللہ! قیصر و کسریٰ تو دنیا کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ رسولِ خدا ہو کر بھی اس حالت میں ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ان کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت؟''(215)

یہ درست ہے کہ دنیا کی باگ ڈور ہمارے ہی ہاتھ میں ہونی چاہیے اور رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا دوسروں سے زیادہ احساس تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کی نجی زندگی انتہائی سادہ تھی۔

درحقیقت آپ ﷺ اپنے لیے جینے کی بجائے دوسروں کے لیے جیتے تھے۔ آپ ﷺ کا اس حد تک اپنی دعوت کا عملی نمونہ بننا ہی دلوں کے آپ کی طرف کھچے چلے آنے کا سب سے اہم سبب تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی، کردار، افعال اور طرزِ حیات میں داعی حضرات کے لیے بڑے اہم اسباق ہیں۔ دلوں پر اثر انداز ہونے کی بنیادی شرط دعوت کے اصول ومبادی کو پہلے اپنی ذات پر نافذ کرنا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کر کے دکھایا ہے۔

اگر آپ کسی کے سامنے خوفِ خدا اور خشیت الٰہی سے رونے کی حقیقت بیان کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہیے کہ راتوں کو اٹھ کر اپنی جائے نماز کو آنسوؤں سے تر کریں، اس صورت میں جب دوسرے دن آپ لوگوں کو دعوت دیں گے تو اپنی گفتگو کی اثر انگیزی دیکھ کر خود بھی حیران رہ جائیں گے، بصورت دیگر آپ آیت مبارکہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ (الصف: ۲) ''مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے؟'' کا مصداق ٹھہریں گے اور لوگوں کو متاثر کرنے میں ناکامی کا سامنا کریں گے۔

۳۔ دعوت بلا معاوضہ

رسول اللہ ﷺ کا دعوت وتبلیغ کے عوض کسی دینی یا دنیوی معاوضے کی توقع نہ رکھنا آپ ﷺ کی نبوت کی صداقت کی ایک اور دلیل ہے۔ یہ نبوی خُلق ہے۔ ماضی و مستقبل کے تمام حقیقی داعی حضرات اس خلق سے متصف ہوتے ہیں۔ قرآن کریم بھی ہمیں ایسے لوگوں کی پیروی کرنے کا کہتا ہے، جو کسی سے معاوضے کا سوال نہیں کرتے۔ (216)

حضرت خدیجہؓ کی ساری دولت دعوت کے راستے میں خرچ ہوگئی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے کسی چیز کا سوال نہیں فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ جو آپ ﷺ کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور آپ ﷺ کے ہمراہ مدینے کی طرف ہجرت کرنے کی تیاری کر رہے تھے، نے آپ ﷺ کے لیے ایک اونٹنی خریدی، لیکن نبی کریم ﷺ نے قیمت کی ادائیگی کے بغیر اس پر سوار ہونے سے انکار فرمادیا۔ (217) ایسے سنگین حالات میں بھی کہ جب انسان کو دشمنوں کے تعاقب کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی، رسول اللہ ﷺ کو اپنی اونٹنی کی قیمت ادا کرنے کی فکر لاحق تھی۔ کیا یہ آپ ﷺ کی اعلیٰ درجے کی للّٰہیت کی دلیل نہیں؟ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے مشکل حالات میں انسان اس قسم کے ثانوی امور کے بارے میں سوچ سکے؟ اس واقعے میں دورِ حاضر کے داعی حضرات کے لیے بڑا اہم سبق ہے، انہیں چاہیے کہ اسے خوب سمجھ لیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک دن میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: "یارسول اللہ ﷺ! کیا بات ہے، آج آپ بیٹھ کر نماز ادا فرمارہے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اے ابوہریرہ! بھوک نے نڈھال کردیا ہے۔" یہ سن کر میں رو پڑا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "رومت، کیونکہ اگر کوئی شخص ثواب کی نیت سے بھوک برداشت کرے تو قیامت کی سختی سے محفوظ رہے گا۔"(218)

بھوک رسول اللہ ﷺ کی ہمزاد تھی، جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ہی مروی ہے کہ ایک دفعہ رات یا دن کے کسی پہر رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے تو ان کی حضرت ابوبکر اور عمر سے ملاقات ہوگئی۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: "اس وقت تمہیں کس چیز نے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا ہے؟" انہوں نے عرض کی: "یارسول اللہ ﷺ بھوک نے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، مجھے بھی اسی چیز نے گھر سے نکالا ہے، جس نے تمہیں نکالا ہے۔"(219) آپ ﷺ کی مراد بھوک سے تھی۔ ان تینوں حضرات نے اپنی کل متاع راہِ خدا میں لٹا دی تھی اور اپنے پاس اتنی دولت بھی نہ چھوڑی، جس سے روح اور جسم کا تعلق برقرار رکھ سکتے اور جب بھوک نے بہت ستایا تو ان کی نیند اڑ گئی اور وہ مدینے کی گلیوں میں نکلنے پر مجبور ہوگئے۔

یہ وہ مضبوط بازو تھے، جنہوں نے اس دور میں دعوت و تبلیغ کا بوجھ اٹھایا تھا۔ آج بھی دعوت کی نشر و اشاعت کے لیے اسی طرح کے مضبوط بازوؤں کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو دیکھئے جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: "فاطمہ میری لختِ جگر ہے، جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔"(220) چونکہ آپؓ کے پاس کوئی خادمہ نہ تھی، اس لیے گھر کا کام مثلاً پانی لانا اور دانے پیسنا وغیرہ آپ خود کیا کرتی تھیں حتیٰ کہ آپ انتہائی تھک جاتیں اور کام کے آثار آپ کے ہاتھوں اور کندھوں پر واضح طور پر نظر آتے۔ آپ کے شوہر حضرت علی بن ابی طالبؓ یہ سب کچھ دیکھ کر رنجیدہ ہوتے، لیکن کچھ نہ کر سکتے تھے، اسی طرح وقت گزرتا رہا، لیکن حضرت فاطمہؓ کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا، کیونکہ جس طرح وہ نشست و برخاست اور چال ڈھال میں اپنے والدِ محترم جیسی تھیں،(221) اسی طرح اپنے والدِ محترم والے اخلاق کی بھی حامل تھیں۔

ایک معرکے میں بہت سامالِ غنیمت اور قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ جب یہ مالِ غنیمت اور قیدی مدینے لائے گئے تو ضرورت مند لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نے

حسب گنجائش ان کی اعانت کی۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو مشورہ دیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جا کر ایک معاون خدمت گار مانگیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خود حضرت علیؓ کی زبانی پیش کیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں: ''ایک مرتبہ فاطمہؓ نے چکی پیسنے کی تکلیف کی شکایت کی، اسی عرصے میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کچھ قیدی آئے۔ حضرت فاطمہ آپ ﷺ کے پاس گئیں، لیکن آپ ﷺ موجود نہ تھے۔ ان کی حضرت عائشہ سے ملاقات ہوئی اور انہیں اپنی آمد کی غرض سے آگاہ کیا۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے آپ ﷺ کو حضرت فاطمہ کے آنے کی اطلاع دی، چنانچہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، اس وقت ہم اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ میں آپ ﷺ کو دیکھ کر کھڑا ہونے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی جگہ لیٹے رہو۔'' آپ ﷺ ہمارے درمیان بیٹھ گئے حتیٰ کہ مجھے آپ کے قدم مبارک کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس ہو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ سکھاؤں جو تم نے مجھ سے مانگی ہے۔ جب تم اپنے بستر پر جایا کرو تو تینتیس بار (ایک روایت میں چونتیس بار کا ذکر ہے) الله أكبر، تینتیس بار سبحان الله اور تینتیس بار الحمدلله پڑھ لیا کرو۔ یہ تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔''(222)

ایک دن آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کے پاس سونے کی ایک زنجیر دیکھی تو ان سے فرمایا: ''اے فاطمہ! کیا تم اس وجہ سے دھوکے میں مبتلا ہو کہ لوگ کہیں گے کہ یہ رسول اللہ کی بیٹی، حالانکہ اس کے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہے۔'' اس پر حضرت فاطمہؓ نے اسے بازار بھیج کر فروخت کر دیا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کا شکر ہے کہ اس نے فاطمہ کو آگ سے بچا لیا۔''(223)

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کسی سے معاوضے یا منفعت کے طلبگار نہ تھے، لیکن اس کے باوجود آپ کو دوسروں سے دشمنی، تکالیف اور اذیتیں اٹھانی پڑیں، کتنی ہی بار لوگوں نے آپ ﷺ کے سر مبارک پر مٹی ڈالی، لیکن فاطمہؓ کے سوا کوئی آپ کی مدد کو نہ آیا، کتنی ہی بار آپ ﷺ کے راستے میں بچھائے گئے کانٹوں سے آپ کے قدم مبارک لہولہان ہو گئے... ایک مرتبہ آپ ﷺ کعبے میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ بعض مشرکین آپ کے گرد جمع ہو گئے اور ان میں سے ایک شخص نے آپ ﷺ کی گردن میں چادر ڈال کر زور سے گلا گھونٹا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے آکر

اسے ہٹایا اور فرمایا: ''کیا تم ایک ایسے شخص کے قتل کے در پے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور جو تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح نشانیاں لایا ہے۔''(224)

لیکن یہ باتیں آپ ﷺ کو اپنی دعوت سے باز نہ رکھ سکیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جب آپ کی بیٹی حضرت زینب مشرکین کی طرف سے اپنے والد کو پہنچنے والی اذیتوں پر رو رہی تھیں تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: ''اے میری بیٹی! اپنے باپ کے قتل یا بے وقعت ہونے کا اندیشہ نہ کر...''(225) یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ضائع فرمایا اور نہ ہی بے وقعت ہونے دیا، بلکہ آپ کے کروڑوں پیروکاروں کے دلوں میں آپ کی سرمدی محبت ڈال دی۔

کسی دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہونے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے بارے میں کچھ مزید گفتگو کی جائے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دعوت تمام انبیائے کرام کی زندگی کا مقصد تھا، ان کی تخلیق صرف دعوت و تبلیغ ہی کی خاطر ہوئی تھی، جبکہ ہم دعوت و تبلیغ کو ایک فریضے اور ذمہ داری کی حیثیت سے ادا کرتے ہیں۔

اس موضوع کے تجزیئے کے دوران ہم نے اس بات کی بھی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو پیغام لے کر آئے تھے اس پر آپ ﷺ کی رسالت کی چھاپ تھی۔ ہم نے ان طریقوں اور اسالیب کا بھی ذکر کیا ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیغام کو پہنچانے کے لیے اختیار کیے تھے۔ یہ اسالیب آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی مستقل دلیل ہیں۔ ہم نے ان راستوں کی بھی نشان دہی کی ہے جن پر چلنے والے داعی حضرات کبھی سرگرداں ہوتے ہیں اور نہ بھٹکتے ہیں۔ ہم پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم مستقل اور پائیدار کامیابی کے متمنی ہیں تو ہمارے لیے نبی کریم ﷺ کے اختیار کردہ طریقوں اور اسالیب کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہزاروں واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ کسی اور طریقے یا اسلوب سے کامیابی ممکن نہیں، اس لیے ہم ایک بار پھر تاکید کرتے ہیں کہ جو داعی حضرات انسانیت کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ بننا چاہتے ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کے نقش پا پر چلیں، آپ ﷺ ہی حقیقی راہنما ہیں اور آپ ﷺ کا راستہ ہی ہدایت کا راستہ ہے، کیونکہ آپ خواہشاتِ نفس کی بجائے وحی خداوندی کی روشنی میں گفتگو فرماتے تھے۔

ب: تبلیغ رسول اللہ ﷺ کی فطرتِ ثانیہ

تبلیغ سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کی طبیعت اور فطرت تھی، جس طرح ہمیں کھانے، پینے اور ہوا میں سانس لینے سے روک دیا جائے تو ہمیں گھٹن ہوتی ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو اپنی دعوت پہنچانے کے لیے کوئی پاکیزہ دل نہ ملتا تو آپ ﷺ کو گھٹن ہوتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھانے پینے کا اہتمام نہ فرماتے تھے۔ بسا اوقات آپ ﷺ کئی کئی دن مسلسل روزے رکھتے تھے[226] اور بعض اوقات صرف اتنے کھانے پر اکتفا فرماتے، جس سے جسم اور روح کا رشتہ برقرار رہتا۔[227] آپ ﷺ کے دل میں دعوت کا اس قدر غم تھا کہ آپ کی کھانے پینے کی خواہش ختم ہوگئی تھی۔ جس طرح فرشتوں کی غذا تسبیح ہوتی ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی غذا دعوت تھی۔ قرآن کریم آپ ﷺ کی اسی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (الشعراء:٣) ''(اے پیغمبر) شاید تم اس (رنج) سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کردو گے۔'' ایک دوسری آیت مبارکہ میں ارشاد ربانی ہے: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً﴾ (الکھف:٦) ''(اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم ان کے پیچھے رنج کر کر کے اپنے تئیں ہلاک کردو گے۔''

اگر آپ ﷺ خدا کے حضور سجدہ ریزی سے محروم کسی نافرمان بندے کو دیکھتے تو آپ ﷺ کا دل درد سے بھر آتا۔ ایسا انسان آپ ﷺ کے لیے غم کا باعث بنتا تھا۔ ایمان کی دولت سے محروم ہر شخص آپ کے لیے حزن والم کا سبب بنتا تھا۔ یہ غم شروع سے ہی آپ کی روح میں تھا، لیکن بعثت کے بعد اس کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔

دین کے تمام احکامات، تعلیمات اور سنتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم نبی کریم ﷺ کے ایک شاگرد رشید کا معنی خیز جواب سنتے ہیں، جنہوں نے دورِ حاضر میں امت مسلمہ کے دکھوں کا مداوا کرنے اور اس کی امیدوں کو برلانے کا ذمہ اٹھایا ہے۔ جب ان سے شادی نہ کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: ''افکار کی کثرت اور امت مسلمہ کی مشکلات و آلام کے حل میں مصروف رہنے کی وجہ سے مجھے شادی کے بارے میں سوچنے کے لئے وقت ملتا ہے اور نہ ہی فرصت۔'' یہ انبیائے کرام اور ان کے ورثاء کا درجہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آج پوری انسانیت ایسے افراد کے لیے بے تاب ہے، جن کے دل دعوت کی فکر اور درد سے تڑپتے ہوں۔

جب یہ موضوع چھڑ ہی گیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ ایک اور مثال ذکر کرتا چلوں جو شاید میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں گا، تاہم اس سے ہمارے موضوع کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے:

ہمارا ایک پاکیزہ دل دوست جرمنی کے ایک محلے میں رہتا تھا۔ وہ اپنی روحانی پاکیزگی، کردار کی بلندی اور سب سے بڑھ کر توفیق خداوندی سے مالک مکان اور اس کے اہل خانہ کے دلوں کو متاثر کر کے ان کی ہدایت کا ذریعہ بننے میں کامیاب ہو گیا، چنانچہ سب سے پہلے شوہر مسلمان ہوا، اس کے بعد بیوی اور پھر بچوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے نتیجے میں وہ گھر جنت کا نمونہ بن گیا۔ ایک روز صاحب خانہ اپنے اس دوست کے ساتھ بیٹھا گفتگو کر رہا تھا اور اپنے دل میں موجزن ہدایت کے جذبات واحساسات سے شاد ہو رہا تھا کہ اچانک کہنے لگا: ''دوست! میں تم سے اس قدر محبت کرتا ہوں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں، کیونکہ تم میری ہدایت کا ذریعہ بنے اور تم نے مجھے اور میرے اہل خانہ کو حیاتِ جاوداں بخشی، لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے تم پر غصہ بھی اتنا شدید ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اٹھ کر تمہاری ٹھیک ٹھاک پٹائی کروں۔ شاید تمہارے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارے آنے سے کچھ عرصہ پہلے میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔ صاف ستھری زندگی اور پاکیزہ روح کی بدولت وہ مسلمان ہونے کا ہم سے زیادہ حق دار تھا۔ اگر تم اس کی وفات سے پہلے ہمارے ہاں آتے تو یقیناً اس کی ہدایت کا بھی سبب بن جاتے۔ تمہارے تاخیر سے پہنچنے پر مجھے سخت غصہ ہے۔''

یہ عتاب نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا کی آہ وزاری کی ترجمانی کرتا ہے۔ مجھے سخت اندیشہ ہے کہ کہیں مجھ سے اسلام کے پیغام کو کماحقہ نہ پہنچانے پر باز پرس نہ ہو اور مجھے پیشانی سے پکڑ کر گھسیٹا نہ جائے۔

ج: تبلیغ رسالت کی شدید خواہش

رسول اللہ ﷺ پیغام رسالت کی تبلیغ کے شدید خواہش مند تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ کوئی شخص دعوتِ حق سے محروم نہ رہے۔ آپ ﷺ صحیح اور مناسب طریقِ کار کے ذریعے لوگوں کو دعوت دینے میں مصروف رہتے تھے، اسی لیے آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کی زندگی کے آخری لمحات میں ان کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔ تقریباً چالیس سال تک ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت وحمایت کی تھی۔ اعلانِ نبوت کے بعد سے وہ رسول اللہ ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان اس طرح سے سدِ اسکندری کی طرح حائل رہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ تک ابو طالب کی لاش پر سے گزر کر ہی پہنچ سکتے تھے۔

ابو طالب رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی خاطر ہر طرح کی تکالیف اور مصائب وآلام برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے اپنی ناداری اور بڑھاپے کے باوجود قریش مکہ کی طرف سے کیے گئے تین سالہ مقاطعے کی مشکلات کا سامنا کیا۔

اب جبکہ ابو طالب بسترِ مرگ پر دراز تھے، رسول اللہ ﷺ ان کے سرہانے کھڑے ہو کر جب بھی موقع ملتا ان سے کہتے: ''اے میرے چچا! لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیجئے تاکہ میں قیامت کے دن اللہ کے ہاں آپ کا مقدمہ لڑ سکوں۔'' تاہم ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ، ابو طالب کی ہدایت کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ انہوں نے ابو طالب سے کہا: ''اے ابو طالب! کیا تم عبد المطلب کے دین سے روگردانی کر رہے ہو۔'' اور یہ بات بار بار دہراتے رہے حتیٰ کہ ابو طالب کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے: ''میں عبد المطلب کے دین پر ہوں...'' اس پر بھی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تک مجھے منع نہ کیا گیا اس وقت تک میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔''(228) چنانچہ اس کے بعد درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی، جس میں آپ ﷺ کو ان کے لیے دعائے مغفرت کرنے سے منع کر دیا گیا: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾[التوبة: ١١٣] ''پیغمبر اور مسلمانوں کو شایاں نہیں کہ جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ مشرک اہل دوزخ ہیں تو ان کے لئے بخشش مانگیں، گو وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں۔''

حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ کی ابو طالب کی ہدایت کی خواہش سے بخوبی واقف تھے، اسی لیے جب فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابو بکر اپنے بوڑھے والد ابو قحافہ کو قبول اسلام کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں لائے تو حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے

فرمایا: ''تم نے بزرگوار کو گھر پر ہی کیوں نہ رہنے دیا کہ میں خود ان کے پاس چل کر آتا۔'' حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی: ''میں نے چاہا کہ اللہ انہیں اس پر اجر دے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچائی کے ساتھ مبعوث فرمایا مجھے اپنے باپ کے قبولِ اسلام کی بہ نسبت ابوطالب کے قبولِ اسلام پر زیادہ خوشی ہوتی، کیونکہ اس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں۔''(229)

جس طرح رسول اللہ ﷺ کے دل میں اپنے چچا ابوطالب کی ہدایت کی خواہش تھی، اسی طرح آپ ﷺ اپنے چچا حمزہؓ کے قاتل وحشی کو بھی راہِ ہدایت پر لانا چاہتے تھے۔ تاریخ کے اوراق میں یہ واقعہ بھی محفوظ ہے۔

۱- وحشی کو دعوتِ اسلام

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی بن حرب کے پاس دعوتِ اسلام کا پیغام بھیجا۔ اس نے جواب میں کہا: ''اے محمد! آپ مجھے کیسے اسلام کی دعوت دے رہے ہیں، حالانکہ آپ سمجھتے ہیں کہ جس شخص نے قتل، شرک یا زنا کیا وہ سخت گناہ کا مرتکب ہوگا، قیامت کے روز دوہرے عذاب میں گرفتار ہوگا اور ہمیشہ ذلیل و خوار ہو کر اس میں رہے گا اور میں نے یہ تمام کام کیے ہیں تو کیا میرے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيماً﴾ (الفرقان: ۷۰) ''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو خدا نیکیوں سے بدل دے گا اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس پر وحشی نے کہا: ''اے محمد! توبہ اور نیک اعمال کی شرط بڑی سخت ہے۔ شاید مجھ سے یہ شرط پوری نہ ہو سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿إِنَّ اللَّهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾ (النساء: ۴۸) ''خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کردے۔''

اس پر وحشی نے کہا: ''اے محمد! یہ تو خدا کی مشیت پر موقوف ہے، نہ جانے وہ مجھے بخشے گا یا نہیں؟ کیا تمہارے پاس اس کے سوا بھی کوئی حل ہے؟'' اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (الزمر: ۵۳) ''(اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو) کہہ دو کہ اے میرے

بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ سن کر وحشی نے کہا: "اب میں مطمئن ہوں۔" اور اسلام لے آیا۔(230)

اسلام قبول کر کے حضرت وحشیؓ ان صحابہ کرام کی صف میں شامل ہو گئے، جن کے نام کے ساتھ ہم ہمیشہ رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ حضرت حمزہؓ کے قاتل تھے، جسے فراموش کرنا ان کے بس میں تھا اور نہ کسی اور کے بس میں۔ یہ صحیح ہے کہ چونکہ انہوں نے اس گناہ کا ارتکاب قبولِ اسلام سے پہلے کیا تھا اور اسلام اپنے سے پہلے کے گناہوں کو دھو ڈالتا ہے، اس لیے قیامت کے دن ان سے اس پر باز پرس نہ ہوگی اور ان کے گزشتہ تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔(231a) اس پہلو سے واقعی وہ بہت خوش قسمت تھے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ بھی حقیقت تھی کہ حضرت حمزہؓ کا قتل ان کے ہاتھوں سرزد ہوا تھا۔

حضرت حمزہؓ جو ایک مافوق الفطرت ہیرو کی طرح شیروں کا شکار کر کے انہیں چیر پھاڑ ڈالتے تھے، نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اختیار کر کے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا تھا، چونکہ رسول اللہ ﷺ اور انہوں نے ایک ہی چھاتی سے دودھ پیا تھا، اس لیے وہ آپ ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔(231b) آپؓ کے قبولِ اسلام سے پہلے مسلمان خوف زدہ رہتے تھے، لیکن آپؓ کے اسلام لانے کے بعد جزیرہ عرب کا گوشہ گوشہ مسلمانوں کی صدا اور دعوت سے گونج اٹھا۔ انہی حضرت حمزہؓ کو حضرت وحشیؓ نے اپنے دورِ جاہلیت میں غزوہ احد کے موقع پر سینے میں نیزہ مار کر شہید کیا تھا۔ جب وہ زمین پر گرے تو ان کے جسم کی ہیئت "لا" (نہیں) کے مشابہ تھی۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ خدا کے سوا ہر چیز کو "لا" کہتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو ان کی انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ ان کے سرہانے بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے... آج وہی وحشی حضرت حمزہؓ کے خون سے رنگین ہاتھ بیعت کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر رہا تھا۔ آپ ﷺ کے نزدیک دعوت و تبلیغ کی اہمیت کا اندازہ لگائیے کہ آپ ﷺ نے وحشی کا ہاتھ پکڑ کر اسے قبولِ اسلام پر مبارک باد پیش کی... بلکہ درحقیقت آپ ﷺ نے ہی اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔

حضرت وحشیؓ کے اسلام لانے کے بعد آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: "کیا تمہارے لیے ممکن ہے کہ اپنا چہرہ مجھ سے چھپائے رکھو؟" آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے ارشاد فرمائی تھی کہ آپ ﷺ جب

بھی انہیں دیکھتے تو آپ ﷺ کو حضرت حمزہ کی یاد آ جاتی اور آپ کا غم تازہ ہو جاتا تھا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ ان کے لیے اس رحمت کا اظہار نہ فرما سکتے تھے، جس کا اظہار نبی پر اپنے ساتھیوں کے لیے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے ایک طرف حضرت وحشیؓ کی حق تلفی ہوتی تھی تو دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کے فریضے میں کوتاہی ہوتی تھی۔

دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرح حضرت وحشی نے بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی پیروی کی اور کبھی حکم عدولی نہ کی۔ وہ آپ ﷺ کے سامنے نہ آنے اور آپ ﷺ سے فاصلے پر رہنے کی کوشش فرماتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر لمحے رسول اللہ ﷺ کے ایک اور بلاوے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر نبی کریم ﷺ کی طرف دیکھتے رہتے۔ آپ ﷺ کی نگاہوں کا پیچھا کرتے اور اس امید میں رہتے کہ کبھی تو رسول اللہ ﷺ ان سے فرمائیں گے کہ اب میرے سامنے آ جایا کرو۔

لیکن اسی مبارک دن کا انتظار کرتے کرتے ایک روز انہیں یہ ہولناک خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ یہ خبر ان پر بجلی بن کر ٹوٹی، کیونکہ اب انہیں کسی بلاوے کی امید نہ رہی تھی۔

حضرت وحشیؓ کے شب و روز گزشتہ گناہوں کی تلافی میں گزرتے رہے یہاں تک کہ جنگ یمامہ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ حضرت وحشی فوراً حضرت خالد بن ولید کے اس لشکر میں شامل ہو گئے، جو یمامہ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اس موقع کو نہیں کھونا چاہتے تھے۔ ماضی میں انہوں نے اسلام کے ایک ہیرو کو شہید کر کے گناہ کا ارتکاب کیا تھا، اگرچہ یہ گناہ بخش دیا گیا تھا، لیکن ان کا ضمیر ابھی تک اس گناہ کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اب انہیں اس کی تلافی کے لیے اسلام کے سخت ترین دشمن مسیلمہ کذاب کو قتل کرنے کا سنہری موقع میسر آیا تھا، چنانچہ انہوں نے وہ زنگ آلود نیزہ ہمراہ لیا، جس سے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا اور جنگ یمامہ میں شریک ہو گئے۔ جنگ کئی روز تک جاری رہی... یہ بڑا سخت معرکہ تھا۔ جب شکست کے آثار نمودار ہونے لگے تو مسیلمہ کذاب نے قلعے سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ صحابہ کرام میں سے ایک محافظ نے اسے دیکھ لیا اور وحشی کو پکارا: ''وہ رہا خدا کا دشمن، جانے نہ پائے۔''

جوں ہی حضرت وحشی نے یہ آواز سنی تو اپنے زنگ آلود نیزے کو حرکت دی اور اسے مسیلمہ کذاب کے سینے میں ایسے ہی اتار دیا جیسے کبھی حضرت حمزہؓ کے سینے میں اتارا تھا۔ نیزہ مسیلمہ کذاب کے سینے میں گھس گیا اور وہ گھوڑے پر سے زمین پر گر پڑا۔ حضرت وحشیؓ نے یہ منظر دیکھا تو شکر خداوندی میں زمین پر سجدہ ریز ہو گئے (232) اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا، گویا وہ رسول اللہ ﷺ کی

روح مبارک کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہوں: ''یا رسول اللہ ﷺ کیا اب مجھے آپ کے سامنے آنے کی اجازت ہے؟''

ہمیں نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا جواب دیا ہوگا... لیکن اس بات کا احتمال بہرحال موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو روحانیت جنگ یمامہ میں شریک تھی، اس کا دل حضرت وحشیؓ کی آہ وزاری اور انکسار پر پسیج گیا ہوگا اور اس نے انہیں ان کی بہادری اور جوانمردی پر داد دیتے ہوئے کہا ہوگا: ''ہاں، آج سے تم میرے سامنے آسکتے ہو۔'' ہم اس بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں جانتے، کیونکہ اس کا تعلق ایک دوسری قسم کے حقائق سے ہے، لیکن اس واقعے کو یہاں پیش کرنے سے ہمارا مقصود رسول اللہ ﷺ کے نزدیک دعوت و تبلیغ کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالنا ہے۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں اپنے عظیم، بہادر اور محبوب چچا حضرت حمزہؓ جو آپ ﷺ کی باپ کی طرح عزت اور آپ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے، کے قاتل کے لیے کس قدر رحمت و شفقت کے جذبات تھے۔ اس سے بڑھ کر آپ ﷺ نے حضرت وحشیؓ کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے مختلف طریقے آزمائے اور بالآخر ان جیسے انسان کو صحابی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر دعوت و تبلیغ آپ ﷺ کے رگ و پے میں جاری، آپ کی فطرت میں ودیعت اور آپ کی جان کا حصہ نہ ہوتی تو کیا وحشی جیسے انسان کو دعوتِ اسلام دینے پر اس قدر اصرار کا مشاہدہ ممکن تھا؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے... بلکہ رسول اللہ ﷺ کا اس قدر اصرار اور جان سوزی اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ دعوت و تبلیغ آپ کا ایک خصوصی وصف تھا، اسی لیے آپ ﷺ کے لئے اس کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

۲۔ عکرمہ کو دعوتِ اسلام

عکرمہ کی اسلام دشمنی وحشی سے بڑھ کر تھی۔ اسے اسلام کی ذات سے بیر تھا، جس کے پس پردہ باقاعدہ ارادہ اور عزم کارفرما تھا۔ جس گھر میں عکرمہ نے پرورش پائی تھی، وہ دشمنانِ اسلام کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اس گھر کے تمام افراد کی فطرت میں اسلام دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس گھر کا سربراہ ابوجہل تھا، جس کی جہالت کے اثرات تمام اہل خانہ میں سرایت کر چکے تھے، جس کے نتیجے میں وہ جہالت اور معنوی تاریکی کا مرکز بن چکا تھا اور اگر اس گھر کے افراد میں سے کوئی اسلام قبول کرتا تو اسے ناقابل بیان تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

عکرمہ اسلام دشمنی میں اپنے باپ سے بھی دو قدم آگے تھا۔ اسلام کے خلاف ہر اس معاملے میں شریک ہوتا تھا، جس میں اس کا باپ شریک ہوتا، کفر و گمراہی نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے مکہ فتح کر لیا تھا اور اہل مکہ اسلام قبول کر چکے تھے، عکرمہ اسلام دشمنی پر ڈٹا رہا، مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کی اور پھر یمن کی طرف فرار ہو گیا۔

حضرت اُم حکیم بنت حارث بن ہشام عکرمہ کی بیوی اور چچا کی بیٹی تھیں۔ وہ بڑی سمجھدار خاتون تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں۔ وہ اپنے خاوند سے وفاداری کے جذبے کے تحت یمن گئیں اور اسے واپس مکہ لوٹنے پر آمادہ کیا، لیکن عکرمہ رسول اللہ ﷺ کا سامنا کرنے سے شرما رہے تھے، کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ عداوت کے اظہار اور آپ ﷺ کو ایذا پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھانے اور آپ ﷺ کے سر مبارک پر مٹی ڈالنے والوں میں وہ پیش پیش رہتے تھے، لیکن دوسری طرف رسول اللہ ﷺ ان کے قبولِ اسلام کے ایسے ہی خواہش مند تھے جیسے آپ وحشی کے قبولِ اسلام کے آرزومند تھے، چنانچہ جب عکرمہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا: ''سوار مہاجر کو خوش آمدید، سوار مہاجر کو خوش آمدید، سوار مہاجر کو خوش آمدید۔''
اگرچہ فتح مکہ کے بعد اصطلاحی مفہوم میں ہجرت موقوف ہو چکی تھی، لیکن ان الفاظ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے دور دراز شہر سے آنے کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ یہ استقبال حضرت عکرمہؓ کے دل سے دشمنی کی برف کو پگھلا دینے کے لیے کافی تھا، چنانچہ کلمہ پڑھ لینے کے بعد انہوں نے شرم سے سر جھکائے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: ''یا رسول اللہ! آپ اپنے خلاف میری ہر عداوت اور اظہارِ شرک کے لیے کسی بھی گروہ میں میری شرکت کے بارے میں دعائے مغفرت فرمائیے۔''

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: ''اے اللہ! عکرمہ کی میرے خلاف ہر عداوت اور راہِ خدا سے روکنے کے لیے کسی بھی گروہ میں اس کی شرکت کو بخش دے۔'' یہ دعا سنتے ہی حضرت عکرمہؓ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی، کیونکہ انہیں اس طرح کے استقبال کی قطعاً امید نہ تھی، چنانچہ انہوں نے انتہائی متاثر ہو کر کہا:

''یا رسول اللہ ﷺ ماضی میں میں راہِ خدا سے روکنے کے لیے جتنا مال خرچ کیا کرتا تھا اب اس سے دگنا مال راہِ خدا میں خرچ کروں گا اور ماضی میں راہِ خدا سے روکنے کے لیے، جس قدر لڑا کرتا تھا اب راہِ خدا میں اس سے دگنی طاقت صرف کروں گا۔''

حضرت عکرمہ نے جنگ یرموک میں جامِ شہادت نوش فرما کر اپنا یہ وعدہ پورا کر دکھایا۔ جنگ یرموک میں وہ بیوی بچوں کے ہمراہ شریک ہوئے تھے۔ جب وہ شدید زخمی ہو گئے تو انہیں اٹھا کر خیمے میں لایا گیا۔ انہیں دیکھ کر ان کی بیوی اور بچے رونے لگے، اس پر انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: ''رومت، کیونکہ فتح سے پہلے مجھے ہرگز موت نہ آئے گی۔'' یہ ان کی کرامت تھی۔ تھوڑی دیر بعد خیمے میں ان کے چچا حارث بن ہشام داخل ہوئے اور خوشخبری دیتے ہوئے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی ہے۔'' حضرت عکرمہ نے اس پر شکر خداوندی ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے جان آفریں کے سپرد کر دی: ﴿توَفَّنِیْ مسلماً والحقنی بالصالحین﴾[233] (یوسف: ۱۰۱)
''تو مجھے (دنیا سے) اپنی اطاعت (کی حالت) میں اٹھائیو اور (آخرت میں) اپنے نیک بندوں میں داخل کیجو۔''

آپ ﷺ انسانیت کی ہدایت کے شدید خواہش مند تھے اور دعوت و تبلیغ کے اس مقام پر فائز تھے، جہاں کسی اور کے لیے پہنچنا ممکن نہیں۔ آپ ﷺ نے ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں کی روشنی اور ہدایت کے عالم کی طرف راہنمائی فرمائی اور پھر اسی پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اپنے سخت ترین دشمنوں کی طرف بھی دست شفقت بڑھایا۔ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انبیائے کرام کے ہاں دعوت و تبلیغ کو ایسی بلند و بالا چوٹی کی حیثیت حاصل ہے، جسے کسی دوسرے کے لیے سر کرنا ممکن نہیں۔

د: دعوت کے غم نے آپ ﷺ کی نیند اڑا دی

اعلانِ نبوت کے بعد آپ ﷺ کبھی میٹھی نیند نہ سوئے، کیونکہ آپ ﷺ انسانیت کے دکھ درد میں برابر کے شریک تھے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ساری زندگی دعوت وتبلیغ کے لئے وقف کردی تھی، اس لیے آپ ﷺ کے سوا کسی اور کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔

مکہ مکرمہ میں دعوت کے ابتدائی سالوں میں آپ ﷺ لوگوں کو دین حق کی دعوت دینے کے لیے ایک بازار سے دوسرے بازار اور ایک محلے سے دوسرے محلے کے چکر لگاتے تھے۔ اس دوران آپ ﷺ کو طرح طرح کی ایذیتیں اٹھانا پڑتی تھیں، کبھی آپ ﷺ پر پتھر پھینکے جاتے تھے تو کبھی آپ ﷺ کے سر مبارک پر مٹی ڈالی جاتی تھی، لیکن آپ ﷺ ان مصائب کی پرواہ کیے بغیر اپنی دعوت کے راستے پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ جس مبارک چہرے کو دیکھ کر فرشتے بھی شرما جاتے تھے، اس پر سنگ دل مشرکین مکہ تھوکتے تھے۔ جس رُخِ انور کو سورج کی تمازت سے بچانے کے لیے بسا اوقات بادل بھی سایا کیا کرتے تھے، اسے کفار کی طرف سے تحقیر واہانت کی مختلف صورتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

جب آیت مبارکہ ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (الشعراء: ٢١٤) ''اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنادو۔'' نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنے تمام عزیز واقارب کو جمع کر کے ان سے فرمایا: ''اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر نکلنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کروگے؟'' انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں تمہیں سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔''

جب آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو سب پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ پتھر کے بت ہوں۔ کسی نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس موقع پر ابولہب اٹھا اور رسول اللہ ﷺ سے کہنے لگا (کاش! اس نے یہ بات نہ کہی ہوتی): ''تو برباد ہو! کیا اسی مقصد کے لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟''(234) اس کے بعد محفل برخواست ہوگئی اور سب واپس چلے گئے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت کا بیشتر حصہ اُن دعوتوں پر خرچ کردیا تھا جو رسول اللہ ﷺ شرفائے مکہ کو دین حق کی دعوت دینے کے لیے منعقد کیا کرتے تھے، لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے...

حضرت علی بن ابی طالبؓ ایک ایسی ہی مجلس کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے شرفائے مکہ کی اپنے گھر پر دعوت کی، جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو رسول اللہ ﷺ نے گفتگو کا آغاز کیا اور فرمایا: ''میں اللہ کا رسول ہوں اور تم میرے سب سے قریبی رشتہ دار ہو، اس لیے تمہیں میری پشت پناہی کرنی چاہیے۔'' اور گفتگو کے اختتام پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کون اس پر مجھ سے بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی اور ساتھی بن کر رہے گا۔'' لیکن کوئی بھی کھڑا نہ ہوا۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ میں کھڑا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم بیٹھ جاؤ۔'' آپ ﷺ نے تین بار یہ بات ارشاد فرمائی اور ہر بار میں کھڑا ہوتا رہا اور ہر بار آپ ﷺ مجھے بیٹھنے کا کہتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا۔''(235)

ماہ و سال گزرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ بغیر کسی اکتاہٹ اور تھکاوٹ کے اپنی دعوت و تبلیغ میں لگے رہے۔ آپ ﷺ کے عزیز و اقارب نے آپ کی باتوں پر توجہ نہ دی تو آپ ﷺ نے غیروں میں ایسے لوگوں کی تلاش شروع کر دی جو آپ کی بات کو قبول کر لیں، لیکن زندہ دل لوگوں کی تلاش کوئی آسان کام نہیں۔ طائف کے لوگوں نے آپ ﷺ پر سنگ باری کی۔(236) مقامی بازاروں کے جن خیموں میں آپ ﷺ تشریف لے گئے ان میں سے اکثر سے آپ ﷺ کو باہر نکال دیا گیا،(237) لیکن دعوت کی دھن آپ ﷺ کو عالم اتفاقات میں لے گئی، چنانچہ تقدیر نے آپ ﷺ کی عقبہ کی طرف راہنمائی کی، جہاں آپ ﷺ کی بعض پاکیزہ صفت انسانوں سے ملاقات ہوئی۔ عقبہ اُولیٰ میں آپ ﷺ کا بارہ افراد سے تعارف ہوا۔ اگلے سال عقبہ ثانیہ کے موقع پر ان کی تعداد ستر سے بڑھ گئی۔ آپ ﷺ نے انہیں بعض باتوں کی تعلیم دی اور فرمایا: ''اگر وہ ان پر ایمان رکھتے ہیں تو انہیں فلاں فلاں شرائط کی پاسداری کرنی ہوگی۔'' ان تمام افراد نے بغیر کسی تردّد کے رسول اللہ ﷺ کی تمام باتوں کو تسلیم کر لیا۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ نے ان سے کہا کہ وہ عہد و پیمان کرنے سے پہلے خوب سوچ لیں، کیونکہ ان کے اس عہد و پیمان کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام عرب کو اپنے خلاف کر رہے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے قول و اقرار سے نہیں پھرا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے آپ ﷺ پر اپنی جانیں فدا کرنے کی بیعت کی۔ آپ ﷺ نے دین کی تعلیم کے لیے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو روانہ فرمایا۔(238)

حضرت مصعبؓ مکہ کے امیر ترین خاندان کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے سترہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ جب وہ مکہ کی گلیوں سے گزرتے تو لڑکیاں دریچوں سے جھانک کر انہیں دیکھنے لگتیں۔ وہ انتہائی خوش لباس انسان تھے،(239) لیکن اسلام قبول کرتے ہی ان کے خاندان نے انہیں

دھتکار دیا۔ مدینے جاتے ہوئے ان کے پاس کپڑوں کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔ وہاں پر بھی فقر کی زندگی گزاری یہاں تک کہ غزوہ احد میں شہادت پائی اور ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اس موقع پر صحابہ کرامؓ کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے انہیں کفن دیتے۔ (240)

رسول اللہ ﷺ کے اس جلیل القدر شاگرد نے مدینے پہنچتے ہی دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ مدینے میں کوئی ایسا دروازہ نہ تھا، جس پر انہوں نے دستک نہ دی ہو... دعوت میں اخلاص اور اس کی خاطر جاں سوزی کی وجہ سے ان کی بات دلوں میں بیٹھ جاتی اور روحوں کو اسیر بنا لیتی۔ لوگ دھڑا دھڑ کفر کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یثرب میں آپ کی آمد نے ایک خوش آئند انقلاب برپا کر دیا، گویا آپؓ ایک ایسے شفاف نور کا سرچشمہ تھے، جو دلوں میں راہ پا کر ان پر حکومت کرنے لگتا تھا۔

اسعد بن زرارہؓ نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا ہوا تھا، اگرچہ ابھی نمازِ جمعہ فرض ہوئی تھی اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ مدینے تشریف لائے تھے، لیکن اسعد بن زرارہؓ اہل ایمان کو جمع کر کے انہیں نمازِ جمعہ پڑھاتے تھے۔ (241)

یثرب کے ہر اہم شخص نے اسعد بن زرارہؓ کے گھر آ کر حضرت مصعبؓ کی گفتگو سنی، ان میں سے بعض برہمی کی حالت میں آتے، لیکن خوش و خرم واپس لوٹتے۔ حضرت سعد بن معاذ بھی انہی میں سے ایک تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ مصعب مدینے میں فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے غصے میں قسم اٹھائی کہ وہ مدینے میں کسی کو شورش برپا نہیں کرنے دیں گے۔ وہ اس فتنے کو دبانا ضروری خیال کرتے تھے۔ جب وہ اسعد کے گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے حضرت مصعب کو میٹھے اور شریں انداز میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا... سعد نے بے قابو ہو کر حضرت مصعبؓ سے درشت لہجے میں گفتگو کی، لیکن اس کے جواب حضرت مصعبؓ نے ان سے فرمایا:

"کیا آپ بیٹھ کر میری بات سننا پسند نہیں کریں گے؟ اگر آپ کو میری بات اچھی لگے اور پسند آئے تو اسے قبول کر لیجئے اور اگر آپ کو میری بات ناپسند آئے تو میں آپ کو ایسی چیز نہیں پیش کروں گا جسے آپ ناپسند کرتے ہوں۔"

چنانچہ سعد بیٹھ گئے اور ان کا غصہ زائل ہو گیا۔ جب وہ حضرت مصعبؓ کی گفتگو سننے لگے تو انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی دوسرے جہاں میں آ گئے ہیں، جس سے وہ پہلے ناآشنا تھے اور جس میں انہیں فرشتوں کے پروں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی... زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہ دل سے کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ (242)

جس طرح حضرت عمر بن خطابؓ کے قبولِ اسلام سے مکہ میں کہرام برپا ہو گیا تھا، اسی طرح

حضرت سعد بن معاذ کے قبولِ اسلام سے یثرب میں ہلچل مچ گئی اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح یثرب اور اس کے قرب وجوار میں آباد قبائل میں پھیل گئی۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ دعوت کی اشاعت میں مشغول رہتے، اسی طرح آپ ﷺ کے مخلص اور صاف دل صحابہ کرامؓ بھی انتہائی حسین اور عمدہ اسلوب میں اسلام اور حق کی اشاعت کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کئے ہوئے تھے۔ سارا جہاں ان سے امید لگائے بیٹھا تھا کہ وہ کب مشعلیں اٹھائے اطرافِ عالم کو منور کرنے نکلتے ہیں۔ حضرت مصعبؓ کو مدینے، حضرت طلحہؓ کو دومتہ الجندل اور کئی سال بعد حضرت براءؓ اور حضرت خالدؓ کو یمن بھیجنے کے پیچھے دعوت کی اشاعت اور پورے عالم میں اسے پھیلانے کی یہی خواہش کارفرما تھی۔

اگر کسی صحابی کو جہاں انہیں بھیجا گیا تھا دعوت میں کامیابی نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ان کی جگہ کسی اور صحابی کو بھیج دیتے اور اس تبدیلی کے ہمیشہ مثبت نتائج برآمد ہوتے۔ مثلاً جب آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید کو یمن بھیجا تو انہیں وہاں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہوئی، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی جگہ حضرت علی بن ابی طالبؓ کو وہاں بھیجا اور حضرت خالد بن ولیدؓ کو عیسائیوں کے علاقے نجران منتقل کردیا۔ حضرت براء بن عازبؓ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو دعوتِ اسلام کے لیے اہل یمن کی طرف بھیجا، لیکن اہل یمن نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو بھیجا... میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو حضرت علی کے ہمراہ بعد میں گئے۔ جب ہم ان لوگوں کے قریب پہنچے تو وہ باہر نکل کر ہمارے پاس آئے۔ حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر ہمیں نماز پڑھائی اور ہمیں ایک صف میں کھڑا کردیا اور پھر آگے بڑھ کر ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا والا نامہ پڑھ کر سنایا، جسے سن کر قبیلہ ہمدان کے سارے لوگ مسلمان ہوگئے۔'' (243)

حضرت علی بن ابی طالبؓ کو یمن میں اسی لیے کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ انہوں نے ایک طویل عرصہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ گزارا تھا، نیز وہ حضراتِ حسنینؓ کے والد اور قیامت تک آنے والے اقطاب، اصفیاء، اولیاء اور مقربین کے سرخیل تھے۔ آج بھی حق اور حقیقت انہی کی اولاد کے دم سے قائم ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے مسحور کن الفاظ سے اہل یمن کے دل جیت لیے، جس کے نتیجے میں وہ لوگ فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں سے آملے۔ (244)

۵: سربراہانِ ممالک کے نام خطوط

جہاں رسول اللہ ﷺ اسلام کی طرف رشد و ہدایت کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے باصلاحیت اور قابل حضرات کو مختلف مقامات کی طرف بھیجتے تھے، وہیں آپ ﷺ مختلف ممالک کے سربراہوں اور سرداروں کو اسلام اور دینِ حق کی دعوت دینے کے لیے خطوط بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کی دعوت و تبلیغ کے میدان کی ایک اور جہت تھی۔

۱- نجاشی کے نام خط

نجاشی حبشہ کے حکمران تھے۔ اگرچہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت نہ کر سکنے کی وجہ سے صحابی تو نہ تھے، تاہم وہ بڑے مرتبے کے انسان تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن امیہ کے ہاتھ ان کے نام خط بھیجا تھا، جس کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

''محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے شاہ حبشہ اصحمہ نجاشی کے نام

تم پر سلامتی ہو۔ میں تمہارے سامنے اس خدا کی تعریف بیان کرتا ہوں، جو بادشاہ، امن دینے والا اور نگہبان ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی روح اور کلمہ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے کنواری، عفیفہ اور پاکدامن مریم کی طرف القاء کیا تھا، نیز میں تمہیں ایک خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں، جس کا کوئی شریک نہیں۔''(245)

نجاشی کے نام رسول اللہ ﷺ کے مکتوب گرامی میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اسے ''سلام علیك'' کے الفاظ سے سلام کیا، گویا آپ ﷺ اس سے خیر کی توقع رکھتے تھے اور فراست کی آنکھ سے جان گئے تھے کہ وہ ہدایت پا جائے گا، مزید برآں رسول اللہ ﷺ کا اسلوب انتہائی عمدہ تھا، جس کی دلیل یہ ہے آپ ﷺ نے نجاشی سے حضرت مریم علیہ السلام کے حوالے سے گفتگو فرمائی، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ نجاشی کے دل میں ان کے لیے محبت اور احترام کے جذبات ہیں۔ ہم بھی حضرت مریم علیہ السلام کا احترام کرتے ہیں، کیونکہ وہ ایک بلند پایہ نبی کی والدہ اور الہام خداوندی کا مظہر ہیں۔

ایک دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ چونکہ نجاشی عیسائی تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے گفتگو فرماتے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآنی آیات ذکر کیں۔ یہ نجاشی کے دل میں جگہ بنانے کا سب سے بہتر اور مؤثر طریقہ تھا، جس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

جب یہ مکتوبِ گرامی نجاشی کے پاس پہنچا تو وہ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا، اس نے مکتوبِ گرامی پکڑا، اسے چوم کر اپنے سر پر رکھا اور اسے پڑھنے کے بعد قبولِ اسلام کا اعلان کیا، نیز اپنے کاتب کو اس مکتوبِ گرامی کا جواب لکھنے کا حکم دیا، جس کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

''محمد رسول اللہ ﷺ کے نام نجاشی کی طرف سے

میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ یا رسول اللہ میں صرف اپنی جان کا مالک ہوں، اگر آپ چاہیں گے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کی بات حق ہے۔''(246)

نجاشی ایک سمجھدار مؤمن تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا: ''اگر میرے کندھوں پر امورِ سلطنت کا بوجھ نہ ہوتا تو میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کے نعلین مبارک اٹھاتا۔''(247) کچھ عرصہ بعد رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے صحابہ کرام سے فرمایا: ''تمہارا بھائی (نجاشی) وفات پا گیا ہے، اٹھو اور اس کی نماز جنازہ پڑھو۔''

غائبانہ نماز جنازہ کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ علمائے احناف کے سوا دیگر فقہائے کرام غائبانہ نماز جنازہ کو جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ علمائے احناف کا موقف یہ ہے کہ چونکہ نجاشی کا تابوت معجزاتی طور پر رسول اللہ ﷺ کے سامنے لایا گیا تھا، اس لیے یہ نماز جنازہ غائبانہ نہ تھی۔ یہ ایک فقہی موضوع ہے، جس کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔(248)

۲- ہرقل کے نام خط

رسول اللہ ﷺ نے اپنا دوسرا مکتوبِ گرامی دحیہ کلبی کے ہاتھ شہنشاہ روم ہرقل کی طرف بھیجا۔ اس مکتوبِ گرامی کا مضمون کچھ یوں تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی طرف سے عظیم الروم ہرقل کے نام

ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر سلامتی ہو!

میں تمہیں اسلام کی طرف دعوت دیتا۔ اسلام لے آؤ مامون ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں دگنا

اجرعطا فرمائیں، لیکن اگر تم نے روگردانی اختیار کی تو دہقانوں کا گناہ بھی تمہارے سر ہوگا: ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: ٦٤) ''اور اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے، اس کی طرف آؤ، وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرمانبردار ہیں۔''(249)

ہرقل اس مکتوب گرامی سے بہت متاثر ہوا۔ اس وقت ابوسفیان ہرقل کے شہر میں موجود تھے۔ ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان اس بارے میں درج ذیل مکالمہ ہوا:

ہرقل: تمہارے خاندان میں اس کا نسب کیسا ہے؟

ابوسفیان: وہ عالی النسب ہے۔

ہرقل: کیا یہ بات اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے کہی ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: شرفاء اس کی پیروی کرتے ہیں یا کمزور لوگ؟

ابوسفیان: کمزور لوگ۔

ہرقل: ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟

ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

ہرقل: کیا کسی نے اس کا دین قبول کرنے کے بعد ناپسندیدگی کی بنا پر چھوڑا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا یہ بات کہنے سے پہلے تم نے اس پر کبھی جھوٹ کا الزام لگایا تھا؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا وہ دھوکا دیتا ہے؟

ابوسفیان: نہیں، لیکن آج کل ہمارے درمیان ایک معاہدہ چل رہا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ اس بارے میں کیا کرنے والا ہے۔

ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان مذکورہ بالا مکالمہ ہوا۔ ابوسفیان ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے، لیکن اس کے باوجود آخری جملے میں تردد کا اظہار کرنے کے سوا وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کوئی بات نہ کہہ سکے۔

ہرقل نے ابوسفیان کے ایک ایک جواب کو دہرا کر انہیں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی صداقت کی دلیل قرار دیا۔ اس کے بعد اس نے رومیہ میں موجود اپنے ایک دوست سے مشورہ لیا۔ وہ بھی ہرقل کی طرح صاحب علم انسان تھا۔ اس نے بھی ہرقل کی رائے سے اتفاق کیا۔ ایک روایت کے مطابق ہرقل نے ابوسفیان سے کہا: ''اگر تمہاری فراہم کردہ معلومات درست ہیں تو عنقریب اس کی حکومت میرے قدموں کے نیچے موجود زمین تک پھیل جائے گی۔'' چنانچہ سب جانتے ہیں کہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔(250)

جب روم کے امراء کو ہرقل کی اسلام کی طرف رغبت کا علم ہوا تو وہ غصے میں بغاوت پر اتر آئے۔ ہرقل کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی، چنانچہ اس نے ان سے کہا: ''میں نے تو یہ بات صرف تمہاری دینی پختگی دیکھنے کے لیے کہی تھی۔ سو میں نے وہ دیکھ لی ہے۔ اس پر وہ خوش ہو گئے اور اس کے سامنے سجدۂ تعظیم بجا لائے۔(251) دوسری طرف ہرقل کے رومیہ والے دوست نے اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ سے غائبانہ بیعت کی۔(252)

۳۔ دیگر سلاطین کے نام خطوط

رسول اللہ ﷺ نے دیگر اطراف اور شخصیات کی طرف بھی مکتوبات بھیجے۔ ان میں سے بعض کو ہدایت نصیب ہوئی اور وہ مسلمان ہو گئے اور بعض نے اگرچہ اسلام تو قبول نہ کیا، لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں احترام کا برتاؤ اختیار کیا، مثال کے طور پر جب رسول اللہ ﷺ نے قبطیوں کے بادشاہ مقوقس کی طرف حضرت حاطب بن بلتعہؓ کو بھیجا تو اس نے اگرچہ اسلام قبول نہ کیا، لیکن حضرت حاطب بن بلتعہؓ جتنا عرصہ اس کے پاس ٹھہرے، اس نے ان کا اکرام کیا اور واپسی پر ان کے ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے لیے تحائف بھیجے۔ انہی تحائف میں ام المؤمنین حضرت ماریہ بھی شامل تھیں، جو بعد میں حضرت ابراہیمؓ کی والدہ بنیں، نیز انہی تحائف میں دُلدُل نامی ایک سفید خچر بھی تھا۔(253) عربوں نے ایسا خچر پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

کسریٰ نے نبی کریم ﷺ کا مکتوب گرامی پرزے پرزے کر کے زمین پر پھینک دیا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس کی بادشاہت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور کچھ ہی عرصے میں سلطنت فارس کا شیرازہ بکھر گیا۔(254)

رسول اللہ ﷺ نے مختلف ممالک اور قبائل کے حکمرانوں اور رئیسوں کو دعوت دی... دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ نے پوری دنیا تک اپنا پیغام پہنچایا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ دلوں پر آپ ﷺ کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا، گویا آپ ایسی پاکیزہ مگر پوشیدہ جاذبیت کے مالک تھے، جو غیر مرئی اور پوشیدہ ڈوریوں کے ذریعے دلوں کو آپ کی طرف کھینچتی چلی آ رہی تھی۔ آپ ﷺ کے قریب آنے والا ہر فرد اور معاشرہ روشنیوں کے جہاں کی طرف پرواز کرنے لگتا۔ دلوں میں آپ ﷺ کی محبت کے اس قدر جاگزیں ہو جانے کے بعد آپ ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا یا آپ ﷺ کے بارے میں معاندانہ رویے کو برقرار رکھنا ایسے ہی ناممکن ہو گیا تھا جیسے سورج کی روشنی کو بجھانے یا چھلنی کے ذریعے اسے چھپانے کی کوشش کرنا۔

تھوڑے ہی عرصے میں سب کو اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ آپ ﷺ کی دعوت کی راہ میں حائل ہونے کی کوئی بھی کوشش کارگر ثابت نہیں ہو سکتی، چنانچہ انہوں نے ہتھیار ڈال کر آپ ﷺ کی اطاعت قبول کر لی۔

و: صلح حدیبیہ کا دعوتی پہلو سے جائزہ

صلح حدیبیہ دعوت وتبلیغ کے مواقع کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر سخت شرائط کو قبول کیا تو ابتدا میں حضرت عمر بن خطابؓ جیسے بعض صحابہ جن کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شدید قلبی تعلق کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا، کی طرف سے منفی ردِعمل سامنے آیا اور ابتدائی پریشان کن لمحات میں یوں لگتا تھا کہ صلح کا یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

لیکن زمینی حقائق شاہد ہیں کہ آئندہ سال مسلمان پوری آزادی کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ مسلمانوں کی اس آمد نے جو پورا ایک سال اہل مکہ کی مجالس کا موضوعِ سخن بنی رہی، آہستہ آہستہ بہت سے دلوں کو اسلام کے لیے وا کردیا، چنانچہ خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن عاصؓ جیسی مکہ کی بہت سی اہم شخصیات برضا ورغبت اسلام لے آئیں۔ (255)

عزتِ نفس مجروح ہوئے بغیر محض اپنی مرضی سے قبولِ اسلام نے ان کی آئندہ زندگیوں میں اسلام کی خاطر عظیم خدمات سرانجام دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

نیز بیعت کے دوران رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کا شدید جذباتی لگاؤ بھی مکی وفد کی نظروں سے اوجھل نہ تھا۔ اس سے بھی اسلام کے لیے دلوں کے کھلنے میں مدد ملی۔

ز: انفرادی دعوت

رسول اللہ ﷺ نے اپنی فتوحات کے عروج کے زمانے میں بھی انفرادی تعلقات کو کبھی نظر انداز نہ فرمایا، بلکہ انہیں خصوصی توجہ دی، چنانچہ باوجود اس کے کہ آپ ﷺ کو علم تھا کہ عنقریب تمام اہل مکہ آپ کی اطاعت اختیار کر کے آپ سے معافی کے خواستگار ہوں گے، آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن عاصؓ کی آمد اور قبولِ اسلام کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ آپ ﷺ نے ان عبقری شخصیات کے استقبال کے لیے بعض صحابہ کرام کو بھیجا اور جب حضرت خالد بن ولید نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کیا اور شہادتین کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ”خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں ہدایت نصیب فرمائی، مجھے تمہاری عقل و دانش سے یہی توقع تھی کہ وہ تمہیں ضرور بھلائی تک پہنچا دے گی۔“(256)

کسی شخص کے لئے ایسے نفسیاتی موقع پر رسول اللہ ﷺ کی اس قسم کی گفتگو انتہائی قابل فخر بات ہو سکتی تھی۔ کون جانتا ہے کہ اس گفتگو نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی روح کو جھنجھوڑنے اور ان کے دل میں ایمان کی چنگاری بھڑکانے میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہوگا؟

حضرت عمرو بن عاصؓ نے جب رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک تھاما تو ان کا اسے چھوڑنے پر دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ انہوں آپ ﷺ سے عرض کی: ”یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کے ہاتھ پر اس شرط پر بیعت کروں گا کہ میرے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اسلام اور ہجرت گزشتہ گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔“(257)

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے دل اپنی مٹھی میں لے لیے تھے، لیکن آپ ﷺ انہیں صرف دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کرتے۔ لوگ آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے اور جوق در جوق خدا کے دین میں داخل ہونے لگے۔ ان لہروں کے اثرات دورِ حاضر میں بھی محسوس ہو رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے رسول اکرم ﷺ کا مقدس پیغام رسالت تا قیامت قائم و دائم رہے گا۔

اخبارات میں ہم روزانہ پڑھتے ہیں کہ ہزاروں یورپین لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ساری دنیا کی نظریں اسلام پر مرکوز ہیں... یورپ کے پیٹ میں اسلام ہے اور ایک نہ ایک دن اس کے پیٹ سے اسلام جنم لے گا، نیز عالم اسلام بھی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور عنقریب اس کے پیٹ سے بھی کچھ نہ کچھ برآمد ہونے والا ہے۔

دنیائے مشرق کو دیکھئے جہاں نصف صدی سے زائد عرصے تک منافقت اور بے دینی کا دور دورہ اور حقوق کی پامالی پر مبنی سیاست کارا ج رہا،لیکن اس کے باوجود مختلف اسلامی ریاستوں مثلاً ترکمانستان، قازقستان، آذربائیجان، ازبکستان اور کرغیزستان (Kirghizia) نے اسلامی روح اور فکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ اپنے روحانی اور فکری ورثے کی حفاظت کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں۔ان شاء اللہ عنقریب ماسکو کے قلب میں اذانِ محمدی بلند ہوگی اور لوگ جوق در جوق اسلام کو قبول کریں گے، دعوتِ محمدی کے نمائندے دعوت کے لیے محبت اور شفقت کا اسلوب اختیار کریں گے اور زمین کا کوئی ایسا گوشہ نہ چھوڑیں گے، جہاں دعوت کی آواز نہ پہنچی ہو۔

ح: خدائی حفاظت وعنایات کا استحقاق

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ (المائدة:٦٧) ''اے پیغمبر! جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ بیشک خدا منکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیائے کرام سے مختلف انداز میں مخاطب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دیگر انبیائے کرام کو محض ان کے ناموں سے مخاطب کرتے ہیں۔ تعظیمی الفاظ کے ساتھ خطاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیازی وصف ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے پیغام رسالت وصول کر کے لوگوں تک عالم غیب کی خبریں پہنچاتے تھے۔ اس قسم کے تعظیمی الفاظ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے میں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہے، وہیں خدا کے ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرو منزلت کا اظہار بھی ہے۔ یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عظمت کا اعلان کر رہے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک پیغام رسالت پہنچاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس بلند مرتبے پر فائز رہیں گے، گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جو نبی تم سے باتیں کرتے ہیں اور تم ان سے باتیں کرتے ہو وہ ایک ایسے انسان ہیں، جس کی اللہ تعالیٰ بھی تعظیم واحترام کرتے ہیں، اس لیے تم اسے اس کے نام سے ''اے محمد اے محمد'' کہہ کر پکارنے کی بجائے "یاأیھا الرسول" کہہ کر پکارا کرو، یعنی اے وہ ذات جو وحی خداوندی سے قلب وروح کو جلا بخشتی ہے۔ اے نبی! جو انسانیت کی مدد کو لپک کر آتا ہے۔ اس قسم کے اندازِ تخاطب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نورانیت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت ونبوت کا شرف بخشا اور براہ راست اپنے ساتھ ہم کلامی کی اہلیت سے نوازا، یہی وجہ ہے کہ بعض اہل تحقیق کے نزدیک معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ہم کلامی فرمائی تھی، یعنی جس طرح دیگر اوقات میں وحی کا سلسلہ پردوں کے پیچھے سے تکمیل پاتا تھا، اگرچہ وہ وحی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تھی، اسی طرح معراج کی رات وحی کا نزول بغیر کسی پردے کے براہ راست ہوا تھا۔[258]

یہ ہمارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور خدا کی طرف سے انہیں عطا کردہ مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمارہے ہیں: ''آپ اپنے پروردگار کی طرف سے نازل کردہ وحی کو پہنچا دیجئے

اور تبلیغ رسالت کی راہ میں کسی قسم کے خوف واضطراب یا کسی اور مانع مثلاً بھوک، پیاس یا حب جاہ ومنصب کو حائل نہ ہونے دیجئے۔"

ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو کما حقہ تبلیغ رسالت اور ادائے امانت سے کوئی چیز باز نہ رکھ سکی۔ آپ ﷺ کے سامنے رسالت کا دروازہ کھلا اور آپ نے اسے ایسے انداز سے کھولا کہ آپ ﷺ سے پہلے کسی نے بھی اسے ایسے نہ کھولا تھا۔ اسی کی روشنی میں ہم ارشاد ربانی: ﴿كَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى﴾ (النجم:۹) "تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم" کو سمجھ سکتے ہیں۔ آپ ﷺ تمام حدود عبور کر کے اس مقام پر جا پہنچے تھے، جس کے بارے میں أمیر الشعراء کہتے ہیں:

حتیٰ بلغت سماء لا یطار لها　　　　علی جناح، ولا یسعیٰ علی قدم

یہاں تک کہ آپ ان رفعتوں تک پہنچ گئے، جن تک پروں کے ذریعے اڑ کر اور نہ قدموں پر چل پہنچا جا سکتا ہے۔

وقیل: کل نبی عند رتبة　　　　ویا محمد هذا العرش فاستلم

اور کہا گیا کہ ہر نبی کا مخصوص مقام ہوتا ہے، لیکن اے محمد! آپ کے لیے یہ عرش حاضر ہے اس پر بیٹھیے۔

یہ امکان کی حدود کو عبور کرنے کے مترادف ہے۔ موضوع کی مناسبت سے (August Comte) کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ اثباتی فلسفے (Positivism) کے بانیوں میں سے تھا اور اس کی تمام عمر مذہب دشمنی میں گزری تھی، کیونکہ اس کی رائے میں جو بھی چیز سائنسی تجربے سے ثابت نہ ہو سکتی وہ فضول اور لایعنی چیز ہوتی۔ "تاریخ مراد" میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ اندلس گیا اور وہاں مسلمانوں کے تعمیر کردہ آثار اور اسلامی فنون کے شاہکار دیکھے تو ششدر رہ گیا اور ایک مدت تک انتہائی حیرت کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے وہاں کے بعض لوگوں سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں اور جب اسے بتایا گیا کہ محمد ﷺ ایک اُمّی انسان تھے تو وہ حیرت کے مارے سکتے میں چلا گیا اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ روم گیا اور پاپائے روم سے حلفیہ طور پر اس بارے میں پوچھا اور جب پوپ نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی تو وہ بے ساختہ بول اٹھا: "اگرچہ محمد خدا نہیں ہیں، لیکن وہ بشر بھی نہیں ہیں۔"

کیا ہمارے شاعر بوصیری نے بھی یہی بات نہیں کہی تھی:

فمبلغ العلم فيه أنه بشر | وأنه خير خلق كلهم

"آپ ﷺ کے بارے میں انسانی علم کی معراج یہی ہے کہ آپ بشر تو ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی افضل ترین مخلوق ہیں۔"

یقیناً آپ ﷺ ایک انسان تھے، آپ کے والدین تھے اور آپ کی زندگی کا ایک مادی پہلو بھی تھا، لیکن آپ ﷺ کی شخصیت کو صرف مادی پہلو سے سمجھنا ممکن نہیں۔ آپ تو آسمانِ نبوت کے طائر لاہوتی تھے۔ ہماری گفتگو تو ہمیشہ اس انڈے تک محدود رہتی ہے، جس سے آپ ﷺ کا ظہور ہوا تھا، لیکن معراج کی رات آپ ﷺ جن رفعتوں پر پہنچے تھے، ہم ان کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، کیونکہ یہ انسانی ادراک وشعور کے احاطے سے باہر ہے۔

تبلیغ کی ضرورت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندے کو اس کی ذمہ داری سونپی، اسے اس کی ضرورت واہمیت سے آگاہ کیا اور کسی بھی پہلو سے اس میں کوتاہی کرنے پر خبردار کیا۔

اسی لیے آپ ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے دعوت وتبلیغ ہماری بھی اہم ترین ذمہ داری ہے اور ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ انسانیت کی نجات صرف اور صرف آپ ﷺ کی دعوت اور آپ ﷺ کے نقش پا پر چلنے والوں کے انفاسِ طیبہ پر موقوف ہے۔

چوتھی فصل: فراست

فراست عقل کے ذریعے عقل کو عبور کرنے سے عبارت ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ فراست کو ''نبوی منطق'' سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ منطق قلب و روح، احساس اور دیگر لطائف کا مجموعہ اور نقطۂ اجتماع ہوتی ہے۔

فراست محض خشک عقل و منطق کا نام نہیں۔ اسلام کو محض عقل و منطق کی طرف منسوب کر کے اسے عقل و منطق کا مذہب قرار دینا نہ صرف اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے، بلکہ انتہائی خطرناک تحریف کی طرف پہلا قدم بھی ہے۔ اسلام ہرگز عقل و منطق کا مذہب نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ یہ وحی خداوندی پر مبنی دین ہے۔

اسلامی عقائد کے عقل و منطق سے متصادم نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ ہر چیز پر محیط ''علم خداوندی'' اور اسی آسمانی سرچشمے کے مناسب ''نبوی منطق'' کی تفسیر ہے، دوسرے لفظوں میں یہ بیک وقت ''نبوی الہام'' بھی ہے اور ''نبوی منطق'' بھی۔ یہ منطق جہاں وحی خداوندی کو وصول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہیں اس کا درِ حس، قلب و روح اور فلسفے کے لیے بھی کھلا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں لطائف و حِکَم کا ظہور ہوتا ہے، گویا یہ منطق عام منطق سے بلند تر ہوتی ہے، اسی لیے ہم اسے ''عظیم ترین فراست'' کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

ہر وحی خداوندی کا اس منطق میں منعکس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا بھی تقاضا ہے، کیونکہ اگر وحی خداوندی کو براہ راست انسانیت تک پہنچا دیا جاتا اور اسے نبوی منطق کے سانچے میں ڈھال کر ایسے ہی منظم اور ہم معیاری (standardized) نہ کیا جاتا جیسے انتہائی زیادہ وولٹ کی حامل برقی رو کو ہم معیاری اور پیہم (regularized) کیا جاتا ہے تو انسانیت حواس کھو بیٹھتی اور وحی خداوندی کی تجلی سے بالکل اسی طرح راکھ ہو جاتی، جیسے اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے حجاب اور پردے اٹھا لیں تو ہر چیز جل جائے۔(259)

دوسرے لفظوں میں انبیائے کرام کی فراست وحی کے شہب ثاقبہ کے خلاف کرۂ فضائی کا کام کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی خداوندی کو انسانی فہم کی سطح کے مطابق پیش کرنا ہی دین کا صحیح مصداق ہے اور یہ فریضہ صرف انبیائے کرام کی فراست سرانجام دے سکتی ہے، اسی لیے ہر نبی میں فراست کا

پایا جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ انبیائے کرام کی منطق (فراست) کو عبقریت کا نام دینا درست نہیں، کیونکہ انبیائے کرام کی منطق ہر قسم کی منطق سے اعلیٰ وارفع ہوتی ہے جسے "الفطنة" (فراست) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگر انبیائے کرام فراست کے حامل نہ ہوتے تو وہ دشمنوں کے تمام اعتراضات کے جوابات دے سکتے اور نہ ہی اپنے پیروکاروں کے پوچھے گئے مسائل واستفسارات کی وضاحت کر پاتے، جس کا لازمی نتیجہ دین میں ابہام اور اس کی فہم میں مشکلات کی صورت میں نکلتا، نیز تمام دینی واجبات بے معنی اور انسان کی تخلیق بے مقصد ہو جاتی۔ اوپر ذکر کردہ منفی نتائج کے سدباب کے لیے انبیائے کرام کو ایسی خرقِ عادت فراست سے نوازنا ناگزیر تھا، جس کے ذریعے وہ تمام مشکلات اور مسائل کا سہولت کے ساتھ حل پیش کر سکیں۔

نبی کریم ﷺ کی فراست

اگر ہم دورِ نبوی پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ سے بسا اوقات بہت پیچیدہ شرعی مسائل دریافت کرتے تھے، اسی طرح دین اسلام کی طرف مائل لوگ بھی اپنے ذہنوں میں پیدا ہونے والے بعض سوالات اور شبہات کے شافی جوابات کے منتظر رہتے تھے، مزید برآں بعض اہل کتاب نبی کریم ﷺ سے حسد اور بغض کی بنا پر لوگوں کے درمیان شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ نبوی منطق اور فراست کے بغیر ایسے تمام سوالات اور شبہات کا جواب دینا ممکن نہ تھا۔

نبی کریم ﷺ کے مخاطبین سمجھ بوجھ کے اعتبار سے کئی مراتب میں تقسیم تھے۔ آپ ﷺ کے بعض مخاطبین دین سے وابستگی رکھنے والے ایسے حضرات تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عبادت گاہوں میں بسر کر کے زندگی کے بعض شعبوں سے متعلق آگاہی اور نفسیات کے سمجھنے میں گہرائی حاصل کر لی تھی۔ بعض لوگوں کو فلسفیانہ امور میں مہارت حاصل تھی اور اصحاب عقل و خرد کہلاتے تھے۔ کچھ لوگوں کو معیشت و تجارت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ بعض سامعین فنونِ حرب اور سیاست کے ماہر مانے جاتے تھے، نیز آپ ﷺ کے سامعین میں دنیوی امور سے ناآشنا دیہاتی بھی شامل تھے... ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مسائل و مشکلات کے حل کی تلاش میں تھا۔ مخاطبین کے اس قدر تنوع کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ﷺ ایسی گفتگو فرمائیں، جسے ایک دیہاتی اور اعلیٰ درجے کا دانشور دونوں سمجھ سکیں اور اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس سے استفادہ کر سکیں اور دین کی جامعیت کا یہ وصف قیامت تک باقی رہے۔

انسان سوچنے، سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ ان اوصاف کی وجہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کے ساتھ جزوی مشابہت حاصل ہے۔ اگر افکار ذہن سے کلام اور کلام سے تحریر کی صورت اختیار کر لیں تو انہیں دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ جو افکار و نظریات کلام اور تحریر کی صورت اختیار نہیں کرتے وہ اپنے خالق کی موت کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح سوچنے کی صلاحیت انسان کے لیے نعمت ہے، اسی طرح بولنے اور افکار کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت بھی انسان پر بہت بڑا انعام خداوندی ہے، چنانچہ قرآن کریم اللہ عزوجل کی رحمانیت کو بیان کرتے ہوئے تخلیق انسان کے تذکرے کے فوراً بعد انسان کی تعبیر کی صلاحیت کا تذکرہ کرتا ہے: ﴿و عَلَّمَهُ البيانَ﴾ (الرحمان: ٤) ''اسی نے اس کو بولنا سکھایا۔''

انسان ابتدائے آفرینش سے سوچنے اور بولنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے اور قیامت تک رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ کا تقاضا ہے، جس کا ظہور انبیائے کرام علیہم السلام اور خصوصاً ہمارے

نبی کریم ﷺ کے حق میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوا ہے۔ انبیائے کرام کے بلند مرتبے کی فراست "الفطنة" کے بغیر کوئی توجیہ ممکن نہیں، کیونکہ فراست کے بغیر وہ ایسے بلند مرتبے پر فائز نہیں ہو سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ فراست انبیائے کرام علیہم السلام کی اہم ترین صفت ہے۔

ہر نبی سمجھنے اور ادراک کرنے کی اعلیٰ ترین صلاحیت اور اسے تعبیر کرنے کی قدرت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو آسانی سے حل اور انہیں عام فہم الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ انبیائے کرام کے اسلوبِ بیان کو سھل ممتنع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یعنی وہ اپنا مدعا اتنے آسان پیرائے اسلوب میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بھی اسی انداز میں گفتگو کر سکتا ہے، لیکن کوشش کرنے پر اسے اپنے عجز کا احساس ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی یہ صلاحیت ایک ایسا عطیۂ خداوندی ہے، جو ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔

نبی کریم ﷺ کو کوئی کتنی ہی منفرد اور انوکھی مشکل کیوں نہ پیش آتی آپ ﷺ اس کا اتنی آسانی سے حل نکال لیتے کہ یوں لگتا گویا آپ ﷺ کو اس کے بارے میں پرانا تجربہ حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ "جارج برنارڈ شو" (Geogre Bernard Show) آپ ﷺ کے بارے میں لکھتا ہے: "محمد (ﷺ) دورِ حاضر کے مشکل ترین مسائل کو چٹکیوں میں حل کر سکتے ہیں۔"

عصرِ حاضر کے کتنے ہی معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت اپنوں اور غیروں سب پر واضح ہو چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چشمۂ حکمت کی طرف رجوع کیے بغیر ان مشکلات و مسائل کو حل کرنا ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی فراست سے متعلق اس قدر اقوال موجود ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتب تیار ہو سکتی ہے۔ تاہم اس وسیع موضوع کی تکمیل کے لیے ہم ذیل میں صرف دو اقوال کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

ترجمان القرآن حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان فرماتے ہیں: "لوگوں میں سے سب سے افضل اور عقلمند تمہارے نبی محمد ﷺ ہیں۔"

حضرت وہب بن منبہ ایک تابعی عالم تھے، انہوں نے تورات اور انجیل کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، وہ فرماتے ہیں: "میں نے اکہتر کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان سب میں یہی پڑھا کہ نبی کریم ﷺ عقلمند ترین اور سب سے بہتر رائے والے انسان ہیں۔" ایک دوسری روایت کے مطابق انہوں نے یوں فرمایا ہے: "میں نے ان سب میں یہی پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولین و آخرین کو جو عقل دی ہے اسے آپ ﷺ کی عقل و خرد سے وہی نسبت ہے، جو ریت کے ایک ذرے کو دنیا بھر کے ریگستانوں سے ہے۔"(260)

الف: آپ ﷺ کی فراست کی چند مثالیں

ا- تعمیر کعبہ

زمانہ جاہلیت میں لوگ انتہائی فسادی اور فتنہ پرداز طبیعتوں کے مالک تھے۔ فتنے کی آگ بھڑکانا گویا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ جب بھی دو تین آدمی اکٹھے ہوتے تو کوئی نہ کوئی فتنہ برپا ہو جاتا۔ یقیناً ایسے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے ان کی ایسی تربیت کرنا کہ وہ مستقبل میں پورے عالم کے معلم و مرشد بن جائیں، رسول اللہ ﷺ کا خصوصی معجزہ ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی بے پناہ فراست کی مدد سے اس ذمہ داری کو بخوبی سرانجام دیا۔ اتفاق سے رسول اللہ ﷺ کے دعویٰ نبوت سے کچھ عرصہ پہلے مشرکین نے کعبہ شریف کی تعمیر نو کا آغاز کیا۔ تعمیر ابھی پائے تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ حجر اسود کو اپنی جگہ پر رکھنے کے بارے میں مشرکین کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر قبیلہ اس سعادت کے حصول کا متمنی تھا، چنانچہ تلواریں سونت لی گئیں، تیر کمانوں میں ڈال دیئے گئے اور نیزے سیدھے کر دیئے گئے۔ قریب تھا کہ کوئی بہت بڑا فتنہ برپا ہو کر شدید لڑائی کی صورت اختیار کر لے۔ رسول اللہ ﷺ ابھی تک نبوت سے سرفراز نہ ہوئے تھے، لیکن آپ ﷺ کی روح میں پنہاں تخم نبوت پھلنے پھولنے کے لیے موسم بہار کی آمد کا منتظر تھا... حالات ایک منحوس لڑائی کا عندیہ دے رہے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اگر یہ خانہ جنگی چھڑ گئی تو کتنا عرصہ جاری رہے گی، کتنی جانیں اس کی بھینٹ چڑھیں گی اور کتنا مال و زر ضائع ہوگا۔ ایسے میں نہ جانے کیسے ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ تجویز آئی کہ فلاں دروازے سے سب سے پہلے داخل ہونے والے شخص کو ثالث بنا لیا جائے اور سب اس کے فیصلے کو تسلیم کریں۔ تمام قبائل نے یہ تجویز منظور کر لی اور سب لوگ اس مخصوص دروازے سے سب سے پہلے داخل ہونے والے شخص کا شدت سے انتظار کرنے لگے... چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے اس دروازے سے داخل ہوئے تو سب خوشی پکار اٹھے: ''یہ شخص محمد ہے، جو امین ہے، ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ کو جب معاملے سے آگاہ کیا گیا تو آپ ﷺ نے زیادہ سوچ و بچار کے بغیر فوراً ایک چادر لانے کے لیے کہا۔ جب چادر لائی گئی تو آپ ﷺ نے خود حجر اسود اٹھا کر اس کے درمیان رکھا، ہر قبیلے کے سردار نے چادر کے کناروں کو تھاما اور حجر اسود کو نصب کرنے کی جگہ پر لے گئے، جہاں ہمارے آقا ﷺ نے اسے اپنے مقام پر نصب فرما دیا۔ (261)

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے قبائل کے درمیان ایک بڑی خانہ جنگی کا سدباب کر دیا، جس کے

لیے آپ ﷺ کو زیادہ سوچ و بچار کی ضرورت بھی نہ پڑی، بلکہ بہت جلد اور آسانی کے ساتھ درست حل تک پہنچ گئے... کیا یہ فراست نبوی نہ تھی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی تک آپ ﷺ نبوت سے سرفراز ہوئے تھے اور نہ ہی آپ ﷺ پر کوئی وحی نازل ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود یہ ایک ایسی شخصیت کی فراست تھی، جسے نبوت جیسی عظیم اور مشکل ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے منتخب کیا گیا تھا... یقیناً آپ ﷺ سب سے بڑھ کر صاحب فراست اور صاحب دانش تھے اور یہ ایسی شخصیت کے لیے ضروری بھی تھا، جس نے مستقبل میں قرآنِ کریم کی دعوت کو پھیلانا تھا۔

۲- حضرت حصینؓ کا قبول اسلام

حضرت حصینؓ آپ ﷺ کو پند و نصیحت کرنے اور اسلام کی تبلیغ کو چھوڑنے پر رضامند کرنے کے ارادے سے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نبی کریم ﷺ اپنے مخاطب کو سمجھنے اور اس کے مقام کو پہچاننے کا حیرت انگیز ملکہ رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے مخاطب سے اس قدر محتاط اور نپے تلے الفاظ میں گفتگو فرماتے کہ اگر ان میں ایک لفظ کا بھی ردوبدل کر دیا جاتا یا وہی الفاظ اس سے مختلف شخصیت کے حامل انسان سے کہے جاتے تو مطلوبہ مقاصد کبھی بھی حاصل نہ ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ مناسب کلمات کے انتخاب اور اپنے مخاطب کے مقام کو کبھی نظر انداز نہ فرماتے۔ کسی اور انسان میں اس صلاحیت کا اس درجے میں پایا جانا ممکن نہیں۔ آپ ﷺ کا یہ ملکہ فطری اور طبعی تھا۔ آپ ﷺ کو فوراً احساس ہو جاتا تھا کہ آپ کہاں، کس سے اور کیسے گفتگو کر رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کی ہر بات ضروری اور موقع و محل کے مطابق ہوتی تھی۔ جس طرح آپ ﷺ کی گفتگو ہر قسم کی غلطی سے محفوظ ہوتی تھی، اسی طرح آپ کی گفتگو میں ضرورت سے زائد ایک لفظ بھی نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی آپ ﷺ کی ارشادات کے ایک ایک لفظ کا بغور جائزہ لے تو اسے ایک بھی ایسا لفظ نہ ملے گا، جس کا تذکرہ ضروری نہ ہو... اگر یہ فراست نبوی نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

حضرت حصینؓ پر آپ ﷺ کی فراست کی سحر انگیزی دیکھئے کہ جب حضرت حصینؓ نے اپنی بات مکمل کی تو آپ ﷺ نے انتہائی نرمی اور ادب کے ساتھ حضرت حصینؓ سے دریافت فرمایا: ''اے حصین! تم کتنے معبودوں کی عبادت کرتے ہو؟'' حضرت حصینؓ نے کہا: ''آٹھ کی، جن میں سے سات زمین پر ہیں اور ایک آسمان میں ہے۔''(262)

آپ ﷺ نے پوچھا: ''جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی تو کسے پکارتے ہو؟'' حضرت حصینؓ نے

جواب دیا: ''اس معبود کو جو آسمان میں ہے۔'' آپ ﷺ نے پھر پوچھا: ''جب تمہارا مال برباد ہوتا ہے تو کسے پکارتے ہو؟'' حضرت حصینؓ نے کہا: ''اس معبود کو جو آسمان میں ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہاری داد رسی تو آسمان والا معبود تنہا کرتا ہے، لیکن تم اس کے ساتھ دوسرں کو بھی شریک ٹھہراتے ہو۔ کیا تم شکر کے طور پر اس بات پر راضی ہو گئے ہو یا تمہیں مغلوب ہونے کا اندیشہ ہے؟'' حضرت حصینؓ نے جواب دیا: ''ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایسی گفتگو میں نے پہلے کبھی نہیں سنی۔'' آپ ﷺ نے حضرت حصین سے فرمایا: ''اسلام قبول کرلو سلامتی پالو گے۔'' حضرت حصینؓ نے کہا: ''میری قوم اور خاندان بھی ہے، ایسی صورتِ حال میں مجھے کیا کہنا چاہیے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یوں کہو: اے اللہ! میں آپ سے اپنے لیے ہدایت اور راہنمائی کا طلبگار ہوں اور مجھے علم نافع عطا فرما۔'' حضرت حصینؓ نے یہ کلمات کہے اور مجلس سے اٹھنے سے پہلے اسلام قبول کرلیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرانؓ (263a) ان کی طرف بڑھے اور ان کے ہاتھ، پاؤں اور سر کو بوسہ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو آپ ﷺ رو پڑے اور فرمایا: ''مجھے عمران بن حصینؓ کے طرزِ عمل کو دیکھ کر رونا آیا ہے کہ جب حصین کفر کی حالت میں آئے تھے تو عمرانؓ ان کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ ہی ان کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن جب حصینؓ نے اسلام قبول کیا تو عمرانؓ نے ان کا حق ادا کیا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔'' جب حضرت حصینؓ واپس جانے لگے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: ''اٹھو اور ان کے گھر تک ان کے ساتھ چلو۔'' حضرت حصینؓ باہر آئے تو قریش نے انہیں دیکھ کر کہا کہ یہ بھی بے دین ہو گیا ہے اور ان سے دور ہو گئے۔ (263b)

یہ حقیقت ہے کہ یہ مکالمہ انتہائی سادہ اور واضح تھا۔ اس میں جملوں کا انتخاب حضرت حصینؓ کے مقام اور عقلی سطح کے بالکل مطابق تھا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے آخری ارشاد کے بعد حضرت حصینؓ کے سامنے شہادتین: ''أشهد أن لا اله الا الله و أن محمد رسول الله'' کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، یعنی ان کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو شہادتین کا اقرار کر کے ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی سے سرفراز ہو جائیں یا بغیر کچھ کہے رسول اللہ ﷺ کی مجلس سے اٹھ جائیں اور ضد پر قائم رہیں۔

۳- بدوی کے مقام اور ذہنی سطح کے مطابق گفتگو

بدوی صحراء میں رہنے والے انسان کو کہتے ہے... جسے کبھی تو اپنی ضروریات کا بھی خیال نہیں رہتا... اور کبھی صحرائی آندھیوں سے گھبرا کر گلے شکوے کرنے لگتا ہے... ذرا ایسے شخص کے بارے میں سوچیے... اگر اسے کوئی مصیبت آ گھیرے یا وہ کسی تنگی کا شکار ہو جائے تو وہ کیا کرے گا؟... یقیناً وہ

وہی بات کہے گا جو حضرت حمزہؓ نے قبولِ اسلام کے وقت رسول اللہ ﷺ سے کہی تھی: ''اے محمد، اے میرے بھتیجے...! جب میں رات کے وقت صحراء میں گھومتا پھرتا ہوں تو میرا وجدان کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے ہیں انہیں کسی چاردیواری میں محبوس نہیں کیا جاسکتا۔''

جو لوگ بھی لات، عزیٰ اور ہبل کی عدم نفع رسانی کا مشاہدہ کرتے وہ یہی بات کہتے، کیونکہ ان کے ضمیر دلوں میں موجود اس حقیقت کا پکار پکار کر اعلان کرتے تھے۔ ضمیر کی یہ آواز صدائے حق تھی، یہی وجہ تھی کہ کتنے ہی اس قسم کی نفسیاتی اور روحانی طبیعت کے لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے، اور اپنے بدویانہ قسم کے سوالات کے انتہائی مناسب اور اپنی حالت اور روحانی کیفیت کے بالکل مطابق جوابات ملنے پر قبولِ حق کا اعلان کرتے اور آسمانِ ہدایت پر درخشاں ستاروں کی مانند چمکنے لگتے۔ (264)

امام احمد بن حنبلؒ ابو تمیمہ ہجیمیؒ سے روایت کرتے ہیں، جنہوں نے اپنی قوم کے ایک آدمی سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یا (راوی کہتے ہیں کہ اس آدمی نے یوں کہا کہ) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟'' راوی کہتے ہیں کہ یا اس نو وارد نے یوں کہا: ''کیا آپ محمد ہیں؟'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بالکل۔'' اس پر نو وارد شخص نے پوچھا: ''آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس اکیلے خدا کی طرف بلاتا ہوں، جسے اگر تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ تمہاری تکلیف دور کرتا ہے، قحط سالی میں پکارتے ہو تو تمہارے لیے اناج پیدا کرتا ہے اور بے آب وگیاہ زمین میں راستے سے بھٹک کر اسے پکارتے ہو تو تمہیں راستہ دکھاتا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کی یہ گفتگو سن کر وہ بدوی شخص مسلمان ہوگیا۔ (265)

بدوی سے کی گئی یہ گفتگو کس قدر شاندار ہے! ہر جملہ ہی بدوی کے لیے اپنے اندر ایک جاندار اور پرتاثیر عنوان لیے ہوئے ہے، مثلاً خشک سالی، مصائب، آزمائش اور صحرائی زندگی کی مشکلات وغیرہ۔

ایک بدوی آزمائش، تنگ دستی اور مصائب کا بہت قریب سے مشاہدہ کرتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے پہلے ان چیزوں کا تذکرہ فرمایا اور پھر اس لامحدود طاقت کے بارے میں بتایا، جس کے سوا کوئی جائے پناہ اور ٹھکانا نہیں۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے بدوی کے اس ضمیر کو جھنجھوڑا، جس میں اگرچہ ان حقائق کی آواز موجود تھی، لیکن وہ ابھی تک اس کے معانی و مطالب سے ناآشنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے گویا ضمیر کی اس آواز کے مفہوم و مطلب کی وضاحت فرمائی، جس نے اس کے دل کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ قبولِ اسلام کا اعلان کیے بغیر نہ رہ سکا۔

مذکورہ بالا گفتگو اپنی سادگی اور اہلِ بلاغت کے تکلفات سے خالی ہونے کے باوجود اس بدوی کے اس قدر مناسبِ حال، اس کی ذہنی سطح کے اس قدر موافق اور اس کی نفسیات سے اس قدر ہم آہنگ تھی کہ اسے سننے کے بعد وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

کیا تاریخ میں رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی اور ایسا شخص گزرا ہے، جس نے سنگ دل لوگوں کو رحمت کے فرشتوں میں بدل دیا ہو؟ یہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہی تھی، جس نے اپنی خداداد صلاحیتیں حکیمانہ انداز سے استعمال کر کے اتنا عظیم انقلاب برپا کر دیا، جس کی کوئی مادی توجیہ پیش کرنا مؤرخینِ اور ماہرین عمرانیات کے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے معاشرتی زندگی کی ندیوں کو جن جواہر سے مالا مال کیا تھا ان سے اٹھنے والی لہریں دورِ حاضر کے ساحل سے چھو رہی ہیں اور یقیناً قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اطراف عالم سے لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اسلام کی یہ پاکیزہ کشش اور جاذبیت جو صدیاں گزرنے کے باوجود موجود ہے اگر نبی کریم ﷺ کے طفیل نہیں تو پھر اور کس کے طفیل ہے؟ کیا آپ ﷺ کے سوا کوئی اور اس قدر پرکشش اور پرتاثیر شخصیت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، یہ قطعاً ناممکن ہے۔ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس زمانے بھر میں یکتا ہے اور ہر چیز کو آپ ﷺ کے صدقے وجود ملا۔

۴۔ غزوہ حنین کے موقع پر انصارِ مدینہ سے خطاب

جس طرح سرورِ کونین ﷺ مشکل ترین مسائل کو بآسانی حل فرما لیتے اور پیچیدہ ترین مشکلات کی گرہیں جلد اور بلا تاخیر سلجھا لیتے تھے، اسی طرح آپ ﷺ اچانک پیش آمدہ مسائل و مشکلات کا سامنا بھی احتیاط اور حوصلے کے ساتھ کرتے اور بلا تاخیر ان کا کوئی مناسب حل تلاش فرما لیتے تھے۔ اگر آپ نبی کریم ﷺ کے ایک ایک قول و فعل کا بغور جائزہ لیں تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ ﷺ کی ہر حرکت، زندگی کا ہر اقدام اور گفتگو کا ہر ہر لفظ انتہائی موزوں اور مناسب انداز سے باہم مربوط اور موقع و محل کے مطابق ہوتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ ﷺ کو اتنی شاندار کامیابی و کامرانی کبھی حاصل نہ ہو سکتی، مزید برآں آپ ﷺ نے کبھی بھی اپنے معاملات کو بہ تکلف سنوارنے کی کوشش نہیں فرمائی اور نہ ہی آپ ﷺ کے پاس ان کے بارے میں زیادہ غور و فکر کرنے کی فرصت ہوتی تھی۔

اگر آپ ﷺ خرقِ عادت فراست کے مالک نہ تھے تو پھر آپ ﷺ کی فراست کے واقعات کی کیا توجیہ پیش کی جا سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے آپ ﷺ نبی تھے۔ آپ ﷺ کی فراست نبوت کی فراست

تھی... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر اور عمل انبیائے کرام کے افکار و اعمال جیسے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کبھی ناکامی حائل نہ ہوئی، بلکہ ہمیشہ اعلیٰ کامیابیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم چومے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کی رسائی ممکن نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بہت سے واقعات اس پر شاہد ہیں، لیکن اس موقع پر صرف ایک واقعہ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر ذکر کیا جاتا ہے۔

فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کا اکثر حصہ سردارانِ قریش اور دیگر قبائل کے مشہور سربراہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ فتح مکہ کے بعد ان سرداروں کی دل جوئی ہو اور فتوحات کا یہ سلسلہ جاری رہے، کیونکہ ان میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل تھے، جو پوری رضامندی سے حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوئے تھے، لہذا اگر ان کی دل جوئی کے ذریعے ان کے دلوں سے کفر کی برف کو مکمل طور پر نہ پگھلایا جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ اسلام کے لیے پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے اور اسے شدید نقصان پہنچاتے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تالیفِ قلوب کا اقدام کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست کا نتیجہ تھا۔ اس موقع پر تقسیم کیے گئے مالِ غنیمت کی تفصیل کچھ یوں تھی: ۶۰۰۰ قیدی ۲۴۰۰۰ اونٹنیاں، ۴۰۰۰۰ بھیڑیں اور ۴۰۰۰ اوقیہ سونا چاندی۔ (266)

تقسیمِ غنیمت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کا اکثر حصہ اہلِ مکہ کو عطا فرمایا اور بعض شخصیات کو بہت بڑی مقدار میں مالِ غنیمت دیا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے یہ وہ لوگ تھے جن کی دل جوئی کر کے انہیں اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود تھا۔ ایسا کرنا نہ صرف فائدہ مند، بلکہ ناگزیر تھا۔ مثال کے طور پر کچھ شخصیات اور انہیں دیئے گئے مالِ غنیمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آلِ ابی سفیان کو ۳۰۰ اونٹنیاں اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی عطا فرمائی، حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو بھی ۳۰۰ اونٹنیاں دیں۔ نصیر بن حارث، قیس بن عدی، صفوان بن امیہ، حویطب بن عبدالعزیٰ، اقرع بن حابس اور مالک بن عوف کے حصے میں سو سو اونٹنیاں آئیں۔ عیینہ بن حصن کو سو اونٹ دیئے گئے۔ بعض دیگر اہم شخصیات کو بھی چالیس سے پچاس کے درمیان اونٹنیاں دی گئیں۔ (267)

تقسیم کیا گیا مالِ غنیمت اونٹنیوں اور سونے چاندی پر مشتمل تھا... جس کا مقصد دین کا دفاع اور نومسلموں کی دل جوئی کر کے انہیں اسلام کے قریب لانا تھا، اس لیے کہ مکہ فتح ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ چونکہ اہلِ مکہ کے نزدیک مکہ کا تقدس ہی سب کچھ تھا، اس لئے بعض اہلِ مکہ شکستہ دل تھے، چنانچہ اس کی تلافی کرنے اور ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔

تاہم اس تقسیم نے بعض انصاری صحابہ خصوصاً نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکا یا یہاں تک کہ کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی مغفرت فرمائے، آپ ﷺ ہمیں چھوڑ کر اہل مکہ کو نوازنے لگے ہیں، حالانکہ ہماری تلواروں سے ابھی تک ان کا خون ٹپک رہا ہے۔ یہ باتیں فتنے کا آغاز تھیں۔ ایسی باتیں کرنے والوں کی تعداد کا کم ہونا اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ اگر اس فتنے کا فوراً سد باب نہ کیا جاتا تو یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتا، نیز نبی کریم ﷺ پر ادنیٰ سے اعتراض سے بھی انسان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور وہ دین و ایمان کی دولت سے محروم ہو کر ابدی نقصان کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی سنگینی فتنے کی سنگینی سے کہیں بڑھ کر تھی۔

حضرت سعد بن عبادہؓ نے فوراً رسول ﷺ کو اس معاملے سے آگاہ کیا۔ اگرچہ ایسی باتیں صرف نوجوانوں نے کی تھیں اور پختہ عمر کے لوگوں نے تقسیم غنائم کی کوئی فکر نہ کی تھی، لیکن اس فتنے کی آگ کو پھیلنے سے روکنے کے لیے جلد بجھانا ضروری تھا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے صرف انصاری صحابہ کو ایک جگہ جمع ہونے کے لئے کہا اور پھر درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

"اے جماعت انصار! تمہاری طرف سے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تمہارے دلوں میں میرے بارے میں ناراضگی ہے۔" اس انداز سے خطبے کا آغاز سامعین کے لیے نفسیاتی طور انتہائی حیران کن تھا، کیونکہ کسی کو بھی ایسی گفتگو کی توقع نہ تھی۔ اکثر حضرات تو اس اجتماع کے سبب سے ہی ناواقف تھے۔ اس جملے نے اچانک لگائے جانے والے طمانچے کا کام کیا، جس سے دلوں کو درستی کی طرف مائل کرنے میں مدد ملی۔ ایسے ماحول میں رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرنا تو کسی صحابی کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ بعض صحابہ کے دلوں میں غنائم کی تقسیم کی وجہ سے احساسِ محرومی پیدا ہونے کا خدشہ تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ اس خدشے کو ختم کرنے کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے اس جملے سے احساسِ محرومی کا شکار ہونے والے بعض نوجوان صحابہ کرامؓ کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ ہمہ تن گوش ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حال میں آپ ﷺ جو بات بھی ارشاد فرماتے وہ بہت اہم ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ مطلوبہ نتیجے کے حصول کے لیے اس انتظار کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ کچھ توقف کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب میں تمہارے پاس آیا تھا تو کیا اس وقت تم گمراہ نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت عطا کی؟ کیا تم ضرورت مند اور محتاج نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دار بنا دیا؟ کیا تم ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی؟" انصار نے جواب میں کہا: "کیوں نہیں، یا رسول اللہ ﷺ ... یہ سب اللہ اور اس کے رسول کا احسان ہے۔"

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے گفتگو کا رخ دوسری طرف پھیرا... اور احساسات و جذبات کے اچھی طرح بیدار ہو جانے کے بعد انصار کی طرف سے گفتگو کرتے ہوئے وہ تمام باتیں کہیں جو انصار بدترین حالات میں کہہ سکتے تھے، حالانکہ اگر کوئی بھی مسلمان اپنے نبی سے ایسی بات کہے تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں۔

رسول اللہ ﷺ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا: ''اے انصار کے گروہ! کیا تم مجھے جواب نہیں دو گے؟ انصار صحابہ کرامؓ نے پوچھا: ''یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ سے کیا عرض کریں اور آپ کو کیا جواب دیں؟ یہ سب اللہ اور اس کے رسول کا احسان ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بخدا اگر تم چاہو تو بجا طور پر کہہ سکتے ہو کہ آپ جلاوطن ہو کر ہمارے پاس آئے ہم نے آپ کو پناہ دی، آپ مفلس و نادار تھے ہم نے آپ سے غمخواری کی، آپ خوفزدہ تھے ہم نے آپ کو امان دی اور آپ بے یار و مددگار تھے ہم نے آپ کی مدد کی۔''

یہ سن کر انصار صحابہؓ نے عرض کی: ''ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے زیر بارِ احسان ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کیا تم مجھ سے اس وجہ سے ناراض ہو کہ میں نے تھوڑے سے دنیوی مال و متاع سے کچھ لوگوں کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے ان کی دل جوئی کی ہے اور تمہیں اسلام کے سپرد کر دیا، جس سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں نوازا ہے؟ اے جماعت انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ تو اپنے گھر بھیڑ، بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے گھر لے جاؤ؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر لوگ ایک گھاٹی میں چلیں اور انصار دوسری گھاٹی میں چلیں تو میں انصار کی گھاٹی میں چلوں۔ اگر ہجرت نہ ہوئی ہوتی تو میں بھی انصار میں سے ایک آدمی ہوتا۔ اے اللہ! انصار پر، انصار کے بیٹوں پر اور ان کے بیٹوں کے بیٹوں پر رحم فرما۔''

یہ سن کر انصار صحابہ کرامؓ اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور انہوں نے عرض کی: ''ہم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رسول اللہ ﷺ کی تقسیم پر راضی ہیں۔'' اس کے بعد آپ ﷺ لوٹے اور انصار صحابہ کرامؓ بھی اٹھ آئے۔ (268)

اس مختصر مگر جامع تقریر سے فتنے کی آگ تقریباً بجھ گئی اور آپ ﷺ نے ایک بار پھر انصار کے دل جیت لیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ کی فراست کو پیش نظر رکھے بغیر اس واقعے کی کوئی وضاحت ممکن

نہیں۔اس خطبے کے ایک ایک جملے اور لفظ کا بغور جائزہ لیجئے، اس روحانی مسافت کا اندازہ لگائیے، جو صحابہ کرامؓ نے خطبے کے پہلے اور آخری جملے کے درمیان طے کی اور پھر اپنے ضمیر میں جھانک کر بتائیے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی اور شخص بغیر کسی سابقہ سوچ و بچار اور تیاری کے فی البدیہہ ایسی شاندار تقریر کرسکتا ہے؟ ہر صاحب ضمیر شخص اپنے وجدان سے یہی آواز اٹھتے ہوئے سنے گا کہ یہ صرف آپ ﷺ کا امتیاز ہے، بشرطیکہ وہ ہٹ دھرم اور پہلے سے کوئی رائے قائم کئے ہوئے نہ ہو، بلکہ غیر جانبدارانہ طور پر معاملات کا مطالعہ و تجزیہ کرے۔

آئندہ سطور میں ہم اس خطبے کا مختصر انداز میں تجزیہ کریں گے، تفصیلی جائزہ ماہرین نفسیات و عمرانیات پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے نبی کریم ﷺ کی فراست کے نئے نئے پہلو انسانیت کے سامنے لائیں۔

اس تجزیے کو درج ذیل نقاط کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے:

اول: چونکہ مہاجرین اور اہل مکہ کا اس تقریر کا باعث بننے والے واقعے کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے تقریر میں صرف انصار صحابہ کرامؓ کو مخاطب بنایا گیا، نیز غیر انصار کی موجودگی انصار صحابہ کرامؓ کی توجہ میں خلل پیدا کرسکتی تھی، جبکہ اس موقع پر ان کی خصوصی توجہ درکار تھی

دوم: صرف انصار صحابہ کرامؓ کو ہی حاضری کی اجازت دی گئی، جو ان کے لیے باعث فخر و مسرت بات تھی اور اس کا ان کی نفسیات پر مثبت اثر پڑا۔

سوم: چونکہ خطبے میں ایک تعبیر یعنی ''لوگ بکریاں اور اونٹ لے کر گھروں کو لوٹیں'' ایسی تھی، جس سے کسی نہ کسی حد تک اہل مکہ اور مہاجرین کے احساسات مجروح ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے انہیں اس اجتماع میں نہیں بلایا گیا۔

چہارم: خطبے کے اختتامی کلمات انصار کی خصوصی تعریف اور دعا پر مشتمل تھے۔مہاجرین صحابہ کرامؓ کو اس تعریف اور دعا میں شریک نہ کرنے کی وجہ سے ان میں احساسِ محرومی پیدا ہوسکتا تھا، حالانکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنا مال و متاع اور گھر بار چھوڑا تھا۔

پنجم: اگر علم ادب و بلاغت کی رو سے دیکھا جائے تو یہ خطبہ فصاحت و بلاغت کا عظیم شاہکار ہے۔

ششم: خطبے کے آغاز میں سامعین کے احساسات کو جھنجھوڑا گیا ہے اور پھر مسرت انگیز باتیں کر

کے انہیں خوش کیا گیا ہے۔ جب سامعین کی طرف سے گفتگو کی گئی ہے تو انہیں خاموش سامع سمجھا گیا ہے، جو گفتگو کا ایک عمدہ اسلوب ہے۔

ہفتم: اگر اسلوب لفاظیت اور مصنوعی ملمع سازی سے پاک، مگر خلوص اور سچائی سے لبریز ہو تو ایسی گفتگو کے بعد سامعین کو مزید کسی بات کی ضرورت نہیں رہتی۔ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ایسا اسلوب بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ہشتم: فی البدیہہ اور پہلے سے تیاری کے بغیر خطبہ ارشاد فرمانے سے خطبے کے مثبت اثرات میں اضافہ ہوا۔

اوپر ذکر کردہ نقاط اور بسا اوقات دل پر وارد ہونے والے دیگر نقاط سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ذاتی رائے سے مصائب ومشکلات کا حل نہ نکالتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کو اللہ عزوجل کی طرف سے وحی، الہام اور فراست حاصل تھی، جس کی روشنی میں آپ ہمہ قسم کی مشکلات کا حل تلاش کر لیتے تھے۔

ب: ہمارے نبی اقدس ﷺ اور جوامع الکلم

آپ ﷺ کی فراست کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو تمام اہل بلاغت کی سیادت حاصل تھی اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بابرکت کلام کی ترجمانی کے لیے آپ ﷺ کا انتخاب کیا تھا۔ اب تک کتنے ہی فصیح و بلیغ حضرات دنیا میں آئے اور اپنی اپنی صلاحیتوں کی بقدر فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھا گئے، لیکن اہل بلاغت کے سرخیل حضرت محمد ﷺ کے کلام میں ایک انوکھی گہرائی اور چاشنی ہے، جو کسی اور کے کلام میں نہیں۔

آپ ﷺ کی گفتگو کی چاشنی اور تعبیر کی سحر انگیزی سے سر چکرا جاتے، عقلیں گرویدہ ہو جاتیں، حیرت کے مارے دلوں کی حرکت بند ہونے لگتی اور خرد اطاعت قبول کر لیتی۔ آپ ﷺ کی گفتگو انسانی جذبات کو حیاتِ نو بخشتی اور روحانی ترقی کا باعث بنتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسی قوتِ بیان سے نوازا تھا کہ سامعین آپ ﷺ کی دلفریب گفتگو سے محظوظ ہوتے اور اسے اتنی توجہ سے سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ آپ ﷺ کے کلام کے جلال سے زبانیں گنگ اور دل مسحور ہو جاتے۔ جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے اور حکمت کے موتی بکھیرتے تو اہل دانش کے لئے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ جب آپ ﷺ خیر و بھلائی اور صدق وصفا کا تذکرہ فرماتے تو دل آپ ﷺ کی شیریں بیانی کے گرویدہ ہو جاتے، جب آپ ﷺ شعلہ بیانی سے شر و فساد کا قلع قمع فرماتے تو کفر و شر نیست و نابود ہو جاتا اور جب آپ ﷺ اپنی دعوت و رسالت کے دلائل بیان فرماتے تو تاریکی کے بادل چھٹ جاتے اور سیاہ دل لوگوں پر خاموشی طاری ہو جاتی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جن نعمتوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپ ﷺ کو ان کا بخوبی اندازہ تھا، اسی لیے آپ ﷺ اظہارِ تشکر کے طور پر ان کا تذکرہ کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ فرماتے تھے: ''میں محمد نبی امی ہوں۔'' ''مجھے فواتح الکلم، جوامع الکلم اور خواتم الکلم عطا کئے گئے ہیں۔''(269) ''مجھے آغاز کرنے والا اور اختتام کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، نیز مجھے جوامع الکلم اور فواتح الکلم عطا کئے گئے ہیں۔''(270)

آپ ﷺ اپنی پرنور گفتگو میں فرماتے ہیں کہ میں ماضی و مستقبل کے تمام خطباء کا سردار ہوں۔ آپ ﷺ اپنے حیات افروز انفاسِ طیبہ کی بدولت گلستانِ حق میں نغمہ سرا بلبل کی مانند تھے... جب آپ ﷺ اپنے مافی الضمیر کا اظہار فرماتے تو یوں محسوس ہوتا گویا مسحور کن خدائی نغمات

آپ ﷺ کی زبان پر جاری ہو گئے ہیں۔ صبح کی شبنم میں کھلے تروتازہ پھولوں کی کلیوں کی مانند آپ ﷺ کی نرم دم گفتگو یکتا اور بے مثال ہوتی۔ آپ ﷺ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ مکمل اور شبنم کی مانند تروتازہ ہوتا... آپ ﷺ کی سحر انگیز گفتگو کے ذوق اور اس کی گہرائی کے ادراک کی نعمت صرف انہی خوش نصیبوں کے حصے میں آئی تھی، جنہیں آغاز سے ہی آپ ﷺ کی مجلس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

اہل فصاحت کے سرخیل حضرت محمد ﷺ نے اپنے زورِ بیان سے ایسی چمکدار تلوار تیار کی، جسے محض سروں پر لہرانے سے ہی دروغ گوئی اور ملمع سازی کی تمام چمگادڑوں کا خاتمہ ہو گیا۔

آپ ﷺ کی فصاحت کی وادیوں سے ایسے چشمے پھوٹے، جن سے جاہلیت کے ریگستان سرسبز وشاداب نخلستانوں اور ایسے بہتے آبشاروں میں تبدیل ہو گئے، جہاں ایمان سے لبریز دل اپنے آپ کو ازلی اور ابدی سمندروں کی طرف رواں دواں پاتے ہیں۔

آپ ﷺ کے مبارک ارشادات غیب کے چشموں سے پھوٹتے تھے... اگر آپ ﷺ کے وحی سے منور ارشادات نہ ہوتے تو دنیا بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو کر تاریکی میں ڈوبی رہتی۔

آپ ﷺ نے اپنے زورِ بیان سے فطرت کے چہرے کو بے نقاب کیا اور اپنے ارشادات کے نقش ونگار سے کتابِ شریعت کو حسن بخشا... آپ ﷺ کے نزدیک گفتگو کرنے کے ملکہ کی اہمیت شاہسوار کے ہتھیاروں اور ترکش میں رکھے سونے کے پروں والے تیروں کی مانند تھی... آپ ﷺ جہاں بھی گئے اہل فہم کے دامن کو حکمت کے موتیوں سے بھر دیا، اپنے گھوڑے اور کمان کے ذریعے جہالت کی تاریکیوں کا مقابلہ کیا اور جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آخری بار اپنے کلام کے ذریعے دنیا میں ایک نئے نظام کی بنیاد رکھیں تو یہ ذمہ داری سرانجام دینے کے لیے اہل بلاغت کے سرخیل حضرت محمد ﷺ کو اپنا نمائندہ بنا کر مبعوث فرمایا۔

آغازِ تاریخ سے جتنے بھی ایسے شاہسوارانِ زبان دنیا میں آئے ہیں، جنہوں نے اس دنیا سے ماوراجھانک کر دیکھا، ان سب کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے والی اورکسٹرا (Orchestra) کے ارکان کی سی تھی، جبکہ نبی کریم ﷺ کی حیثیت اس جماعت کے سربراہ اور اولیاء واصفیاء کے حلقہ ذکر کے پیشوا کی سی تھی... آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو پوری دنیا میں آپ ﷺ کی دعوت کا ڈنکا بجا اور اس کی صدائے بازگشت چہار دانگِ عالم میں سنائی دی، جس سے پوری دنیا لرز اٹھی۔

آپ ﷺ کے مبارک کلمات سے مزین ہر ہر پھل جو آپ ﷺ نے انسانیت کو پیش کیا اس آسمانی

دستر خوان سے چنا گیا تھا، جو آپ ﷺ کو اپنے محبوب اور خالق کے باغ سے خصوصی تحفے میں ملا تھا... اس باغ کے اکثر پہلو مخصوص اور پر اسرار ہیں، جسے کسی نے دیکھا ہے اور نہ ہی کسی کا اس کے قریب سے گزر ہوا ہے۔

جب اس عظیم المرتبت بلبل کا دل محبت و وجد سے جوش مارتا ہے تو وہ اس مقدس اور مخصوص باغ کے پھولوں کے پاس میٹھے سروں میں نغمہ سرا ہوتا ہے... جسے سن کر زبانیں گنگ ہو جاتیں ہیں... روحیں ہمہ تن گوش بن جاتی ہیں... دل محبت سے لبریز ہو جاتے ہیں اور اس کی فصاحت و بلاغت کی سحر انگیزی سے ہر نفس مبہوت رہ جاتا ہے۔

آپ ﷺ کے ارشادات ان دریاؤں کی مانند ہیں، جو اپنے ساحل پر موجوں، بلند و بالا آبشاروں اور گہرائی سے پھوٹنے والے دلفریب چشموں کے ذریعے موتی بکھیرتے ہیں۔ ہم ان آبشاروں اور چشموں کی انتہاؤں اور ان دریاؤں کی گہرائی میں موجود جواہرات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نہ احاطہ۔

سینکڑوں ادیبوں اور محققین نے اپنی زندگیاں آپ ﷺ کے ارشادات سے موتیوں کی تلاش اور ان میں غور و فکر کرنے میں گزار دیں... ہزاروں مفکرین نے اس چشمہ حیات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور بہت سے ماہرین نے اپنی عمریں آپ ﷺ کے ارشادات کی گہرائیوں میں غوطہ زنی میں گزار دیں... لیکن آپ ﷺ کے ارشادات کے معانی کی تحقیق میں جس نقطہ پر بھی کوئی پہنچا اس سے آگے سفر ابھی جاری ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح ایک قطرہ پورے سمندر کی نمائندگی اور ایک ذرہ سورج کی تمام خصوصیات کی ترجمانی نہیں کر سکتا، اسی طرح علماء، اولیاء اور صوفیاء جو حقیقۃ محمدیۃ کے ایک ادنیٰ حصے کی ترجمانی کرتے ہیں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت کتنے ہی کامل کیوں نہ ہوں، حقیقۃ محمدیۃ کی مکمل ترجمانی کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی پوری تصویر پیش کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اُمّی ہونے اور کسی درسگاہ کے فاضل نہ ہونے کے باوجود ایک مکمل ہادی و رہبر تھے، جس کا سبب آپ ﷺ کی مادی و روحانی شخصیت کی پختگی، احساسات کی پاکیزگی، فکر کی مضبوطی، کشادہ دلی اور بلند نظری جیسے اوصاف تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نے پیغام الٰہی کو من و عن وصول کر کے اس کی حفاظت اور اسے لوگوں تک پہنچانے کا حق ادا کر دیا... آپ ﷺ فطری طور پر اس ذمہ داری کو اٹھانے کے اہل تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے باطن کی پاکیزگی کا انتظام فرمایا، انسانی اوصاف کے منافی ہر چیز سے آپ کی حفاظت فرمائی اور پھر وحی کی تعلیمات سے آراستہ

کر کے انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا... آپ ﷺ کے امی و مرشد کامل ہونے اور کسی درسگاہ سے تربیت حاصل نہ کرنے کا یہی مطلب ہے۔

آپ ﷺ اخلاق و عادات، ظاہری و باطنی احساسات اور عقل و فراست کے اعتبار سے وظیفہ نبوت کی ادائیگی کی پوری اہلیت رکھتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے بغیر کسی رد و بدل کے چھوٹی بڑی تمام تفاصیل کے ساتھ وحی الٰہی کو پہنچایا... بلکہ آپ ﷺ لوگوں تک وحی الٰہی ایسے پہنچاتے تھے جیسے منشور (prism) اپنے اندر سے گزرنے والی روشنی آگے پہنچاتا ہے، تاکہ وحی الٰہی انسانی عقل کے مناسب حال ہو جائے...

پاکیزہ ترین سرچشمے سے نکل کر پاکیزہ ترین دل میں قرار پانے والا پیغام خداوندی سب سے مہربان، پاکیزہ اور فصیح زبان کے ذریعے بشری استعداد کے مطابق لوگوں تک پہنچایا گیا۔ یہ جس طرح آپ ﷺ کی نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی نبوت کے ناقابل تردید دلائل میں سے ایک دلیل اور سفر نبوت کے پرخطر جنگلوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرتے وقت زادِ راہ اور براق بھی ہے۔(271)

جب آپ ﷺ اپنے پروردگار کا پیغام لوگوں کے سامنے پیش کرتے تو ساتھ ہی اپنی رسالت و نبوت کا بھی اعلان فرماتے۔ ایسے ہی جب آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے مسائل و مشکلات سحر انگیز وحی خداوندی کے اسرار و جواہر کے ذریعے حل فرماتے تو ساتھ ہی مدِ مقابل اور دشمن کو لاجواب اور خاموش کرانے کے لیے اسی وحی خداوندی کو تیغ براں کی طرح استعمال فرماتے۔

قرآنِ کریم آپ ﷺ کے لیے سب کچھ تھا؛ ہوا اور پانی... اسلحہ اور زرہ... قلعہ اور اس پر لہراتا علم۔ آپ ﷺ قرآن کے لئے جیتے تھے۔ قرآن کے ذریعے آپ بادلوں کی طرح بلندیوں کو چھوتے... قرآن کے ذریعے آپ ﷺ مظلوموں اور محتاجوں کی مدد کو ایسے پہنچتے جیسے بارش کے قطرے مخلوقِ خدا کی پیاس بجھانے کو تیزی سے گرتے ہیں... قرآن کے ذریعے آپ ﷺ تاریکیوں کا مقابلہ اور برے لوگوں کے شر سے پناہ حاصل کرتے... اور اسی کے ذریعے دشمن پر حملہ آور ہوتے... غرض قرآن کریم نور بن کر اطرافِ عالم میں پھیلتا رہا۔

اگرچہ آپ ﷺ امام البلغاء، سلطان الفصحاء، حکمت و دانائی کے نمائندے اور علم الٰہی کے نہ ختم ہونے والے خزانے کے حامل تھے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود اکثر آپ ﷺ کو لاتعداد مسائل

اور مصائب کا سامنا رہتا تھا۔ بہت سے معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل ومشکلات شافی حل اور جواب کے لیے آپ ﷺ کے منتظر رہتے۔ آپ ﷺ وظیفہ نبوت بخوبی نبھاتے رہے، کیونکہ آپ ﷺ کا قلب اطہر لامحدود علم الٰہی کا مرکز، جائے نزول، گلستان اور اسے منعکس کرنے والے صاف شفاف آئینہ تھا۔

آپ ﷺ قرآنی پیغام کو پہنچانے کے علاوہ اس کی تشریح کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں فصاحت وبلاغت کے شاہکار فرمودات کے ذریعے مطلق حکم کو مقید اور مقید کو مطلق، عمومی حکم کی تخصیص اور مخصوص حکم کی تعمیم بھی فرماتے۔ یہ پوری انسانیت کی طرف مبعوث پیغمبر کی ذمہ داری تھی اور پوری انسانیت کے مرشد و مصلح اور مجدد و مبلغ میں ایسے اوصاف کا پایا جانا ضروری تھا۔

نبی کریم ﷺ جس دور میں شرفِ نبوت سے سرفراز ہوئے، اس دور میں بازارِ جاہلیت میں سب سے زیادہ رائج چیز فصاحت وبلاغت تھی۔ یہ امت جس نے بعد میں اپنی ذہانت اور دانش مندی کے ذریعے پوری دنیا پر حکومت کی، اعلیٰ ادبی ذوق کی مالک تھی، اسی لیے قرآن کریم کی تلاوت اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث وخطبات نے اس امت پر ایسا جادو کیا کہ وہ بے خود ہو کر اسے سنتی اور پھر اس پر فریفتہ ہو کر اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتی۔

آپ ﷺ نے ہر موقع پر اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، لیکن دشمنانِ اسلام کو آپ ﷺ کی شخصیت میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہ آئی، کیونکہ اگر انہیں آپ ﷺ میں کوئی قابل اعتراض بات دکھائی دیتی تو دورِ حاضر کے دشمنانِ اسلام دلوں سے آپ ﷺ کی محبت نکالنے کے لئے اسے بڑھا چڑھا کر دنیا بھر میں پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے، کیونکہ یہ لوگ آپ ﷺ پر چھوٹے چھوٹے الزامات بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، لیکن اس عناد کے باوجود انہیں آپ ﷺ کے خلاف کوئی بات نہ ملی اور آپ ﷺ کی قوتِ بیان اور فصاحت وبلاغت کی وجہ سے وہ آپ ﷺ کے بارے میں وہ بات بھی نہ کہہ سکے، جو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہی تھی۔(272)

جس شخصیت نے اپنے بارے میں کہا ہے: ''مجھے میرے پروردگار نے تعلیم وتربیت دی اور کیا خوب تعلیم وتربیت دی۔'' اس کے کلام کا سرچشمہ اس قدر اعلیٰ وارفع ہے کہ اس کے دوست ودشمن سب ہی اس کے لیے اور اس کی فصاحت وبلاغت سے بھرپور گفتگو کے لیے احترام اور حیرت کے جذبات کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بہت سے صحابہ کرامؓ صاحب بلاغت تھے، مثلاً حضرت لبید، حضرت خنساء، حضرت کعب بن

مالک، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن رواحہ وغیرہ۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن عاص اور حضرت ابن عباسؓ کا شمار خطباء میں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ بعض صحابہ فقہ اور حکمت و دانائی میں شہرت کے حامل تھے، ان سب حضرات نے نبی کریم ﷺ کو زندگی کے ہر معاملے میں اپنا رہبر و معلم تسلیم کیا تھا۔

آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بہت سے شارحین وحفاظِ حدیث، خداداد صلاحیتوں سے بہرہ مند مفسرین، مستقبل پر نظر رکھنے والے فقہاء، بلند پایہ ائمہ کرام، مجتہدین عظام، ہزاروں اولیاء، صوفیاء، روحانی دنیا میں ممتاز مقام رکھنے والے مقربین، علم منطق و کلام کے ماہرین اور دیگر بہت سے علوم وفنون کے علماء پیدا ہوئے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی احادیث اور ارشادات کی صورت میں قابل اعتماد ذخیرہ اور کبھی نہ خشک ہونے والا چشمہ ہدایت پایا اور اپنی پیاس بجھانے اور بھوک مٹانے کے لئے اس ربانی دسترخوان کی طرف رجوع کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ کی سنت مبارکہ روز اول سے آج تک مجتہدین کے لیے گمراہی سے محفوظ سرچشمہ، علم کا وسیع دروازہ، آسمانِ علم میں پرواز کرنے والوں کے لیے مضبوط پر اور سہارا، اولیاء وصوفیاء کرام کے کشف والہامات کا رواں دواں اور پاکیزہ چشمہ رہی ہے، بلکہ تمام شرعی علوم، صوفیائے کرام کے تمام سلاسل طریقت، سارے کائناتی علوم اور قلب و وجدان کے تمام اسرار آپ ﷺ کے پرنور ارشادات کے چشمہ صافی سے پھوٹتے ہیں۔

آپ ﷺ نے متعدد مواقع پر ابتدائے آفرینش اور تخلیق انسانی سے لے کر قیامت تک کہ جب انسان کو جنت یا جہنم میں سے کسی ایک میں جانا ہوگا، کے حالات وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے ربانی علوم کی صلاحیت رکھنے والے اہل دل اور آخرت میں ان کے اللہ رب العزت کے جمال کا مشاہدہ کرنے، نیز ایمان وعقائد اور عبادات کا بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ آپ ﷺ نے اور بھی متعدد موضوعات کے بارے میں گفتگو فرمائی اور ہر موضوع کے لیے ایسی زبان اور اندازِ بیان اختیار فرمایا کہ قرآنِ کریم کے سوا کسی کلام میں ایسا اندازِ بیان ہے اور نہ ہی ایسی فصاحت۔

آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسمائے حسنی پر موضوع کی حساسیت کا لحاظ رکھتے ہوئے دِقت اور توازن کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ آپ ﷺ نے قیامت، حشر نشر، حساب کتاب اور جنت

دوزخ کا تذکرہ فرما کر خشیت آمیز امید اور سعادت کا ذریعہ بننے والا خوف پیدا کیا۔ آپ ﷺ ملائکہ، روح، جن وشیاطین اور دیگر اسرارِ غیبیہ کی ایسی منظر کشی کرتے گویا آپ یہ سب کچھ مضبوط چمکدار شیشے کے پیچھے سے دیکھ رہے ہوں۔ آپ ﷺ ایمان وعمل، اخلاص، بیج کے نشوونما پانے، مٹی کے اگانے کی صلاحیتوں، بارش سے حاصل ہونے والی زندگی، رنگوں اور خوشبوؤں سے مہکتے سرسبز وشاداب موسم بہار کی خوبصورتیوں کا تذکرہ فرماتے تو یوں لگتا گویا کسی بڑے ماہرفن کی تخلیق کردہ تختی آپ کے سامنے رکھی ہو اور آپ اسے دیکھ کر معلوم کرلیں کہ پاکیزہ انسان کی فطرت ایمان کے ذریعے کیسے رفعتوں کو چھوتی اور اسلام کے ذریعے کیسے نشوونما پاتی ہے، نیز اخلاص کے ذریعے طوبیٰ جیسا سایہ دار درخت بن کر اپنے گردونواح پر کیسے سایہ افگن ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز انسان کی ہر دم کی ساتھی ہے، جو اس کی تنہائی کو دور اور اس کے راستے کو روشن کرتی ہے...وضو انسان کی رگوں میں دوڑتے خون اور اس میں موجود روح کی مانند ہے... یا پھر گھر کے سامنے بہتی نہر ہے، جو ہر گندگی کو دھو ڈالتی ہے...اذان واقامت بلند وبالا درخت کی مانند ہیں... یا پھر بجلی کی کڑک دار آواز کی طرح ہیں، جس کے خوف سے شیاطین بھاگتے ہیں اور ان کے دلوں میں رعب پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ اہل ایمان کے لیے لطف وکرم اور ایسی خوشی ومسرت کا باعث ہیں، جو نماز کے لیے جانے والوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

زکوۃ وصدقات متفرق جماعتوں کو ملانے والے پل یا ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑنے والی گم (Gum) کی مانند ہیں، جو مختلف حصوں کو جوڑ کر یکجا کر دیتی ہے۔

روزہ ڈھال کی طرح روزہ دار کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ جنت کا ایک خفیہ دروازہ ہے، جو روزہ دار شخص کی جنت میں داخل ہونے میں مدد کرتا ہے، نیز وہ روزہ دار کو آبِ کوثر بھی پلائے گا۔

حج پھٹے ہوئے کپڑوں کی درستی کرنے والے درزی...داغ دھبے صاف کرنے والے دھوبی... اور لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والی مجلس شوریٰ کی مانند ہے۔

جہاد جہنم کا راستہ روکنے والے جانباز... جنت کے دروازے پر خوش آمدید کہنے والے دربان...اور معاندینِ اسلام کو ہاتھ سے پکڑ کر فردوسِ بریں کی طرف لے جانے والے مہربان باپ کی طرح ہے۔

ذکر اور دعا خالق ومخلوق کے درمیان وائرلیس کا کام دیتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حیثیت دروازوں، راستوں اور چوراہوں پر کھڑی نظم ونسق قائم کرنے والی ٹریفک پولیس کی سی ہے۔

صلہ رحمی کی مثال جھولی پھیلائے انتظار میں بیٹھی ایسی ماں کی سی ہے، جس کا انسانیت کے ساتھ حساب وکتاب، گفتگو اور برتاؤ ایک عمومی دعویدار کا سا ہوتا ہے۔ وہ اسے یقین دہانی کراتی ہے اور اس کے گریبان سے پکڑ کر اسے گمراہی میں مبتلا ہونے سے خبردار کرتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ایک سحر انگیز، حیات بخش اور خوش کن سامانِ آرائش کی صورت اختیار کرتی ہے۔

آپ ﷺ نے فنی نزاکتوں کی رعایت کرتے ہوئے ان امور کی جس خوبصورتی سے منظر کشی کی، تصویر کشی، نقش ونگار اور آرائش وزیبائش میں جن جن چیزوں کا استعمال کیا اور اس دوران کسی تکلف وتصنع کے بغیر موسیقی اور بلاغت کی جس مہارت کا مظاہرہ کیا ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے، جس کی وضاحت کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔ ہم ایسے مقامات کے گہرائی کے ساتھ جائزے کو اس موضوع کے اہلِ اختصاص کے لیے چھوڑ رہے ہیں اور اس مقام پر صرف چند ایک معروف احادیث مبارکہ کے معانی ومطالب کی گہرائی اور زورِ بیان کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

ا- گلدستۂ احادیث کا تجزیہ

نبی کریم ﷺ کی سب سے نمایاں صفت ایجازِ کلام ہے۔ کسی بھی موضوع پر کی گئی گفتگو میں سب سے مختصر مگر جامع آپ ﷺ کی گفتگو ہوتی ہے، اس بارے میں ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن چونکہ اس مقام پر سب کو سمیٹنا ممکن نہیں، اس لئے ہم ہر دور میں "جوامع الکلم" کی حیثیت رکھنے والی بعض مثالیں ذکر کریں گے، اگرچہ آپ ﷺ کی ہر حدیث کی یہی شان ہے۔

الف: توحید پر مشتمل سب سے بہترین کلمات

جامع ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: "اے لڑکے! میں تمہیں چند کلمات سکھاتا ہوں: اللہ کے احکام کی حفاظت کر اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کے احکام کی حفاظت کر تو اللہ کو اپنے سامنے پائے گا۔ جب کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگ۔ جب مدد کی ضرورت ہو تو اسی سے مدد مانگ اور یقین رکھ کہ اگر ساری امت تمہیں نفع پہنچانا چاہے تو تمہیں صرف اتنا ہی نفع پہنچا سکتی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے اور اگر ساری امت تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو تمہیں صرف اسی قدر نقصان پہنچا سکتی ہے، جس قدر اللہ تعالیٰ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھائے جا چکے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔"(273)

ان مختصر مگر جامع کلمات کے ذریعے جہاں نبی کریم ﷺ نے تقدیر اور رضا بالقضاء کے انتہائی

پیچیدہ مسائل کو بالکل سادہ اور آسان انداز میں بیان فرمایا ہے، وہیں آپ ﷺ نے چند لفظوں میں دعوت و تبلیغ کے میدان میں عبادت کے مفہوم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ب: انسان ایک مسافر

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''دنیا میں ایک اجنبی یا مسافر کی طرح رہو اور اپنے آپ کو اہل قبور میں شمار کرو۔''(274)

یہ تین جملے زہد، پرہیز گاری اور دنیا و آخرت کے درمیان توازن قائم رکھنے کے موضوع پر سب سے زیادہ معنی خیز اور جامع ترین گفتگو ہے اور اگر اس سے مختصر کوئی جملہ ہوتا تو وہ بھی آپ ﷺ کی زبانِ اطہر سے نکلتا۔

چونکہ انسان دنیا میں غریب الدیار، اپنے مالک حقیقی سے دور اور مولانا رومی کے الفاظ میں نرکل کی سبزی سے جدا پھل کی مانند ہے، اس لیے اس کی ساری زندگی آہ و بکا میں گزرتی ہے۔ دنیا میں انسان ایک ایسے مسافر کی طرح ہے، جس کے سفر کا آغاز عالم ارواح سے شروع ہوا اور رحم مادر، بچپن، جوانی، بڑھاپے، موت، اور پھر قبر سے ہوتے ہوئے جنت یا جہنم پر اختتام پذیر ہوگا، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا انسان کو اپنے مسافر ہونے کا ادراک ہے؟

اگر انسان اپنے مسافر ہونے کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا تو سفر زندگی میں کبھی بھٹکتا اور نہ ہی کھجور کی گٹھلی سے بھی کم حیثیت دنیوی لذتوں پر مرتا، بلکہ ثابت قدمی اور اطمینان سے اپنا سفر جاری رکھتا۔ اگر انسان اپنے آپ کو اہل قبور میں شمار نہ کرے، اسلاف کے الفاظ میں ''موتوا قبل أن تموتوا'' ''مرنے سے پہلے مرجاؤ۔''(275) پر عمل نہ کرے اور اپنی زندگی کو اس عظیم حقیقت کے مطابق نہ ڈھالے تو وہ شیطانی چالوں اور حیلوں سے کبھی بھی نہیں بچ سکتا۔ انسان کو چاہیے کہ روحانی زندگی سے سرفراز ہونے کے لئے برائی پر آمادہ کرنے والے نفس اور مادی خواہشات کے اعتبار سے اپنے آپ کو مردہ خیال کرے۔ جنہوں نے زندگی کا مقصد خواہشاتِ نفس کے پیچھے چلنے کو ہی سمجھا وہ بے چارے جسم کے بوجھ تلے دب کر برباد ہو گئے۔

ج: سچائی اور جھوٹ کا انجام

امام بخاری، مسلم اور ابوداؤد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہمیشہ سچ بولو، کیونکہ سچائی نیکی کی طرف اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ جو شخص ہمیشہ سچ بولتا اور سچائی کی جستجو میں رہتا ہے اسے بالآخر اللہ تعالیٰ کے ہاں صدّیق لکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ برائی کی طرف اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔ جو شخص ہمیشہ جھوٹ بولتا اور جھوٹ کی تلاش میں رہتا ہے اسے بالآخر اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔''(276)

سچائی انبیائے کرام کا اور جھوٹ کفار و منافقین کا شعار ہے۔ سچائی موجودہ اور آئندہ زمانے کے لیے اہم بنیاد ہے، جبکہ جھوٹ زمانے کی پیشانی پر سیاہ دھبہ ہے۔ جھوٹ کی روش اختیار کر کے کوئی خوش وخرم زندگی گزار سکا اور نہ ہی ابدی سعادت حاصل کر سکا، نیز سچائی کے درخشاں راستے پر چل کر کوئی بدنصیب ہوا اور نہ ہی دنیا و آخرت میں ناکام۔

جھوٹ کفر کی اہم ترین بنیاد اور منافقت کی واضح ترین علامت ہے۔ یہ علم باری تعالیٰ کے برعکس دعویٰ ہے۔ دورِ حاضر میں جھوٹ ہی ہمارے زوال کا سبب ہے... جھوٹ نے لوگوں کو بگاڑ کر دنیا کو جھوٹوں کی آماج گاہ بنا دیا ہے۔ جھوٹ اتنی خطرناک معاشرتی برائی ہے کہ اگر اسے جینے کا حق دے کر وطن، گھر، بازار، پارلیمنٹ اور فوجی چھاؤنیوں تک رسائی دے دی جائے تو امت ایسے تباہ ہو گی کہ پھر کبھی سنبھل نہ سکے گی۔

اس کے برعکس سچائی اسلام کا اہم ترین اصول، نبوی اخلاق کا نمایاں ترین وصف، انبیاء و اولیاء کی امتیازی خصوصیت اور مادی و معنوی ترقی کا مرکزی محور ہے۔ سچائی ملائکہ کی خوبی ہے، جبکہ جھوٹ شیطانی خصلت ہے۔ سچائی اللہ تعالیٰ کے مقرب و مکرم بندوں کا وصف ہے، جبکہ جھوٹ برے لوگوں کی عادت ہے۔ سب سے بڑھ کر سچائی فخرِ کائنات ﷺ کا وصف ہے، جبکہ جھوٹ دجالوں کی صفت ہے۔

حدیث شریف میں وارد لفظ ''البـــــرّ'' سے مراد ہر قسم کی بھلائی کا مجموعہ ہے، جس میں سوچ کی سچائی، گفتار کی سچائی، کردار کی سچائی، نیت کی سچائی اور زندگی کی سچائی... شامل ہے، گویا اس عنوان کے تحت بھلائی کی لاتعداد صورتیں داخل ہیں۔ اس کے برعکس ''الـفـجـور'' کے لفظ سے ہر قسم کی برائی کا مجموعہ مراد ہے۔ وہ تمام بھلائیوں کی ضد ہے۔ تمام غلط افکار، باتوں اور طور طریقوں پر ''الـفـجـور'' کا لفظ صادق آتا ہے، گویا ''الفجور'' جہنم کا بیج ہے۔

حدیث مبارک میں سچے اور جھوٹے شخص کے درمیان تقابل کیا گیا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سچائی پہلے شخص کی طبیعت و فطرت بنی، جس کے نتیجے میں وہ سچائی کا نمونہ بن گیا اور دوسرے شخص کی طبیعت و فطرت میں جھوٹ رچ بس گیا، جس کے نتیجے میں اس کا شمار پیشہ ور جھوٹوں میں ہونے لگا۔

مبالغہ کے الفاظ دونوں صفات کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ جو اپنے آپ کو سچائی کے لیے وقف کردے وہ دنیا و آخرت میں آج نہیں تو کل گفتار و کردار میں سچائی اور قربِ الٰہی کی پہچان بن جائے گا اور جو شخص جھوٹ کا ہو کر رہ جائے وہ آج نہیں تو کل دنیا و آخرت میں سوچ، گفتار اور کردار میں دروغ گوئی کی علامت بن جائے گا۔

یہ دو راستے ہیں: ایک طویل ہے اور دوسرا مختصر، ایک درخشاں ہے اور دوسرا تاریک، ایک پرخطر ہے اور دوسرا پرامن، ایک لازماً جنت کا راستہ ہے اور دوسرا یقیناً جہنم تک پہنچاتا ہے۔ ایک کے راہرو کو ہر درمیانی منزل پر انعامات سے نوازا جاتا ہے یہاں تک وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے اور دوسرے راستے میں ناکامی ہی ناکامی ہے یہاں تک وہ اپنے راہی کو جہنم اور ہمیشہ ہمیشہ کی ناکامی تک لے جاتا ہے۔

یہ حدیث ہم رسول خدا ﷺ کی صداقت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بھی ذکر کر چکے ہیں، لیکن اس موقع پر ہم دنیا و آخرت میں سچائی کے نتائج اور انفرادی و اجتماعی سطح پر دروغ گوئی کے نقصانات کا جائزہ لے کر اس بات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کیسے اتنے بہت سے معانی کو ایک مختصر سے جملے میں پیش کیا ہے۔

اس حدیث مبارک میں گہرائی کے ساتھ غور و فکر کرنے والا شخص ہی اس بات کا ادراک و تصدیق کرسکتا ہے کہ اتنے وسیع مفاہیم کو اتنے مختصر جملوں میں اس قدر سحر انگیز اسلوب میں پیش کرنا صرف رسول اللہ ﷺ کا خصوصی امتیاز ہے۔

د- انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہوتا ہے

بخاری و مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے درج ذیل حدیث روایت کی ہے:

''انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کا انجام اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔''(277)

اس حدیث مبارک کے معانی و مطالب پر روشنی ڈالنے کے لیے کم از کم ایک مفصل کتاب درکار ہے۔ یہ حدیث مبارک ان شکستہ دل لوگوں کے لیے آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہے، جن کا پاؤں آدھے راستے میں پھسل گیا یا جو اپنے مرشد کے نقشِ پا پر مکمل طور پر چل سکے اور نہ ہی اپنے فرائض کو کماحقہ سرانجام دے سکے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان خواہ اچھے لوگوں سے محبت کرے یا برے لوگوں سے دنیا و آخرت میں اس کے ساتھ انہی لوگوں کا سا برتاؤ کیا جائے گا جن کے ساتھ اسے محبت

ہوگی، لہٰذا جو لوگ انبیائے کرام، صدیقین اور شہداء کی معیت میں رہنا چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ان سے محبت کریں، دوسرے لفظوں میں قیامت کے دن انبیائے کرام، صدیقین اور شہداء کی معیت میں وہی لوگ ہوں گے، جو دنیا میں ان سے محبت کیا کرتے تھے۔ یہی انجام برے لوگوں کے ساتھ محبت کرنے والوں کا ہوگا، چنانچہ ایک جملے پر مشتمل یہ حدیث مبارک شدید اختصار کے باوجود ان تمام معانی اور نہ جانے اور کتنے مفاہیم کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اتنی جامعیت و اختصار کے ساتھ صرف وہی شخص گفتگو کرسکتا ہے، جس کی فراست کا الہام ربانی اور وحی خداوندی کے ساتھ براہ راست تعلق ہو۔

حضرت نعیمانؓ سے بعض اوقات شراب نوشی کا ارتکاب ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ ان پر شرعی حد جاری فرماتے۔ یقیناً شراب نوشی گناہ ہے، لیکن اس کے باوجود جب رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو انہیں برا بھلا کہتے سنا تو ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بنو۔ خدا کی قسم! میں تو اس کے بارے میں یہی جانتا ہوں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔''(278)

جب اللہ اور اس کے رسول کی محبت ان کی معیت کا سبب بنتی ہے تو بعض گناہوں کے سرزد ہو جانے کے باوجود ایسے حضرات کو برا بھلا کہنا مناسب نہیں۔ تاہم ایسی محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان اوپر ذکر کردہ حدیث مبارک کی رو سے رسول اللہ ﷺ کی معیت پانے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو سرانجام دے اور گناہوں سے اجتناب کرے۔

ہ: تقویٰ

حضرت امام احمد بن حنبل حضرت معاذ بن جبلؓ سے درج ذیل حدیث روایت کرتے ہیں:

''جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو، گناہ سرزد ہو جانے کے بعد نیکی کر لیا کرو، کیونکہ نیکی گناہ کو مٹا دیتی ہے اور لوگوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔''(279)

اچھے اخلاق سے بڑھ کر کوئی اور چیز انسان کی رفعتوں کا باعث نہیں بنتی، اچھے اخلاق خدائی اخلاق ہیں اور یہ خدائی اخلاق کو اپنانے کا دوسرا نام ہے۔

زیرِ نظر حدیث مبارک تقویٰ اور اس کی حفاظت کے طریقے کی وضاحت کر رہی ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے، جس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن چونکہ ہمارا مقصود صرف بعض مثالیں پیش کرنا ہے، اس لئے ہم اس مقام پر تقویٰ سے متعلق بلند پایہ حقائق کی وضاحت نہیں کریں گے۔

و: جیسے عوام ہوں گے ویسے ہی ان کے حکمران ہوں گے

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمہارے حکمران ہوں گے۔''(280)

یعنی جس قسم کے تم لوگ ہو گے، اسی قسم کے تمہارے حکمران ہوں گے، کیونکہ عوام اور حکمران دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے... اس حدیث مبارک کی وضاحت اور خاص طور پر اس میں بیان کردہ انتظامی امور کے بارے میں کئی جلدوں پر مشتمل کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔ ذیل میں ہم اس موضوع کی تھوڑی سی وضاحت کریں گے۔

آپ علیہ السلام کی حدیث مبارک: ''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔''(281) کے مطابق ہر ایک کی ذمہ داری کی کچھ حدود ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے حکمران کی ذمہ داری پورے ملک پر مشتمل ہوتی ہے، تاہم ارشاد نبوی ''جیسے تم ہو گے ویسے ہی تم پر حکمران مقرر کئے جائیں گے۔'' اس موضوع کو معاشرتی قانون کے نقطہ نظر سے ایک نیا پہلو عطا کرتا ہے۔

اول: یہ حدیث ابتدا سے ہی عام شہریوں کو اس بات کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ تم لوگوں کو انتہائی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ جو لوگ تمہارے حکمران بنیں گے انہیں تمہارا دروازہ ضرور کھٹکھٹانا پڑے گا، وہ طریقۂ کار کچھ بھی اختیار کرلیں بہر حال انہیں تمہاری ضرورت ضرور پڑے گی، گویا تم ہی اپنے حکمرانوں کی راہ ہموار کرنے والے ہو۔

بلاشبہ معاشرتی علوم کے اپنے اٹل قوانین ہوتے ہیں، جس طرح فزکس، کیمسٹری اور فلکیات کے اپنے اپنے فطری اور غیر متغیر قوانین اور اصول ہوتے ہیں اسی طرح معاشرتی علوم کے بھی کچھ قوانین اور اصول ہیں، جن میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، مثلاً جب ہم لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ برائی کو پھلنے پھولنے دے رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس برائی کو اپنے دلوں میں جگہ دے رکھی ہے، جس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا حکومتی نظام برے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے گا، کیونکہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا برائی لوگوں کے دلوں میں پرورش پاتی ہے؟ کیا ان کے دلوں میں برائی کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لئے زرخیز مٹی پائی جاتی ہے؟ اور کیا فساد کا سرچشمہ لوگوں

کے دل ہی ہیں؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر حکومت کے لئے حکام بھی انہی جیسے مقرر فرمائیں گے۔

دوسری بات جس کی طرف یہ حدیث اشارہ کررہی ہے یہ ہے کہ قوانین اور نظاموں کی حیثیت کاغذ پر لکھے چند حروف کے سوا کچھ نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ بہت مؤثر ہوتے ہیں، لہٰذا اگر لوگ جمع ہو کر باہمی تعاون سے اعلیٰ سے اعلیٰ قوانین وضع کرلیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، بلکہ اہم بات یہ ہے ان قوانین پر عمل درآمد کس حد تک ہو رہا ہے، کیونکہ ان لوگوں کے اخلاق ہی سب سے پہلا معیار ہیں، اگر لوگوں کے اخلاق اچھے ہوں گے اور اخلاقی نظام کے تحت اپنے مسائل اور درپیش مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے تو ان پر حکومت کرنے والے لوگ بھی ہرگز برے نہ ہوں گے۔ آئندہ سطور میں میں آپ کے سامنے اس موضوع سے متعلق ایک حقیقی واقعہ پیش کرتا ہوں:

طاہر آفندی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور بڑے عالم فاضل انسان تھے، جس وقت باقی ممبران مختلف جلسہ گاہوں میں پرجوش تقاریر کرنے میں مشغول تھے، اس وقت آپ نے خاموش رہنے کو ترجیح دے رکھی تھی، لیکن ایک جلسے میں آپ کے دوست احباب نے بہت اصرار کرکے آپ کو خطاب کرنے پر راضی کرلیا، چونکہ آپ کو فضول گوئی پسند نہ تھی اور آپ مختصر اور مفید کلام کو پسند کرتے تھے، اس لیے آپ نے اس خطاب میں درج ذیل باتیں کہیں:

''حاضرین گرامی! اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تم لوگ انتخاب کرنے والے ہو اور ہم منتخب ہونے والے ہیں، ہماری پارلیمنٹ منتخب لوگوں پر مشتمل ہوگی، تم نے جو کام سرانجام دینا ہے، اسے انتخابی عمل کہتے ہیں۔ انتخاب کا لفظ ''نخبہ'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ''جھاگ'' ہے، اس بات کو نہ بھولو کہ ہر چیز کی جھاگ کا تعلق اس چیز کی نوعیت کے ساتھ ہوتا ہے، چنانچہ دہی کے اوپر دہی کی جھاگ آئے گی، دودھ کے اوپر دودھ کی اور پھٹکڑی کے اوپر پھٹکڑی کی جھاگ آئے گی۔''

اسی سے ملتا جلتا جواب حجاج بن یوسف ثقفی نے اس شخص کو دیا تھا، جس نے اس کے سامنے حضرت عمر بن خطابؓ کے انصاف کا تذکرہ کیا تھا۔ حجاج نے کہا تھا:

''اگر تم لوگ حضرت عمرؓ کے ساتھیوں جیسے ہوتے تو میں بھی حضرت عمرؓ جیسا ہوتا۔''

تیسری بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات میں کوتاہی تلاش کرنی چاہیے، کیونکہ جب تک انسان اپنی ذات کا دفاع اور دوسروں کے اندر عیوب تلاش کرتا رہتا ہے، اس وقت تک کوئی مثبت پیش رفت نہیں

کر سکتا، جب تک لوگ خود اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتے اللہ تعالیٰ بھی ان کی حالت نہیں بدلتے (282) اور جب باطن میں فساد ہو تو وہ ہر طرف پھیل کر رہتا ہے یہاں تک کہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

بعینہ یہی بات ہم لوگوں کی باطنی درستی اور استقامت کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ حکام کی درستی عوام کی درستی کے ساتھ ایسے ہی مربوط ہے جیسے نتیجہ اپنے سبب کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ نہ جانے اس مختصر سے ارشاد میں اور کتنے جواہر پوشیدہ ہیں اور اہل علم حضرات اس سے مزید کتنے معانی کا استخراج واستنباط کر سکتے ہیں۔ کوئی اور انسانی کلام اتنے مختصر انداز میں ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کی ترغیب نہیں دے سکتا اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ کسی عام انسان کا کلام نہیں ہے، بلکہ اعلیٰ درجے کی ذہانت کے مالک رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ کا کلام ہے، جن کی ہر بات آسمانِ فصاحت وبلاغت کی رفعتوں کو چھوتی ہے۔

آپ علیہ السلام فصاحت وبلاغت کے میدان میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، کوئی بھی ادیب اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا، یہ درست ہے کہ آپ ﷺ کے ارشادات قرآنی آیات نہیں ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان میں الہامی صفت پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام ادیب اور اہل فصاحت آپ ﷺ کے خادموں کے درجہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ ایک بلند پایہ شاعر تھے... رسول اللہ ﷺ نے انہیں دعا دی تھی اور ان کی تعریف میں فرمایا تھا کہ جبریل امین ان کے معاون ہیں، لیکن اس کے باوجود حضرت خنساء نے ان کے چار شعروں میں آٹھ غلطیوں کی نشاندہی کی تھی... اس عظیم شاعرہ نے جب رسول اللہ ﷺ کا کلام سنا تو اسلام لے آئی اور پھر شہنشاہِ کلام کی باتیں سننے کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا، جس کے کلام نے اسے اتنا متاثر کیا کہ جب جنگِ قادسیہ میں اسے اپنے چار بیٹوں کی شہادت کی خبر پہنچی تو اس کی زبان پر ایک بھی حرفِ شکایت نہ آیا، حالانکہ یہ وہی خنساء تھی، جس نے اپنا پورا دورِ جاہلیت اپنے بھائی صخر پر مرثیہ خوانی اور اس کی یاد میں رونے میں گزار دیا تھا، لیکن جب جنگِ قادسیہ میں اسے اپنے چاروں بیٹوں کی شہادت کی خبر ملی تو زبان پر حرفِ شکایت لانے کی بجائے یوں گویا ہوئی: ”تمام تعریفیں اس اللہ کو سزاوار ہیں، جس نے مجھے ان کی شہادت کا اعزاز بخشا۔“ (283)

خنساء ایک صاحب الہام خاتون تھیں... چنانچہ جب ان کا کوئی بیٹا جنگ میں شہید ہو کر گرتا تو ان کا رنگ تکلیف سے متغیر ہو جاتا اور یوں محسوس ہوتا گویا کوئی تیر ان کے سینے میں لگا ہے، لیکن ان کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اتنا گہرا تعلق تھا کہ شکایت کا ایک لفظ بھی ان کی زبان پر نہ آیا۔

ز: تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے

امام بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا، جو اس کی نیت ہوگی، چنانچہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا کے حصول یا کسی عورت سے شادی کی غرض سے ہوگی تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے سمجھی جائے گی، جس کے لیے اس نے ہجرت کی ہوگی۔''(284)

چونکہ ہجرت ہی اس حدیث کا پیش خیمہ بنی تھی، اس لیے ہجرت کو اس میں اصل موضوع بنایا گیا ہے، چنانچہ ایک روایت کے مطابق درج ذیل واقعہ اس حدیث کا شانِ ورود ہے:

تمام صحابہ کرام محض رضائے الٰہی کی خاطر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے، لیکن ایک صحابی جس کا نام معلوم نہ ہوسکا نے ام قیس نامی ایک عورت سے شادی کرنے کی غرض سے ہجرت کی... بلاشبہ وہ صحابی مؤمن تھے، لیکن ہجرت کے لیے ان کی نیت دوسروں کی طرح خالص نہ تھی، وہ بھی مہاجر تھے... لیکن ام قیس کی خاطر، جس کے لیے انہوں نے ہجرت کی تمام تکلیفیں برداشت کیں، اسی لئے یہ عمل کسی کا نام ظاہر کیے بغیر رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا موضوع بن گیا، لیکن چونکہ اعتبار حکم کی عمومیت کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا، اس لیے اس حدیث کے عموم میں ہر چیز اور انسان داخل ہے۔

ا: خلوصِ نیت

صرف ہجرت ہی نہیں، بلکہ تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، لہٰذا اگر کسی مہاجر شخص کی نیت اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی رضا کا حصول ہو تو وہ بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کی صورت میں اپنی ہجرت کا بدلہ پائے گا، بعینہ یہی بات نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ایک حدیث میں گزر چکا ہے کہ جو شخص اللہ کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے وہ اللہ کو اپنے سامنے پاتا ہے: ''احفظ الله يحفظك'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رحمت خداوندی اور عنایاتِ الٰہیہ کو اپنے سامنے پاتا ہے اور جب انسان اپنے سامنے یہ کرم و عنایات پاتا ہے تو اس کے جذبات میں ولولہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں اسے مزید قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے اور جس قدر اسے قربِ خداوندی نصیب ہوتا ہے اسی قدر فکری اور عملی لحاظ سے اس کی نیت میں پاکیزگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ایسی پرخلوص نیت کے زیرِ سایہ جب وہ قبر، برزخ، حشر اور پل صراط کی اخروی

منازل طے کرے گا، جہاں ہر چیز کی حقیقت بدل جائے گی تو وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے پائے گا اور اگر اس کے اعمال اسے مرتبہ ''لواء الحمد'' تک لے گئے تو وہ اپنے سامنے رسول اللہ ﷺ کو بھی پائے گا اور آپ ﷺ کی مبارک صحبت سے فیض یاب ہوگا۔ یہ ایک ایسا مقام ہے، جو تصور و خیال سے ماوراء ہے۔

دوسری طرف جس شخص کی نیت میں اخلاص نہ ہوا، بلکہ اس کی ہجرت اور جدوجہد کسی عورت کی خاطر ہوئی اور اس کے پیش نظر جسمانی لذات ہوئیں تو انجام کار اس کی تمام جدوجہد اور تگ و تاز رائیگاں جائے گی۔

جو شخص اپنے بدن اور جسمانی لذات کی خاطر جیتا ہے اور روح و ضمیر کی آواز پر کان نہیں دھرتا وہ اپنی زندگی بے مقصد گزارتا ہے اور کبھی بھی ان ثمرات سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا جو رضائے الٰہی کی خاطر زندگی گزارنے والے شخص کو حاصل ہوتے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔''[285] اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے وہ اپنے مطلوبہ ہدف تک نہیں پہنچ سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت کے پیش نظر اس کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں، چونکہ مؤمن کی نیت اس کے عمل سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے اس لیے اس کی نیت کو اس کے عمل سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

موضوع کی مناسبت سے میں آپ کی توجہ ایک اور حدیث مبارک کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''سنو! جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔''[286]

اگر آپ کی نیت خالص ہوگی تو آپ کو بڑی زرخیز مٹی میسر آئے گی، جس میں آپ جو بھی بیج ڈالیں گے وہ خوب پھلے پھولے گا، اگرچہ ابتدا میں وہ چھوٹا سا پودا دکھائی دے گا، لیکن بعد میں وہ ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرلے گا، جس کے سائے میں ہم عالم آخرت میں بیٹھیں گے، جس قدر ہماری نیت میں خلوص ہوگا اسی قدر یہ درخت بلند و بالا ہوگا اور جنت میں ہمارے لیے ثمر آور ثابت ہوگا۔ نیت کی بدولت انسان کی عادات اور عام حرکات عبادت بن جاتی ہیں، چنانچہ جو شخص نماز تہجد کے لیے اٹھنے کی نیت سے سوتا ہے، نیند کی حالت میں اس کے سانس ذکر الٰہی بن جاتے ہیں، ورنہ انسان کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنی مختصر زندگی میں اتنے تھوڑے اعمال کے ذریعے جنت حاصل کرسکتا۔

جنت کی حیاتِ جاوداں مؤمن کے لیے ایسا عطیہ خداوندی ہے، جو اسے ہمیشہ عبادتِ خداوندی کرتے رہنے کی نیت کے بدلے ملتا ہے، دوسری طرف کافر اسی لیے ہمیشہ ہمیشہ جہنم کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ اس کی نیت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انکارِ خداوندی شامل ہوتا ہے۔

نیت ہی کی بدولت بلا استثناء چھوٹے بڑے تمام اعمال کو قدر و قیمت حاصل ہوتی ہے اور ان میں زندگی کی روح پڑتی ہے، بلکہ صرف نیت ہی کے ذریعے انسان بھلائی کے کاموں پر اجرِ عظیم کا مستحق قرار بنتا ہے، مثلاً اگر انسان کوئی نیکی کا کام کرنے کا ارادہ کرے، لیکن پھر اسے نہ کر سکے تو اسے اپنی نیت کی بدولت ایک نیکی ملے گی اور اگر اس نے اس پر عمل بھی کر لیا تو اسے اس پر نہ صرف دس، سو، بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیاں ملیں گی۔ دوسری طرف اگر اس نے کوئی برائی کرنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر اس کا ارتکاب نہ کیا تو اسے اس برے ارادے پر کوئی گناہ نہ ملے گا اور اگر اس نے اس برائی کا ارتکاب کر لیا تو اس کے اعمال نامہ میں ایک گناہ لکھا جائے گا۔[287] بلاشبہ مکافاتِ عمل از جنس عمل ہوتی ہے۔

۲- ہجرت

اس حدیث مبارک میں ہجرت کی اہمیت قابل توجہ ہے... یہ بات درست ہے کہ ہجرت اپنے خاص مفہوم کے اعتبار سے ختم ہو چکی ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''فتح مکہ کے بعد اب کوئی ہجرت نہیں ہے۔''[288] لیکن اپنے عمومی مفہوم کے لحاظ سے ہجرت تا قیامت جاری رہے گی، کیونکہ ہجرت اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور جہاد کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔''[289]

داعی اور مؤمن دعوت الی اللہ کی خاطر اپنے ماں باپ، گھربار اور وطن کو خیر آباد کہہ کر دیارِ غیر میں جاتا ہے، وہ مستقل طور پر ہجرت کی حالت میں ہے اور اسے اس پر اجر و ثواب بھی ملتا ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کرنے پر اجر و ثواب کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن ایسے اعمال کا اجر و ثواب مسرت انگیز انداز میں غیر متوقع طور پر دیا جائے گا۔ فرشتوں کا کام تو اعمال کا من و عن اندراج کرنا ہوتا ہے، باقی ان کے ثواب کا تعین اللہ تعالیٰ ہی فرماتے ہیں۔

حدیث مبارک کے آغاز میں ''انّما'' کا لفظ حصر کی غرض سے آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ عمل کو عمل کی حیثیت نیت کی بدولت ہی ملتی ہے۔ نیت کے بغیر کوئی عبادت عبادت شمار نہیں ہوتی، لہٰذا اگر

کوئی شخص بغیر نیت کے سو رکعات نماز پڑھے، یا سال بھر بھوکا رہے یا اپنا سارا مال خرچ کردے یا تمام مناسکِ حج ادا کرے تو اسے نمازی، روزے دار، زکوٰۃ ادا کرنے والا یا حاجی نہیں کہیں گے، کیونکہ نیت ہی ان تمام اعمال کو عبادت کا درجہ دیتی ہے۔

الف: گناہوں سے ہجرت

حدیث مبارک کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نیت جیسے وسیع موضوع کو محض تین الفاظ میں سمجھا دیا اور پھر ہجرت جیسے کثیرالجہت موضوع کی طرف دو تین جملوں میں اشارہ فرمایا۔ آغاز میں آپ نے گناہوں اور معاصی سے اجتناب کے مفہوم میں ہجرت کا ذکر فرمایا اور پھر دو تین جملوں میں ''سہل ممتنع'' کے اسلوب میں قیامت تک راہ خدا میں کی جانے والی تمام ہجرتوں کا ذکر فرمایا۔ یہ اہل فصاحت و بلاغت کے سردار محمد ﷺ کا ہی اعجاز ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بہترین مہاجر وہ شخص ہے، جو معاصی اور گناہوں کو چھوڑ دے اور اپنے دل کو اللہ کی محبت کے سوا تمام محبتوں سے خالی کر دے۔(290)

ایک دن حضرت ابراہیم بن ادہم نے دعا میں فرمایا:

''اے پروردگار! میں آپ کی محبت میں فنا ہو چکا ہوں۔ میں ہر چیز کو چھوڑ کر آپ کے دربار میں حاضر ہوں۔ اب میری آنکھوں کو تیری تجلّی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا...'' آپ اسی ولولہ انگیز دعا میں مشغول تھے کہ آپ کی نظر کعبے کے پاس کھڑے اپنے بیٹے پر پڑی اور آپ کے بیٹے نے بھی آپ کو دیکھ لیا، سالہا سال کی جدائی نے انہیں ایک دوسرے کی طرف بڑھنے پر مجبور کر دیا، لیکن گرم جوش معانقہ کے دوران حضرت ابرہیم بن ادہم کو ہاتف غیبی کی آواز سنائی دی: ''اے ابراہیم! ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں۔'' یہ سننا تھا کہ حضرت ابراہیم بن ادہم پکار اٹھے: ''اے پروردگار! جو میری اور آپ کی محبت میں حائل ہوا سے آپ اپنے پاس بلا لیجئے۔'' چنانچہ ان کا بیٹا اسی وقت فوت ہو کر ان کے قدموں میں گر پڑا۔(291)

ب: رحمت خداوندی کی طرف ہجرت

ہجرت کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان معاصی کو چھوڑ کر رحمت خداوندی کے دروازے کی طرف لپکے اور اس وقت تک اس در کو نہ چھوڑے جب تک اسے دربار خداوندی سے پروانۂ مغفرت نہ مل جائے، کسی شاعر نے اس مفہوم کو کتنے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے:

الهی عبدك العاصی أتاك مقراً بالذنوب و قد دعاك
وان تغفرفأنت أهل لذاك وان تطردفمن یرحم سواك

''اے الٰہی! آپ کا گناہ گار بندہ آپ کے دربار میں حاضر ہے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے آپ کو پکارا ہے، اگر آپ اسے معاف فرما دیں تو یہ آپ کے شایاں ہے اور اگر آپ اسے دھتکار دیں تو آپ کے سوا کون رحم کرے گا۔''

وہی شخص راہِ ہجرت پر صحیح طور پر گامزن ہو سکتا ہے، جو ان گناہوں کے دوبارہ ارتکاب کو جن سے وہ توبہ کر چکا ہے، اپنے آگ میں پھینکے جانے سے زیادہ ناپسند کرتا ہو۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی محرمات کی طرف ایسے ہی دیکھتا ہے، جیسے آتش گیر مادے سے اٹے ہوئے میدان کی طرف دیکھتا ہے اور اپنے اعضاء و جوارح کو گناہوں کے ارتکاب سے بچاتا ہے وہ خلوت میں ہو یا جلوت میں، عمر بھر راہِ خدا میں ہجرت کرنے والا سمجھا جاتا ہے، ہجرت اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کی ہر دم کی ساتھی ہوتی ہے، تاہم خلوت کی ہجرت کا اپنا مزا اور لطف ہوتا ہے، کیونکہ اس میں انسان انس الٰہی سے محظوظ اور انفاسِ خداوندی سے سرفراز ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس حدیث میں متعدد امور کی طرف اشارہ ملتا ہے:

الف: نیت عمل کی روح ہے، جس کے بغیر عمل کی حیثیت بے جان مردے کی سی ہے۔

ب: نیت ایک پراسرار نورانی اکسیر ہے، جو نیکیوں کو برائیوں میں اور برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتی ہے۔

ج: نیت کی بدولت ہی کوئی کام عبادت بنتا ہے۔ نیت کے بغیر ہجرت سیاحت، جہاد فساد، حج تفریح، روزہ جسمانی پرہیز اور نماز ورزش کہلاتی ہے۔ ان تمام عبادات کو پرخلوص نیت کی صورت میں ایسے پروں کی ضرورت ہوتی ہے، جو انسان کو اڑا کر جنت کی طرف لے جائیں۔

د: جنت کی حیاتِ جاوید ہمیشہ عبادت کرتے رہنے کی نیت کا ثمر ہے، اسی طرح جہنم کی ابدی زندگی ہمیشہ انکارِ خدا پر ڈٹے رہنے کے عزم کا نتیجہ ہے۔

ہ: انسان نیت کی برکت سے معمولی کوشش اور تھوڑی سی قیمت سے اعلیٰ نتائج اور قیمتی انعامات حاصل کر سکتا ہے۔

و: جو شخص نیت کے سربستہ راز کو استعمال کرتا ہے وہ پوری دنیا کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

ز: اگرچہ دنیا اور عورت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، لیکن ان نعمتوں کا غلط استعمال اور ان سے محظوظ ہوتے وقت شرعی اصولوں کی رعایت نہ کرنا، بلکہ انہیں اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کے مقابل لاکھڑا کرنا انسان کے لیے عظیم خسارے کا باعث بنتا ہے۔

حدیث کے یہ تین یا پانچ جملے ان تمام عظیم مفاہیم اور نہ جانے اور کتنے ایسے حقائق پر مشتمل ہیں، جن میں سے ہر ایک کے مفہوم کی وضاحت کے لیے مستقل کتابیں درکار ہیں، دوسرے لفظوں میں شہنشاہِ فصاحت حضرت محمد ﷺ نے ہمیں ایک ذرے میں آفتاب اور ایک قطرے میں سمندر دکھا دیا۔

ح: ہاتھ اور زبان کی آفات

امام بخاری صاحبِ جوامع الکلم حضرت محمد ﷺ سے درج ذیل حدیث روایت کرتے ہیں: ''مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دے۔''(292)

۱- مثالی مسلمان

"المسلم" اور "المسلمون" کے شروع میں لامِ تعریف کا مخصوص معنی ہے۔ مثالی مسلمان وہ ہے، جو امن، آشتی اور اعتماد کے ماحول میں گھل مل جاتا ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمانوں کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ یہاں وہ شخص مراد نہیں، جس کے شناختی کارڈ پر لکھا ہوا ہو کہ وہ مسلمان ہے، بلکہ حقیقی مسلمان اور مثالی مؤمن کے اوصاف زیرِ بحث ہیں۔

حدیث میں "المسلم" کے شروع میں لامِ تعریف عہد کے لیے ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی صیغہ صفت کو علی الاطلاق ذکر کیا جائے تو اس صفت کا کامل ترین فرد مراد ہوتا ہے، چنانچہ جب "المؤمن" کہا جاتا ہے تو اس سے ''مؤمن کامل'' کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ حدیث میں مذکور "المسلم" سے بھی یہی مراد ہے۔

انسان عام طور پر زبان کی ایسی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتا۔ ان امور سے صرف وہی لوگ واقف ہوتے ہیں، جنہوں نے مدارس اور درس و تدریس کے حلقوں میں یا کسی عالم کے پاس نحو اور لغت باریک بینی

سے پڑھی ہو، لیکن یہ بات نبی کریم ﷺ کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ آپ ﷺ خود سے کلام نہ فرماتے تھے، بلکہ اس کا سرچشمہ معلم ازلی کی ذات تھی، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی گفتگو تمام لغوی باریکیوں سے مزین اور ہر قسم کی لسانی غلطیوں اور کمزوریوں سے پاک ہوتی ہے۔

اب ہم دوبارہ حدیث مبارک کی طرف لوٹتے ہیں:

مسلمان اس قدر امن وآشتی کا پیکر ہوتا ہے کہ دوسرے مسلمان بے خوف ہو کر اس کی طرف اپنی پشت پھیر سکتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ انہیں اس سے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ جب انہیں اپنے اہل وعیال کسی کے سپرد کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ بلا خطر اپنے اہل وعیال کی خبر گیری اس کے سپرد کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کی زبان یا ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ جب وہ اس کے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو انہیں اس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ وہ ان کی عدم موجودگی ان کی غیبت کرے گا اور نہ ہی حاضرین مجلس میں سے کسی سے ان کی غیبت سنے گا۔ وہ دوسروں کی عزت وآبرو کی بالکل ایسے ہی حفاظت کرتا ہے، جیسے اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرتا ہے۔ کبھی دوسروں کو کھانا کھلا دیتا ہے، لیکن خود بھوکا رہتا ہے، بسا اوقات دوسروں کو پانی پلا دیتا ہے، لیکن خود پیاسا رہتا ہے حتی کہ بعض اوقات دوسروں پر اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے، بلکہ دوسروں کی خاطر اپنی روحانی واردات کی بھی قربانی دے دیتا ہے، یہ تمام معانی حصر کا فائدہ دینے والے لام تعریف کے تحت داخل ہیں۔

۲- مسلمان اور سلامتی

بلاغت کے پہلو سے دیکھیں تو اس حدیث کے دو لفظوں "المسلم" اور "سلم" میں صنعت ''جناس'' بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں کا مادہ اشتقاق ''س ل م'' ہے، چونکہ دونوں کے حروف میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے، اس لیے یہ ''جناس ناقص'' ہے، تاہم صیغے کے اعتبار سے دونوں لفظ مختلف ہیں۔ یہ مشابہت اور اختلاف درج ذیل معانی پر دلالت کرتا ہے:

مسلمان ایسا انسان ہے، جس کے تمام کام "سلم"، "سلامة" اور "سلام" سے سرانجام پاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شوقِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی ہر حرکت وسکون اسی مرکزی قوت کے گرد گھومتی ہے۔ وہ واقف کار اور انجان ہر ایک کو سلام کرتا ہے، جس کی وجہ سے دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہو جاتی ہے۔[293]

وہ اپنی نماز کو سلام پر ختم کرتا ہے، اس کے اس سلام کو تمام جن وانس اور ملائکہ قبول کرتے ہیں، اگر چہ وہ اسے نظر نہیں آتے۔ اہل ایمان کے سوا کوئی بھی اس قدر ''سلام'' نہیں پھیلاتا۔

دائرہ اسلام میں مکمل طور پر داخل ہونے کے لیے ارکانِ اسلام نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور شہادتین کی ادائیگی ضروری ہے، جسے آیت مبارکہ ﴿ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً﴾ (البقرة:۲۰۸) ''اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔'' نے ''سلم'' میں داخل ہونے سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ سلامتی کے سمندر میں اپنا بادباں کھول کر اپنی کشتی چلاتا ہے۔ ایسا شخص ہر دم ہر سو سلامتی کی مہک پھیلاتا ہے۔ لوگ اس میں صرف بھلائی پاتے اور اس سے خیر ہی کی توقع رکھتے ہیں۔

۳- ہاتھ اور زبان کا ہی انتخاب کیوں؟

چونکہ رسول پاک ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے الفاظ کے انتخاب میں بڑی احتیاط فرماتے تھے، اس لیے اس حدیث میں ہاتھ اور زبان کے انتخاب میں بھی بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہوں گی، جن میں چند ایک کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

ایک انسان کسی دوسرے انسان کو دو ہی طریقوں سے تکلیف پہنچا سکتا ہے، اس کی موجودگی میں اسے تکلیف پہنچائے گا یا پھر اس کی عدم موجودگی میں، چنانچہ جو تکلیف موجودگی میں پہنچائی جاتی ہے، اس کے لیے ''ہاتھ'' کو ذکر کیا گیا اور جو تکلیف عدم موجودگی میں پہنچائی جاتی ہے، اس کے لیے ''زبان'' کا انتخاب کیا گیا۔ یعنی کبھی تو انسان اپنے سامنے موجود انسان کے حقوق کو نقصان پہنچاتا ہے اور کبھی غیر موجود شخص کی غیبت، اہانت یا تحقیر کر کے اس کے حقوق کو پامال کرتا ہے۔ دونوں صورتیں قابل نفرت ہیں، جن کا صدور کسی مسلمان سے ممکن نہیں، کیونکہ اس کا دوسروں کے ساتھ برتاؤ ہمیشہ مروت پر مبنی ہوتا ہے، خواہ وہ اس کے سامنے موجود ہوں یا نہ ہوں۔

رسول ﷺ نے زبان کو ہاتھ سے پہلے ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھ کے ذریعے کی جانے والی زیادتی سے دفاع ممکن ہوتا ہے، جبکہ کسی کی عدم موجودگی میں کی جانے والی غیبت یا الزام تراشی کا عام طور پر فوری ردعمل ظاہر نہیں ہوتا، چونکہ اس قسم کے طرز عمل سے نہ صرف افراد بلکہ اقوام کے درمیان بسہولت دشمنی کے بیج بوئے جا سکتے ہیں، نیز آمنے سامنے پہنچائے گئے نقصان کی بہ نسبت زبان سے پہنچائے گئے نقصان کا ازالہ زیادہ مشکل سے ہوتا ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے زبان کو ہاتھ سے پہلے ذکر فرمایا ہے۔ اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمان کے مرتبے کا بھی پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں دی۔

امن و سلامتی کے علمبردار دین اسلام کی اخلاقیات کا ایک اہم ترین پہلو یہ بھی ہے کہ جس طرح انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے مادی و روحانی نقصانات سے بچائے اسی طرح اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ دوسروں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائے، نیز صرف اسی پر اکتفا نہ کرے، بلکہ معاشرے کے ہر طبقے کے لیے امن و آشتی کا پیامبر بن جائے۔

کسی انسان کے حقیقی مسلمان ہونے کا معیار اس کے دل میں موجود امن و سلامتی کے جذبات ہیں۔ حقیقی مسلمان کی صبح و شام، حرکت و سکون اور نشست و برخاست اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام "السلام" سے پھوٹنے والے جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اہل ایمان سے ملاقات کے وقت وہ انہیں سلام کرتا ہے، ان سے رخصت ہوتے وقت ان کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہے، نماز میں "التحیات" کو سلام سے زینت بخشتا ہے اور دربارِ الٰہی سے رخصت ہونے سے پہلے اہل ایمان پر سلامتی بھیج کر اپنی نماز کی تکمیل کرتا ہے۔ جس شخص کی زندگی کا مرکز و محور امن و سلامتی ہو اس سے یہ ناممکن ہے کہ اپنی بنیادی فکر سے بغاوت کرتے ہوئے مادی و روحانی یا دنیوی و اخروی امن و امان کو برباد کرنے والی راہ پر چلے۔ حدیث مبارک کے اس سرسری جائزے کے بعد ہم ذیل میں اس کی روح سے پھوٹنے والی چند خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

الف: حقیقی مسلمان روئے زمین پر عالمی امن کا بہترین علمبردار ہوتا ہے۔

ب: مسلمان جہاں کہیں بھی ہو وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں امن و سلامتی کی خوشبو مہکاتا رہتا ہے۔

ج: مسلمان نہ صرف یہ کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے اجتناب کرتا ہے، بلکہ ہر جگہ امن و اطمینان کی علامت بن کر رہتا ہے۔

د: مسلمان ہاتھ کے ذریعے کسی پر زیادتی کرتا ہے اور نہ ہی کسی کی غیبت، چغل خوری، بہتان طرازی، الزام تراشی اور تحقیر و اہانت کر کے زبان کے ذریعے ایذا پہنچاتا ہے، بلکہ زبان کے ذریعے کسی پر زیادتی کرنے کو ہاتھ کے ذریعے زیادتی کرنے سے بڑا گناہ سمجھتا ہے۔

ہ: ان گناہوں کے ارتکاب کے باوجود انسان مسلمان رہتا ہے اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، دوسرے لفظوں میں ہمارے عقیدے کے مطابق یہ گناہ ایمان اور کفر کے درمیان حد فاصل تصور نہیں ہوتے۔

حاصل یہ کہ ایک سطر پر مشتمل معجزانہ کلام کی حامل یہ حدیث مبارک اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ انسان کو عام اسلام وایمان اور شرعی احکام پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ان کے اعلیٰ ترین مراتب کے حصول میں لگے رہنا چاہیے، تاہم ان مراتب تک پہنچنے کے لیے دل میں شوق ومحبت کی شمع جلانا ضروری ہے۔

ط: آدمی کے اسلام کی زینت لایعنی امور سے اجتناب ہے

ہجرت کے مفہوم کی مختصر وضاحت کے بعد ایک اور حدیث نبوی کی طرف آتے ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشادِ پاک ہے: ''آدمی کے اسلام کی زینت لایعنی امور سے اجتناب ہے۔''(294)

اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے مؤمن کے اسلام کو احسان واتقان کے مرتبے تک پہنچانے کا نسخۂ کیمیا ارشاد فرمایا ہے، دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ نے ظاہری لحاظ سے ہر قسم کے نقص وعیب سے پاک اسلام کو اور باطنی لحاظ سے درجۂ احسان کے سربستہ رازوں کو پالینے کا طریقہ بتایا ہے، لہٰذا اس مرتبے کے خواہش مند شخص پر لازم ہے کہ وہ بے فائدہ امور سے کنارہ کش رہے۔

ا- باطنی وقار کے اثرات انسان کے ظاہر پر نظر آتے ہیں۔

بے پرواہ اور غیر سنجیدہ لوگوں کی عبادت بھی سنجیدگی سے خالی ہوتی ہے۔ اس قسم کے انسان بعض اوقات نماز میں سنجیدگی اور وقار کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن اگر انسان کا باطن اور قلب وضمیر سنجیدگی اور وقار سے خالی ہو تو اس کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کوئی جگنو اپنے آپ کو جگمگاتے ستارے کی مانند دکھانے کی کوشش کرے، لیکن چونکہ اخلاق اور کردار کو چھپانا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے وہ اس قسم کا تکلف زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ہر انسان جلد یا بدیر اپنی فطرت اور اخلاق کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرتا ہے، تاہم مشق اور مجاہدے کے ذریعے دکھلاوے کو ختم کر کے سنجیدگی اور وقار کو فطرتِ ثانیہ بنایا جا سکتا ہے۔ انسان اپنے لاشعور کا تابع ہوتا ہے، جس طرح کوا کبھی بھی زیادہ عرصے تک ہنس کی چال نہیں چل سکتا، اسی طرح انسان بھی اپنے لاشعور سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس حدیث مبارک کا خلاصہ درج ذیل امور کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے:

دل سے باہر کی دنیا میں عمدگی کے پائے جانے کے لیے ضروری ہے کہ دل کی دنیا میں احسان کی صفت موجود ہو، یعنی ظاہر کے لیے باطن کی اعانت ناگزیر ہے، دوسرے لفظوں میں دل میں سنجیدگی اور وقار ہونا چاہیے تاکہ اس کے اثرات ظاہر پر بھی پڑیں۔

جب حضرت عمر بن خطابؓ کے سامنے ایک بڑے صحابی کا تذکرہ ہوا اور کہا گیا کہ ان میں خلافت کی اہلیت موجود ہے تو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: ''وہ یقیناً خلافت کے اہل ہیں، لیکن ان کے مزاج میں مزاح کا عنصر ہے، جبکہ خلافت سنجیدہ پن کی متقاضی ہے، اس میں مزاح کی گنجائش نہیں۔''(295)

جب اس خلافت کے لیے جس کے دائرہ کار میں لوگوں کے انتظامی امور چلانا شامل ہے، سنجیدہ پن مطلوب ہے تو روئے زمین پر خلافت الٰہیہ کے لیے سنجیدہ پن کیونکر مطلوب نہ ہوگا۔ جو انسان اپنے خالق و مالک کے حضور سنجیدگی اور وقار کا مظاہرہ نہیں کرتا وہ دیگر مواقع پر کیسے سنجیدہ انسان ثابت ہو سکتا ہے؟

۲- احسان اور سنجیدگی کا احساس

حدیث شریف کے آغاز میں لفظ ''من'' اپنے اندر حصر کا مفہوم لیے ہوئے ہے، یعنی اس حدیث میں اس راستے کی طرف اشارہ ہے، جو انسان کو مرتبۂ احسان تک پہنچاتا ہے، وہ راستہ بے پروائی سے کنارہ کش رہنے سے عبارت ہے، لہٰذا جب تک انسان بے پروائی کو ترک کر کے سنجیدگی اختیار نہیں کرتا اس وقت تک وہ قطعاً درجۂ احسان تک نہیں پہنچ سکتا۔

حدیث جبرائیل علیہ السلام میں مرتبۂ احسان کو سب سے آخر میں ذکر کیا گیا ہے، جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سب سے پہلے ایمان سے متعلق سوال کیا، پھر اسلام کے بارے میں پوچھا اور پھر رسول اللہ ﷺ کے جوابات کی تصدیق کرنے کے بعد احسان کی حقیقت دریافت کی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (احسان کی حقیقت یہ ہے کہ) ''تم خدا کی عبادت ایسے کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔''(296)

پرہیزگاری، دنیا سے بے رغبتی اور ولایت کے بغیر اس مرتبے کا حصول ممکن نہیں، انسان پر لازم ہے کہ اس مرتبے کے حصول کو اپنا نصب العین بنائے اور اس تک پہنچنے کے لیے مختلف راستوں کو آزمائے۔ اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ انسان کا دل رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، وہ جس طرف چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ ہر چیز میں اس کی تجلی عیاں ہے۔ اسے اپنی ذات سے باہر تلاش کرنا فضول ہے۔ وہ تو انسان سے اس کی اپنی ذات سے بھی قریب تر ہے، تاہم یہ راز انسان پر مرتبۂ احسان کو پا لینے کے بعد کھلتا ہے۔

۳- ہر کام کو عمدگی سے سرانجام دینا

جب انسان کے قلب وضمیر کو احسان کی چادر ڈھانپ لیتی ہے تو اس کے ہر کام میں عمدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ عمدگی سے کیے ہوئے کام کو پسند فرماتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (التوبة: ١٠٥) ''اور ان سے کہہ دو کہ عمل کیئے جاؤ۔ خدا اور اس کا رسول اور مؤمن (سب) تمہارے اعمال دیکھ لیں گے اور تم غائب وحاضر کو جاننے والے (خدائے واحد) کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر جو کچھ تم کرتے رہے، ہو وہ سب تم کو بتادے گا۔''

یعنی تمام اعمال اللہ، اس کے رسول اور روشن دماغ رکھنے والے اہل ایمان کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور ان کی بڑی محتاط باز پرس کے مرحلے سے گزریں گے، لہٰذا انسان کو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کا ہر کام بڑی کڑی جانچ پرکھ کے مرحلے سے گزرے گا۔ اس لیے شرمندگی یا ندامت سے بچنے کے لئے اسے ہر کام انتہائی عمدگی سے سرانجام دینا چاہیے، لیکن کاموں میں اس قدر عمدگی پیدا کرنے کے لیے مرتبۂ احسان کو پانا ضروری ہے، جب انسان کے باطن میں گہرائی پیدا ہوتی ہے تو اس کے کاموں میں عمدگی کا معیار بلند ہو جاتا ہے اور اس میں اسلام کی خوبیوں کی جھلک نظر آنے لگتی ہے، ایسا شخص بے پروائی کا شکار نہیں ہوتا، دوسرے لفظوں میں ایسا انسان حقیقی اسلامی زندگی سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

''مالا یعنیہ'' سے ایسے امور مراد ہیں، جن سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو، وہ اس کے لیے حال و مستقبل میں غیر ضروری اور غیر مفید ہوں اور ان میں مشغول ہونے سے اسے، اس کے خاندان کو یا امت مسلمہ کو کوئی فائدہ پہنچنے کی امید نہ ہو، چنانچہ جو شخص اسلام کے حسن و جمال کو پالیتا ہے وہ بے پروائی اور غیر سنجیدگی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ اعلیٰ کاموں میں مصروف رہے، کیونکہ ایسے کاموں میں مصروف رہنا اس کی ذات، خاندان اور امت کے لیے سودمند ہے۔ درحقیقت ایسا ہی شخص سنجیدہ انسان کہلانے کے لائق ہے۔

اس حدیث کے ضمن میں میں ایک باریک نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں:

جو شخص بے فائدہ کاموں میں مشغول رہتا ہے اس کے پاس حقیقی فائدے کے کاموں کے لیے وقت ہی نہیں بچتا۔ جس شخص نے ابھی تک اپنی ذات کو پایا اور نہ ہی اسے مناسب ماحول اور رُخ میسر ہے اس کے لیے کوئی مثبت یا عمدہ کام سرانجام دینا ممکن نہیں۔ تھوڑی تک غیر مفید کاموں میں دھنسے

ہوئے شخص کے لیے مفید کاموں کی طرف متوجہ ہونا ممکن نہیں، کیونکہ اس کا دل ودماغ فضول اور بے کار خیالات سے بھرا ہوتا ہے، لہٰذا ایسے شخص سے کسی قابل قدر کام میں مصروف ہونے کی توقع رکھنا فضول ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان تمام معانی ومطالب کو چند کلمات پر مشتمل ایک جملے میں سمو دیا ہے۔ ان معانی کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کوئی زائد بات نہیں کہی۔ میں نے تو صرف تعبیر کی کدال سے اس حدیث کی پرشکوہ عمارت پر چند ضربیں لگائی ہیں، جو کچھ آپ تک پہنچا ہے وہ اس سے اترنے والے چند ٹکڑے ہیں۔ میں ان معانی کی کماحقہ وضاحت نہیں کرسکا، تاہم میرے اور میرے جیسے لوگوں کا عجز رسول اللہ ﷺ کی فصاحت وبلاغت اور قوتِ تعبیر کا مُنہ بولتا ثبوت ہے، کیونکہ ہم آپ ﷺ کے ان ارشادات کے تمام معانی کا احاطہ نہیں کرسکتے، جنہیں آپ ﷺ بغیر کسی تیاری کے کہا کرتے تھے۔ جن معانی کے احاطے کے لیے ہماری فکر کا دائرہ تنگ پڑ جاتا ہے، آپ ﷺ انہیں روزمرہ کی زندگی میں بلاتکلف ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ کیا فراست کے سوا کسی اور لفظ سے اس کی تعبیر ممکن ہے؟ عبقریت کا لفظ بھی اس وصف کی تعبیر کے سامنے بے مایہ دکھائی دیتا ہے۔

ی: صبر

صحیح بخاری ومسلم میں ارشادِ نبوی مذکور ہے: ''صبر تو پہلے صدمہ کے وقت ہی ہوتا ہے۔''(297)

جب رسول اللہ ﷺ نے زیارتِ قبور کے دوران جاہلیت کی رسوم کو بدستور ہوتے دیکھا تو آپ ﷺ نے اہل ایمان کو زیارت قبور سے منع فرما دیا، لیکن بعد میں آپ ﷺ نے نہ صرف زیارت قبور کی اجازت دے دی، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے: ''میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع کیا تھا، لیکن محمد (ﷺ) کو اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت دی گئی ہے، چنانچہ تم بھی قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ اس سے آخرت کی یاددہانی ہوتی ہے۔''(298) اس کی وجہ یہ ہے کہ قبر میں انسان کے لیے عبرت کا بہت سامان ہے۔ قبر کی یاد انسان کو طولِ امل سے بچانے کے لیے انتہائی مؤثر ہے۔ آپ ﷺ جو پیکر وفا تھے، بکثرت زیارت قبور کے لیے تشریف لے جاتے اور شہدائے احد کی قبروں کی ہفتے میں ایک دفعہ ضرور زیارت فرماتے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ایک عورت کے پاس سے گزر ہوا، جو ایک قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا: ''خدا سے ڈر اور صبر کر۔'' اس عورت نے کہا: ''میرے پاس سے ہٹ جایئے، کیونکہ تمہیں اس مصیبت کا احساس نہیں جو مجھ پر ٹوٹی ہے۔''

جب اسے بتایا گیا کہ یہ نبی کریم ﷺ ہیں (ایک روایت میں ہے کہ یہ سن کر اس کی حالت غیر ہوگئی) تو وہ فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ ﷺ کے دروازے پر کوئی دربان موجود نہ تھا، چنانچہ اس نے عرض کی: ''میں نے آپ کو پہچانا نہ تھا...'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''صبر تو پہلے صدمے کے وقت ہی ہوتا ہے۔''[299]

آپ ﷺ نے بلاغت کے لحاظ سے اعجاز کی حدود کو چھونے والے چار کلمات میں ایک ایسے مسئلے کی وضاحت فرما دی، جس کے لیے کئی جلدیں درکار تھیں۔

صبر کی متعدد اقسام

صبر کبھی مصیبت پر ہوتا ہے، کبھی گناہوں اور معاصی سے اجتناب کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی عبادات پر استقامت کی صورت میں ہوتا ہے، چنانچہ روزانہ پانچ وقت نمازوں کی ادائیگی، سال میں کم از کم ایک ماہ کے روزے، زکوۃ کی ادائیگی اور دیگر ضروری عبادات کی پابندی صبر کی متقاضی ہے۔ اس سے انسان کی زندگی میں نظم وضبط پیدا ہوتا ہے اور اس پر آخرت کا رنگ چڑھتا ہے۔ ایسی زندگی انوار و برکات سے معمور رہتی ہے اور آخر کار جنت میں داخلے کا باعث بنتی ہے، اسی لیے انسان پر لازم ہے کہ ان عبادات پر استقامت کے ساتھ مداومت کرے تا کہ اس کی زندگی ان انوارات سے منور رہے۔

صبر اس ایلوے کی طرح کڑوا ہوتا ہے، جسے طبیب حضرات بعض دواؤں کی تیاری میں استعمال کرتے ہیں، تاہم یہ کڑواہٹ صرف ابتدا میں محسوس ہوتی ہے، اس کے نتائج ہمیشہ مٹھاس کی صورت میں برآمد ہوتے ہیں۔

المناک اور دردانگیز حادثات پر صبر کرنا اور مصائب کو فکری وانتظامی امور میں خلل اور اعصاب شکنی کا شکار ہوئے بغیر برداشت کرنا کوئی آسان کام نہیں، تاہم ان تکالیف کا سامنا صرف پہلے صدمے کے موقع پر ہوتا ہے، کیونکہ کسی اور حالت کی طرف منتقل ہونے سے انسان کی نفسیاتی کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے، غم ہلکا ہو جاتا ہے اور انسان آہستہ آہستہ شدید صدمے کا باعث بننے والے حوادث کو بھی بھولنے لگتا ہے۔

فرض کریں ہمیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے، ابتدا میں ہم سمجھیں گے گویا اسے برداشت کرنا ہمارے بس میں نہیں... ایسی صورت میں ہمیں چاہیے کہ سب سے پہلے اپنی موجودہ کیفیت کو تبدیل کر کے صدمے کے اثرات کو زائل کریں، چنانچہ اگر ہم کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں اور اگر بیٹھے ہیں تو لیٹ

جائیں،غرض ہمیں اپنی سرگرمی میں کوئی نہ کوئی تبدیلی لانی چاہیے،مثلاً وضو کرلیں ، نماز پڑھنا شروع کردیں ،جس موضوع پر گفتگو کررہے تھے اس کے سوا کسی دوسرے موضوع پر باتیں کرنے لگیں یا جس جگہ ہم موجود ہیں اسے چھوڑ کر کسی دوسری جگہ یا کسی دوسرے ماحول میں چلے جائیں،بعض اوقات تھوڑی دیر سو جانا پہلے صدمے کے غم کو ہلکا کرنے میں مفید ثابت ہوتا ہے۔غرض حالت ، کیفیت یا جگہ کے تبدیل کرنے سے اس صدمے یا مصیبت کے اثرات کوکم کرنے میں مدد ملتی ہے، جسے ہم ناقابل برداشت سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

اسی طرح عبادات پر استقامت ومداومت کے لیے بھی صبر کا مظاہرہ کرنا ضروری ہوتا ہے،مثلاً بعض اوقات نئے آدمی پر نماز کی ادائیگی انتہائی شاق گزرتی ہے،لیکن اگر وہ کچھ صبر کا مظاہرہ کرے گا تو نماز کا اس کی روح کے ساتھ ایسا امتزاج پیدا ہو جائے گا کہ ایک وقت بھی نماز کو چھوڑنا اسے جہنم کے عذاب سے کم نہ لگے گا۔یہی بات روزے، زکوۃ اور حج جیسی دیگر عبادات کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔خود غور فرمایئے کہ حج جیسی مشکل عبادت سرانجام دینے والا شخص کیسے ایک بار پھر حج کی سعادت حاصل کرنے کے شوق سے سرشار ہو جاتا ہے حتی کہ حج کے معاملات میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں سے وہ پاگل ہونے لگتا ہے۔عبادت کی ایسی محبت پہلے صدمے کی مشکلات کو برداشت کرنے میں مدد دیتی ہے،یہی بات تقریباً دیگر تمام عبادات پر بھی صادق آتی ہے۔ضروری ہے کہ انسان محرمات کے مقابلے میں صبر سے کام لے،کیونکہ دل پر گناہ کے حملے کے پہلے صدمے کا علی الاعلان مقابلہ کرنے سے گناہ کی چنگاری بجھ جاتی ہے اور اس کی طاقت میں کمی آجاتی ہے،جس کے نتیجے میں انسان گناہ کے پہلے صدمے سے بحفاظت بچ جاتا ہے،اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:’’اے علی!ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ مت دیکھو، کیونکہ پہلی نظر تمہارے لیے معاف ہے، لیکن دوسری نہیں۔‘‘[300] یعنی بعض اوقات انسان کی نظر حرام چیز پر پڑ جاتی ہے،اگر تو اس نے اپنا چہرہ اور نگاہ فوراً پھیر لی تو اس پر اسے گناہ نہ ہوگا ، بلکہ حرام کی طرف نہ دیکھنے پر ایک نیکی بھی ملے گی ،لیکن دوسری اور اس کے بعد کی نظریں زہر آلود تیروں کی طرح اس کے دل وجاں میں اتر کر اس کے پاکیزہ خیالات کو آلودہ اور اس کے ارادے کی روحانی قوت کو کمزور کردیں گی ، کیونکہ حرام کی طرف ہر نظر دراصل گناہوں کی دلدل میں گھسنے کی دعوت ہوتی ہے، ہر نظر ایک اور نظر کا شوق دلاتی اور اس کی طرف دعوت دیتی ہے،جس کے نتیجے میں انسان گناہوں کے سمندر میں اپنی کشتی ڈالنے کے لیے بادبان کھول کر ایک ایسے راستے پر چل پڑتا ہے،جس سے پلٹنا مشکل ہو جاتا ہے،لہٰذا اس مرحلے تک پہنچنے سے

پہلے حرام کے پہلے صدمے پر ہی صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف التفات نہ کرنا، بلکہ آنکھوں کو بند کر لینا ضروری ہے، یہ ہمارے لیے رسول اللہﷺ کی سنہری وصیت ہے۔

قدیم زمانے میں اپکٹیتوس (Epictetos) نے کہا تھا:

''جب تمہیں نقصان دہ خیالات گھیر لیں تو پہلی فرصت میں ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرو، ورنہ وہ تمہیں ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں سے تم کبھی واپس نہ آسکو گے۔'' یہ الہامی بات ہے، اگر یہ آدمی رسول اللہﷺ کے بعد پیدا ہوا ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس نے یہ الہام آپﷺ سے ہی لیا ہے۔

جب انسان حرام کے بارے میں یہ موقف اختیار کرتا ہے تو یہ اس کی طبیعت اور عادت بن جاتی ہے، کیونکہ بار بار یہ مشق کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا ہونے والا نور جہنم کے شعلوں کی مانند گناہوں اور اس کے درمیان ایک آڑ بن جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب حرام چیز کو دیکھ آنکھیں جھکا لینا اس کے فطری کردار کا حصہ بن جاتا ہے اور اگر کبھی اس کے دل میں کسی غلط کام کا وسوسہ آتا بھی ہے تو وہ اپنے دل میں موجود شہد ایمانی کے خلیوں میں انگلی ڈبو کر ایمانی لذت کے سائے میں اپنے آپ کو ایمانی اور روحانی ماحول سے دور کرنے کا باعث بننے والی ہر چیز سے بچا کر لے جاتا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کا قصداً حرام کی حدود میں قدم رکھنا بہت بعید از قیاس ہے۔

ہر مصیبت کا مخصوص صدمہ ہوتا ہے، اگر اسے برداشت کر لیا جائے تو مصیبت رحمت میں، تکلیف لذت میں اور غم خوشی میں تبدیل ہو جاتا ہے... ایسے انسان کے سارے دکھوں کا مداوا ہو جاتا ہے، تاہم یہ سب کچھ پہلے صدمے کو کامیابی کے ساتھ برداشت کرنے کے ساتھ مشروط ہے۔ رسول اللہﷺ نے اس وسیع موضوع کو صرف چار لفظوں "الصبر عند الصدمة الأولى" میں بیان فرما دیا۔

ک: اوپر والا ہاتھ

بخاری، مسلم اور احمد بن حنبل نے ایک حدیث روایت کی ہے، جس میں رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔''(301)

دوسری احادیث سے پتا چلتا ہے کہ اوپر والے ہاتھ سے خرچ کرنے اور دینے والا ہاتھ مراد ہے، جبکہ نیچے والے ہاتھ سے لینے والا ہاتھ مراد ہے۔(302) جس طرح نفس الامر میں دینے والا ہاتھ لینے

والے ہاتھ سے بلند ہوتا ہے، اسی طرح حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ خرچ کرنے پر ملنے والا اجر وثواب خرچ کرنے والے ہاتھ کو لینے والے ہاتھ سے بلند تر کر دیتا ہے، نیز اس میں سلیم الطبع انسانوں کو خرچ کرنے کی ترغیب اور لینے سے نفرت دلا کر انسانی شرف کو بلند کرنا بھی مقصود ہے۔ حدیث مبارک میں ان تمام مضامین کو اختصار کے ساتھ ایسے عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا ہر ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بالکل مناسب انداز میں موجود ہے۔

دینے اور خرچ کرنے کے عمل کو بامقصد بنانے کے لیے دینے والے ہاتھ کے مقابلے میں لینے والے ہاتھ کو ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث مبارک میں دینے والے ہاتھ کو "خیـــر" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے، لیکن لینے والے ہاتھ کو "شـــر" کے ساتھ موصوف نہیں کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ بعض حالات میں لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا، تاہم حدیث میں اس طرف ہلکا سا اشارہ ضرور موجود ہے کہ لینے والے ہاتھ میں نسبتاً کم بھلائی پائی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا مفاہیم کے ساتھ ساتھ حدیث پاک ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔'' میں ہاتھ کا صرف حقیقی معنی ہی مراد نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ نے الفاظ کو درج ذیل مجازی معانی میں بھی استعمال فرمایا ہے:

اول: آپ ﷺ نے ''جز'' بول کر ''کل'' مراد لیا ہے، یعنی ہاتھ سے خود انسان مراد ہے، اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ دینے والا انسان لینے والے انسان سے بہتر ہوتا ہے۔

دوم: جو شخص خرچ کرتا ہے وہ دینے والا ہوتا ہے اور جس پر خرچ کیا جاتا ہے وہ لینے والا ہوتا ہے، اس لیے اگر رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ ہاتھ کی صفات کی وضاحت کے لیے ارشاد فرمائے ہوتے تو ضروری تھا کہ آپ ﷺ یوں ارشاد فرماتے: ''دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔'' لیکن آپ ﷺ نے ''دینے والا'' اور ''لینے والا'' کی بجائے ''اوپر والا'' اور ''نیچے والا'' کی تعبیر اختیار فرمائی، اس سے ایک باریک نکتے کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے ہمیشہ افضل نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات لینے والا ہاتھ دینے والے ہاتھ سے کہیں بہتر ہوتا ہے، مثلاً اگر وہ شدید ضرورت کی بنا پر لے رہا ہو یا دینے والے کے مال کو صحیح مصرف پر خرچ کر کے اسے اجر وثواب کا مستحق بنانے کی نیت سے لے رہا ہو یا دینے والا شخص احسان جتلانے والا ہو تو ان تمام صورتوں میں اگرچہ بظاہر دیکھنے میں دینے والا ہاتھ اوپر والا ہاتھ نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ نیچے والا ہاتھ ہے اور لینے والا ہاتھ اوپر والا ہاتھ ہے۔

آپ بعض صابر فقراء کو دیکھتے ہوں گے کہ ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، چہرہ غبار آلود ہے، محفلوں میں انہیں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، بلکہ انہیں دیکھ کر دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اگر وہ خدا کی قسم اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری فرما دیتے ہیں...'' حضرت براء بن مالک کا شمار بھی ایسے ہی حضرات میں ہوتا تھا، جب کبھی مسلمان جنگ کے دوران کسی مشکل میں پھنس جاتے تو حضرت براء کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں کہتے کہ وہ قسم اٹھا کر کہہ دیں کہ مسلمان فتح یاب ہوں گے، چنانچہ وہ قسم اٹھاتے اور مسلمانوں کو فتح ہو جاتی۔ (303) بعض اوقات ایسے انسان کا ہاتھ لینے والا ہاتھ ہوتا ہے۔

حضرت ثوبانؓ تنگ دست صحابہ میں سے تھے، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے انہیں کسی سے سوال نہ کرنے کی وصیت فرمائی تھی، اس دن سے حضرت ثوبان نے کسی انسان سے کوئی چیز نہ مانگی حتی کہ وہ اونٹنی پر سوار ہو کر جا رہے ہوتے اور ان کے ہاتھ سے چابک گر پڑتی تو کسی کو کہنے کی بجائے خود اونٹنی سے اتر کر اسے اٹھاتے اور پھر دوبارہ اونٹنی پر سوار ہو جاتے۔ (304) بعض اوقات لوگ ایسی ہستیوں کو کوئی چیز دیتے ہیں... یہ ایسے ہی ہے جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی صورت میں آئیں اور لوگ انہیں کوئی چیز یا صدقہ دیں، ایسے لوگ کبھی دینے والوں کی بہ نسبت گھٹیا یا کم مرتبہ نہیں ہوتے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو صدقہ دینا اللہ تعالیٰ کو صدقہ دینا ہے، گویا اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو وہ صدقہ دے رہے ہوتے ہیں۔ (305)

۱- وصیتیں

رسول اللہ ﷺ اس حدیث میں ہمیں درج ذیل وصیتیں فرما رہے ہیں:

ہمیشہ اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کرو۔ مانگ کر اپنے آپ کو ذلیل و رسوا نہ کرو اور کبھی بھی فرد یا قوم کی حیثیت سے لینے والا ہاتھ نہ بنو، بلکہ ہمیشہ دینے والا ہاتھ بنو۔ ایسی صورت میں تم باعزت مقام پر فائز رہو گے اور اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کر سکو گے۔ یہ کبھی نہ بھولو کہ اوپر والا ہاتھ خرچ کرتے وقت ہمیشہ پرسکون رہتا ہے، جبکہ نیچے والا ہاتھ عطایا لیتے وقت ہمیشہ بے چین رہتا ہے، تم محکوم ہاتھ بننے کی بجائے حاکم ہاتھ بنو، کیونکہ اگر تم بلندی پر ہو گے تو تم ہی غالب رہو گے۔

۲- بین الاقوامی معیار

یہ حدیث ہمارے لیے ایک ایسا پیمانہ اور میزان مقرر کرتی ہے، جو بین الاقوامی معاملات میں غلط

ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ہم اوپر والا ہاتھ بنے تو بین الاقوامی توازن برقرار رکھنے میں اپنا کردار ادا کر سکیں گے اور مسلمانوں کی اکثریت بین الاقوامی قوتوں کے ہاتھوں اپنی ثروت کا استحصال ہونے سے بچانے میں کامیاب ہو سکے گی، اس کے بغیر مسلمانوں کی اکثریت کا استحصال اور ذلت کی صورتِ حال سے باہر نکلنا ممکن نہیں، آج دنیا میں ہم جو منظر دیکھ رہے ہیں وہ اس بات کا شاہد ہے۔ بین الاقوامی قوتیں اقوام عالم کا خون چوس رہی ہیں اور اس کے عوض پروپیگنڈے کی غرض سے انہیں چند درہم دیتی ہیں اور پھر اس سے کئی گنا زیادہ ان سے واپس لے لیتی ہیں۔ آج ہم نیچے والا ہاتھ ہونے کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری انسانیت ہم سے جو توقعات وابستہ کئے بیٹھی ہے ان پر پورا اترنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر جدوجہد کریں۔

یہ تمام مطالب اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے معانی جن کا ہمیں علم نہیں، اختصار و بلاغت کی شاہکار اس حدیث نبوی میں موجود ہیں۔

ل: تین قسم کے لوگ جن کی مغفرت نہ ہوگی

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ”تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن گفتگو فرمائیں گے، نہ ان کی طرف نظر التفات فرمائیں گے اور نہ ہی ان کو گناہوں سے پاک کریں گے۔ وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ وہ تین شخص یہ ہیں: چادر کو (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانے والا، کسی کو کوئی چیز دے کر احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر اپنا سامان فروخت کرنے والا۔“ (306)

”ثلاثة“ کے لفظ کو کسی قید کے بغیر ذکر کیا گیا ہے، اس سے تین مرد، تین عورتیں یا تین جماعتیں مراد ہو سکتی ہیں، نیز یہ تین لوگ عالم بھی ہو سکتے ہیں اور جاہل بھی، کیونکہ ان لوگوں کی شناخت کی بجائے اوصاف کی اہمیت ہے، اس لیے ”ثلاثہ“ کے لفظ کو کسی قید کے ساتھ مقید کرنے کی بجائے عموم پر برقرار رکھا گیا ہے، پھر ”ثلاثہ“ کو نکرہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں تنوین بھی ”نکارت“ کا مفہوم پیدا کرنے کے لیے لائی گئی ہے، یعنی ان لوگوں کی کوئی ایسی پہچان نہ ہوگی، جس سے ان کی شناخت ہو سکے، بلکہ وہ غیر معروف لوگ ہوں گے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ قدر و منزلت کے استحقاق سے عاری، گھٹیا اور حقیر لوگ ہوں گے، لہٰذا جس طرح اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر التفات فرمائیں گے اور نہ ہی ان سے گفتگو کریں گے، اسی طرح تم بھی ان میں کوئی ایسی باعث فضیلت بات نہ پاؤ گے، جس سے تم انہیں پہچان سکو یا ان سے گفتگو کر سکو... وہ نہ صرف جسمانی لحاظ

سے گریں گے، بلکہ قلبی اور روحانی اعتبار سے بھی انحطاط کا شکار ہوں گے، ان کے ضمیر ان کے جسموں کے بوجھ تلے دب جائیں گے، ان میں ترقی کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہے گی، جس کے نتیجے میں وہ جہنم کی گہرائیوں میں لڑھکتے چلے جائیں گے۔

لفظ "ثلاثة" کے بعد تین ایسے افعال کا ذکر ہے، جو مستقبل کی طرف مشیر ہیں اور لوگوں کے سامنے ان تین قسم کے لوگوں کے "نامۂ سیاہ" کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

۱- تین محرومیاں

الف: ہم کلامی سے محرومی

پہلا فعل "لا یکلمهم الله" کے جملے کے آغاز میں فعل مضارع ہے۔ فعل مضارع جس طرح مستقبل پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح زمانہ حال پر بھی دلالت کرتا ہے۔ مصیبت کا آغاز اس خدائی اطلاع سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس انسان سے گفتگو فرمائیں گے اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو سکے گا، باوجود اس کے کہ وہ گفتگو کی صلاحیت سے بہرہ مند ہوگا۔ پہلے جملے کے آغاز میں ذکر کردہ یہ مصیبت واقعی بہت ہولناک ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ سورہ رحمان میں انسان کو بیان کی تعلیم دینے کو احسانِ خداوندی قرار دے کر اسے خدائی نعمتوں میں شمار کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے گفتگو نہ فرمائیں گے، کیونکہ ایسا شخص اتنی پستی کا شکار ہو چکا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے گفتگو کرنے اور اسے یہ اعزاز بخشنے کو پسند نہ فرمائیں گے۔ کیا انسان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی عذاب ہوگا کہ اسے ایسے دن بولنے سے روک دیا جائے اور اس کی بات نہ سنی جائے جب اسے اپنی حالت زار بتانے اور اپنا دفاع کرنے کے لیے گفتگو کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی؟ وہ اس دن مدد کے لیے پکارے گا اور درد سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کسی ایسے شخص کو تلاش کرے گا جو اس کی حالت زار کو بیان کر سکے، لیکن وہ یکتا اور اکیلی ذات جو اس کی مدد کر سکتی ہوگی وہی اس کی بات نہ سنے گی۔ قرآن کریم اس صورت حال کی منظر کشی کرتے ہوئی کہتا ہے: ﴿قَالَ اخْسَؤُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ﴾ (المؤمنون: ۱۰۸) "(خدا) فرمائے گا کہ اسی ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا تمہارے بولنے کی جگہ تھی، تم وہاں بول بھی سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے انس بھی پیدا کر سکتے تھے... لیکن دنیا میں تم نے اللہ تعالیٰ سے انس پیدا نہ کیا، اس لیے آج وہ بھی تم سے انس پیدا نہ کرے گا۔

ب: نظرِ الٰہی سے محرومی

دوسرا منظر "ولا ینظر الیھم" کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف ایسے دن نظرِ رحمت سے نہ دیکھیں گے جب وہ رحمت و مہربانی کی نظر کے سب سے زیادہ ضرورت مند ہوں گے۔ جب بعض تر و تازہ چہرے پُرمسرت اور ہشاش بشاش ہوں گے اس وقت دیگر بعض چہروں پر پژمردگی اور تاریکی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ وہی چہرے ہوں گے، جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظرِ التفات نہ فرمائیں گے۔ جس دن ہر انسان کو اس کے نام سے پکارا جائے گا اور ہر انسان اپنے جائز مرتبے تک پہنچ جائے گا، اس دن ان لوگوں کی کتنی بُری کیفیت ہوگی، جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظرِ التفات نہ فرمائیں گے... اس منظر کی ہولناکی کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم اس معاملے کی ہولناکی کی کچھ جھلک حضرت کعب بن مالکؓ کے واقعے کے تناظر میں دیکھ چکے ہیں، جن کا آپ ﷺ اور اہلِ ایمان نے کچھ عرصے کے لیے مقاطعہ کیا تھا، جس کے نتیجے میں زمین اپنی تمام تر کشادگیوں کے باوجود ان پر تنگ پڑ گئی تھی اور ان کا دم گھٹنے لگا تھا،(307) لیکن یہ لوگ تو اس سزا میں ہمیشہ ہمیشہ مبتلا رہیں گے... یا خدایا... یہ صورتِ حال تو جہنم کے عذاب سے بھی زیادہ ہولناک ہے... ایسے انسان کی سزا کتنی دہشت ناک ہوگی، جس کی طرف ربِ رحیم ایک بار بھی نظرِ التفات نہ فرمائیں گے، یہ کتنا سخت عذاب ہوگا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ انسان جو کچھ بوئے گا وہی کاٹے گا اور اپنے اعمال کا بدلہ پائے گا، نیک کام کرے گا تو اچھا بدلہ، برے کام کرے گا تو برا بدلہ۔

ج: مغفرت سے محرومی

تیسری محرومی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں سے پاک نہ فرمائیں گے۔ انسان کے تزکیے یعنی گناہوں کی میل کچیل سے صفائی کی جگہ دنیا ہے... انسان پر لازم ہے کہ وہ آخرت کے لیے کوچ کرے تو گناہوں سے پاک صاف ہو... چونکہ آخرت میں گناہوں سے صفائی کا ذریعہ صرف دوزخ ہے... اس لیے وہاں اللہ تعالیٰ بھی انہیں گناہوں سے پاک نہ فرمائیں گے۔

انسان کے پاس امتحان کا صرف ایک ہی موقع ہوتا ہے... وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کامیابی و کامرانی حاصل کر سکتا ہے... جو شخص اس فرصت سے نفع اٹھا لیتا ہے وہ فائدے میں رہتا ہے اور جو اسے ضائع کر دیتا ہے وہ ناکام و نامراد ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں۔

جو بیچارہ انسان اپنے دل، ضمیر، روح، احساسات اور تمام خداداد لطائف کو ایسے آلودہ اور زخم زدہ کر دیتا ہے جیسے حضرت ایوب علیہ السلام کا جسم زخمی ہو گیا تھا... وہ قیامت کے دن اپنی حالت زار کو دیکھ کر اپنے آپ سے سوال کرے گا: ''کیا میں اپنے آپ کو پاک کر سکتا ہوں؟'' بسا اوقات اسے امید کی کرن دکھائی دے گی، لیکن اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا تین قسم کے لوگوں کو کبھی پاک نہ فرمائیں گے۔[308]

۲- انجام: دردناک عذاب

ان کا انجام دردناک عذاب ہوگا... وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے، اپنے سامنے المناک عذاب پائیں گے، ایسا عذاب جو دل تک کو جھلسا دے گا اور انسان کے روئیں روئیں میں سرایت کر جائے گا۔ وہ لوگ اچانک اپنے آپ کو عذاب کی وادی کی گہرائی میں گرتا ہوا پائیں گے۔ وہ کون لوگ ہیں، جن کے لیے ایسا خوفناک عذاب منتظر ہے؟ وہ کون لوگ ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ گفتگو فرمائیں گے، نہ ان کی طرف نظر التفات فرمائیں گے اور نہ ہی ان کو پاک فرمائیں گے؟ وہ کون لوگ ہیں، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے؟ حدیث مبارک کا اتنا حصہ پڑھ کر قاری کا تجسس نقطۂ عروج تک پہنچ جاتا ہے اور وہ ان تین قسم کے لوگوں کے بارے میں جاننے کے لیے ہمہ تن گوش بن جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اپنی چادر کو لٹکانے والا'' یہ غرور و تکبر سے کنایہ ہے۔ آپ نے یقیناً تصویروں میں رومیوں اور یونانیوں کو اپنی چادریں اور کپڑے گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہوگا، ان لوگوں سے متعلق بنائی گئی فلموں میں یہ بات زیادہ واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے، تاہم حدیث میں ''چادر کو لٹکانا'' اہم نہیں، بلکہ اسے غرور و تکبر کے لیے بطور کنایہ استعمال کیا گیا ہے اور یہی حدیث کا منشا ہے۔

۳- غرور اور تکبر

متعدد آیات اور احادیث نے غرور و تکبر کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ان بری بیماریوں میں سے ہے، جو انسان کو انجام بد سے دوچار کرتی ہیں۔ اس بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔''[309]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر ہدایت کے راستے بند کر دیتے ہیں، جس کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور و تکبر ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ

سَبِيلًا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴾ (الأعراف: ١٤٦) ''جو لوگ زمین پر ناحق غرور کرتے ہیں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔ اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر راستی کا رستہ دیکھیں تو اسے (اپنا) رستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے رستہ بنا لیں، یہ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غفلت برتتے رہے۔''

غرور آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے، جس دل میں تکبر ہو وہ کائنات میں بکھرے معجزات کو دیکھ پاتا ہے اور نہ ہی ان کا ادراک کر کے انہیں سمجھ سکتا ہے، کیونکہ جب انسان بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے تو خالی بصارت جو محض ادراک کر سکتی ہے، کچھ نفع نہیں دیتی۔

عظمت اور بڑائی صرف خدا تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ یہ حقیقت جس کا روزانہ پانچ مرتبہ میناروں پر سے اعلان ہوتا ہے، کسی اور کی طرف کیسے منسوب ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرماتے ہیں: ''بڑائی میری اوپر کی چادر ہے اور عظمت نیچے کی چادر ہے، جو مجھ سے ان میں سے کوئی ایک بھی چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔''[310] بڑائی، تکبر اور عظمت اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جو حیثیت لباس اور چادر کی انسان کے لیے ہوتی ہے وہی حیثیت تکبر، بڑائی اور عظمت کی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، تاہم ہم ان صفات کی کیفیت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات میں سے کسی ایک میں شراکت داری کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں پھینک کر سزا دیں گے۔ متکبر دل میں ایمان راہ نہیں پا سکتا، دوسرے لفظوں میں غیر اللہ میں مشغول دل میں ایمان بسیرا نہیں کر سکتا۔ متکبر انسان کی یہی کیفیت ہوتی ہے، ایسے ہی شخص کے بارے میں ایک حدیث مبارک میں آیا ہے کہ وہ تکبر سے اپنے کپڑے گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے۔

۴- احسان جتلانے والا

لوگوں کی دوسری قسم احسان جتلانے والوں کی ہے۔ ''منّان'' سے ایسا شخص مراد ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مال واقتدار سے نوازا ہوتا کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محظوظ ہو اور دوسروں پر بھی خرچ کرے، جس کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے ہزار گنا زیادہ اجر و ثواب عطا فرمائیں گے، لیکن وہ شخص غفلت میں مبتلا ہے اور اگر کبھی خرچ کرتا بھی ہے تو جس پر خرچ کرتا ہے اس پر احسان جتلا کر اپنے عمل کو برباد کر دیتا ہے، لیکن اسے یہ خیال نہیں آتا ہے کہ جو مال اس نے خرچ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت

ہے اور جس پر خرچ کیا ہے وہ اللہ کا بندہ ہے... حقیقت میں تو وہ اللہ کا ہی مال خرچ کر رہا ہے، لیکن وہ اسے مال سمجھتے ہوئے احسان جتلانے کی راہ اختیار کرتا ہے۔ یہ کتنی شدید غفلت اور کتنی پستی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے مال واقتدار سے نوازا ہے اور اس مال میں دوسروں کا حصہ بھی مقرر فرمایا ہے، لیکن وہ بخل کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں پر خرچ نہیں کرتا اور اگر انہیں کچھ دیتا ہے تو ان پر احسان بھی جتلاتا ہے۔ کسی پر خرچ کرنے یا اسے صدقہ دینے کے بعد اس پر احسان جتلانے سے تو بہتر تھا کہ وہ اس سے نرم اور اچھے انداز میں گفتگو کر لیتا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ باری ہے: ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى﴾ (البقرة: ۲۶۳) ''جس خیرات دینے کے بعد (لینے والے کو) ایذا دی جائے اس سے تو نرم بات کہہ دینی اور (اس کی بے ادبی سے) درگزر کرنا بہتر ہے۔''

''احسان جتانے والا'' بخیل بھی ہوتا ہے اور بخل ایسی چیز ہے، جو انسان کو اللہ، جنت اور دوسرے لوگوں سے دور کر کے جہنم کے قریب کر دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ بخیل کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ''بخیل اللہ، جنت اور لوگوں سے دور اور دوزخ سے قریب تر ہوتا ہے۔''(311)

۵- مکافاتِ عمل از جنس عمل

اس حدیث مبارک میں بلاغت کے قاعدے ''لف و نشر مرتب'' کی رعایت کی گئی ہے، یعنی ''ولا یکلمهم'' کے مقابلے میں ''المسبل ازاره'' ہے، ''ولا ینظر الیهم'' کے مقابلے میں ''المنان'' ہے اور ''ولا یزکیهم'' کے مقابلے میں ''المنفق سلعته بالحلف الکاذب'' ہے۔ اس موازنے سے ہم درج ذیل نتیجے پر پہنچتے ہیں:

جو احسان جتلانے والا شخص دنیا میں لوگوں کو نگاہِ رحمت سے دیکھتا ہے اور نہ ہی ان کا خیال رکھتا اور اگر انہیں کوئی چیز دیتا ہے تو ان پر احسان جتا کر اپنی اس نیکی کو برباد کر دیتا ہے، وہ آخرت میں اسی جنس کا بدلہ پائے گا اور اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہوئے اسے نظرِ رحمت سے نہ دیکھیں گے۔

جو شخص متکبرانہ چال چلتا ہے، غرور سے اپنی چادر گھسیٹتا ہے اور لوگوں کی طرف گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے، اسے پتا ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے ہرگز گفتگو نہ فرمائیں گے، لہٰذا اسے یہ روش ترک کر کے ایسی خوفناک سزا تک پہنچانے والے راستے کو چھوڑ دینا چاہیے۔

جو شخص دنیوی فائدے کی خاطر جھوٹی قسمیں اٹھا کر اپنا سامان فروخت کرنے کا عادی ہے، اس کا انجام بھی بہت برا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے گناہوں سے پاک نہ فرمائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس منظر کو "المنفق سلعته بالحلف الكاذب" سے تعبیر فرمایا ہے۔ وہ دنیوی نفع کی خاطر اپنے تجارتی لین دین میں جھوٹ بولتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹی قسم کے ذریعے لوگوں کو دھوکا دے سکتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں قسم کے لوگ عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

ہمیں رسول اللہ ﷺ کے جامع کلمات پر غور وفکر کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ کی ہر ہر حدیث پڑھتے وقت اس پر غور وفکر کرنا ہماری ذمہ داری ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی ہر ہر بات آپ ﷺ کی رسالت کی صداقت کی دلیل ہے۔ اللهم صل على سيدنا محمّد بعدد أوراق الأشجار و أمواج البحار وقطرات الأمطار و على آله و صحبه و سلم تسليماً كثيراً۔

م۔ عفت اور زبان کی آفات

امام بخاری، ترمذی اور احمد بن حنبل نے ایک صحیح حدیث روایت کی ہے، جس میں آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''جو شخص مجھے اپنے جبڑوں کے درمیان اور ٹانگوں کے درمیان موجود اعضاء کی ضمانت دے گا میں اسے جنت کی ضمانت دوں گا۔''(312)

یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے، جو بخوبی جانتے ہیں کہ کس چیز کی ضمانت دی جا سکتی ہے اور کس کی نہیں دی جا سکتی، لہٰذا جب آپ ﷺ نے جنت کی ضمانت دی ہے تو یہ پکی ضمانت ہے۔ اس کی تائید بخاری میں حضرت عثمان بن مظعون کی بیوی سے مروی روایت سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نے ان کی وفات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: '' اے ابو السائب! خدا تم پر رحم کرے، میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عزت بخشی۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت بخشی؟'' میں نے عرض کی: '' اے اللہ کے رسول، میرے والد آپ پر قربان، اللہ تعالیٰ کس کو عزت بخشتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جہاں تک ان (عثمان بن مظعون) کا تعلق ہے تو ان کی وفات ہو چکی، بخدا میں ان کے بارے میں اچھی امید رکھتا ہوں، تاہم خدا کی قسم پیغمبر خدا ہونے کے باوجود مجھے علم نہیں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔'' میں نے کہا: '' خدا کی قسم! اس کے بعد میں کبھی کسی کی براءت کی گواہی نہ دوں گی۔''(313)

لہٰذا جب رسول اللہ ﷺ اپنے جبڑوں اور ٹانگوں کے درمیان موجود اعضاء کی ضمانت دینے والے لوگوں کو ضمانت دے رہے ہیں تو آپ ﷺ ایسا اپنے آپ سے نہیں کر رہے، بلکہ ضروری ہے کہ آپ ﷺ یہ بات اللہ تعالیٰ کے بتانے سے کہہ رہے ہوں، کیونکہ آپ ﷺ نے کبھی خواہشِ نفس سے

گفتگو فرمائی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زبان مبارک پر کبھی ایسی بات جاری فرمائی، بلکہ ہمیشہ آپ ﷺ کو اس سے محفوظ رکھا، لہٰذا آپ ﷺ کی باتیں ہمیشہ حق اور سچ ہوتی ہیں اور مقررہ وقت پر من وعن پوری ہوتی ہیں، چنانچہ اگر تم اپنی زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کرو گے اور پاکیزہ زندگی گزارو گے تو میں بغیر کسی تردد کے کہتا ہوں کہ اگر قیامت کے دن جہنم کے فرشتوں نے تمہیں پکڑ کر جہنم کی طرف لے جانا بھی چاہا تو تم پوری قوت سے پکار کر کہہ سکو گے کہ اللہ کے رسول ﷺ میرے ضامن اور کفیل ہیں، یہ کہتے ہی رسول اللہ ﷺ کی شفاعت آپہنچے گی اور تمہیں بچا کر لے جائے گی۔

۱- گفتگو کی صلاحیت ایک عظیم نعمت

زبان انسان کا اہم ترین حصہ ہے، چونکہ یہ بیان کی نعمت کا مظہر ہے، اس لیے اس کی بڑی قدرو منزلت ہے، لیکن اگر اس مبارک حصے کو غلط استعمال کیا جائے تو یہ انتہائی فساد و نقصان کا باعث بن کر انسان کو تباہی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اسی زبان سے انسان اپنے پروردگار کی تسبیح کرتا ہے، نیکی کا حکم کرتا ہے، برائی سے روکتا ہے، کتابِ فطرت کے ازلی ترجمان قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہے، دوسروں کے سامنے اس کے معانی کی وضاحت کرتا ہے اور بعض اوقات بے دین لوگوں کی دین اسلام کی طرف ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے، جو نیلی چھت کے نیچے موجود ہر چیز سے بہتر عمل ہے، جس کے نتیجے میں انسان أعلیٰ علّیین کا مستحق ٹھہرتا ہے، لیکن یہی زبان انسان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتی ہے، زبان ہی ہر قسم کے کفر اور گمراہی کا ذریعہ ہے، جو لوگ خدا اور اس کے رسول پر سب وشتم کرتے ہیں وہ ایسا برا اور قابلِ نفرت کام اپنی زبانوں سے ہی کرتے ہیں، نیز جھوٹ، غیبت اور بہتان طرازی بھی زبان سے ہی ہوتی ہے، زبان ہی کی بدولت انسان جھوٹ کے اس گڑھے میں جا گرتا ہے، جس میں مسیلمہ کذاب گرا تھا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لفظ کے ذریعے ایک عضو کے بارے میں متنبہ فرمایا اور اس ایک نکتے میں وہ تمام معانی جو ہم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیے ہیں اور ان کے علاوہ سینکڑوں دیگر مطالب کو سمو دیا، گویا رسول اللہ ﷺ ہم سے فرما رہے ہیں: ''اپنی زبانوں کو خیر کے کاموں میں استعمال کرو تاکہ میں تمہیں جنت میں داخلے کی ضمانت دے سکوں۔'' آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ زبان پر تالے لگا کر کسی خانقاہ میں بیٹھ جاؤ، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اسے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں استعمال کرو۔

۲- گفتگو کا ایک ادب

رسول اللہ ﷺ نے شرمگاہ کا صراحتاً ذکر کرنے کی بجائے "مابین رجلیه" (جو اس کی ٹانگوں کے درمیان ہے) کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ یہ اسلوب آپ ﷺ کے اعلیٰ ترین آداب کا مظہر ہے۔ آپ ﷺ فطری اور طبعی امور کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بھی ان آداب کا لحاظ رکھتے اور جب نفس پر شاق گزرنے والے موضوعات پر گفتگو فرماتے تو ان کی ایسی تصویر کشی فرماتے کہ وہ دلفریب مناظر کی طرح دکھائی دیتے۔ آپ ﷺ کی ذات اقدس تمام اعلیٰ اخلاق، اچھی عادات اور لازوال حسن وجمال کی آئینہ دار تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ ایک ایسے عضو جس کے ذکر پر لوگ شرم محسوس کرتے ہیں، کی طرف "مابین رجلیه" (جو اس کی ٹانگوں کے درمیان ہے) کے خوبصورت اسلوب میں اشارہ فرماتے ہیں۔ یقیناً صاحب جمال انسان کی گفتگو بھی حسن و جمال کا مرقع ہوتی ہے۔

۳- مابین رجلیه

ٹانگوں کے درمیان واقع عضو بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ممنوع پھل کھانے کے بعد جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے اخراج کا یہی باعث بنا تھا۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے اخراج سے متعلق آیات کی وضاحت ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لیے یہاں ہم اس پر گفتگو نہیں کریں گے، تاہم ہم ٹانگوں کے درمیان واقع عضو کی اہمیت کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔ اس عضو پر انسانی نسل کی بقا اور نسب کی حفاظت کا مدار ہے، جبکہ زنا اور فواحش نسل انسانی کی بربادی کا ذریعہ ہیں، کیونکہ اس عضو کے غلط استعمال اور ایسے تمام امور کی عدم رعایت کی وجہ سے انساب خلط ملط ہو جاتے ہیں، جن کی حفاظت قانونی اداروں کی ذمہ داری ہے۔

کون کس کا باپ ہے؟ کون کس کا وارث ہے؟ کون اپنے حق کا کس سے مطالبہ کرے گا؟ خاندان اور قوم کی حفاظت کیسے ہوگی؟ اس قسم کے تمام سوالات کا تعلق شرمگاہ کی عفت کے ساتھ ہے۔ پاکباز افراد اور ان سے تشکیل پانے والے معاشرے اپنے اندرونی ڈھانچے کو قیامت تک محفوظ رکھ سکتے ہیں، لیکن زنا اور فواحش کے جوہڑ میں گرے ہوئے افراد اور معاشرے اپنے وجود کو ایک نسل سے زائد عرصے تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔ دوسرے مواقع کی طرح یہاں بھی حلال کا دائرہ کافی وسیع ہے، جو انسانی ضروریات کے لیے بالکل کافی ہے، لہٰذا حرام کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حلال کے دائرے میں رہتے ہوئے انسان اپنی خواہش کو مکمل طور پر پورا کر سکتا ہے، اسی

لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "نکاح کرو تاکہ تمہاری تعداد زیادہ ہو، کیونکہ میں تمہارے ذریعے دیگر امتوں پر فخر کروں گا۔"(314)

رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے ذریعے دیگر امتوں پر فخر فرمائیں گے۔ آپ ﷺ کی امت کی تعداد اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کے مقابلے میں دیگر امتوں کی کوئی حیثیت نہ رہے گی، آپ ﷺ کی امت میں اس قدر اضافے کا تعلق بھی شرمگاہ کے ساتھ ہے۔ صاحب نسب اور بغیر نسب کے لوگوں میں اس طرح فرق ظاہر ہو جائے گا، لہٰذا انسان کی شرمگاہ ایک ایسی زرخیز کھیتی ہے، جس سے یہ دو متضاد چیزیں جنم لیتی ہیں۔

جب انسان حلال طریقے سے جنسی خواہش پوری کرتا ہے تو اسے واجب کی ادائیگی کا ثواب ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے صحابہ کرام کے سامنے یہ بات بیان فرمائی تو انہوں نے حیرت سے پوچھا: "یہ کیسے ممکن ہے؟" اس پر آپ ﷺ نے مسکرا کر ارشاد فرمایا: "اگر وہ اپنی خواہش حرام طریقے سے پوری کرتا تو کیا اسے گناہ نہ ملتا؟ لہٰذا جب اس نے اسے حلال طریقے سے پورا کیا تو اسے ثواب بھی ملے گا۔"(315) اس کی وجہ یہ ہے کہ حرام سے اجتناب واجب ہے، لہٰذا عورت سے حلال طریقے سے صحبت کرنے پر انسان کو واجب کی ادائیگی کا ثواب ملے گا۔

یہ ایک ایسی بات ہے، جسے اختیار کرنے سے بعض لوگ شرماتے ہیں، حالانکہ اس راستے پر انبیائے کرام بھی چلے ہیں۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام اس خواہش سے محروم ہوتے تو فخر کائنات حضرت محمد ﷺ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اس ممنوعہ پھل کا اصل مقصد نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری ہی تھی۔ میں نے ایک پرجوش واعظ کو یہاں تک کہتے سنا ہے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو اس ممنوعہ پھل کی طرف ہاتھ بڑھانے اور محمد ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کے درمیان موجود تعلق کا علم ہوتا تو وہ اس کی طرف صرف ہاتھ بڑھانے پر اکتفا نہ فرماتے، بلکہ اس درخت کو جڑوں سمیت اکھیڑ دیتے۔"

۴- عمودی ولایت

میں یہاں آپ کی توجہ ایک انتہائی اہم موضوع کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو جنت کی ضمانت دی ہے، جو اپنے جبڑوں اور ٹانگوں کے درمیان واقع اعضاء کی حفاظت کی ضمانت دیں گے۔ ہمیں ان لوگوں کا مقام معلوم ہے، جنہیں

آپ ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے، لہٰذا ان لوگوں کے علاوہ بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے قرب و مرتبے کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔ان کا جنت میں داخل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جبڑوں اور ٹانگوں کے درمیان واقع اعضاء کی ضمانت دینا آسان نہیں، بلکہ انتہائی مشکل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شہوت انسان کے پورے جسم پر کنٹرول کر کے نفس کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے، روح کو جھنجھوڑتی ہے اور ارادے میں سرایت کر کے اسے کمزور کر دیتی ہے تو آدمی کا نفس ہر قسم کی برائیوں کے لیے آسان شکار بن جاتا ہے۔ایسے وقت میں محض اللہ کے خوف سے اور اس کی خوشنودی کے لیے نفس کو قابو کرنا اس قدر اہم ہوتا ہے کہ اس کے نتیجے میں انسان کو عمودی رفعت حاصل ہوتی ہے، جسے یہ مقام حاصل ہو جائے وہ بلاشبہ جنت میں داخلے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ضمانت کا استحقاق رکھتا ہے۔

میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ جو شخص اپنے نفس کے سرکش گھوڑے کو لگام دے سکتا ہے، اسے قابو کر کے گناہوں کی دلدل میں گھسنے سے روک سکتا ہے اور غیر متناہی صبر کے ذریعے ہمیشہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اسے بعض اوقات ایک لمحے میں ایسے فیوض و برکات حاصل ہو جاتے ہیں جو ایسے شخص کو حاصل نہیں ہوتے، جس نے اپنی عمر کے کئی سال خانقاہ میں گزار دیئے ہوں یا وہ ہر شب سینکڑوں رکعات نمازیں پڑھتا ہو، بعض اوقات تو وہ اتنے بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ ولایت کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے۔کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہم نفل نمازوں اور روزوں کی اہمیت گھٹا رہے ہیں۔نوافل قربِ الٰہی کا اہم ذریعہ ہیں اور رہیں گے۔ ہمارا مقصود تو صرف ایک اور وسیلے کے بارے میں بتانا ہے، جو کمالات تک پہنچنے میں انسان کا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ہم فرض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں پانچ یا دس آدمیوں کی قوت پیدا کر دی اور انسانی کمال کی معراج تک پہنچنے کے تمام لوازمات بھی مہیا کر دیئے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں گناہ تک پہنچانے والی ہر چیز سے محفوظ رکھا... لیکن اہم بات یہ ہے کہ انسانی فطرت میں گناہ کے محرکات کے پائے جانے کے باوجود انسان اپنے نفس پر کنٹرول رکھے۔ایک ضرب المثل ہے: "بحسب المغرم المغنم" "خطرے کی بقدر ہی نفع ہوتا ہے۔" یعنی جتنی مشقت ہوگی اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا، اسی طرح خطرات کی بقدر ہی رفعت اور سرفرازی ملتی ہے، لہٰذا جس قدر پر خطر ماحول میں آپ کام کریں گے اور جس قدر خطرناک شعبوں میں آپ ذمہ داری اٹھائیں گے اسی قدر آپ کے بدلے میں بھی اضافہ ہوگا۔

اس کی کچھ مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ نے آپ کی فطرت میں بعض نقصان دہ صفات ودیعت کی ہیں، مثلاً غصہ، حسد، نفرت اور شہوت وغیرہ... لیکن اگر یہ مضر صفات کسی بھی وقت آپ پر تسلط قائم نہ کرسکیں، بلکہ اس کے برعکس آپ اپنے مضبوط ارادے کے ذریعے ان پر غالب رہے اور بجائے اس کے کہ پرکشش اور جہنم کی طرف دعوت دینے والے چمکدار مظاہر آپ کا شکار کرتے آپ ایک پرعزم اور صاحب دل انسان کی طرح ضمیر اور روح کے راستے پر چلتے ہوئے فرائض اور سنتیں ادا کرتے رہے اور جنت کے راستے کی مشکلات برداشت کرتے رہے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا حشر انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مسلم جماعت پر رسول اللہ ﷺ کی نگاہ کرم اسی وجہ سے ہے کہ یہ اسلام کے نشاۃ ثانیہ کی نمائندگی کرتی ہے اور ایسے پرفتن دور میں اسلام کا دامن تھامے ہوئے ہے، جس میں بازار، سڑکیں، میدان اور دیگر تمام معاشرتی مظاہر فتنوں سے اٹے ہوئے ہیں اور انسانوں کو نگل کر اپنے آپ میں جذب کرلیتے ہیں، لہٰذا جو شخص ہمت کرکے ایسے معاشرے میں جذب ہونے سے انکار کردے گا اور اپنی شخصیت اور شناخت کو برقرار رکھے گا وہ قیامت کے دن بجا طور پر صحابہ کرام کی معیت کا مستحق ہوگا۔ صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے رفقاء اور دوست ہیں، جبکہ ایسے لوگ آپ ﷺ کے بھائی ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سے صدیوں بعد آنے والے ان اہل ایمان کو چاہا تھا اور ان کے لیے اپنی محبت، سلام اور دعا بھجوائی تھی۔[316]

رسول اللہ ﷺ ہر زمانے کے انسان اور خاص طور پر دورِ حاضر کے انسان کو مخاطب کرکے فرما رہے ہیں: ''جو شخص مجھے اپنے جبڑوں اور ٹانگوں کے درمیان واقع عضو کی حفاظت کی ضمانت دے گا میں اسے جنت کی ضمانت دوں گا۔'' یہ ارشاد جنت اور رسول اللہ ﷺ کی ملاقات کا شدید اشتیاق رکھنے والوں سے ہے۔ ان شاء اللہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی بشارت کے مناسب اور شایاں ردعمل کا اظہار کرکے کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ مختصر اور بلیغ ترین انداز میں جنت کے راستوں کی نشان دہی فرماتے ہیں اور مثالی فرد اور معاشرے کو لائحہ عمل تیار کرکے دیتے ہیں۔ اتنے عظیم حقائق کو اتنے مختصر الفاظ میں بیان کرنا رسول اللہ ﷺ کی اعلیٰ ترین فراست کی دلیل ہے۔ آپ ﷺ بلاشبہ شہنشاہِ کلام تھے اور آپ ﷺ کا سارا کلام جوامع الکلم پر مشتمل تھا۔

گناہوں کو معاف کرو:

درجات کو بلند کرنے والے اعمال:

ایک اور حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''کیا میں تمہیں ایسے اعمال کے بارے میں نہ بتاؤں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف اور درجات کو بلند فرماتے ہیں؟'' صحابہ کرام نے فرمایا: ''کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ ضرور بتائیے۔'' اس پر آپ نے فرمایا: ''دل نہ چاہتے ہوئے وضو کرنا، کثرت سے مسجدوں کی طرف قدم اٹھانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے لیے انتظار کرنا، یہ خدا کے راستے میں پہرا دینا ہے، یہ خدا کے راستے میں پہرہ دینا ہے، یہ خدا کے راستے میں پہرہ دینا ہے۔''(317)

آیئے حسب استطاعت اس حدیث مبارک کے قیمتی جواہرات جیسے معانی و مطالب پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ ان راستوں کی نشاندہی فرما رہے ہیں، جو انسان کو جہنم کی وادیوں میں پہنچانے والے گناہوں سے بچاتے ہیں۔

چونکہ حدیث مبارک میں ذکر ہونے والے امور توجہ اور بیداری کے متقاضی ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے سامعین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنی گفتگو کا آغاز لفظ ''الا'' کے ذریعے فرمایا۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں، جنہیں انسان نیند کی حالت میں بھی سرانجام دے سکتا ہے، مثلاً انسان سوئے ہوئے ہونے کی وجہ سے زنا یا غیبت کے ارتکاب سے بچ جاتا ہے، لیکن چونکہ جن امور کا ذکر حدیث مبارک میں آنے والا ہے، وہ بیداری کے متقاضی ہیں اور انہیں صرف بیدار لوگ ہی سرانجام دے سکتے ہیں اس لیے حدیث مبارک کے آغاز میں لفظ ''الا'' لایا گیا ہے۔

لفظ ''الخطایا'' بھی سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے، کیونکہ ہر انسان خطا کار ہے اور جو شخص اپنے آپ کو خطا کار نہیں سمجھتا وہ سب سے بڑھ کر خطا کار ہے۔ عصمت اور گناہوں سے حفاظت صرف انبیائے کرام کی خصوصیت ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک اور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: ''آدم کی ساری اولاد خطا کار ہے، تاہم بہترین خطا کار وہ لوگ ہیں جو کثرت سے توبہ کرتے ہیں۔''(318) لیکن رسول اللہ ﷺ دوزخ کی وادیوں تک پہنچانے والے گناہوں سے بچنے کے طریقوں کی طرف انسان کی راہنمائی کرنا چاہتے ہیں۔

صرف گناہوں سے بچنا ہی کافی نہیں، کیونکہ اعلیٰ درجات کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا بھی

انسان کی ذمہ داری ہے، اگرچہ گناہوں کی معافی بھی فی نفسہ کسی قدر بلندی تصور کی جاسکتی ہے، تاہم اگراس کے ساتھ کچھ نیک اعمال بھی شامل ہوجائیں تو بعض اوقات انسان اعلیٰ درجات تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح کے مثبت اعمال کے ذریعے انسان ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور میری رائے میں معرفت الٰہیہ کی منزل طے کرنے کا یہی مطلب ہے۔ ان اعمال میں سے سب سے پہلا عمل دل نہ چاہنے کے باوجود تمام ارکان اور سنتوں کی رعایت کرتے ہوئے مکمل طور پر وضو کرنا ہے۔ سردی اور ٹھنڈک میں بھی وضو کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات تو وضو کرنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا عمل مسجد کے راستوں پر چلتے چلتے عمر گزارنا ہے۔ ایسی عمر اس بیج کی مانند ہے، جو آخرت میں ایسے بلند و بالا درخت میں تبدیل ہوجائے گا، جو جنت کے پھلوں سے لدا ہوگا۔ اس دوسرے عمل میں دو کام شامل ہیں ایک دور فاصلے پر واقع مسجدوں کی طرف چلنا اور دوسرے کبھی مساجد سے تعلق نہ توڑنا۔

۱- نماز ایک عظیم مقصد

تیسرا عمل ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے شوق میں انتظار کرنا ہے، جیسا کہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مسجد کے ساتھ قلبی تعلق مراد ہے،(319) نماز روح کا چین اور دل کا سکون ہے۔ ہر انسان کو کسی نہ کسی چیز میں شدید رغبت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شدید رغبت نماز میں تھی۔(320) اسی لیے آپ ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتے تھے: ''بلال! ہمیں نماز کے ذریعے راحت پہنچاؤ۔''(321) ایک دوسری حدیث میں بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے: ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''(322) میری رائے میں جنت میں داخل ہوتے وقت شوق کے جن جذبات سے ہمارے دل معمور ہوں گے، آپ ﷺ وہ جذبات ہر نماز میں محسوس فرماتے ہوں گے، اسی لیے آپ ﷺ ہر نماز کے بعد دوسری نماز کا شدت سے انتظار فرماتے۔

اگرچہ اس حدیث میں تین امور کا ذکر ہے، لیکن اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھیں تو تینوں امور ایک ہی محور کے گرد گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور وہ محور نماز ہے۔ نماز انسانی زندگی کا ایک انتہائی اہم محرک ہے۔ نماز مؤمن کی معراج ہے۔ معرفت کے مراتب کو طے کرتی ہوئی نماز انسان کو انسانی حقائق کی طرف سب سے بہتر انداز میں توجہ دلاتی ہے۔ نماز دین کا ستون ہے۔(323) نماز دین کی کشتی کو چلاتی ہے۔ اگر نماز نہ ہوتی تو دین زیادہ عرصے تک باقی نہ رہ سکتا۔ چونکہ نماز کا مقصد تنبیہ کرنا ہے، اس لیے نماز کو ایسے طریقے سے ادا کرنا چاہیے کہ اس سے یہ مقصد حاصل ہوجائے۔ انسان کو چاہیے کہ نماز ادا کرتے ہوئے اپنے دل کو دنیوی خیالات اور مشاغل سے خالی کردے، اسی لیے ایسے شخص کی

نماز قبول نہیں ہوتی جسے قضائے حاجت کا تقاضا ہو رہا ہو۔[324] لہذا جب انسان کا ذہن دنیوی امور میں مشغول ہو اس وقت نماز نہ شروع کرے، کیونکہ اس وقت اس کا ذہن دو چیزوں میں مشغول ہوگا اور ایسی صورتِ حال میں عموماً کام صحیح نہیں ہو پاتے، نیز ایسی حالت میں نماز کی ادائیگی نماز کی اہانت بھی ہے، کیونکہ نماز کوئی ایسا معمولی کام نہیں ہے کہ اسے جیسے بھی ہو ادا کر دیا جائے، نماز تو ہماری زندگی کو منور کرنے کے لیے ہے، اس لیے اسے جلد بازی سے ادا کرنا ٹھیک نہیں۔

۲۔ نماز کی تیاری

حضورِ قلب کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے لیے جو اقدامات کیے جائیں گے وہ انسان کے لیے باعث ثواب ہوں گے، اس حیثیت سے وہ نماز کے حکم میں ہی ہیں، لہذا انسان پر لازم ہے کہ عبادت میں مشغول ہونے سے پہلے دل سے تمام مصروفیات کا خیال نکال دے، صرف عبادت کی طرف دھیان رکھے اور دیگر تمام مشاغل اور خیالات سے نجات حاصل کر لے۔ ایسی صورت میں نماز کی تیاری کے دوران بھی انسان کو نماز ہی کا ثواب ملتا رہے گا، کیونکہ اس کی نیت اطمینان اور حضورِ قلب کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے ساتھ مربوط ہے اور مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے،[325] کیا یہ بات باعث تعجب نہیں کہ دوسرے لوگ جب قضائے حاجت کے لیے جاتے ہیں تو وہ صرف ایک طبعی ضرورت پوری کر رہے ہوتے ہیں، لیکن مؤمن جب وضو اور نماز کی تیاری کی غرض سے بیت الخلاء میں جاتا ہے تو اپنی طبعی ضرورت پوری کرتے وقت اسے اجر بھی مل رہا ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ نماز کی ادائیگی کے لیے قضائے حاجت اور وضو کرنا انسان کو روحانی طور پر نماز کے لیے تیار کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وضو کے ذریعے نماز کی تیاری کی کچھ بھی توجیہ کی جائے مثلاً یہ کہ وضو اعضاء کو دھونے اور ملنے کے دوران جسم میں توانائی پیدا کرتا ہے۔ اس سے نتیجے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وضو کے دوران انسان کے دل میں اس قسم کی حکمتوں یا توجیہات کا خیال نہیں آتا، بلکہ اس کا دھیان تو صرف نماز کی طرف لگا رہتا ہے، جس کے لیے وہ وضو کر رہا ہوتا ہے۔ وضو کی تیاری نماز کے لیے تنبیہ ہوتی ہے۔ وضو دوسری اور اذان تیسری تنبیہ ہے۔ وضو کے دوران اور اختتام پر وضو کے پانی میں سے کچھ پینا اور بعض دعائیں پڑھنا مسنون عمل ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو عالم ماوراء کی طرف لے جاتی ہیں اور اگر اس کے بعد سنتیں بھی پڑھ لی جائیں تو انسان فرض نماز کے لیے بالکل تیار ہو جاتا ہے۔

نماز کے ماحول میں ہر چیز ہمیں نماز کا دھیان دلاتی ہے، جس کا آغاز میناروں پر سے گونجے والی اذان سے ہوتا ہے، جو ہمارے دلوں کو چھو کر انہیں خدائی عظمت کا احساس دلاتی ہے، چنانچہ ہم اذان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں۔ جب اذان ختم ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے، گویا ہمارا قلب وجگر بھی اس کے ساتھ پگھل گیا ہے، پھر ہم مسجد پہنچتے ہیں اور نوافل ادا کرتے ہیں، ان کی حیثیت فرض نماز کے دروازے کی سی ہے، کیونکہ ہم میں سے ہر ایک نفل نماز میں اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گویا اللہ سے یہ التجا کررہا ہوتا ہے کہ اے میرے پروردگار! میں صرف آپ ہی کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں، جس کی مجھے جستجو ہے اس کے سامنے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ آپ کو دیکھنا اور سننا چاہتا ہوں اور صرف آپ ہی کی معیت میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں، کیونکہ آپ کے سوا کسی کو دیکھنا، آپ کے غیر کا مشاہدہ کرنا اور آپ کے سوا کسی اور چیز میں مشغول ہونا بے فائدہ کام اور سعی لاحاصل ہے، میں ان بے فائدہ کاموں سے کنارہ کش ہو کر اہم اور مفید امور کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔

اس طرح نفل نماز پورے ادراک اور توجہ کے ساتھ فرض نماز کی تیاری اور درِ خداوندی کے قریب پہنچنے کا اہم ذریعہ بن جاتی ہے۔ وضو اور اذان اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ تیسرا مرحلہ نفل نماز کا ہوتا ہے۔ اسی دوران مؤذن قبلہ رخ کھڑے ہو کر خوبصورت آواز میں اقامت کہنا شروع کرتا ہے۔ اس وقت رقت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ احساسات وجذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ اگر اس وقت بھی جذبات نہ ابھریں، اللہ تعالیٰ کا پورا دھیان نصیب نہ ہو اور انسان اپنے محراب کی طرف متوجہ نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں نقص رہ گیا ہے۔ جب مؤذن اقامت مکمل کرتا ہے تو وہ انسان کو اللہ سے دور کرنے والی ہر چیز پر آخری ضرب لگا دیتا ہے اور انسان ایسے ماحول میں ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے نماز میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ رکوع اور سجدے میں آتے جاتے اس بات کو بار بار دہراتا ہے اور ہر رکوع اور سجدے میں عظمت خداوندی کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اے میرے پروردگار! آپ عظمت وکبریائی کے مالک ہیں اور میں ایک عاجز وناتواں بندہ ہوں۔'' یعنی انسان اپنے پروردگار کے سامنے اپنی عبودیت اور کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے اور اس طرح نماز کی حقیقت وروح کو پالیتا ہے۔

بالآخر انسان نماز میں قربِ الٰہی کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے حضور ''تحیہ'' پیش کرتا ہے۔ یہ وہی تحیہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے شب معراج کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش فرمایا تھا۔

۳۔ گناہوں کی مغفرت

حدیث مبارک میں گناہوں کی مغفرت کو "یمحو اللہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، "یمحو" کا لفظ کسی لکھی ہوئی چیز کو مٹانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ خطایا گناہ انسان کی فطرت میں ایک بیج کی صورت میں موجود ہے۔ انسان کے اختیار میں ہے چاہے تو اس کی آبیاری کر کے اس کی نشو ونما کرے اور چاہے تو اسے پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہ دے۔ جب انسان رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی پیروی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹا کر اس کی برائی کی صلاحیت کو بھلائی کی صلاحیت میں تبدیل فرما دیتے ہیں، چنانچہ آیت مبارکہ ﴿يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ (الرعد: ۳۹) "خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔" اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ انسان میں گناہ کا ارتکاب کرنے کی صلاحیت موجود ہے، کیونکہ یہ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ جسے اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انسان کا انتہائی اہم وصف ہے، اسی لیے تزکیہ نفس کا اہتمام ہر انسان کا نصب العین ہونا چاہیے۔

ہر انسان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے اور بعض اوقات تو اس کی ساری زندگی گمراہی میں گزر جاتی ہے، تاہم اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے انہیں مٹانے اور بھلائی کے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کا موقع انسان کو ہر دم میسر ہوتا ہے۔ اس مقصد کو پانے کا ایک طریقہ مشکل حالات میں وضو کرنا ہے، دوسرا طریقہ ذوق وشوق سے مسجد کی طرف جانا، مسجد میں دل لگانا اور دوبارہ واپس آنے کی نیت سے مسجد سے نکلنا ہے اور تیسرا طریقہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہنا ہے۔ ان طریقوں سے ایک طرف انسان کے گناہ مٹتے ہیں تو دوسری طرف انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔

۴۔ الرباط

رسول اللہ ﷺ نے ان اعمال کو "رباط" کے لفظ سے تعبیر فرما کر اسے تین بار ذکر فرمایا ہے۔ رباط کا لفظ جس طرح ہر قسم کے مادی وروحانی فیض وبرکت کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح اس کا اطلاق ہر قسم کے مصائب وآلام سے خبردار اور متنبہ کرنے پر بھی ہوتا ہے، نیز اس کا اطلاق انسان کے اپنے آپ کو کسی کام سے وابستہ کرنے یا اس کے لیے وقف کرنے پر بھی ہوتا ہے، اسی لیے اس سپاہی کو مرابط کہتے ہیں، جو پرخطر مقامات پر پہرہ داری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے۔

آیت مبارکہ ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران: ۲۰۰) ''اے اہل ایمان (کفار کے مقابلے میں) ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور (مورچوں پر) جمے رہو اور خدا سے ڈرو تاکہ مراد حاصل کرو۔'' ایک دوسری آیت ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾ (الأنفال: ۶۰) ''اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو۔'' میں رباط کے مفہوم کا ایک اور پہلو مراد ہے۔ چونکہ رباط کا مطلب انسان کا اپنے آپ کو کسی کام کا پابند بنانا اور اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا ہے اور حدیث مبارک میں ذکر کردہ کام وضو کرنا، صبح و شام گھر اور مسجد کے درمیان آمد و رفت جاری رکھنا اور کسی بھی جگہ کسی بھی کام میں دل مسجد سے اٹکائے رکھنا ہیں، اس لیے ان کاموں پر عمل پیرا ہونے کا مطلب اپنے آپ کو خدا کے لیے وقف کر دینا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اس کلام میں ''صنعت جناس'' پائی جاتی ہے، کیونکہ آپ ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں کہ رباط کا اصل اطلاق سپاہیوں کے اپنے آپ کو سرحدی چوکیوں پر اپنے ملک کا دشمن سے دفاع کرنے کے لیے وقف کر دینے پر ہوتا ہے، لیکن جس طرح دشمن کے داخل ہونے کی ممکنہ جگہوں پر دشمن کے خلاف تیار رہنا اور فوج جمع رکھنا رباط ہے، اسی طرح انسان اور اس کے دشمنوں یعنی نفس و شیطان کے درمیان بھی ایک معرکہ جاری رہتا ہے اور بعض پہلوؤں سے یہ جہاد اس جہاد سے بڑا جہاد سمجھا جاتا ہے۔ انسان دونوں جہادوں کے قیام کا مکلّف ہے۔ ان میں سے ایک ''جہادِ اصغر'' اور دوسرا ''جہادِ اکبر'' ہے۔ جب انسان میدانِ جنگ میں دشمنوں سے برسرِ پیکار ہوتا ہے تو اسے اپنی خواہشاتِ نفس کے بارے میں غور و فکر کی فرصت نہیں ملتی، اس لیے اس بات کا معمولی سا احتمال موجود ہوتا ہے کہ ایسا انسان کہیں جسم کی خواہشات کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تو اس کا نفس جہاد کی فکر میں مصروف و مشغول ہے، لیکن جونہی وہ آرام کرنے یا سستانے لگتا ہے تو خواہشات اس کے نفس پر حملے کرنے لگتی ہیں اور اس بات کا احتمال بڑھ جاتا ہے کہ کہیں وہ اس کی روح کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لیں، اس لیے اس پر اپنے نفس کی نگرانی اور حفاظت ضروری ہے۔ یہ بھی جہاد ہے، جس کا مؤثر ترین اسلحہ نماز ہے۔ جہاد کبھی فرض عین ہوتا ہے اور کبھی فرض کفایہ۔ اس پہلو سے خارجی جہاد اور باطنی جہاد میں مماثلت پائی جاتی ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ایک معرکے سے لوٹتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔[326]

اگر انسان کا دل مسجد میں اٹکا رہے یعنی وہ نماز میں مشغول رہے یا نبوی فہم کے مطابق اسے نماز کے ساتھ ایسا عشق و محبت ہو جائے کہ نماز اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے تو اس کا یہ عمل جنگی سرحد پر پہرہ دینے والے کے عمل کے مساوی ہوگا۔ اس حدیث مبارک سے متعلق ہماری معروضات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اس حدیث مبارک میں تین اعمال کا ذکر ہے، جن میں سے دو کا تعلق ''فعل'' اور ایک کا تعلق نیت کے ساتھ ہے، گویا یہ اعمال انسان کی فکر اور احساسات کو بھی اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں، اس لیے عمدہ اور خوشخبری کے حامل قاعدے ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (ھود: ۱۱٤) ''کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔'' کے تحت یہ اعمال جہاں انسان کو ماضی کے گناہوں سے پاک کرتے ہیں، وہیں اسے عبادت کے شوق، تعلق مع اللہ اور اچھی نیت کے ذریعے مستقبل کے گناہوں اور معاصی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں:

اول: جب موسمی حالات کی بنا پر وضو کرنا آسان نہ ہو مثلاً موسم بہت سرد ہو اور پانی انتہائی ٹھنڈا یا پانی بآسانی میسر نہ ہو یا اتنا کم ہو کہ عام لوگوں پر اسے وضو کے لیے استعمال کرنا گراں گزرے (یقیناً اضطرار اور زندگی کی بقا سے متعلق حالات اس سے مستثنیٰ ہیں۔) تو ایسے مشکل حالات میں انسان کا وضو کرنا اس کے اخلاص کی گہرائی، تعلق مع اللہ کی مضبوطی، اجر و ثواب کی شدید رغبت اور مشکل ترین حالات میں بھی وظیفۂ بندگی سرانجام دینے کے شوق و اشتیاق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان تمام امور میں امر مشترک تعلق مع اللہ ہے۔ ایسے مشکل حالات میں اگر ایسے دلوں کو بعض گناہ چھو بھی لیں تو وہ ان میں ٹھہر نہیں سکتے۔ وضو سے متعلق دیگر موضوعات مثلاً توانائی کے توازن کو برقرار رکھنا، نفسیاتی کسل پر قابو پانے میں انسان کا معاون ثابت ہونا یا انسان کو روحانی اعتبار سے دن میں پانچ مرتبہ جدّت و نشاط بخشنا وغیرہ کو تسلیم کرنے کے باوجود موضوع سے خارج ہونے کی وجہ سے ہم اس مقام پر زیر بحث نہیں لائیں گے۔

دوم: نماز ایک قسم کی معراج ہے۔ مساجد کی طرف متوجہ ہونے کی عادت دراصل توجہ الی اللہ ہے۔ اس میں بدن کی ورزش اور جسم کے نشاط و تازگی کی حفاظت ہے۔ اس سے روح میں عقل کے ادراک سے ماوراء جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ دل کو نماز سے پہلے ہی نماز کا ماحول مل جاتا ہے۔ وہ خدا کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے ضروری توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس راستے پر چلنے کو رسول اللہ ﷺ نے ''قدموں کی کثرت'' سے تعبیر کیا ہے۔ جو شخص اس راستے پر چلتا ہے وہ اپنے سابقہ نامۂ سیاہ کو ندامت

کے سچے جذبات اور آنسوؤں سے دھو کر خالص نامۂ سفید میں تبدیل کر دیتا ہے اور درستی کے ایسے حلقے میں داخل ہوتا ہے، جس میں ایک بھلائی دوسری بھلائی کا وسیلہ بنتی رہتی ہے، جو شخص اس حلقے میں سیاحت کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنے ماضی کے اعتبار سے اس آیت مبارکہ ﴿لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ﴾ (الفتح: ۲) ''تا کہ خدا تمہارے اگلے گناہ بخش دے'' کا مظہر ہوتا ہے، جو وفا کا آئینہ دار ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنے ارشاد ﴿وَمَا تَأَخَّرَ﴾ ''اور پچھلے گناہ بھی بخش دے'' کے ذریعے مستقبل کے اعتبار سے مضبوط قلعے میں داخل فرماتے ہیں۔ آنکھیں اس سیاحت کی ہر منزل پر ''یمحو اللہ بہ الخطایا'' کی طرف لگی رہتی ہیں اور دل ''ویرفع بہ الدرجات'' کے مشتاق رہتے ہیں۔

سوم: انسان کا شوق و اشتیاق کے ساتھ نماز کے اوقات کا انتظار کرنا عاشق کے شوقِ وصال سے مشابہت رکھتا ہے۔ زندگی کی سرگرمیوں کو نماز کے اوقات کے مطابق ترتیب دینا زمانے کا ایک ایسا تصور ہے، جس کے ذریعے انسان اپنی سرگرمیوں کے درمیان موجود خلا کو پُر کر سکتا ہے۔ اس سے نماز میں موجود اطمینان و سکون اور تعلق مع اللہ کی کیفیت نماز سے باہر بھی حاصل ہو جاتی ہے اور انسان کے تمام دنیوی مشاغل کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جڑ جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ سارے مشاغل عبادت بن جاتے ہیں اور پھر یہ محدود عبادت غیر محدود عبادت کا روپ دھار لیتی ہے، لہٰذا انتظار کی کیفیت کے ساتھ نماز کی ادائیگی بندے کے تعلق مع اللہ اور اس مادی و روحانی جہاد کی عکاس ہے، جسے ''الرباط'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ حدیث مبارک مؤمن کی تابناک زندگی کے گہرے معانی کی ایک جھلک پیش کرتی ہے، جس میں انسان وضو کے ذریعے زینت حاصل کر کے نماز کے دوران فراز کی طرف پرواز کرتا ہے۔ یہ حدیث گہرے اور جامع مفاہیم کی حامل مختصر گفتگو کا نمونہ ہے۔ گفتگو کو طوالت دینے کی بجائے میں ایک اور ارشادِ نبوی کی طرف منتقل ہونا پسند کروں گا جو حدیث قدسی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ احادیث قدسیہ سے مراد ایسی احادیث ہیں، جن کے معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، لیکن اسلوب نبی کریم ﷺ کا اپنا ہوتا ہے، یعنی آپ ﷺ انہیں اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں:

س:- صالح افراد کیلئے غیر متوقع اجر

بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گزرا ہے۔''(327)

اس حدیث مبارک میں غیر متوقع طور پر پیش آنے والے امور کے بارے میں بتایا گیا ہے، کیونکہ وہاں انسان کو غیر متوقع طور پر ایسے امور پیش آئیں گے، جن کا اس کے دل میں کبھی خیال بھی نہیں گزرا ہوگا۔ اگرچہ قرآن کریم میں جنت کی بعض نعمتوں کا تذکرہ ملتا ہے، لیکن ان کی حیثیت صرف ناموں، اجمالی خاکوں اور ایک تصور کی سی ہے، کیونکہ دنیا میں ان نعمتوں کی حقیقت کو سمجھنا اور برداشت کرنا ممکن نہیں۔ حضرت ابن عباس آیت کریمہ ﴿وأتوا به متشابهاً﴾ (البقرة: ٢٥) ''اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''جنت کی چیزیں دنیا کی چیزوں کے ساتھ صرف نام میں مشابہت رکھتی ہیں۔'' ایک دوسری روایت میں ہے: ''دنیا میں جنت کی چیزوں کے صرف نام ہی ہیں۔''(328) جب تم وہاں کوئی نعمت چکھو گے تو کہو گے: ''یہ فلاں چیز کے مشابہ ہے۔'' لیکن یہ وہ چیز ہرگز نہ ہوگی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت کی نعمتیں بھی جنت کی طرح ابدی و سرمدی زندگی کے موافق اور مناسب حال ہوں گی، اس لیے وہاں دنیا کے تربوز اور سیب وغیرہ دیکھنے کی توقع رکھنا انتہائی بھولا پن ہے۔

جنت غیر متوقع امور (Surprises) کی دنیا ہے، جس میں عقل و فکر حیران و سرگرداں ہو جائے گی۔ جنت میں اخروی نعمتیں اس قدر متنوع، مسلسل اور پے در پے ہوں گی کہ دل سرشار اور مخمور ہو جائے گا، انسان فیصلہ نہ کر پائے گا کہ وہ ان نعمتوں کا کیا کرے پھر دیدارِ جمال خداوندی جس کے مقابلے میں جنت کی ہزار سالہ نعمتیں بھی ہیچ ہوں گی، جنت کی اتفاقیات میں سے ہوگا، یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ زمان و مکان سے ماوراء ہیں خواہ وہ زمان و مکان جنت کے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اس کے باوجود اہل ایمان جنت میں داخل ہونے کے بعد اپنے پروردگار کو دیکھ سکیں گے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جنت میں نیک بندوں کے لیے اپنے جمال کے دیدار کی نعمت غیر مترقبہ تیار کر رکھی ہے۔

''صالح'' اس شخص کو کہتے ہیں، جس کا عمل عیب، نقص اور خلل سے پاک ہو اور ''صالحات'' سے مراد وہ اعمال ہیں، جن میں عیب، نقص اور خلل نہ ہو۔ کسی بھی عمل کو خدائی معیار پر پرکھنے کے بعد ہی ''صالحات'' میں شمار کیا جا سکتا ہے، یعنی ہم خدائی معیارات کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور جہاد کیسے ادا کیا جاتا ہے، انسان کی باطنی دنیا کی نگرانی اور ضمیر کی تہذیب کیسے کی جاتی ہے، روح میں کیسے انقلاب برپا کیا جاتا ہے، ارادے کو کیسے مضبوط بنایا جاتا ہے اور احساسات و جذبات کو کیسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ہم ان تمام اعمال کو خدائی میزان پر پرکھ کر ان کی قدر و قیمت کا تعین کر سکتے ہیں، لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی ذات کو بھی خدائی معیارات اور ان طریقوں کے

مطابق پرکھے، جن کے ذریعے وہ رضائے الٰہی تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ اگر اسے اس میں کامیابی حاصل ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے نیک اعمال کی راہ میں پہلا مرحلہ طے کرلیا ہے۔

جس طرح ایک موسیقار گانا شروع کرنے سے پہلے اپنے آلاتِ موسیقی کو پرکھتا ہے، اسی طرح اگر تم رضائے الٰہی کے طلبگار ہو تو تم پر لازم ہے کہ اپنے آپ کو قرآن کے مطابق پرکھو اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہاری طرف نظر التفات نہ فرمائیں گے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہیں اور وہ ہر آواز کو سنتے اور ہر چیز کو دیکھتے ہیں، لیکن اگر تمہاری آواز مقام الٰہی کے مناسب نہ ہوئی تو وہ ہرگز تمہاری بات نہ سنے گا اور تمہیں اس تک اپنی آواز پہنچانے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ایک اور معنی کے لحاظ سے صالحات پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ ادا کیے جانے اعمال کو کہتے ہیں، یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب ان اعمال کو کرنے والا جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کا مشاہدہ اور نگرانی فرما رہے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ تمام نیک اعمال پوری توجہ اور اہتمام سے سرانجام دے، کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کون سا عمل اس کی نجات کا ذریعہ بنے گا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''خدا سے ڈر اور کسی بھی نیکی کو حقیر خیال نہ کر۔''(329) زیر بحث حدیث قدسی میں ''لعبادی الصالحین'' کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کو قرب الٰہی کا ایسا مقام حاصل ہوتا ہے، جس کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث قدسی اللہ تعالیٰ کے محبوبین کے مقام کی یوں وضاحت کرتی ہے: ''جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا قدم بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔''(330)

یعنی بندہ نیک اعمال کے ذریعے اتنا قرب الٰہی حاصل کرلیتا ہے کہ وہ خدائی رنگ میں رنگا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے محرک بن جاتے ہیں، یعنی وہ غسل دینے والے کے ہاتھ میں اس مردے کی طرح ہو جاتا ہے، جسے غسل دینے والا جس طرح چاہتا ہے حرکت دیتا ہے۔ یہ خدائی جبر کس قدر لذت آمیز ہے، جو اسے بھلائی کے راستوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے شخص کا اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا ناممکن ہوتا ہے، کیونکہ وہ ایسے عظیم مرتبے پر فائز ہو چکا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عبادی کہہ کر پکارتے اور وصف عبودیت کے ساتھ یاد فرماتے ہیں۔ یہ مقربین کا مقام ہے، جہاں پہنچ کر بندہ خدا کے حضور یوں التجا کرتا ہے: ''اے میرے پروردگار! میرا ہاتھ تھام لیجیے، کیونکہ میں آپ سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔'' ایسا شخص ہر عمدہ کام سرانجام دیتا ہے اور ہر عمل میں اس کے پیش نظر اپنی نجات کے وسیلے کی جستجو

ہوتی ہے۔ چونکہ اسے پتا نہیں ہوتا کہ کون سا نیک عمل اس کی نجات کا ذریعہ بنے گا، اس لیے وہ کسی بھی کارِ خیر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہ تمام اعمال اتفاقیات (Surprises) کے صندوقوں میں محفوظ ہو جائیں گے اور قیامت کے دن جب مسلمان جنت میں داخل ہوگا تو یہ صندوق یکے بعد دیگرے اس کے سامنے کھلنا شروع ہو جائیں گے اور وہ ایسی ایسی غیر متوقع چیزیں دیکھے گا، جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا۔

بعض اوقات ایک کتے کو پانی پلانا جنت میں داخلے کا سبب بن جاتا ہے[331] اور کبھی ایک بلی کو محبوس کر کے جان سے مار ڈالنا جہنم میں جانے کا باعث بن جاتا ہے۔[332] ان حقائق کو پیشِ نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور اس کی نعمتیں مسلسل اتفاقیات کی دنیا ہوں گی۔ انسان صرف اسی چیز کا ادراک کر سکتا ہے، جس کا وہ مشاہدہ، سماع یا تصور کر سکتا ہے۔ چونکہ انسان کے محدود ہونے کی وجہ سے اس کے حواس بھی محدود ہیں، اس لیے وہ اپنے محدود حواس کے ذریعے صرف محدود چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ اپنے ناقص اور محدود حواس کے ذریعے غیر محدود دنیا کی نعمتوں کا ادرک کرنے سے قاصر ہے، معروف شاعر ضیاء پاشا کہتے ہیں:

''چھوٹی سی عقل کے لیے مفاہیم عالیہ کا ادراک ممکن نہیں،
کیونکہ یہ ترازو اتنے بڑے بوجھ کا وزن نہیں کر سکتا۔''

بعض اوقات اس کی یہ توجیہ بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک اعمال کا اجر و ثواب کبھی دس گنا، کبھی سو گنا، کبھی ہزار گنا، کبھی لاکھ گنا، کبھی دس لاکھ گنا اور کبھی اتنی مقدار میں دیتے ہیں کہ اس کا حساب و کتاب ممکن نہیں ہوتا۔ کسی بھی انسان کو اپنے اجر و ثواب کی نوعیت کا یقینی طور پر علم نہیں ہوتا، اس لیے قیامت کے دن جب اس کے نیک اعمال پر اسے ناقابلِ تصور حد تک کئی گنا زیادہ اجر و ثواب ملے گا تو یہ اس کے لئے اتنا بڑا غیر متوقع واقعہ ہوگا، جس کا اس کے دل میں کبھی خیال بھی نہ گزرا ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ گہرے حقائق مختصر الفاظ میں، بغیر کسی سابقہ تیاری اور غور و فکر کے فی البدیہہ انداز میں بتا رہے ہیں۔ صرف یہی کلام آپ ﷺ کے ناقابلِ تصور حد تک فراست کے مالک ہونے کی کافی دلیل ہے، اسی لیے ہم آپ ﷺ کے کلام کے دلدادہ ہیں اور آپ ﷺ کی چند دیگر احادیث کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ع: جنت ناگوار امور سے اور جہنم خواہشات سے ڈھانپی ہوئی ہے

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''جنت کو ناگوار امور سے اور جہنم

کو خواہشات سے ڈھانپا گیا ہے۔"(333) یعنی جہنم مرغوبات، خواہشات اور ایسے ماحول سے ڈھانپی ہوئی ہے، جو خواہشاتِ نفس کو بہت راس آتا ہے، جبکہ جنت (عقل کی ظاہری زبان میں) ناگوار اور مشکلات سے ڈھانپی ہوئی ہے۔ جو لوگ مادے کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور ہر بات کی مادی توجیہہ کرتے ہیں ان کی رائے میں جنت کی راہ پر چلنے والے کوئی معقول کام نہیں کر رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت اور جہنم دونوں ہمارے لیے نعمت ہیں، کیونکہ راہ سلوک طے کرتے ہوئے جنت ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کا شوق دلاتی ہے تو جہنم ہمیں غلط راستے پر چلنے سے بچاتی ہے۔ جب ہم جنت کا روشن چہرہ دیکھتے ہیں تو ہم میں اس تک پہنچنے کا شوق موجزن ہوتا ہے اور جب ہمارے سامنے جہنم کی خوفناک صورت نمودار ہوتی ہے تو ہم اپنے آپ کو اس کی کھائی میں گرنے سے بچانے کے لیے پوری جدوجہد صرف کرتے ہیں اور جنت کو مضبوطی سے تھام کر اس سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں ہمارے لیے رحمت ثابت ہوتی ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کو عمل کے بازار میں ہمارے سامنے سامانِ تجارت کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انسان خداداد اختیار کے ذریعے ان میں سے جسے چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ جو شخص اپنا ارادہ استعمال کر کے جنت کو اختیار کرتا ہے وہ سعادت مند لوگوں میں شمار ہوتا ہے اور جو شخص جہنم کا انتخاب کر کے اس کی راہ پر چلتا ہے وہ بد بخت لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔

جہنم ہر طرف سے مرغوب فضا سے ڈھانپی ہوئی ہے۔ باہر سے دیکھیں تو اس کی ہر چیز پرکشش دکھائی دیتی ہے، مثلاً کھانا، پینا، سونا اور نفسانی وجسمانی خواہشات کی تکمیل کی ہر چیز وہاں میسر ہے۔ ان خواہشات ومرغوبات نے جہنم کو ایسے گھیر رکھا ہے جیسے کنگن کلائی کو گھیر لیتا ہے۔ حاصل یہ کہ جہنم کا راستہ ہر قسم کی نفسانی وجسمانی خواہشات اور مرغوبات کا راستہ ہے۔

دوسری طرف جنت ناگوار امور سے گھری ہوئی سیپی ہے، مثلاً وضو کرنا، نماز ادا کرنا، سفرِ حج کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، جہاد کرنا، راہِ خدا میں مشکلات ومصائب برداشت کرنا، انسان کے ساتھ اس کے اپنے وطن میں قیدیوں جیسا سلوک کیا جانا، اسے تمام انسانی حقوق سے محروم کر کے ایک جیل سے دوسری جیل منتقل کرنا اور صرف اس لیے اسے ہر قسم کی تکلیف وایذا پہنچانا کہ وہ کہتا ہے: "میرا رب اللہ ہے۔" اسے جلاوطن کرنا اور بالآخر تختۂ دار پر چڑھا دینا... غرض مشکلات اور ناگوار امور کی ایک طویل فہرست ہے، جو انسان کو پیش آتے ہیں اور ظاہری عقل کو ناگوار لگتے اور نفس پر شاق گزرتے ہیں۔ ان مشکلات اور ناگوار امور نے جنت کو ڈھانپ کر پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو صرف پردے نظر آتے ہیں۔ ان پردوں کی وجہ سے خواہشاتِ نفس کو جہنم ہیجان خیز اور جنت

خوفناک دکھائی دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف ان کی ظاہری صورت کو دیکھ کر اکثر لوگ ان کے خارجی مظاہر کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا ہو گئے، چنانچہ جہنم کے طلبگاروں کی تعداد زیادہ اور جنت کے طلبگاروں کی تعداد کم ہو گئی۔

اکثر لوگ کم مدتی چیزوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں: ''ٹھیک ہے! نماز ایک اچھی چیز ہے، لیکن اسے دن میں پانچ مرتبہ ادا کرنا مجھے مشکل لگتا ہے۔'' ایسے لوگوں کی نظر نماز میں موجود تھوڑی سی مشقت تک محدود رہتی ہے، اسی طرح بعض لوگوں کے لیے سردیوں میں وضو کی دشواری نماز سے مانع بن جاتی ہے، جبکہ یہی وضو ان لوگوں کے لیے جنت سے قربت کا باعث بن جاتا ہے، جو دھیرے دھیرے اس مشقت کو برداشت کر لیتے ہیں۔ یہی بات روزے، زکوٰۃ، حج اور جہاد وغیرہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، لیکن کتنے ہی ایسے لوگ ہیں، جن کی عقلیں دانش مندی سے کام لینے میں حائل ہو جاتی ہیں، چنانچہ وہ ان چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کو عبور کرنے کی بجائے ان سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں اور جنت کے گرد موجود ناگوار امور ان کے اور جنت کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف جہنم اس فسادی جادوگرنی کی طرح ہے، جو لوگوں کو پھنسانے کے لیے خواہشات کا جال بچھاتی ہے تو لوگ اس کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں، لیکن انہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ مہلک خطرہ ہے۔ ان کی مثال اس مکھی کی سی ہے، جو شہد پر ٹوٹ پڑتی ہے، لیکن وہ اس کے لیے قبرستان ثابت ہوتا ہے۔ خواہشات بھی زہر آلود شہد کی مانند ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم آگ کے گرد گھومتے ہوئے ان پتنگوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں، جو بالآخر اس میں جل جاتے ہیں، ایسے ہی جب یہ لوگ آگ کے گرد موجود خواہشات کی طرف لپکیں گے تو اپنے آپ کو جہنم میں پائیں گے۔ چونکہ جہنم کے اردگرد خواہشات کے پردے سے ماوراء کچھ دکھائی نہیں دیتا، اس لیے وہ اپنی جسمانی خواہشات کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ان میں منہمک ہو جاتے ہیں۔[334] رسول اللہ ﷺ نے اسی موضوع کی درج ذیل تشبیہ کے ذریعے وضاحت فرمائی ہے: ''میری اور میری امت کی مثال اس شخص کی سی ہے، جس نے آگ جلائی اور جاندار اور پتنگے اس میں گرنے لگے، میں تو تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑے ہوئے ہوں اور تم اس میں گھسے جا رہے ہو۔

لیکن جن لوگوں کی راستے میں رسول اللہ ﷺ سے واقفیت ہو جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں آپ ﷺ کی ہدایات کے مطابق راستہ طے کرتے ہیں اور ان کے دل حقائق کے لیے وا ہو جاتے ہیں وہ کبھی بھی جنت کے راستے میں موجود ناگوار مظاہر سے دھوکا نہیں کھاتے، بلکہ وہ ان کی حقیقت سے

واقف ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت ان کے دلوں میں ایک ایسے بیج کی صورت میں موجود ہوتی ہے، جو رفتہ رفتہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان کی ساری روحانی دنیا کو اپنے سائے میں لے لیتا ہے۔ جب اور لوگ جنت کو باہر تلاش کر رہے ہوتے ہیں یہ لوگ اپنے دلوں میں موجود جنت سے محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کی مادی جنت میں زندگی گزارتے ہیں وہ عمر بھر ایک لمحے کے لیے بھی اس سعادت کو نہیں پا سکتے، جسے وہ لوگ محسوس کرتے ہیں، جنھوں نے اپنے من میں جنت بسا رکھی ہوتی ہے۔ ''ایمان جنت پر مشتمل بیج ہے، جبکہ کفر جہنم پر مشتمل بیج ہے۔ یہ دونوں بیج نشوونما پاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ آخرت میں حقیقی جنت اور جہنم میں تبدیل ہو جائیں گے، لہٰذا مؤمن دنیا میں بھی جنت والی زندگی گزارتا ہے، اگرچہ بظاہر اس کی زندگی ناگوار امور اور مشکلات میں گھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جو روحیں جنت کے راستے پر چلتے ہوئے اور اس کی منزلیں (جن میں سے ہر ایک منزل مستقل سعادت ہے) طے کرتے ہوئے ذوق وشوق سے جنت کی طرف بڑھتی ہیں، وہ جسم اور نفس پر گراں گزرنے والے بہت سے امور کا سامنا کریں گی مثلاً بدنی عبادات جیسے وضو، نماز، روزہ اور حج اور دیگر مشکل احکامات مثلاً زکوٰۃ، صدقات اور ان کے علاوہ دیگر مالی احکامات یا مادی اور بدنی احکامات مثلاً حج اور جہاد وغیرہ۔ ان احکامات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے بسا اوقات بعض لوگوں کے لیے جنت کے راستے پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ بعض پر وضو اور نماز گراں گزرتی ہے۔ بعض لوگوں کو روزوں میں بھوک اور پیاس مشکل لگتی ہے، بعض مال اور جان کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، چنانچہ باوجود اس کے کہ جنت اپنی تمام تر رعنائیوں اور حسن و جمال کے ساتھ ان سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ہوتی ہے، وہ اس تک نہیں پہنچ پاتے۔

جس طرح جنت اس دنیائے سعادت کا نام ہے، جس کا تصور عقل خواب میں بھی نہیں کر سکتی، لیکن اس کا راستہ ناگوار امور، مشکلات، صعوبتوں اور ذمہ داریوں سے اٹا پڑا ہے، اسی طرح جہنم گہرا کنواں اور مہلک وادی ہے، لیکن اس کا راستہ ان جاذبِ نظر جسمانی لذات، نفسانی خواہشات اور دنیوی مرغوبات سے پُر ہے، جو روحانی اعتبار سے کمزور لوگوں کو اس کے سحر میں گرفتار کرتی ہیں اور اس کے قریب سے گزرنے والے ہر انسان کو پوری قوت کے ساتھ اس کے بلیک ہول کی مثل مرکز کی طرف کھینچتی ہیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں، جنھیں جہنم کے غیر حقیقی پردے اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس کی وادیوں میں گرا دیتے ہیں، اسی طرح کتنے ہی لوگ ہیں، جنھیں جنت کے پردوں پر نظر آنے والی

صعوبتیں خوف زدہ کر دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں وہ الٹے پاؤں لوٹ کر ابدی سعادت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک انسان جنت کی حقیقت جانتا ہو، لیکن اس کا شوق رکھے اور نہ ہی اس کے لیے سعی کرے یا جہنم کی حقیقت جانتا ہو لیکن اس سے دور ہونے کی کوشش نہ کرے؟ لیکن دنیا میں تکلیف، ایمان بالغیب اور امتحان کا تقاضا یہ تھا کہ جنت اپنے چہرے پر مشقت، صعوبت اور ناگوار امور کا نقاب اوڑھ لے اور جہنم لذات اور خواہشات کی پوشاک پہن لے۔

رسول اللہ ﷺ کے کلام کی قوت اور سحر انگیزی ملاحظہ فرمائیے کہ آپ ﷺ نے پوری تفصیل کے ساتھ ان دو طویل راستوں کی حقیقت اور ان میں پیش آنے والے امور کو بیان فرمایا اور اپنی ہمیشہ کی عادت مبارکہ کے مطابق انتہائی ایجاز کے ساتھ چند کلمات کے ذریعے ان میں سے ایک راستے کی سعادت و نیک بختی اور دوسرے راستے کے خطرات سے آگاہ فرمایا۔ ہم یہاں اس بات کا ذکر مناسب خیال کرتے ہیں کہ ہم نے سید المرسلین ﷺ کے کلام کے صرف جواہر کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا ہے اور آپ ﷺ کے کلام کے بلاغی پہلوؤں اور لسانی قوت کے موضوع کو نہیں چھیڑا۔ اگر ہم ان پہلوؤں کی بھی تحقیق و تجزیہ کرتے تو کئی اور دقیق معانی اور امور کا انکشاف ہوتا، لیکن چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اس لیے ہم اسے یہاں نہیں چھیڑیں گے۔

ف: تین حقوق: اللہ کا حق، ریاست کا حق اور دین کا حق

امام ترمذی درج ذیل حدیث نقل فرماتے ہیں: ''میں تمہیں اللہ سے ڈرنے اور سمع و اطاعت کی وصیت کرتا ہوں، اگرچہ تم پر حبشی غلام امیر بنا دیا جائے۔ تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، لہٰذا میری اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اور نئی باتوں سے بچنا، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔''(335)

اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے تین حقوق کا ذکر فرمایا ہے:

اول: تقویٰ جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

دوم: سننا اور اطاعت اختیار کرنا، جو حکومت چلانے والوں کا حق ہے۔

سوم: سنت کے ساتھ تعلق قائم رکھنا، جو دین کا حق ہے۔

تقویٰ کا لفظ ''الوقایہ'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے شریعت کے فطری قوانین کی رعایت کرنا، اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں داخل ہونا اور شریعت کے فطری قوانین کی حفاظت کو یقینی بنانا۔

اسی طرح ان لوگوں کی اطاعت وادب ہے، جنہیں تم حکومت قائم کرنے کے لیے منتخب کرتے ہو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ تمام جمہوریتوں سے بالاتر جمہوریت ہے، جس تک ابھی انسانیت کی رسائی نہیں ہوئی اور واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کی دعوت چودہ صدیاں پہلے دی جا چکی ہے، انسانیت کو اس تک پہنچنے میں کافی وقت لگے گا، تاہم کسی نبی کے لائے ہوئے نظام کے لیے جمہوریت کی اصطلاح استعمال کرنا مناسب نہیں، اس لیے کہ تہذیب وتمدن کا دعوی کرنے والی کسی قوم میں ابھی تک اس قسم کے مفہوم یا فکر کا وجود نہیں ملتا۔ امریکا میں سیاہ فام لوگ ابھی تک دوسرے درجے کے شہری شمار ہوتے ہیں۔ کئی ملکوں میں سیاہ فام لوگوں کو انسان تک نہیں سمجھا جاتا، جبکہ اسلام نے صدیوں پہلے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ اگر لوگ خوشی سے ایسے شخص کو حکمران منتخب کر لیں تو ان پر اس کی اطاعت ضروری ہو جاتی ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہے، لہٰذا اگر لوگ کسی سیاہ فام غلام کو اپنا حکمران بنانا چاہیں تو انہیں اس کا اختیار حاصل ہے اور اس کی اطاعت سب پر واجب ہوگی۔ اس نظام میں منتخب ہونے والا شخص اہم نہیں، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اسے منتخب کرنے والے سواد اعظم ہوں۔

ارشاد خداوندی ﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ﴾ (المائدة:٣) ''آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا ہے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ دین مکمل ہو چکا ہے، اب کوئی کہنے کی بات باقی نہیں رہی، لہٰذا اس میں کوئی نئی چیز داخل کرنا ممکن نہیں، کیونکہ دین میں کوئی نئی بدعت داخل کرنے کا مطلب کسی نہ کسی سنت مطہرہ کو ختم کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت اس پرندے کی مانند ہے جسے شکار کرنے کے بعد انتہائی حفاظت سے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت دوسروں تک زبان کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر تنقید کرے گا تو اس پر نیزے تان لیے جائیں گے اور اسے اس کے خلاف زبان درازی کی اجازت ہرگز نہ دی جائے گی۔

دل میں نہ جانے کتنی بار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اگر ہم یہ حدیث خود شہنشاہِ کلام سے سنتے اور پھر اسے سمجھتے تو جن پہلوؤں کی وضاحت کی ہم نے کوشش کی ہے، بالکل کافی ہوتے، آپ ﷺ کے کلام پر کھلنے والا ہر دریچہ ہمیں نئے اور عمدہ معانی تک پہنچاتا ہے اور آپ ﷺ کی گفتگو سن کر آپ کی صداقت کی گواہی دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

ص: ایک بل سے دوبار ڈسا جانا

بخاری ومسلم کی ایک روایت میں آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''مؤمن ایک بل سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔''(336)

ہم اس حدیث پر جو مستقبل کے سیاست دانوں کے لیے خصوصی طور پر قابل توجہ ہے، زیادہ بحث نہیں کریں گے، بلکہ صرف بعض اشارات پر اکتفا کریں گے۔

مستقبل کے تعلیم یافتہ لوگ وہ ہیں، جو متنبہ ہو چکے ہیں اور اپنی امت کے مفاہیم اور ثقافت کے بارے میں فکر مند ہیں۔ وہ خود عالم اسلام کی بنیادیں استوار اور اس کے خطوط کا تعین کریں گے۔ قافلۂ نور کے ہمراہ چلنے والے ان تعلیم تافتہ افراد پر لازم ہے کہ اس حدیث کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں، اس پر اچھی طرح غور و فکر کریں اور اس سے حاصل ہونے والے اصولوں پر اپنی داخلی اور خارجی سیاست کی بنیادیں استوار کریں، اس کے نتیجے میں انہیں کامیابی کا راستہ ملے گا، ورنہ سیاست کے میدان میں دھوکے اور فریب کا بازار ہمیشہ گرم رہے گا اور ہماری عوام ہمیشہ دھوکے میں مبتلا رہے گا۔

ق: لوگ معادنیات کی طرح

علمائے تربیت کو چاہیے کہ بخاری و مسلم کی روایت کردہ درج ذیل حدیث شریف کی خوب جانچ پرکھ کریں: ''لوگ سونے اور چاندی کی معدنیات کی طرح ہیں۔ جاہلیت کے بہتر لوگ اسلام میں بھی بہتر ہیں، بشرطیکہ دین کی سمجھ بوجھ رکھتے ہوں۔''(337)

گویا رسول اللہ ﷺ اپنی اس حدیث میں مربی حضرات اور ماہرین نفسیات کو یہ درس دے رہے ہیں کہ تربیت کے دوران انسان کی شخصیت اور اس کی اصل فطرت کا علم اور تعین بہت ضروری اور اہم ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان کی حیثیت اس کی باطنی دنیا کی علامات میں سے ہوتی ہے، اس لیے سب سے پہلے انسان کی داخلی اور باطنی دنیا کی معرفت ضروری ہوتی ہے، تاکہ اسے مناسب سانچے میں رکھ کر پگھلایا جا سکے۔ تربیت سے مراد نئی شکل دینا ہوتا ہے، جس کے لیے زیر تربیت انسان کو کسی خاص سانچے میں پگھلانا ضروری ہوتا ہے۔ بے ترتیب طریقے سے تربیت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات الٹا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو شروع سے ہی ہدایت فرمادی تھی: ﴿قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ (یوسف: ۱۰۸)

یعنی کسی بھی فکر کی دعوت بصیرت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ بصیرت پر مبنی دعوت ایسی شعوری دعوت کہلاتی ہے، جسے اپنے مخاطب، دعوت کی غرض اور معیار کا علم ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی دعوت کا شعوری طریقہ اختیار فرماتے اور اپنی امت کو بھی اسے اختیار کرنے کی تاکید فرماتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود براہ راست اس طریق کار کو اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

ہر شخص کی فطرت سے آگاہی ضروری ہے، مثلاً کس درجہ حرارت پر وہ پگھل کر اپنی شخصیت کو پا سکتا ہے؟ کون سے سانچے سے اسے نکال کر کون سے سانچے میں ڈھالا جائے گا؟ کون سے اور کس ٹیسٹ ٹیوب میں اسے ریفائن کیا جائے گا؟ ان تمام امور کا اسی وقت پتا چل سکتا ہے جب دعوت بصیرت پر مبنی ہو۔ زمانہ جاہلیت کے باشعور، صاحب بصیرت، صاحب عقل اور منصف مزاج لوگوں نے جب حق اور حقیقت کو دیکھا، اسلام کو پہچانا اور اس کی اطاعت اختیار کی تو وہ مسلمانوں کی صف اوّل میں شامل ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سونے کو جب سانچے میں پگھلایا جاتا ہے تو وہ سونا ہی رہتا ہے، اسی طرح چاندی چاندی اور تانبا تانبا ہی رہتا ہے۔ کوئی دھات دوسری دھات میں کبھی تبدیل نہیں ہوتی، لہٰذا جاہلیت میں جس کی دھات سونا تھی اسلام لانے کے بعد بھی سونا ہی رہے گی، لیکن ایک شرط ہے: "اذا فـقـهـوا"، یعنی وہ دین کی سمجھ بوجھ اور اس کا گہرا فہم رکھتے ہوں اور اس کے لیے انہیں معلم اور مرشد کی ضرورت ہوگی، یعنی انہیں ایک ایسا کیمیادان درکار ہوگا جو ان میں سے ہر ایک کو اس کے مخصوص سانچے میں پگھلا دے۔ ان میں اسلام کی روح پھونکنے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر ان کے لیے فقہ تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

ر: ظلم کا انجام برا ہوتا ہے۔

ہم حضور ﷺ کی درج ذیل حدیث بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں: "اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کی گرفت فرماتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ نہیں پاتا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے: ﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ (ھود: ۱۰۲) "اور تمہارا پروردگار جب نافرمان بستیوں کو پکڑا کرتا ہے تو اس کی پکڑ اسی طرح کی ہوتی ہے۔" آیت تلاوت فرمائی۔(338) اللہ تعالیٰ ظالم کو بار بار مہلت دیتے ہیں اور نافرمان کے ساتھ ڈھیل کا معاملہ فرماتے ہیں، لیکن جب بالآخر اس کی گرفت فرماتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے چھوٹ نہیں سکتا۔ یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب ظالم حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور معاملہ حد سے گزر جاتا ہے تو اس کے بعد مزید مہلت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

کائنات میں بعض خدائی قوانین جاری و ساری ہیں، جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی: ﴿تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ﴾ (الروم: ۳۰) انہی قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ ظالم خدائی تلوار ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: "ظالم روئے زمین پر خدا کا عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے انتقام لیتے ہیں اور پھر خود اس سے انتقام لیا جاتا ہے۔"(339) ظالم خدا کی تلوار ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ

اس کے ذریعے ان لوگوں کی سرزنش فرماتے ہیں، جو حدود سے تجاوز کر چکے ہوتے ہیں اور پھر خود ظالم کی زبردست گرفت فرماتے ہیں... آج کے ظالم اپنی سرکشی میں خوب بے باک ہو چکے ہیں، لیکن ایسے حالات دیکھ کر ناامید نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ کتنی ہی بستیوں والوں کو اللہ تعالیٰ نے مہلت دیئے رکھی اور ان سے کہتے رہے: ''کھاپی لو اور عیش کرلو۔'' اور پھر ان کی زبردست اور صاحب اقتدار ذات والی گرفت فرمائی۔(340)

اپنے گردوپیش پر نظر ڈالنے سے تمہیں بہت سی زندہ مثالیں مل جائیں گی۔ ''سدوم'' ''عامورۃ'' اور پومپی (Pompei) صرف تین ہی مثالیں نہیں ہیں... نہ جانے کتنی مثالیں ایسی ہوں گی، جن کا ہمیں علم نہیں یا وہ ان مثالوں کی بہ نسبت کم قابل عبرت ہوں گی، اس لیے بھلا دی گئیں، تاہم یہ سب مثالیں اس خدائی قانون کی گواہ ہیں۔ زیادہ دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا جس قطعہ ارض پر ہم رہ رہے ہیں پر عظیم سلطنت عثمانیہ نہ تھی... جس کے زوال کے امکان کا کسی کے دل میں خیال بھی نہ گزرتا تھا... لیکن جب اس کا سقوط ہوا تو تاریخ کی ایک یادگار بن گئی، جسے ہم دکھی دل سے یاد کرتے ہیں۔

آج ایک چھوٹی سی جماعت جدوجہد میں مصروف ہے اور داخلی و خارجی رجحانات کے مقابلے میں اپنی بقا کی حفاظت کی خاطر اپنی داخلی حدود میں محصور ہے۔ یہ داخلی و خارجی رجحانات اس محدود سے علاقے میں اس سے زندگی کا حق بھی چھیننا چاہتے ہیں، تاہم خدا کا اٹل قانون ﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ (ھود: ۱۰۲) ''...تو اس کی پکڑ اسی طرح کی ہوتی ہے۔'' ضرور حرکت میں آئے گا۔

حقیقی مؤرخین اور ماہرین عمرانیات اس ناقابل تغیر قانون خداوندی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ تاریخ کے قبرستان میں ایسی بہت مثالیں مل جائیں گی، جن سے استفادہ کر کے وہ اپنے آپ کو لمبے عرصے تک زندہ رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس حدیث مبارک کی مزید توضیح کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال کر ایک دوسری حدیث کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

ش: رحمان کے عرش کے سائے تلے

درج ذیل سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ایسے دن اپنے سائے میں جگہ دیں گے، جب اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا: عادل حکمران، ایسا نوجوان جو عبادت خداوندی سرانجام دیتے ہوئے جوان ہوا ہو، وہ آدمی جس کا دل مساجد میں اٹکا رہے، وہ دو آدمی جن میں اللہ کے لیے محبت ہو اسی کے

لیے وہ اکھٹے ہوں اور اسی کے لیے جدا ہوں، ایسا آدمی جسے کوئی خوبصورت اور خاندانی عورت دعوتِ گناہ دے، لیکن وہ کہہ دے: ''مجھے اللہ کا خوف مانع ہے۔'' وہ آدمی جو ایسے خفیہ طریقے سے صدقہ دے کہ اس کے دائیں ہاتھ کو پتا نہ چلے کہ اس کا بایاں ہاتھ کیا خرچ کر رہا ہے اور ایسا آدمی جو اللہ کو خلوت میں یاد کرے اور اس کی وجہ سے اس کے آنسو بہہ پڑیں۔''(341)

انسانی ارادے کی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان میں سے بعض کے معیار پر پورا اترنا انتہائی مشکل ہے تو دیگر بعض انسانی روح کا شکار کرنے کے جال ہیں۔ اگر انسان ان میں سے بعض جالوں سے بچ بھی جائے تو دوسرے جالوں میں پھنس جانے کا احتمال ہمیشہ قائم رہتا ہے، تاہم اگر انسان اپنی قوتِ ارادی کو صحیح طریقے سے استعمال کرے اور عنایت الہیہ اور حفاظت خداوندی پر اعتماد کرے تو ان جالوں میں پھنسنے سے بچنا ممکن ہے۔ حاصل یہ کہ اس راستے کا زادِ راہ انسانی ارادے کے کماحقہ استعمال کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر نصرتِ خداوندی پر اعتماد ہے۔

اس حدیث مبارک میں ذکر کردہ مقدس جماعت، جس میں انسانی ارادے کا تعلق مع اللہ اور نصرتِ خداوندی کے ساتھ مکمل اتحاد ہو، ہی وہ جماعت ہے، جس کا تصور مثالیت پسند مصنفین نے اپنے اپنے ''المدینۃ الفاضلۃ'' میں پیش کیا تھا، لیکن خارجی دنیا میں انہیں اس کا وجود کہیں نہیں ملا۔ یہ حدیث ہمیں اس قسم کی جماعت کو پانے اور اسے حقیقتاً وجود میں لانے کا شوق اور جذبہ دلا رہی ہے۔

جس دن سورج کے سامنے کوئی بادل حائل نہ ہوگا... جس دن سورج ہر طرف آگ برسا رہا ہوگا، جس سے سروں میں دماغ ابل جائیں گے اور پسینہ ٹھوڑیوں تک پہنچ جائے گا، تمام سہارے ختم ہو جائیں گے اور ہر چیز انسان کی دشمن دکھائی دے گی... اس دن اللہ تعالیٰ کی حمایت وعنایت کے سوا کوئی جائے پناہ اور ٹھکانہ نہ ہوگا... یہ بات اہم نہیں کہ وہ سایہ عرش کا ہوگا یا کسی اور چیز کا، اہم بات یہ ہے کہ ہم جس نظام سے واقف ہیں وہ نظام بالکل درہم برہم ہو جائے گا اور پیمانے بدل جائیں گے، بلکہ زمین و آسمان ہی بدل جائیں گے... اس دن کوئی کسی کا مددگار نہ ہوگا، کیونکہ اس دن کسی کی معاونت اور مددکار آمد ہی نہ ہوگی... اس دن کون کس کی مدد کر سکے گا جب ہر طرف خاموشی چھائی ہوگی، کلیجے منہ کو آجائیں گے، سر چکرا جائیں گے اور آنکھیں پتھرا جائیں گی؟ اس دن کون کس کی حمایت کر سکے گا؟ کس میں اتنی ہمت ہوگی؟ اس دن صرف ایک ہی جائے پناہ ہوگی، یعنی اللہ کا سایہ اور اس کی حمایت۔ یہ حمایت درج ذیل لوگوں کو حاصل ہوگی:

الف: وہ سربراہانِ مملکت جنہوں نے دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا اور اپنے پاس موجود امانت کی رعایت کی، دوسرے لفظوں میں حق، انصاف اور استقامت کی رعایت کی۔

ب: وہ نوجوان جو عبادت خداوندی بجالاتے ہوئے پروان چڑھا، جب نفس اور جسم کا جوش وخروش اپنے عروج پر ہوتا ہے۔

ج: ایسا عبادت گزار شخص جس کا دل عبادت کے شوق میں مساجد میں اٹکا رہتا ہے۔

د: اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنے والے جو محبت الٰہیہ کی وجہ سے ملتے اور اسی کی وجہ سے جدا ہوتے ہوں، دوسرے لفظوں میں جنہوں نے رضائے الٰہی اور محبت الٰہیہ کو اپنا قبلہ بنالیا ہو۔

ہ: وہ مردِ کامل جس نے ساری زندگی خوفِ خدا اور خشیت الٰہیہ کے احساس کے ساتھ گزاری، عمر بھر اپنی پاکدامنی کے بارے میں بہت محتاط رہا۔ اپنی خواہشات وتمناؤں پر قابو رکھا اور ہمیشہ اپنے نفس امارہ سے کہتا رہا: ''میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔''

و: وہ شخص جو اپنے اخلاص کی علامت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ جذبہ وفا کے تحت خود ضرورت مند ہونے کے باوجود راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے اپنے اخراجات میں کمی لاتا ہے اور ایسے طور پر خرچ کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہوتا، وہ اس بارے میں غیرت کی حد تک حساس واقع ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتا نہیں چلتا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔

ز: ایسا صاحب دل اور جذبات کا مالک شخص جو اپنی تنہائی اور خلوت کے لمحات کو غور وفکر اور مراقبے کے ذریعے قیمتی بناتا ہے، اپنے دل کے جذبات کی ترجمانی اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کے ذریعے کرتا ہے، اپنے ارادوں کو مضبوط بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہے اور اپنے فولادی ارادے کی تلوار سے گناہ کی خواہش کو پاش پاش کر کے فنا کر دیتا ہے، ایسا شخص ہی درحقیقت صاحب دل اور جذبات کا مالک شخص ہوتا ہے۔

دوسری احادیث سے پتا چلتا ہے کہ عادل حکمران قیامت کے دن نور کے منبروں پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے انعامات وصول (342) اور جذب کرے گا۔ پاکدامنی کے ساتھ جوانی گزارنے والا نوجوان رضائے الٰہی پائے گا، جس شخص کا دل مسجدوں میں اٹکا رہتا تھا، وہ حمایت الٰہیہ کے سائے میں ہوگا، اللہ تعالیٰ کے لیے آپس میں محبت کرنے والے محبت الٰہیہ کو پالیں گے، جس شخص کے دل میں خوف خدا ہوگا وہ قیامت کے دن اندیشوں سے محفوظ ہوگا، صدق دل سے صدقہ دینے والا وفاشعار شخص خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی صورت میں اپنے وہم وگمان سے بڑھ کر بدلہ پائے گا اور سب سے آخر میں اس صاحبِ دل اور جذبات کے مالک شخص کا ذکر ہے، جس کا ظاہر انتہائی پر معنی اور باطن انتہائی گہرا ہوتا ہے، وہ ان لوگوں کے لیے اسوہ حسنہ ہوتا ہے، جو

اسے اس کے ان روشن پہلوؤں سے جانتے ہیں۔ وہ جب خلوت میں اپنے رب کے سامنے ہوتا ہے تو اس کے جذبات اور احساسات آنسوؤں کی صورت میں پھوٹ پڑتے ہیں اور تمام مشکلات اور پر خطر مقامات عبور کرنے اور آخرت میں انعامات الٰہیہ سے سرفراز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مثالی معاشرے اور ایسی مثالی امت کے سامنے نمونہ پیش کرتا ہے، جو انسانیت کو ایسی ہی رفعتوں کی طرف لے جاتی ہے۔

میں یہاں یہ بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ سمندروں جیسے گہرے معانی، جنہیں بیان کرنے کے لئے بہت سی کتابیں بھی ناکافی تھیں، کو آپ ﷺ نے چند سطروں میں یوں ڈھال دیا ہے، جیسے ایک قطرے نے سمندر کو سمیٹ لیا ہو۔

ت: دنیا ایک سایہ

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''مجھے دنیا سے کیا لینا، دنیا میں میری مثال تو اس سوار کی سی ہے جو کسی درخت کی چھاؤں میں (تھوڑی دیر) بیٹھا اور پھر اسے چھوڑ کر چل پڑا۔''(343)

دنیا کیا ہے؟ انسان ایک وقتی اور ختم ہونے والی چیز سے کیسا برتاؤ کرتا ہے؟ انسان اس دنیا میں کیوں آیا اور اسے چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے؟ یہ فلسفے کے بنیادی مسائل ہیں۔ صدیوں سے اس بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، لیکن آپ ﷺ نے ان ساری باتوں کو مختصر اور بلیغ انداز میں بیان فرما دیا۔ یہ اور اس جیسے دیگر مسائل جن کی وضاحت دوسرے لوگ کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں میں نہیں کر سکتے، آپ ﷺ نے انتہائی واضح، بلیغ اور مختصر انداز میں ان کی وضاحت فرما دی۔ بلاشبہ ساری انسانیت آپ ﷺ کی مختصر کلامی پر انگشت بدنداں ہے۔

ث: سید البشر ﷺ کی پانچ خصوصیات

''مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئیں ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں: ایک ماہ کی مسافت تک مجھے رعب عطا فرما کر میری مدد کی گئی ہے۔ زمین کو میرے لیے جائے نماز اور طہارت کا ذریعہ بنایا گیا ہے، لہٰذا میری امت کا کوئی بھی فرد نماز کا وقت پالے تو نماز پڑھ لے۔ مجھ سے پہلے کسی کے لیے مالِ غنیمت حلال نہ تھا، میرے لیے اسے حلال کیا گیا ہے۔ مجھے شفاعت کا اعزاز بخشا گیا ہے۔ پہلے نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا مجھے ساری انسانیت کی طرف بھیجا گیا ہے۔''(344)

اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتیں تو ساری انسانیت کو حاصل ہیں، لیکن ان کے علاوہ ہر امت اور نبی کو بعض خاص خاص نعمتیں بھی عطا کی گئی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو خاص خاص لطف

وانعام سے سرفراز فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کو صفوت (انتخاب) اور اسمائے حسنی کے فہم کے شرف سے نوازا، حضرت نوح علیہ السلام کو جدوجہد اور عزم و ارادے کی روح عطا کی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء، عشق توحید اور خلیل اللہ کے درجے سے نوازا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم وتربیت، عمرانیات اور معاشرے کا نظم ونسق چلانے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نرمی وشفقت، صبر وتحمل، معاشرے میں رواداری اور محبت کی نشر واشاعت کے جذبے سے سرفراز فرمایا اور سرورِ کونین حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کو ارادے، حکمت، میانہ روی اور تحلیل وترکیب جیسی ان صفات سے سرفراز فرمایا جو عالمی پیغام کے لیے ضروری ہوتی ہیں، نیز سابقہ انبیائے کرام کی صفات اس پر مستزاد ہیں، یہی وجہ ہے کہ دین اسلام تمام مذاہب سے زیادہ ذمہ داریوں کا حامل ہونے کے باوجود سب سے زیادہ نرم، بلند مرتبہ، بابرکت اور انسانی فطرت سے قریب تر ہے، اس لیے اسلام بجا طور پر بین الاقوامی مذہب کہلانے کا مستحق ہے۔

یہ حدیث مبارک پیغمبر اسلام اور اس کے عالمی اور جامع پیغام رسالت کو انتہائی دلکش انداز میں غور وفکر کے لیے پیش کر رہی ہے۔ جب اس عالمی دین اور دعوت کے مبلغ اور اس کے اولین شاگردوں نے اسے اطرافِ عالم میں پھیلانا شروع کیا تو انہیں اپنی ذمہ داریوں کی نزاکت کا صحیح طور پر احساس وادراک تھا... چنانچہ وہ زمانے بھر کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے راہِ خدا میں جہاد کرتے ہوئے ایک محاذِ جنگ سے دوسرے محاذِ جنگ کی طرف تیزی سے پیش قدمی کرتے... قتل ہوتے اور قتل کرتے اور جنت اور دیدارِ خداوندی کے حق دار ہونے کو دلیل سے ثابت کرتے۔ جس قدر دوسرے لوگوں کو اپنی دنیوی زندگی کی حرص وخواہش ہوتی تھی، وہ اس سے بڑھ کر اپنی دعوت کی خاطر اپنی دنیوی زندگی کو حقیر سمجھتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شوقِ ملاقات میں پگھل جاتے اور روئے زمین پر خلافت کے قیام کے لیے جدوجہد کرتے۔ عالم آخرت کے ساتھ اس قدر تعلق کی وجہ سے کسی کے لئے ان سے لڑنا ممکن نہ تھا۔ جو بدنصیب ان کے مقابلے میں آتے ان پر آغاز سے ہی اس قدر رعب اور خوف طاری ہو جاتا کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے، خاص طور پر جب مسلمانوں کے دلوں میں عظمت خداوندی خوفِ خداوندی کی حد کو چھونے لگتی، اسی لئے "نصرت بالرعب میسرۃ شھر" "ایک ماہ کی مسافت تک رعب عطا کر کے میری مدد کی گئی ہے۔" کا وعدہ مخلص اہل ایمان کا خوفناک اسلحہ اور مضبوط قلعہ ہے۔

پھر اس دین کے پیروکاروں کے لیے زمین کا مسجد اور طہارت کا ذریعہ ہونا اور ان کا کسی عبادت گاہ

یا جائے نماز کی بجائے ہر جگہ نماز ادا کر سکنا، اس عالمی دین کا ایک مستقل پہلو ہے۔ اس کا ایک پہلو مال غنیمت کا حلال ہونا ہے تاکہ راہِ خدا میں جہاد قیامت تک بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہ سکے۔ اس دین کا ایک اور پہلو قیامت کے دن ''شفاعت کبریٰ'' ہے، جس میں ہر شخص کو مخصوص معیار کی بنیاد پر ہاتھ سے پکڑ کر امن و سلامتی کی کسی خاص سطح تک پہنچا دیا جائے گا۔ دیگر انبیائے کرام کا صرف اپنی امتوں کی طرف مبعوث ہونا اور آپ ﷺ کا تمام انسانیت کی طرف بھیجا جانا اس حقیقت کا بہت ہی واضح پہلو ہے۔ حدیث شریف سے درج امور کا بلا تکلف استنباط کیا جا سکتا ہے۔

الف: نبوت اور رسالت ایک ایسا عطیۂ خداوندی ہے، جسے انسانی کدوکاوش سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ب: مذکورہ بالا پانچ امتیازات ''دعوتِ محمدیہ'' کے خصائص ہیں، یہ کسی اور نبی یا رسول کو عطا نہیں کیے گئے۔

ج: دشمنوں کے دلوں میں طویل فاصلے سے رعب ڈالنا خاص نبوی کیفیت ہے، جو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بھی بطور انعام عطا فرماتے ہیں، جو اس نبوی خط کے زیر سایہ رہتے ہیں۔

د: عبادت کو عبادت خانوں اور مذہبی طبقے[345] کے ساتھ مربوط نہ کرنا، جہاں اس دین کی عالمگیریت اور عمومیت کے پہلو کو واضح کرتا ہے وہیں بندے اور معبود کے درمیان ہر دم اور ہر جگہ تعلق کے قیام کو آسان بھی بناتا ہے۔ یہاں رسالت اسلامیہ کے ایک اور پہلو کا بھی ذکر ہے اور وہ ہے مٹی کا پانی کی طرح ذریعہ طہارت ہونا۔ اس مقام پر ہم اسلام میں غسل کی اہمیت، پانی کے ذریعے طہارت حاصل کرنے کی خصوصیات، اس کے سرچشمہ حیات ہونے اور مٹی کے ذریعے طہارت حاصل کرنے کے خواص کا تذکرہ کرنا ضروری خیال نہیں کرتے۔

ہ: مال غنیمت کا استعمال فی نفسہ حرام نہ تھا، بلکہ اس کی حرمت کا تعلق زمانے اور امتحان کے ساتھ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس کی حرمت کو اٹھا دیا گیا، کیونکہ یہ قیامت تک مشروع رہنے والے جہاد کا اہم محرک تھا،[346] کیونکہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو جہاد کے لیے وقف کر دیا تھا، ان کے لیے ذریعہ معاش، ان کے شوق کا محرک اور دشمن کے محاذ کو مالی اعتبار سے کمزور کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے یہ اگرچہ واجب نہیں، لیکن مباح اور اہم ضرور ہے، نیز اعلائے کلمہ کا وسیلہ ہونے کی وجہ سے اخلاص کے منافی بھی نہیں۔

و: شفاعت برحق ہے اور ہر کوئی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کر سکے گا، لیکن قیامت کے دن اپنی عمومیت، جامعیت اور تقریباً تمام لوگوں سے متعلق ہونے کی حیثیت سے یہ صرف رسول اللہ ﷺ کو عطا کردہ نعمت اور امتیاز ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے خصائص ہیں، جو ہمارے لیے باعث مسرت وافتخار ہیں۔

ز: پہلے انبیائے کرام صرف اپنی اپنی قوموں اور قبائل کے محدود دائرے میں مبعوث ہوتے تھے، لیکن خاتم الرسل اور سید المرسلین نہ صرف انسانوں بالکل ساری کائنات کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ پہلے انبیائے کرام کی دعوت اسی وقت تک برقرار رہتی جب تک ان قوموں اور قبائل کا وجود ہوتا، لیکن رسول اللہ ﷺ کی رسالت عمومی اور جامع ہے، جس کی حدود میں ساری کائنات داخل ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ صبح قیامت تک باقی وساری رہے گی۔ یہ مشمولات اوران کی تعبیر کے اسالیب کے لحاظ سے مشترک، جامع، مضبوط اور پرزور معانی کے گرد ایک اور روشن اور منقوش سلسلہ ہے۔

ح: مؤمن بحیثیت ایک ذمہ دار انسان

"تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ امام نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ آدمی اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ عورت اپنے خاوند کے گھر کی نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اپنی اپنی رعیت کے بارے میں نگہبان ہے۔"(347)

"راعی" ایسے شخص کو کہتے ہیں، جو پہرہ داری، حفاظت، نگرانی اور فکر کرتا ہے، اسی لیے راعی کا لفظ ایسے شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جو اپنی ذمہ داری میں داخل حیوانات کی درندوں سے حفاظت کرتا ہے، ان کے لیے بہترین چراگاہ تلاش کرتا ہے اور یہ ذمہ داری ادا کرتے ہوئے اپنی فطرتِ سلیمہ کے باعث حرص وہوس سے دور رہتا ہے اور اپنے ریوڑ کے لیے سراپا رحمت وشفقت بن جاتا ہے، نیز اس کے درد کو اپنا درد اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی محسوس کرتا ہے۔

سربراہ مملکت اور عوام کے درمیان بھی کسی حد تک اسی قسم کا تعلق پایا جاتا ہے، اسی طرح مختلف محکموں میں اور مختلف سطحوں پر سربراہ مملکت کے نمائندوں کو اپنے ماتحتوں کے حالات کی نگہبانی، ان کے غم وخوشی میں شرکت، ان کے لیے پُرامن اور روشن مستقبل کا بندوبست اور انہیں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

یہی تعلق سربراہِ خانہ اور افرادِ خانہ کے درمیان پایا جاتا ہے، وہ ان کے خرچ، لباس، مناسب رہائش، تعلیم وتربیت، حسن معاشرت اور آخرت کی کامیابی کا باعث بننے والے طرز زندگی کی طرف ان کی راہنمائی کرنے کا اولین ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہی بات امور خانہ کے انتظام اور خاوند کے مال وآبرو کی حفاظت کے بارے میں عورت کے اپنے خاوند کے ساتھ تعلق کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

خادم بھی اپنے مالک وآقا کے مال کا نگہبان ہوتا ہے، جیسے کہ بیٹا اپنے باپ کے مال، شرف اور عزت کی نگہبانی کرتا ہے حتی کہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں کوئی بھی شخص راعی اور رعیت کے دائرے سے خارج نہیں۔ اگر وہ ایک اعتبار سے راعی ہوتا ہے تو دوسرے اعتبار سے رعیت میں شمار ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر کسی راعی کے تحت کسی بھی قسم کی رعیت نہ ہو تب بھی وہ جوابدہ ہے، اس لیے کہ وہ اپنی عقل، جسم، احساسات اور اعضاء کا جوابدہ ہے۔ یہ تمام چیزیں اس کے پاس امانت ہیں، جن کی نگہبانی اور فکر کرنا اس کا فرض ہے۔

تمام نظامہائے زندگی اور مذاہب میں اسلام وہ واحد نظام حیات ہے، جس نے سربراہ مملکت سے لے کر گھر کے خادم تک تمام لوگوں کی ذمہ داریوں کو اس دور میں تفصیل سے بیان کیا ہے، جب کسی کو جمہوریت کا خواب وخیال بھی نہ آیا تھا۔ دنیا کا کوئی نظام زندگی اس لحاظ سے اسلام کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پیغمبر اسلام ﷺ امام کو نگہبان اور اپنی رعیت کا ذمہ داری قرار دیتے ہیں، اس کی ذمہ داریوں کو گنا کر ان کی حدود کا تعین اور اس کے وظائف کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اسی طرح مرد اور عورت کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں بیان کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر اس کی ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں، نیز اولاد کے بارے میں باپ کی ذمہ داریوں اور باپ کے بارے میں اولاد کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہیں، مزید برآں اگر عالمی ارتقا کو پیش نظر رکھیں تو آپ بہت پہلے مزدوروں اور غلاموں کے حقوق اور فرائض کو زیر بحث لائے اور آپ نے انسانی تاریخ میں معاشرتی بحران پیدا ہونے سے پہلے ہی معاشرتی مسائل کا حل پیش کر دیا۔

حکمران اور رعیت کے حقوق کے بارے میں یہ چند نبوی ارشادات تھے۔ اس قسم کے اکثر حقوق "الأحكام السلطانية" میں بیان کیے گئے ہیں، اسی طرح اولاد اور والدین، خاوند اور بیوی، مزدور اور آجر کے حقوق کی تفصیلات فقہ، اخلاق وتربیت کے رسائل اور حقوق ومعاشرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ میں نے ان میں سے صرف چند اہم کا ذکر کیا ہے۔

ز: حرام اور مکروہات کی بعض اقسام

''اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے، قرض اور فرض کی ادائیگی میں غفلت کو حرام قرار دیا ہے، نیز تمہارے لیے قیل وقال، کثرت سے مانگنے اور مال کے ضیاع کو ناپسند فرمایا ہے۔ (348)

۱- ماں کی نافرمانی

جو بیٹا ماں کی نافرمانی کرتا ہے، گویا وہ اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتے کے تمام حقوق کو پامال کرتے ہوئے اسے تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ اگرچہ باپ کی نافرمانی بھی حرام ہے، لیکن یہاں بطورِ خاص ماں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ عورتیں حفاظت کی زیادہ ضرورت مند ہوتی ہیں اور ان کا شعور اور احساس زیادہ لطیف ہوتا ہے اس لیے ان کی نافرمانی ان کے شعور کو زیادہ تکلیف پہنچاتی اور ان کے دکھ میں اضافہ کرتی ہے۔ چونکہ ماں کے ساتھ باپ بھی بیٹے کے ذمے واجب حقوق میں شریک ہوتا ہے، اس لیے باپ کی نافرمانی بھی حرام ہے، لیکن اسے ماں کی نافرمانی کی حرمت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔

۲- بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا

مخصوص علاقوں اور بعض معاشرتی طبقات میں زمانہ جاہلیت کے عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے، بعض عرب یہ وحشیانہ حرکت غیرت کے عجیب وغریب تصور کی بنیاد پر کرتے، بعض غربت اور معاشی تنگی کی وجہ سے اور بعض اپنی ثروت کے اجنبیوں کی طرف منتقل ہونے کو روکنے کے لیے قبائلی تعصب کی بنا پر اس حرکت کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس حرکت کا محرک کچھ بھی ہو یہ ایسا وحشیانہ کام تھا، جسے روکنا اور اس کا سدباب کرنا ضروری تھا اور حقیقت میں اس کا سدباب کر بھی دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت نبویہ نے سختی کے ساتھ اسے حرام قرار دیا ہے۔

۳- امانت میں خیانت

حدیث مبارک میں قرضوں اور دیگر لازمی حقوق کی ادائیگی میں پس وپیش کرنے کو ''منعاً'' کے لفظ سے اور ممنوعہ اشیاء کو مختلف حیلوں سے حاصل کرنے کو ''ھات'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی جیسے واجب الذمہ حقوق کی ادائیگی میں ''ٹال مٹول کرنا حرام ہے، اسی طرح کسی کی چیز پر ناحق قبضہ کرنا بھی حرام ہے، یہاں حرمت کا درجہ بعینہ وہی ہے، جو والدین کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی حرمت کا ہے۔

ممکن ہے پہلے لفظ "منعاً" سے فرض زکوٰۃ، صدقات اور مدد کی دوسری صورتوں سے ہاتھ روکنا اور انہیں مستحق فقراء کو ادا نہ کرنا مراد ہو، جبکہ "ھات" سے سوال کرنا اور بھیک مانگنا مراد ہو۔ اگر ایک قدم آگے بڑھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے لفظ سے قرضہ لے کر ادائیگی سے انکار کرنا، دوسروں کے حقوق پامال کرنا، ہنڈیوں اور بانڈز کی قیمت ادا نہ کرنا اور اس مقصد کے لیے مختلف حیلے بہانے اختیار کرنا مثلاً افلاس وغیرہ کا اعلان کرنا، مال کمانے کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرنا اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں سرکشی کی حد تک غفلت برتنا وغیرہ مراد ہے۔ دورِ حاضر میں دوسرے لفظ کے مفہوم میں بھیک کے معروف طریقے سے لے کر بعض سرکاری و غیر سرکاری اداروں کا عوام کی ثروت چوسنے کے لیے ان کے دینی یا قومی جذبات کا استحصال کرنا، عوام کو دھوکا دینا اور مختلف غلط طریقوں سے ان سے مال و دولت ہتھیانا شامل ہے۔

اس پر معنی اور مختصر حدیث مبارک میں والدین کی نافرمانی کرنے، قطع رحمی کرنے، والدین کے اپنی فطرت میں ودیعت رحمت و شفقت کے جذبات کی رعایت کیے بغیر اپنی اولاد کے ساتھ غیر انسانی اور سخت برتاؤ کرنے اور بعض انا پرست لوگوں کے معاشرے (جو ایک بڑے خاندان کی مثل ہے) میں اپنے ذاتی مفاد اور مصلحت کو ہر چیز پر فوقیت دینے اور اس کے ذریعے معاشرے میں اعتماد، اطمینان اور نظام کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ بالا امور کو حرمت کے ایک مشترکہ درجے میں بیان کرنے کے بعد تین اور ممنوعہ امور کی نشاندہی کی ہے، گو یہ حرمت کے لحاظ سے پہلے ذکر کردہ امور سے کم ہیں۔ وہ تین امور درج ذیل ہیں: "قیل وقال" یعنی افواہیں پھیلانا، "کثرۃ السوال" یعنی بے موقع سوال کرنا یا بھیک مانگنے کو پیشہ بنا لینا اور "اضاعۃ المال" یعنی مال خرچ کرنے میں اسراف کرنا۔

۴۔ افواہیں

افواہوں کی طرف "قیل وقال" کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ "قیل وقال" سے مراد ہر وہ کلام ہے، جس کا دنیا یا آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو، ہر فضول اور غیر ضروری گفتگو "قیل وقال" کے زمرے میں آتی ہے۔ اس میں وہ گفتگو بھی شامل ہے، جو ہمارے متعلق نہ ہو یا اس کی حدود ممنوعات سے ملتی ہوں۔ افواہیں پھیلانا ایک معاشرتی مرض ہے، جس کی شدت میں اسے پھیلانے والوں کے معاشرتی مقام، اسے پھیلانے والے ذریعے مثلاً اخبار، رسالہ، ریڈیو یا ٹیلی وژن وغیرہ کی نوعیت اور دائرہ انتشار کی وسعت کے اعتبار سے فرق آتا رہتا ہے۔ یہ بیماری ان معاشروں میں پھیلتی ہے، جن کے افراد کی صلاحیتیں بے کار ہو چکی ہوں، عوام کے احساسات سطحی نوعیت کے ہوں اور ان کی سوچ کے دائرے تنگ ہوں۔

منہ سے نکلنے والے وہ تمام گناہ جنہیں اسلام نے حرام قرار دیا ہے، "قیل وقال" کے ذریعے سے ہی پھیلتے ہیں، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اچھی بات اور خاموشی کو اپنی درج ذیل تین وصیتوں میں شامل کیا ہے: ''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا پھر خاموش رہے، جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔''(349)

۵- کثرتِ سوال

اس سے یا تو فضول سوالات کرنا مراد ہے یا پھر بغیر ضرورت کے مانگنا یا مانگنے کو پیشہ بنا لینا مراد ہے۔ یہ دونوں باتیں بری ہیں۔قرآن اور سنت نبوی نے بغیر ضرورت کے مانگنے کو حرام قرار دیا ہے۔اسی طرح ہر وقت طرح طرح کے سوالات کرتے پھرنا بھی مذموم اور ناپسندیدہ عمل ہے، کیونکہ انسانی احساسات اور افکار کا مفید اور ثمر آور امور میں مشغول رہنا بہتر ہوتا ہے، تاہم قرآن کریم نے سوالات کی دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک قسم قابل قبول اور مستحسن ہے، جس کی مثال ارشاد باری تعالیٰ: ﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ﴾ (البقرہ: ۲۱۵) ''(اے محمد) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں'' ہے اور دوسری قسم مذموم اور ناپسندیدہ ہے، جس کی مثال ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ﴾ (الاسراء: ۸۵) ''اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں'' ہے۔

سوال کرنا یا نہ کرنا، مانگنا یا نہ مانگنا اور ضرورت کا پایا جانا یا نہ پایا جانا ہی اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ مکلفین کے افعال کب واجب، حرام یا مباح ہوں گے، اس لیے اگرچہ یہ دونوں موضوع بظاہر مختلف دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کی جہت کی وحدت کو پیش نظر رکھ کر ان دونوں کا مطالعہ اور توجیہ اکٹھی بھی کی جاسکتی ہے۔

"اضاعة المال" کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ اس سے ایسے طور پر مال خرچ کرنا مراد ہے، جس کا دنیا یا آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو، یعنی پیسہ بے فائدہ امور میں خرچ کر کے اڑا دینا۔ یہ مرض افراد اور معاشرے دونوں میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنی مال و دولت ضائع کرے یا اسے غیر فائدہ مند امور میں صرف کرے تو اگرچہ بظاہر ایسے دکھائی دیتا ہے کہ یہ ایک شخص کا نقصان ہے، جو اس فرد تک محدود ہے، لیکن درحقیقت چونکہ اس کی ثروت ملک اور معاشرے کی ثروت کا حصہ ہے، اس لیے اسے بے فائدہ امور میں خرچ کرنے سے مجموعی حیثیت سے ملک اور معاشرے کو بھی نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔ یہ حدیث

نبوی آخر میں ایک ایسے مسئلے کو زیر بحث لاتی ہے، جس کی دورِ حاضر میں بڑی اہمیت ہے اور مستقبل میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی، وہ مسئلہ دولت کی مکمل آزادی اور اس سے معاشی فوائد کے حصول سے متعلق ہے۔ بلاغت وادب کے شہنشاہ الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال کے لیے موقع کے چناؤ کے ذریعے معانی میں جو وسعت، گہرائی اور جامعیت پیدا کرتے ہیں، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

ض: احسان

''احسان یہ ہے کہ تم اپنے پروردگار کی ایسے عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے، اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔''(350)

کامل اہل ایمان کا یہی شعار ہوتا ہے کہ ان کا ایمان کامل ہوکر اسلام سے متحد ہوجائے اور پھر احسان کے درجے سے قریب تر ہوجائے۔ اہل ایمان کا اسلام وایمان کے ضمن میں احسان یعنی ایمان واسلام کے اعلیٰ اور بلندترین مرتبے تک پہنچنا اور اس درجے کا حق ادا کرنا انہیں لطف وعنایاتِ خداوندی کا مظہر بنا دیتا ہے، کیونکہ قاعدہ ہے: ''بھلائی بھلائی کو جنم دیتی ہے۔'' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں ایسی نعمتوں کی صورت میں بدلہ عطا فرمائیں گے، جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ہی کسی انسان کے دل پر ان کا خیال گزرا ہے۔''(351) یعنی اسے احسان کی جنس میں سے ہی غیر متوقع طور پر انعام دیا جائے گا، کیونکہ مشہور قاعدہ ہے: ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ (الرحمان: ٦٠) ''نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' بندے کا احسان اس کے ایمان، ادب اور خشیت خداوندی کی بقدر اخلاص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا احسان اپنی عظمت واستغناء کی بقدر اپنے بندے کے دل کو ایمانی جذبات سے سرشار کرنے، الہام کے ذریعے اس کے احساسات کو مہمیز دینے، اشیاء کی حقیقی صورت دکھانے کے لیے اس کی آنکھوں سے پردہ اٹھانے، اس کی زبان کو لایعنی چیزوں میں مشغول ہونے سے بچاکر اس پر حکمت کی باتیں جاری کرنے اور اس کے جذبات کو اس قدر گرمانے کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ وہ تجلیاتِ الٰہیہ کے آفاق میں پہنچ جاتے ہیں... جب مؤمن اس مقام پر پہنچتا ہے اور اس کے سامنے سے وجود کے پردے ہٹتے ہیں تو اسے ایسے لگتا ہے جیسے وہ اللہ تعالیٰ کو ''بلا کم وکیف'' دیکھ رہا ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (الأنعام: ١٠٤) ''(وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔''، لیکن جس مؤمن کو اس بات پر یقین کامل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں اس کے حواس اس دیکھنے کے احسان کی سعادت وہیبت کی وجہ سے کھونے کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ جس

طرح روزہ دار افطار کی گھڑی کے انتظار میں افطار کی لذت محسوس کرتا ہے، اسی طرح جس مؤمن نے اطاعت واخلاص اور خشوع وخضوع کے جذبات سے بھرپور زندگی گزاری ہوتی ہے، وہ اس زندگی کے فوری مگر ناقص دیدار میں آخرت کے مؤجل مگر کامل دیدار کی لذت محسوس کرتا ہے، گویا دنیا کے چند دن محبوب کی ملاقات تک صومِ وصال کی مانند ہیں۔ ہر سیکنڈ کے ایک ایک لمحے میں یہ لذت بڑھتی رہتی ہے گویا اس کی ایک زندگی ہزار زندگیوں میں بدل جاتی ہے۔

جس طرح انسان کے لیے ازل وابد کے بادشاہ کا دیدار لامحدود خوشی کا باعث بنے گا، اسی طرح یہ احساس بھی اس کے لیے خوشی ومسرت کا باعث ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کی پیش کردہ خدمات کی نگرانی فرما رہے ہیں۔ اس احساس کی بدولت نیکی کا چھوٹے سے چھوٹا کام سرانجام دیتے ہوئے بھی وہ انتہائی محظوظ ہوتا ہے۔

ہم نے سید المرسلین ﷺ کے مختصر اور بلیغ کلام کے معانی کے چہرے سے تھوڑی سی نقاب کشائی کی ہے، ورنہ ان کے حسن وجمال کی تفصیل کے لیے تو کئی جلدیں درکار ہیں۔ یہ تو سمندر کا ایک قطرہ ہے، سورج کی ایک کرن ہے یا تاروں بھرے فلک کا ایک شعلہ ہے۔ ''حقیقت احمدیہ'' کے عکاس ان نورانی کلمات کی شرح وتوضیح ہماری استطاعت سے باہر ہے۔ اگرچہ ہم نے اس کوچے میں قصداً قدم رکھا ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ ہماری اس بے باکی سے درگزر فرمائے۔ آپ ﷺ کے نورانی کلمات کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کرنا ہماری استطاعت سے خارج ہے اور ہم ایسے اہل علم کے انتظار میں ہیں، جو اس ذمہ داری کی بجا آوری کی اہلیت رکھتے ہوں، لیکن اس کے باوجود ہم نے کچھ جرأت کا مظاہرہ کیا اور آپ ﷺ کی بعض احادیث کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ ہم نے عام اسلوب میں آپ ﷺ کے وسیع ذخیرہ احادیث میں سے چند ایک نورانی ارشادات پر مضمون کی گہرائی، اسلوب کی پختگی اور معانی کی بلاغت کے پہلو سے گفتگو کی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور ارباب علم سے تسامح کے امیدوار ہیں۔

۲- آپ ﷺ کی دعاؤں کا گلدستہ

ہم یہاں نبی کریم ﷺ کی چند دعاؤں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ کی دعاؤں کے کلمات اور معانی میں اس قدر گہرائی، بلندی، ثروت اور امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ کسی اور کے لیے ان کا حصول ممکن نہیں ہے۔ ہم بلاتردد کہہ سکتے ہیں کہ

آپ ﷺ کی ہر دعا میں اس قدر معانی پائے جاتے ہیں کہ ان سے ایک پوری کتاب بھر سکتی ہے۔ جس طرح آپ ﷺ کے اقوال اور احادیث دیگر تمام انسانیت کی باتوں سے بلند تر ہیں، اسی طرح آپ ﷺ کی دعاؤں میں ماضی و مستقبل کی تمام انسانیت کی دعاؤں سے زیادہ گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ساری مخلوق سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی معرفت وخشیت حاصل تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو سونے کے وقت درج ذیل دعا سکھائی ہے:

''جب تم خواب گاہ میں آنے لگو تو ایسے وضو کرو جیسے نماز کے لیے وضو کرتے ہو پھر اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر یہ دعا پڑھو:"اللهم أسلمت نفسي اليك ووجّهت وجهي اليك وفوضّت أمري اليك وألجأت ظهري اليك رغبة ورهبة اليك، لاملجأ ولا منجا منك الا اليك، آمنت بكتابك الذي أنزلت وبنبيك الذي أرسلت."(352) ''اے اللہ میں نے اپنی ذات آپ کے سپرد کی، اپنا رخ آپ کی طرف پھیرا، اپنا معاملہ آپ کے حوالے کیا، خوشی اور خوف کی حالت میں اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا اور میں آپ کی نازل کردہ کتاب اور آپ کے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان لایا۔'' یہ کلمات کس قدر خوبصورت اور پاکیزہ ہیں! ان میں کس قدر مٹھاس اور رفعت پائی جاتی ہے! اور ان کے معانی میں کس قدر حرارت اور ان کے مضامین میں کس قدر گہرائی پائی جاتی ہے! چونکہ ہم آئندہ صفحات میں آپ ﷺ کی دعائیں ایک مخصوص فصل میں ذکر کریں گے اس لیے ان پر تفصیلی گفتگو بھی وہیں کریں گے، یہاں ہم صرف ان کی بلاغت اور ایجاز کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

آپ ﷺ کی ایک دوسری دعا ملاحظہ فرمائیے:"اللهم باعد بيني وبين خطاياي كما باعدت بين المشرق والمغرب، اللهم نقّني من خطاياي كماينقّى الثوب الأبيض من الدنس." (353)''اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان ایسے ہی دوری پیدا کر دیجئے جیسے آپ نے مشرق اور مغرب کے درمیان دوری پیدا کی ہے اور مجھے میری خطاؤں سے ایسے پاک فرما دیجئے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیا جاتا ہے۔'' اس دعا کے معانی سے ایک پوری کتاب بھر جائے۔ میں مزید کوئی بات نہیں کہنا چاہتا، بیشک آپ ﷺ دعا مانگنے والوں کے سرخیل تھے۔

ایک دعا میں آپ ﷺ فرماتے ہیں:"اللهم انی أسئلك من الخير كلّه، عاجله و آجله، ماعلمت منه ومالم أعلم، وأعوذبك من الشر كلّه عاجله و آجله، ماعلمت منه و مالم أعلم." (354)''اے اللہ! میں آپ سے ہر طرح کی بھلائی مانگتا ہوں فوری بھی اور موخر بھی، جس کا مجھے علم ہے وہ بھی اور جس کا مجھے علم نہیں وہ بھی اور میں آپ سے ہر قسم کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں، فوری سے بھی اور موخر سے بھی، جس کا مجھے علم ہے اس سے بھی اور جس کا مجھے علم نہیں اس سے بھی۔''

آپ ﷺ کی دعا کے جواہر اور جوامع الکلم میں سے درج ذیل دعا بھی ہے: "اللھم لامانع لما أعطیت ولا معطی لما منعت، ولا ینفع ذاالجدمنك الجد." (355) "اے اللہ! آپ جو چیز عطا کرنا چاہیں اسے کوئی روک نہیں سکتا اور آپ جسے روکنا چاہیں اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی مالدار کو اس کا مال آپ کے مقابلے میں فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

ایک اور دعا میں آپ ﷺ فرماتے ہیں: "اللھم ماقلت من قول أو حلفت من حلف أو نذرت من نذر فمشیئتك بین یدی ذلك، ماشئت کان و ما لم تشألم یکن، لاحول ولا وقوة الا بك، انّك علی کل شئ قدیر، اللھم ماصلّیت من صلاة فعلی من صلیت، وما لعنت من لعن فعلی من لعنت، أنت ولیّ فی الدنیاوالآخرة، توفّنی مسلماً و ألحقنی بالصالحین." (356) "اے اللہ! میں نے جو بات بھی کہی، جو قسم بھی اٹھائی یا جو نذر بھی مانی وہ آپ کی مشیت سے تھی۔ جو آپ نے چاہا وہ ہوا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔ آپ کے بغیر نہ کوئی نیکی کرنے کی قوت ہے اور نہ برائی سے بچنے کی طاقت، بیشک آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اے اللہ! میری رحمت یا لعنت صرف انہیں لوگوں پر ہو، جن پر آپ نے رحمت یا لعنت بھیجی ہے۔ آپ دنیا اور آخرت میں میرے کارساز ہیں۔ مجھے اسلام کی حالت میں وفات دیجئے اور نیک لوگوں میں شامل فرمائیے۔"

ایک دعا میں آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "وأسئلك اللھم الرضابعد القضاء و برد العیش بعد الموت ولذّہ النظر الی وجھك وشوقاًالی لقائك من غیر ضراء مضرة ولافتنة مضلّة، أعوذبك أن أظلم أو أظلم أوأعتدی یعتدی علیّ أو أکسب خطیئة أو ذنباًلا تغفرہ." (357) "اے اللہ! میں فیصلے کے بعد آپ سے آپ کی خوشنودی، موت کے بعد اچھی زندگی، آپ کے چہرے کے دیدار کی لذت اور آپ سے ملاقات کا شوق مانگتا ہوں، بغیر اس کے کہ مجھے کسی نقصان پہنچانے والی چیز یا کسی گمراہ کن فتنے کا نقصان پہنچے۔ میں آپ سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم ہو، میں کسی پر زیادتی کروں یا مجھ پر کوئی زیادتی کرے، یا میں کسی ایسے گناہ یا غلطی کا ارتکاب کروں جسے آپ معاف نہ فرمائیں۔"

آپ ﷺ کی ایک دعا حسب ذیل ہے:

"... وأشھد أنّك ان تکلنی الی نفسی تکلنی الی ضیعة وعورة وذنب وخطیئة، وانی لاأثق الا برحمتك، فاغفرلی ذنبی کله، انه لا یغفرالذنوب الا أنت وتب

علىّ انك أنت التواب الرحيم." (358) "...اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھے میرے نفس کے حوالے کر دیا تو یہ مجھے بربادی، شرمندگی، گناہ اور خطا کے سپرد کرنے کے مترادف ہوگا۔ مجھے آپ کی رحمت کے سوا کسی چیز پر بھروسا نہیں۔ آپ میرے تمام گناہ معاف فرما دیجئے۔ آپ کے سوا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ میری توبہ قبول فرمائیے۔ بیشک آپ توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان ہیں۔"

ایک دعا میں آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "ألـلهـم أنـت أحـقّ مـن ذكـر، وأحـقّ من عبـد، وأنـصر من ابتغى وأرأف من ملك وأجود من سئل وأوسع من أعطى، أنت الملك لا شريك لـه والـفرد لا يهلك، كل شيء هالك الا وجهك، لن تطاع الا باذنك، ولن تعصى الا بعلمك، تطاع فتشكر وتعصى فتغفر، أقرب شهيد وأدنى حفيظ، حلت دون الثغور وأخذت بـالـنـواصـى وكتبـت الآثـار ونسـخـت الآجـال، القلوب لك مفضية، والسرّ عندك عـلانية، الحلال ماأحللت، والحرام ماحرّمت، والدين ما شرعت، والأمر ما قضيت، والخلق خـلقك والـعبد عبدك، وأنـت الـله الرؤف الرحيم، أسألك بنور وجهك الذى أشرقت له السمٰوات والأرض، بكل حق هو لك وبحق السائلين عليك أن تقبلنى فى هذه الغداة وفى هذه العشية وأن تجيرنى من النار بقدرتك." (360)

"اے اللہ! آپ سب سے زیادہ ذکر اور سب سے زیادہ عبادت کیے جانے کے مستحق ہیں، جن سے مدد مانگی جاتی ہے آپ ان سب سے زیادہ مدد کرنے والے ہیں۔ آپ سب سے زیادہ رحم دل بادشاہ اور سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ عطا کرنے والے ہیں۔ آپ ایسے بادشاہ ہیں، جس کا کوئی شریک نہیں اور ایسے یکتا ہیں، جس پر فنا نہیں۔ آپ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ آپ کی اطاعت آپ کی اجازت سے ہوتی ہے اور آپ کی نافرمانی بھی آپ کے علم میں ہوتی ہے۔ آپ اپنی اطاعت پر نوازتے ہیں اور اپنی نافرمانی پر معاف فرماتے ہیں۔ آپ سب سے زیادہ قریبی نگہبان و محافظ ہیں۔ آپ سرحدوں کے درمیان حائل ہو گئے، آپ نے پیشانیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور نشانات قدم اور مقررہ مدت کو قلم بند کر لیا۔ دل آپ کے سامنے وا ہیں اور راز آپ کے سامنے افشا ہیں۔ حلال وہی ہے، جسے آپ نے حلال قرار دیا، حرام وہی ہے، جسے آپ نے حرام قرار دیا۔ دین وہی ہے، جسے آپ نے مشروع قرار دیا اور حکم وہی ہے، جس کا آپ نے فیصلہ فرما دیا۔ ساری مخلوق آپ کی پیدا کردہ ہے اور سارے انسان آپ کے بندے ہیں۔ آپ رحم دل اور مہربان خدا ہیں۔ میں آپ کی ذات اقدس کے اس نور کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں، جس سے زمین

وآسمان منور ہیں، میں آپ کے ہر حق اور آپ پر سائلوں کے حق کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ میری اس صبح وشام (کے اعمال) کو قبول فرما اور اپنی قدرت کے ذریعے مجھے جہنم سے بچا۔"

ایک موقع پر آپ نے یہ دعا تعلیم فرمائی: "اللهم انا نسألك من خير ما سألك منه نبيك محمد ﷺ و نعوذبك من شرّ ما استعاذ منه نبيك محمد ﷺ." (361) "اے اللہ! میں آپ سے ہر وہ بھلائی مانگتا ہوں، جو آپ کے نبی محمد ﷺ نے آپ سے مانگی ہے اور ہر اس برائی سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، جس سے آپ کے رسول محمد ﷺ نے پناہ مانگی ہے۔" آپ ﷺ نے یہ دعا بھی فرمائی ہے: "اللهم انی أعوذبك من علم لا ينفع ومن قلب لا يخشع ومن نفس لا تشبع ومن دعوة لا يستجاب لها..." (362) "اے اللہ! میں بے فائدہ علم، بے خوف دل، نہ سیر ہونے والے نفس اور نہ قبول ہونے والی دعا سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

ایک موقع پر آپ ﷺ یوں دعا فرماتے ہیں: "اللّهم أسألك الثبات فی الأمر، وأسألك عزيمة الرشد وأسألك شكر نعمتك وحسن عبادتك، وأسألك لساناً صادقاً وقلباً سليماً، وأعوذبك من شرّ ما تعلم، وأسألك من خير ما تعلم، وأستغفرك مما تعلم انك أنت علّام الغيوب." (363) "اے اللہ! میں آپ سے ہر معاملے میں ثابت قدمی، ہدایت کی پختگی، نعمتوں کا شکر، اچھی عبادت، سچی زبان اور قلب سلیم مانگتا ہوں۔ میں ان برائیوں سے جنہیں آپ جانتے ہیں، آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ ان بھلائیوں کا جنہیں آپ جانتے ہیں، آپ سے سوال کرتا ہوں اور ان گناہوں پر جنہیں آپ جانتے ہیں، آپ کی مغفرت طلب کرتا ہوں۔ بیشک آپ پوشیدہ باتوں کو جاننے والے ہیں۔"

آپ ﷺ کی ایک دعا حسب ذیل ہے: "اللهم انی أسألك فعل الخيرات وترك المنكرات وحبّ المساكين وأن تغفرلی وترحمنی، واذا أردت فتنة الناس فتوفّنی غير مفتون، وأسألك حبّك وحبّ من يحبّك وحبّ عمل يقرّبنی الی حبّك." (364) "اے اللہ! میں بھلائی کے کام کرنے، برائیوں کو ترک کرنے، مساکین کی محبت اور آپ کی مغفرت ورحمت کا آپ سے سوال کرتا ہوں۔ جب آپ لوگوں کو کسی آزمائش میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمائیں تو مجھے کسی فتنے میں مبتلا کیے بغیر ہی وفات دے دیجئے۔ میں آپ سے آپ کی محبت، آپ سے محبت کرنے والوں کی محبت اور آپ کی محبت کا قرب عطا کرنے والے عمل کی محبت مانگتا ہوں۔"

آپ ﷺ کی ایک دعا یہ بھی ہے: "اللّهم انی أسألك فواتح الخير و خواتمه و جوامعه وأوّله وآخره وظاهره وباطنه والدرجات العلى من الجنة، آمين." (365) "اے اللہ! میں خیر کی ابتدا و انتہا، اس کے جوامع، اس کا اول و آخر، اس کا ظاہر و باطن اور جنت کے اعلیٰ درجات مانگتا ہوں، آمین۔"

آپ ﷺ دعا میں فرمایا کرتے تھے: "اللهم أعنى على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك" (366) "اے اللہ! اپنا ذکر و شکر کرنے اور اچھی عبادت سرانجام دینے میں میری مدد فرمایئے۔"

ایک موقع پر آپ نے یوں دعا فرمائی: "اللهم انی أسألك الهدى و التقى والعفاف والغنى." (367) "اے اللہ! میں آپ سے ہدایت، تقویٰ، پاکدامنی اور غنا کا سوال کرتا ہوں۔"

ایک دعائے نبوی میں ہے: "اللّهم أحسن عاقبتنافى الأمور كلّهاو أجرنامن خزى الدنياو عذاب الآخرة." (368) "اے اللہ! ہمارے تمام معاملات کا انجام اچھا فرما اور ہمیں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے بچا۔"

ان دعاؤں میں ایک لفظ کی بھی ردوبدل ممکن نہیں۔ ان کے الفاظ کے درمیان انتہائی عمدہ ربط پایا جاتا ہے۔ ان دعاؤں کے تمام پہلوؤں کا کماحقہ ادراک کسی کے بس میں نہیں۔ رسول اللہ ﷺ دعاؤں کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ تمام اولیائے کرام اور زاہدوں نے اپنی دعاؤں کو حسن بخشنے، ان میں زندگی و گرمائش پیدا کرنے اور رحمت خداوندی کے دروازے پر دستک دینے کے لیے آپ ﷺ کی دعاؤں سے ہی خوشہ چینی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں کا اسلوب اپنی نورانی آب و تاب کے سبب اس قدر ممتاز مقام رکھتا ہے کہ اسے دیگر تمام اسالیب سے جدا کر کے فوراً کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔

جب میں ابوالحسن شاذلی، احمد بدوی، احمد رفاعی اور شیخ جیلانی وغیرہ جیسی عظیم روحانی ہستیوں کی دعائیں اور مناجات پڑھتا ہوں تو مجھ پر وجد و جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور چند ہی حصے پڑھنے سے میں بے خود ہونے لگتا ہوں۔ ان کی دعائیں انتہائی مؤثر اور حیران کن ہیں، لیکن ان سب نے اپنی دعاؤں میں حسن پیدا کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں سے خوشہ چینی کر کے ان کے اقتباسات اپنی دعاؤں میں استعمال کیے ہیں۔ ہم بھی رحمت خداوندی کا دروازہ کھٹکھٹاتے وقت قبولیت کی امید لیے ہوئے ان کی دعاؤں کو استعمال کرتے ہیں۔

آخر میں ہم پھر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کلام اور آپ کی تمام تر احادیث آپ کی فراست کی دلیل ہیں۔ آپ ﷺ کے بعض الفاظ ''جوامع الکلم'' ہونے کی حیثیت سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ ﷺ کی دعاؤں کا اسلوب بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ آپ ﷺ کی احادیث اور دعائیں آخروی اور الہامی پہلو کی حامل نبوی فراست کی طرف مشیر ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ سید المرسلین ہیں۔

ج: آپ ﷺ کی رحمت آپ کی فراست کا ایک پہلو

آپ ﷺ کی رحمت وشفقت آپ کی فراست کا ایک نیا پہلو تشکیل دیتی ہیں۔ سیدنا محمد ﷺ روئے زمین پر خدائی رحمت ورحمانیت کی تجلی کے واحد نمائندہ ہیں۔ آپ ﷺ نے دلوں کو جیتنے اور انہیں وا کرنے کے لیے اس صفت کو اکسیر شافی کے طور پر استعمال کیا، کیونکہ اخلاص اور حقیقی بے غرضی کے بعد رحمت وشفقت لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے اور ان کے دل جیتنے کے لیے اہم ترین عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا باطنی جمال اور رقت آمیزی، آپ کی غیر معمولی صلاحیت اور آپ کی رحمت وشفقت جو آپ کی فراست کی ایک مستقل جہت ہیں، آپ کی نبوت کی دلیل اور آپ کی کامیابی کے ان عوامل میں سے ہیں، جن سے آپ ﷺ نے خوب کام لیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ آپ ﷺ رحمت خداوندی کی تجلیات کے آئینہ دار تھے، گویا آپ کسی صحراء میں اس چشمے یا حوضِ کوثر کی مانند تھے، جس پر ہر کوئی ہاتھ میں جام لیے ٹوٹ پڑا اور اس میں سے جام بھر بھر کر اتنا پیا کہ ہر ایک کی پیاس بجھ گئی۔ یقیناً آپ ﷺ اپنی ذات میں جلوہ گر رحمت خداوندی کے پیش نظر ہر ایک کے لیے حوضِ کوثر کی مانند ہیں، جو بھی چاہے آپ ﷺ سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

آپ ﷺ نے فراست کے ذریعے اپنی فطرت میں ودیعت اس رحمت کو لوگوں کے دل جیتنے کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا۔ جس نے بھی اپنے آپ کو اس مسحور کن ماحول میں پایا وہ جنت کے راستے اور وجد کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ گیا۔ رحمت کا جذبہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں جادو کی چابی کی مانند تھا، جس سے آپ ﷺ ایسے زنگ آلود بند تالوں کو بھی کھول دیتے، جن کے کسی بھی چابی سے کھلنے کی امید نہ ہوتی تھی اور دلوں کو نورِ ایمان سے منور فرماتے۔ یہ طلائی کنجی محمد مصطفیٰ ﷺ کے سپرد اسی لیے کی گئی تھی کہ آپ اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ امانت اہل افراد کے سپرد فرماتے ہیں، اس لیے دلوں کو وا کرنے والی چابی، جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بطور امانت عطا فرمائی تھی، محمد ﷺ کے سپرد کی، جو ساری انسانیت سے زیادہ اس کے اہل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ چونکہ رحمت کے بارے میں توازن کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے آپ ﷺ نے انتہائی توازن کے ساتھ اس رحمت کا معیار قائم فرمایا۔

ا۔ رحمت میں افراط وتفریط

دیگر امور کی طرح رحمت کے بارے میں بھی افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ رحمت کے غلط استعمال

کی سب سے بہترین مثال فری میسنز کی فکر و عمل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ محبت اور انسان دوستی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی بھی دین دار انسان کے ساتھ محبت والفت کے تعلقات قائم نہیں کر سکتے، بلکہ اگر ان کا بس چلے تو وہ کسی بھی دیندار مسلمان کو زندہ نہ چھوڑیں۔ ان کی محبت ان کے ہم فکر لوگوں تک محدود ہوتی ہے۔ یہ وہ محبت نہیں، جس سے ہم آشنا ہیں، بلکہ یہ تو مصلحت و مفاد پر مبنی محبت ہے، جبکہ سید الرسل حضرت محمد ﷺ کی متوازن اور ہمہ گیر محبت نہ صرف انسانیت، بلکہ ساری کائنات پر محیط ہے۔

تمام اہل ایمان نبی کریم ﷺ کی رحمت سے استفادہ کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کی تعریف میں قرآن کریم کہتا ہے: ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبة:١٢٨) ''مؤمنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔'' اہل ایمان کے ساتھ ساتھ منافقین اور کافر بھی آپ ﷺ کی رحمت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں حتی کہ جبریل امین علیہ السلام کو بھی اس رحمت میں سے کافی حصہ ملا ہے،(369) آپ ﷺ کی رحمت کی وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ کی رحمت کو دیکھ کر شیطان کے دل میں بھی امید کی کرن پیدا ہو گئی تھی۔(370) آپ ﷺ کی رحمت چند مخصوص لوگوں یا گروہوں تک محدود نہ تھی اور نہ ہی آپ ﷺ نے بعض دیگر لوگوں کی طرح سے اپنی رحمت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔

۲- ہیومن ازم (Humanism) کا فریب

دورِ حاضر کے بعض رجحانات ہیومن ازم کا لبادہ اوڑھ کر انسانیت کو دھوکا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں اور ان سانپوں اور بچھوؤں میں کیا فرق ہے، جو انسان کو ڈسنے کے لیے اس کے قریب آتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ جس محبت کے داعی تھے، وہ ایسی محبت ہرگز نہ تھی اور نہ ہی اِس محبت کو اُس محبت کے ساتھ جوڑنا چاہیے۔ اسلام میں تو محبت کا مفہوم انتہائی متوازن ہے، جو اپنے اندر دنیا و آخرت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ بلکہ اسلامی احکام کی ہر معاملے میں یہی شان ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنے پیغام محبت کے ذریعے نہ صرف ساری انسانیت، بلکہ ساری کائنات کو عزت بخشی، تاہم دوسروں کی طرح آپ ﷺ کی محبت صرف باتوں یا کتابوں تک محدود نہ تھی، بلکہ اپنی تمام تر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ آپ کی عملی زندگی میں جلوہ گر تھی۔ چونکہ آپ ﷺ ایک صاحب فکر، متحرک اور فعال انسان تھے، اس لیے آپ ﷺ کی ہر فکر عملی طور پر آپ کی زندگی میں نظر آتی تھی۔

چونکہ پوری کائنات پر محیط رسول اللہ ﷺ کی وسیع اور پرخلوص رحمت پورے اخلاص کے ساتھ

ساری کائنات کے جوہر سے پھوٹتی ہے، اس لیے وہ آپ ﷺ کی عملی زندگی میں بھی نمایاں تھی، یہاں ہم حیوانات پر آپ ﷺ کی شفقت کی دو زندہ مثالیں پیش کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک فاحشہ عورت نے سخت گرمی کے وقت ایک کتے کو کسی کنویں کے گرد چکر لگاتے دیکھا، جس کی زبان پیاس کی شدت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس عورت نے اس کے لیے اپنے موزے کے ذریعے کنویں سے پانی نکالا، جس پر اس کی مغفرت کر دی گئی۔(371)

اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ ایک دوسرا واقعہ یوں بیان فرماتے ہیں: ''ایک عورت کو اس لیے عذاب دیا گیا کہ اس نے ایک بلی کو محبوس کر کے مار ڈالا، اس کی سزا کے طور پر اسے جہنم میں ڈالا گیا، کیونکہ جب اس نے اسے محبوس کیا تو نہ تو اسے کھانا پینا دیا اور نہ ہی اسے چھوڑا کہ وہ خود حشرات الارض سے پیٹ بھر لیتی۔''(372)

رسول اللہ ﷺ اسی پیغامِ رحمت کو پہنچانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ آپ ﷺ ایک میٹھا چشمہ تھے، جو بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے آپ ﷺ کے پاس رحمت کو پایا اور جس نے بھی آپ ﷺ کے دستِ مبارک سے آبِ حیات پیا اس نے روحانی سرمدیت حاصل کر لی۔ کاش جو لوگ مشیتِ خداوندی اور لطفِ الٰہی کی بدولت حوضِ کوثر پر آئیں گے، وہ آپ ﷺ کی قدر و منزلت کا کما حقہ ادراک کرتے۔ میں ان مفاہیم کی عملی مثالوں سے وضاحت کرنا چاہوں گا، تاہم اس سے پہلے میں درج ذیل امور کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا مناسب خیال کرتا ہوں۔

۳- آپ ﷺ کو ہر معاملے میں درجہ کمال حاصل تھا۔

بعض لوگ خاص خاص میدانوں میں صفِ اول کے لوگوں میں شامل ہوتے ہیں، لیکن زندگی کے دیگر شعبوں میں ہم انہیں پچھلی صفوں میں پاتے ہیں، چنانچہ ہم میدانِ جنگ کے کامیاب سپہ سالار کو دیکھتے ہیں کہ جنگی فنون میں چاہے اسے کتنی ہی مہارت حاصل کیوں نہ ہو وہ بعض اوقات شفقت، نرم دلی اور فہم میں ایک معمولی چرواہے کے مرتبے کو بھی نہیں پہنچ پاتا، بلکہ اس کے برعکس قتل کا عادی ہونے کی وجہ سے عام طور پر ایک رحم دل انسان ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کثرت سے جنگ و قتال میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس کے احساسات و جذبات کی لطافت و حساسیت ختم ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ کسی انسان کو قتل کرتے وقت کسی قسم کے رحم کے جذبات محسوس نہیں کرتا۔ بعض

اوقات ایک سیاست دان سیاست کے میدان میں جس قدر کامیاب ہوتا ہے، سچائی سے اسی قدر دور ہوتا ہے اور بعض اوقات تو انسانی حقوق کی بھی پاسداری نہیں کرتا۔ سیاست کے میدان میں کامیابی کے باوجود سچائی و مروت سے دوری اس بات کی دلیل ہے کہ بعض اوقات ایک حیثیت سے رفعت اور دوسری حیثیت سے پستی بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کیسے بعض انسان اثباتی فلسفے (Positivism) سے متاثر ہو کر ہر چیز پر تجربات کرنے لگتے ہیں، لیکن روحانی اعتبار سے بالکل صفر ہوتے ہیں، بلکہ بعض لوگ عقلی اعتبار سے ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندیوں کو چھو رہے ہوتے ہیں، لیکن روحانی اعتبار سے بحرِ مردار، جس میں قومِ لوط غرق ہوئی تھی، کی پستیوں میں گرے پڑے ہوتے ہیں۔ کتنے ہی لوگوں کی عقل ان کی آنکھوں میں آجاتی ہے، جس کے نتیجے میں انہیں مادی چیزوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ الہامی حکمت کے سامنے احمقوں کی طرح حیران کھڑے رہتے ہیں اور ان کی آنکھیں حقیقت کو دیکھنے سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ بعض لوگ خاص خاص میدانوں میں کامیابی حاصل کرتے ہیں تو دیگر زیادہ اہم شعبوں میں ناکام بھی رہتے ہیں، گویا انسان میں موجود متضاد صفات ایک دوسرے کے خلاف کام کرتی ہیں، جب ایک صفت میں وسعت و قوت پیدا ہوتی ہے تو دوسری صفات کو اس سے نقصان پہنچتا ہے اور جب ایک صفت میں نشوونما ہوتی ہے تو دوسری صفات ضعف کا شکار ہو جاتی ہیں۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ آپ ﷺ جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی شفیق بھی تھے، ماہرِ سیاست ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی بامروت اور باضمیر بھی تھے، مادی اور تجرباتی امور کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ روحانیات میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ جنگِ احد کے واقعے میں اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس معرکے میں آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ جنہیں آپ ﷺ حقیقی بھائی سمجھتے تھے، کو نہ صرف شہید کیا گیا، بلکہ ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ (373) آپ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحش کے جسم کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ (374) آپ ﷺ کا سرِ مبارک زخمی ہوا، آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور آپ کا جسمِ اطہر لہولہان ہو گیا، (375) لیکن جس وقت آپ کے دشمن آپ کو شہید کرنے کے لیے آپ تک پہنچنے کی غرض سے آپ پر شدید حملے کر رہے تھے اس وقت آپ کی عظیم ہستی ہاتھ اٹھائے اللہ کے حضور گڑگڑا کر یہ دعا فرما رہی تھی: ''اے اللہ میری قوم کو معاف فرما، کیونکہ وہ جانتی نہیں۔'' (376) یہ کس قدر عظیم اور عمدہ شفقت ہے کہ آپ کے دشمن تو آپ کے قتل کے درپے ہیں اور آپ ﷺ انہیں بددعا دینے کی بجائے ان کی مغفرت کے لیے اللہ کے حضور گڑگڑا رہے ہیں۔

فتح مکہ کے موقع تک آپ ﷺ کے دشمنوں نے ایذا رسانی کا کوئی ایسا طریقہ نہ چھوڑا تھا، جو انہوں نے آپ ﷺ پر آزمانہ لیا ہو۔ آپ اندازہ کیجئے کہ کیسے انہوں نے آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا مقاطعہ کر کے انہیں اپنے گھروں سے ایک صحرائی علاقے کی طرف نکال دیا اور اس برے مقاطعے کی دستاویز کو کعبے کی دیوار پر لٹکا دیا۔ اس معاہدے کی رو سے مسلمانوں کے ساتھ خرید و فروخت اور شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا، جس میں مسلمان جڑی بوٹیاں، گھاس اور درختوں کے پتے تک کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بھوک سے بچے اور بوڑھے جاں بحق ہو گئے، لیکن اہل مکہ پر کوئی اثر ہوا اور نہ ہی ان کے دل میں رحم کے جذبے نے کروٹ لی۔ کفار مکہ نے اسی پر بس نہ کی، بلکہ مسلمانوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر دور دراز کے علاقوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور وہاں بھی انہیں راحت و آرام سے نہ رہنے دیا، بلکہ مختلف سازشوں کے ذریعے ان کے سکون و اطمینان کو غارت کرتے رہے۔ بدر، احد اور خندق کے موقع پر مسلمانوں کے ساتھ خون ریز جنگیں کیں، انہیں طوافِ کعبہ جیسے بنیادی حق سے محروم رکھا اور کڑی شرائط پر مشتمل معاہدے کے تحت انہیں واپس گھروں کی طرف لوٹا دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر انعام فرمایا، چنانچہ انہوں نے مکہ کو فتح کیا اور رسول اللہ ﷺ ایک عظیم لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔

بغض و عداوت سے بھری ہوئی اس ساری تاریخ کے باوجود آپ ﷺ کا اہل مکہ کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا؟ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''جاؤ! تم آزاد ہو۔'' اگر میں نے آپ ﷺ سے یہ نصیحت حاصل نہ کی ہوتی تو اگر میں آپ ﷺ کی جگہ ہوتا تو میں اس قسم کے برتاؤ کا مظاہرہ نہ کر سکتا۔ یقیناً آپ حضرات کو بھی میری اس رائے سے اختلاف نہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ جب اپنی سواری پر مکہ میں داخل ہوئے تو ڈھال آپ کے سینے مبارک پر تھی، خود کے سر مبارک پر تھا، تلوار آپ کی دست مبارک میں تھی اور تیر آپ کی پشت پر لٹک رہے تھے، لیکن جنگی لباس کے ان تمام تر مظاہر کے باوجود آپ ﷺ رحمت شفقت کا پیکر بنے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے اہل مکہ سے پوچھا: ''تمہارے خیال میں میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کرنے والا ہوں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''اچھا برتاؤ، کیونکہ آپ صاحب کرم بھائی اور صاحب کرم بھائی کے بیٹے ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے ان سے وہی بات ارشاد فرمائی، جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمائی تھی: ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ (یوسف: ۹۲) ''(یوسف نے) کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (و ملامت) نہیں۔ خدا تم کو معاف کرے اور وہ بہت رحم کرنے والا ہے۔''[377]

آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں احتیاط برتنے میں کبھی کوتاہی نہ فرمائی۔ حسن تدبیر اور توکل کے جس مقام پر آپ ﷺ فائز تھے اس تک کوئی اور نہ پہنچ سکا۔ جب آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ہمراہ میدانِ بدر کی طرف نکلے تو آپ ﷺ نے ان کا امتحان لیا... ان میں سے ہر ایک کوہِ استقامت تھا، جسے پورے لشکر کا تنِ تنہا مقابلہ کرنے میں ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوتا۔ حضرت سعد بن معاذ اور ایک روایت کے مطابق سعد بن عبادہ نے ایسے ہی افراد کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کی تھی: ''اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر آپ ہمیں سمندر میں کودنے کے لیے کہیں گے تو ہم اس میں کود پڑیں گے اور اگر آپ ہمیں ''برک الغماد'' تک جانے کا کہیں گے تو ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔''(378)، نیز رسول اللہ ﷺ کے سامنے ان کی درج ذیل گفتگو کس قدر معنی خیز تھی: ''جس کے ساتھ آپ چاہیں تعلقات قائم فرمائیں اور جس کے ساتھ چاہیں تعلقات توڑ دیں، جسے چاہیں دشمن قرار دیں اور جس کے ساتھ چاہیں صلح فرمائیں اور ہمارے اموال میں سے جو چاہیں لے لیجئے۔''(379)

رسول اللہ ﷺ کے سپاہیوں میں سے ہر ایک سعد بن معاذ جیسے جذبات سے سرشار تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے تدابیر اختیار کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ فرمائی، بلکہ جنگ کے تمام ضروری اموراور وسائل کا انتظام فرمایا اور اس عملی دعا (کیونکہ وسائل کو اختیار کرنا عملی دعا ہے) سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھ اُٹھائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر حضورِ قلب کے ساتھ مدد کی درخواست کی... آپ ﷺ دعا میں اس قدر منہمک ہوگئے کہ آپ کی چادر مبارک گر جاتی مگر آپ کو خبر تک نہ ہوتی، حضرت ابوبکرؓ جو یہ منظر دیکھ رہے تھے، سے یہ برداشت نہ ہوتا اور آپ کو دوبارہ چادر پہنا کر عرض کرتے: ''اے اللہ کے نبی! آپ کا اپنے پروردگار سے دعا کرنا کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے کیے گئے وعدے کو ضرور پورا فرمائیں گے۔''(380)

تمام تدابیر اختیار کرنے کے باوجود پروردگارِ عالم پر اس قدر بھروسا اس اعلیٰ ترین ہستی کا خصوصی امتیاز تھا۔

۴- عالم گیر رحمت

اس موضوع کے آغاز میں میں ذکر کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی رحمت سے مؤمن، کافر اور منافقین سب نے استفادہ کیا۔ مؤمن رسول اللہ ﷺ سے اس حیثیت سے استفادہ کرتا ہے کہ آپ ﷺ

ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اہل ایمان کے نزدیک ان کی جانوں سے بھی عزیز تر ہوں، مفسرین بجا طور پر فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ ﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ (الأحزاب:٦) ''پیغمبر مؤمنوں پران کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔'' کی رو سے اہل ایمان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ ان کی جانوں سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہونے چاہئیں، لیکن حقیقت میں دونوں معانی قریب قریب ہیں، کیونکہ جس طرح ہم رسول اللہ ﷺ کو اپنی جانوں سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی اپنے بارے میں اس قسم کے جذبات رکھنے والے انسان کے ساتھ ایسی ہی محبت فرماتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ انتہائی بامروت انسان ہیں۔

یہ عقلی اور استدلالی محبت ہے۔ اگرچہ اس محبت میں جذبات کا پہلو بھی ہے، تاہم علم اور منطق کی گہرائی بھی اس محبت کے اہم ترین پہلو ہیں۔ اگر اس موضوع پر مکمل تحقیق کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی تو یہ محبت انسان کے دل میں جڑ پکڑ کر اس قدر مضبوط ہو جاتی کہ انسان آپ ﷺ کے تذکروں کے پیچھے ایسے ہی دوڑتا جیسے قیس اپنی لیلیٰ کے پیچھے دوڑتا تھا۔ وہ جب بھی آپ ﷺ کا نام زبان پر لاتا تو اپنے دل کو پگھلتا ہوا محسوس کرتا اور آپ ﷺ کے دیدار سے خالی زندگی کو ہجر و فراق کی زندگی قرار دیتا۔ رسول اللہ ﷺ یقیناً ہمیں اپنی جانوں سے بھی عزیز تر ہیں، کیونکہ ہمیں اپنی جانوں کی وجہ سے طرح طرح کے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن آپ ﷺ کے حضور سے ہمیں کرم، رحمت، بھلائی، شفقت اور مروت ہی ملی ہے۔ چونکہ آپ ﷺ رحمت خداوندی کے ترجمان ہیں، اس لیے آپ ﷺ ہمیں اپنی جانوں سے عزیز تر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی اس بات میں کہ وہ اہل ایمان کو ان کی جانوں سے بھی عزیز تر ہیں بالکل سچے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ (الأحزاب:٦) ''پیغمبر مؤمنوں پران کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے: ''میں اہل ایمان پران کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں، لہٰذا اگر کوئی مقروض ہونے کی حالت میں فوت ہوا تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہوگی اور جس نے مال چھوڑا تو وہ ورثہ کا ہوگا۔''[381] اس حدیث کا شروع کا حصہ کچھ یوں ہے: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی مقروض شخص کی میت لائی جاتی تو آپ ﷺ پوچھتے: ''کیا اس نے اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے مال چھوڑا ہے؟'' اگر آپ ﷺ کو بتایا جاتا کہ اس نے ادائیگی کے لئے مال چھوڑا ہے تو آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ ادا فرماتے، ورنہ فرماتے: ''اپنے ساتھی کی نماز جنازہ خود ہی پڑھ لو۔'' لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتوحات عطا فرمائیں تو آپ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: ''میں اہل ایمان پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں، لہٰذا اگر کوئی مقروض ہونے کی حالت میں فوت ہوا تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہوگی اور جس نے مال چھوڑا تو وہ ورثہ کا ہوگا۔''(382)

رسول اللہ ﷺ کا اہل ایمان کے نزدیک دنیا و آخرت میں ان کی جانوں سے عزیز تر ہونا رحمت ہے اور رحمت کا یہ پہلو ہمیشہ جاری رہے گا۔

آپ ﷺ منافقین کے لیے بھی رحمت تھے۔ اسی وسیع رحمت کی بدولت منافقین کو دنیوی زندگی میں عذاب کا سامنا نہیں کرنا پڑا، وہ مسجد میں آتے، مسلمانوں سے ملتے جلتے اور مسلمانوں کو حاصل تمام حقوق سے لطف اندوز ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے نفاق اور دل کی کیفیات کو جاننے کے باوجود ان کی منافقت کے راز کو کبھی افشا نہ فرمایا، تاہم آپ نے حضرت حذیفہ کو اس بارے میں رازدان بنایا تھا،(383) اسی لیے حضرت عمرؓ حضرت حذیفہ کو دیکھتے رہتے اگر وہ کسی جنازہ میں شریک نہ ہوتے تو حضرت عمر بھی اس میں شرکت نہ فرماتے،(384) لیکن اس کے باوجود اسلام نے ان کی پردہ دری نہیں کی۔ وہ اہل ایمان کے درمیان رہتے رہے اور کم از کم ان کا کفر مشکوک ضرور رہا، جس کی وجہ سے وہ دنیوی لذتوں سے محروم نہ ہوئے، کیونکہ جو یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ فنا ہو جائے گا وہ اپنی زندگی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس کا کفر شکوک وشبہات کا شکار ہو جائے تو بعض اوقات اس کے دل میں آتا ہے کہ ہوسکتا ہے اخروی زندگی کا بھی وجود ہو، جس کے نتیجے میں اس کی زندگی مکمل طور پر تاریک نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ منافقین کے لیے بھی رحمت تھے۔

کفار بھی رسول اللہ ﷺ کی رحمت سے محروم نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ پہلی امتوں کو کفر و نافرمانی کی وجہ سے اجتماعی طور پر ہلاک فرما دیتے تھے، لیکن ہمارے نبی ﷺ کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اجتماعی عذاب کو اٹھا لیا۔ اس طرح انسانیت کو اس قسم کے عذاب سے نجات مل گئی اور یہ بات کفار کے حق میں دنیوی نعمت ثابت ہوئی۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ (الأنفال: ٣٣) ''اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور وہ انہیں عذاب دیتا۔''

نبی کریم ﷺ کے صدقے اللہ تعالیٰ نے اجتماعی عذاب کو اٹھا لیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ

تعالیٰ سے عرض کریں گے: ﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ (المائدة:١١٨) ''اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔'' لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے یوں فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ (الأنفال:٣٣) ''اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا۔''

اللہ تعالیٰ کے ہاں نبی کریم ﷺ کی قدر و منزلت کا اندازہ کیجئے کہ جب تک آپ ﷺ ان میں رہیں گے، جب تک آپ کا ذکر موجود رہے گا، زبانیں آپ کے ذکر سے تر رہیں گی اور لوگ آپ کے راستے پر چلتے رہیں گے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دیں گے اور نہ ہی انہیں برباد کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ سے کفار کو پہنچنے والے فائدے کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے لعنت بھیجنے والا بنا کر مبعوث نہیں فرمایا، بلکہ رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔''(385) یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لیے نہیں بھیجا کہ میں لوگوں پر لعنت اور مصائب کی بددعا کروں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ساری انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے اپنے سخت ترین دشمنوں کی ہدایت کے لیے بھی دعا فرمائی اور اس مقصد کے لیے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دیں۔

جبرائیل امین علیہ السلام نے بھی رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے نور سے استفادہ کیا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: ''کیا تمہیں اس رحمت میں سے کچھ حصہ ملا ہے؟'' اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کی: ''ہاں، مجھے اپنے انجام کے بارے میں اندیشہ لگا رہتا تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ ﴿ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ (20) مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ (التکویر:٢٠-٢١) ''جو صاحب قوت مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا ہے۔ سردار (اور) امانت دار ہے۔'' میں میری تعریف فرمائی تو مجھے اطمینان ہو گیا۔(386)

رسول اللہ ﷺ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: ''میں محمد، احمد، مقفّی(387)، حاشر(388)، توبہ کا نبی اور رحمت کا نبی ہوں۔''(389) توبہ کا دروازہ اسی لیے قیامت تک کھلا رہے گا کہ رسول اللہ ﷺ رحمت اور توبہ کے نبی ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت اور حکمرانی قیامت تک جاری رہے گی۔

رسول اللہ ﷺ اگر کسی بچے کو روتا ہوئے دیکھتے تو اس کے پاس بیٹھ کر خود بھی رونے لگتے، کیونکہ

آپ اپنے دل میں ماں کے دکھ اور تکلیف کو محسوس فرماتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی درج ذیل حدیث میں ہمیں اسی قسم کی رحمت وشفقت کی جھلک دکھائی دیتی ہے: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جب میں نماز شروع کرتا ہوں تو میرا ارادہ اسے لمبا کرنے کا ہوتا ہے، لیکن مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں اس کے بارے میں اس کی ماں کی فکرمندی کے خیال سے نماز کو مختصر کر دیتا ہوں۔''(390)

آپ ﷺ لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتے تھے، خاص طور پر آپ ﷺ کے نوافل تو اس قدر لمبے ہوا کرتے تھے کہ صحابہ کی استطاعت سے باہر ہوتے، لیکن اس کے باوجود جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور نماز کو لمبا کرنا چاہتے اور کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز کو مختصر فرما دیتے، اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں عورتیں بھی باجماعت نماز ادا کیا کرتی تھیں، چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں بچے کی ماں نماز میں شریک نہ ہو آپ نماز کو مختصر کر کے جلدی جلدی ادا فرماتے تا کہ بچے کی ماں کے دل کو سکون مل سکے۔ آپ ﷺ ہر معاملے میں شفقت کا پیکر تھے، بچے کا رونا نہ صرف آپ کو تکلیف پہنچاتا، بلکہ آپ کو رلاتا، لیکن اہم بات یہ ہے کہ آپ ﷺ اس قدر وسیع رحمت وشفقت کے باوجود انتہائی معتدل مزاج کے حامل تھے۔ آپ ﷺ کی یہ رحمت وشفقت کسی بھی قسم کی شرعی حدود کے قیام کی راہ میں حائل نہ ہوتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک صحابی حضرت ماعز رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کیجئے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان سے چہرہ پھیر کر فرمایا: ''تیرا ناس ہو! لوٹ جا۔ توبہ کر اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ۔'' لیکن حضرت ماعز اپنے آپ کو پاک کرانے پر اصرار اور اس کا مطالبہ کرتے رہے۔ جب انہوں نے چوتھی مرتبہ یہ بات کہی تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''تمہیں کس چیز سے پاک کروں؟'' تو حضرت ماعز نے عرض کی: ''یارسول اللہ! زنا سے۔'' حضرت ماعز شادی شدہ یعنی محصن شخص تھے اور محصن شخص کے لیے زنا کی سزا رجم ہے۔ اس بات کو قیامت تک ذہن نشین کرانے کے لیے آپ ﷺ نے اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: ''کیا یہ پاگل ہے؟'' آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں۔ بعض روایات میں درج ذیل جواب منقول ہے: ''ہم تو یہی جانتے ہیں کہ یہ کامل العقل اور نیک انسان ہے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''کیا اس نے شراب پی ہوئی ہے؟'' ایک آدمی نے اٹھ کر اس کے منہ کی بو سونگھی، لیکن اسے شراب کی بو محسوس نہ ہوئی پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماعز سے پوچھا: ''کیا تم نے زنا کیا ہے؟'' انہوں نے اس کا اقرار

کیا، جس پر آپ ﷺ نے انہیں رجم کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ماعز کو رجم کرنے کے لیے جنازہ گاہ کی طرف لے جایا گیا۔ جب انہیں پتھر لگے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے، ایک آدمی جس کے ہاتھ میں اونٹ کے جبڑے کی ہڈی تھی، نے ان کے پاس پہنچ کر انہیں وہ ہڈی دے ماری، جس سے وہ زمین پر آ گرے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے ان کے بھاگنے کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا۔''

حضرت ماعز کے بارے میں صحابہ کرام کی دو رائیں ہو گئیں، بعض کہتے تھے کہ ان کی موت گناہ کی حالت میں ہوئی، جبکہ دیگر بعض کے خیال میں حضرت ماعز سے بہتر کسی کی توبہ نہ تھی، کیونکہ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے ہاتھ میں دیا اور رجم کیے جانے کی درخواست کی۔ اسی طرح دو تین گزر گئے۔ ایک روز صحابہ کرام بیٹھے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا: ''ماعز بن مالک کے لیے دعائے مغفرت کرو۔'' لوگوں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ ماعز بن مالک کی مغفرت فرمائے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک پوری امت پر تقسیم کی جاتی تو اسے کافی ہو جاتی۔''(391) رسول اللہ ﷺ معتدل مزاج انسان تھے۔ اگر بالفرض حضرت ماعز دوبارہ زندہ ہو جاتے اور پھر اسی گناہ کا ارتکاب کرتے تو رسول اللہ ﷺ ان پر دوبارہ یہی سزا جاری فرماتے۔

بنی مقرن کی ایک خادمہ تھی، جسے ان میں سے کسی نے تھپڑ مارا، وہ روتی ہوئی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی اور شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے مالک کو بلوایا اور اس سے فرمایا: ''اسے آزاد کر دو۔'' مالکوں نے کہا کہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی خادم نہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ اس سے خدمت لیتے رہیں، لیکن جوں ہی اس سے مستغنی ہوں اس کا راستہ چھوڑ دیں۔''(392) اگر اس ظالمانہ تھپڑ کا گناہ قیامت کے دن تک باقی رہتا تو وہاں انہیں اس سے زیادہ سخت اور شدید تھپڑوں کا سامنا کرنا پڑتا، اسی لیے قیامت کے دن جہنم کے عذاب سے بچانے کے لیے بدلے کے طور پر اس کی آزادی کو اس تھپڑ کا بدل قرار دیا گیا۔(393)

۵۔ بچوں پر شفقت

آپ ﷺ کا شفقت کا معاملہ خاص طور پر اپنے بچوں پر بالکل ہی منفرد تھا۔ آپ ﷺ اکثر اس گھر تشریف لے جاتے، جس نے آپ ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم کی رضاعت کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی۔ آپ ﷺ دیر تک انہیں اپنی گود میں لیے رکھتے، ان پر جھکتے اور انہیں بوسے دیتے۔(394)

جب اقرع بن حابس تمیمی نے رسول اللہ ﷺ کو حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو بوسے دیتے اور گود میں لیتے ہوئے دیکھا تو کہا: ''میرے تو دس بچے ہیں، لیکن میں نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چوما۔'' آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا: ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''(395) ایک اور حدیث نبوی میں ہے: ''تم اہل زمین پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''(396) ایک بدوی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ''کیا تم لوگ بچوں کو چومتے ہو؟ ہم تو انہیں نہیں چومتے۔'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل سے رحم کے جذبے کو نکال لیا ہے تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔''(397)

جس طرح رسول اللہ ﷺ اپنے عزیز واقارب پر مہربان تھے، اسی طرح آپ اپنے دور وقریب کے دوستوں پر بھی الطاف وعنایات فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں ہے: ''ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے، نبی کریم ﷺ حضرت عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے ہمراہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب آپ ﷺ ان کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ ان پر جھکے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا ان کی موت واقع ہو چکی ہے؟'' لوگوں نے عرض کی: ''نہیں یا رسول اللہ!'' (یہ منظر دیکھ کر) آپ ﷺ پر گریہ طاری ہو گیا اور آپ کو روتے ہوئے دیکھ کر لوگ بھی رونے لگے۔ (اس موقع پر) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سنو! اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسوؤں پر عذاب دیتے ہیں اور نہ ہی دل کے رنج والم پر۔'' اور پھر اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''لیکن اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے عذاب دیتے ہیں۔''(398)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسوؤں پر عذاب نہیں دیتے، بلکہ بعض آنسوؤں کی وجہ سے تو عذاب کو اٹھا لیتے ہیں، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''دو قسم کی آنکھوں کو آگ نہیں چھوئے گی؛ ایک وہ آنکھ جو خوفِ خدا سے روئی اور دوسری وہ آنکھ جو راہِ خدا میں پہرہ دیتے ہوئے رات بھر جاگتی رہی۔''(399) ان میں سے ایک عبادت گزاروں کی آنکھ ہے اور دوسری شہسواروں کی آنکھ ہے۔ وہ رات کو اپنی عبادت اور سجدوں میں آنسو بہانے والے عبادت گزار ہوتے تھے اور دن کو شیروں کی طرح دشمنوں پر پلٹے جھپٹتے حملہ آور شہسوار ہوتے تھے۔ یہ حقیقی اہل ایمان کے آنسو تھے۔ صحابہ کرام بھی اسی قسم کے اہل ایمان تھے، جو رات کو عبادت گزار ہوتے تو دن کو شہسوار ہوتے۔

جب رسول اللہ ﷺ کو حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع ملی تو آپ جلدی

سے ان کے گھر پہنچے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے قریبی اہل تعلق میں سے تھے۔ آپ ﷺ ان پر بہت روئے، لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی نے کہا: ''اے ابوالسائب! خدا تم پر رحم کرے، میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عزت بخشی۔'' تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہیں کس نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت بخشی؟ خدا کی قسم! پیغمبر خدا ہونے کے باوجود مجھے نہیں معلوم کہ خود میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''(400)

اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ انتہائی میانہ رو انسان تھے۔ آپ ﷺ کی شفقت اور گریہ وزاری غلطی کی اصلاح کرنے میں رکاوٹ نہ بنتی تھی۔ اپنے کسی محبوب صحابی پر بہائے جانے والے آنسو اس کے بارے میں مبالغہ آمیز یا غلط رائے کی تصحیح کی راہ میں حائل نہ ہوتے تھے۔ جذبۂ وفا اور حق پرستی کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ ہر ہفتے شہدائے احد کی قبروں کی زیارت کے لیے جاتے،(401) لیکن آپ ﷺ نے کبھی نہیں فرمایا: ''تم جنت کی طرف پرواز کر گئے۔'' ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر وہ جنت میں نہیں گئے تو پھر کون جنت میں جائے گا؟ اس لیے کہ یہی حکم خداوندی ہے۔

کیا آپ ﷺ نے یتیم کی کفالت کرنے والے شخص کو جو قدر و منزلت دی ہے وہ آپ ﷺ کی رحمت و شفقت کی کافی دلیل نہیں؟ ذرا آپ ﷺ کے اس ارشاد پر غور فرمائیے: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایسے ہوں گے۔'' پھر آپ ﷺ نے اپنی شہادت اور درمیان والی انگلیوں کی طرف اشارہ فرمایا اور ان کے درمیان تھوڑا سا خلا پیدا کیا۔(402) گویا رسول اللہ ﷺ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جنت میں میرے اور یتیم کی کفالت کرنے والے کے درمیان کوئی بھی حائل نہ ہوگا۔

٦- حیوانات پر شفقت

آپ ﷺ کی شفقت سے حیوانات بھی محروم نہ تھے۔ یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ ایک عورت ایک بلی کے سبب جہنم میں داخل ہوئی اور ایک فاحشہ عورت ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کے سبب جنت کی مستحق ٹھہری۔ یہاں میں موضوع کو سمیٹتے ہوئے اس سے متعلق ایک اور واقعے کا ذکر مناسب خیال کرتا ہوں۔

حضرت عبدالرحمان بن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپ ﷺ قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے کہ ہم نے ایک چڑیا دیکھی جس کے ہمراہ دو بچے بھی تھے۔ ہم نے اس کے بچوں کو پکڑا تو وہ ہمارے پاس آ کر پھڑ پھڑانے لگی، اسی

دوران رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور یہ منظر دیکھ کر دریافت فرمایا: ''کس نے اسے اس کے بچوں کی وجہ سے تکلیف پہنچائی ہے؟ اسے اس کے بچے لوٹا دو۔''(403) بلاشبہ آپ ﷺ کی شفقت حیوانات کو بھی حاصل تھی۔ پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء میں سے ایک نبی پر چیونٹیوں کی بستی کو جلانے کی وجہ سے اظہار ناراضی فرمایا تھا۔ جب انہوں نے قصداً یا بلاقصد چیونٹیوں کی ایک بستی کو جلایا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر فوراً اظہارِ ناراضی ہوا۔(404) ہمارے نبی کریم ﷺ جنہوں نے ہمیں اس قسم کے واقعات بتائے ہیں، سے صرف اسی قسم کے کردار کی توقع کی جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ کی امت میں ایسے افراد گزرے ہیں، جن کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو کسی چیونٹی کو بھی تکلیف نہیں پہنچاتے۔ یہ لوگ اپنے پاؤں میں گھنٹیاں باندھ لیا کرتے تھے تاکہ گھنٹی کی آواز سن کر حشرات الارض ان کے راستے سے ہٹ جائیں اور ان کے قدموں تلے نہ آئیں۔ یہ کس قدر گہرائی و گیرائی کی حامل شفقت ہے اور رحمت کی کتنی عمدہ مثال ہے کہ چیونٹی بھی آپ ﷺ کی رحمت کے دائرے سے خارج نہیں۔ ایسا انسان کبھی بھی جان بوجھ کر ظلم وستم کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔

رسول اللہ ﷺ ''منیٰ'' میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک چٹان سے سانپ نکل آیا۔ صحابہ کرام اسے مارنے کے لیے دوڑے، لیکن وہ کسی چٹان کی درز میں گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ جو یہ منظر دور سے دیکھ رہے تھے، نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے اور تمہیں اس کے شر سے بچالیا۔''(405)

رسول اللہ ﷺ کی رائے میں صحابہ کرام کے اس ارادے میں بھی شر پنہاں تھا، اس لیے کہ مقتول اگرچہ سانپ ہی کیوں نہ ہو دنیا کے اس نظام میں اس کا بھی مخصوص مقام ہے۔ کسی بھی غیر ضروری قتل سے ماحولیاتی توازن خراب ہوتا ہے اور اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زراعت کے تحفظ کے نام پر حشرات الارض کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ماحولیاتی توازن کے تناظر میں ایک جرم ہے، لیکن تعجب کی بات ہے کہ آج اس جرم کا ارتکاب سائنس کے نام پر کیا جارہا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے بکری کو ذبح کرنے کے لیے لٹایا اور پھر چھری تیز کرنے لگا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم نے اپنی چھری اسے لٹانے سے پہلے کیوں نہ تیز کرلی۔''(406) یہ اس شخص پر ایک قسم کا اظہارِ ناراضی تھا۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے مروی ہے کہ ایک اونٹ دوڑتا ہوا آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا پھر وہ آپ ﷺ کے سامنے کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اس اونٹ کا مالک کون ہے؟'' لوگوں نے کہا: ''فلاں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے

بلاؤ۔" چنانچہ لوگ اسے لے آئے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "یہ تمہاری شکایت کررہا ہے۔" اس نے عرض کی: "یارسول اللہ! ہم بیس سال تک اس اونٹ سے بار برداری کا کام لیتے رہے ہیں، اب ہم نے اسے ذبح کرنے کا ارادہ کیا ہے۔" اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس نے اسی بات کی شکایت کی ہے۔تم نے اسے بہت برا بدلہ دیا ہے۔بیس سال تک اس سے کام لینے کے بعد جب اس کی ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور جلد پتلی ہوگئی تو تم نے اسے ذبح کرنے کا ارادہ کرلیا۔" مالک نے کہا: "یارسول اللہ! یہ آپ کا ہوگیا۔" چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر اسے دوسرے اونٹوں کی طرف بھیج دیا گیا۔[607]

رسول اللہ ﷺ کی رحمت وشفقت آج کے ہیومن ازم کے علمبرداروں کی مزعومہ رحمت سے کہیں بڑھ کر تھی، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنی عظیم فراست کے ذریعے اپنی اس وسیع رحمت کو افراط وتفریط کا شکار ہونے سے بچالیا۔

آپ ﷺ نے کبھی بھی نرمی، رحمت یا درگزر کے نام پر کسی برائی یا گناہ کے بارے میں نرمی برتی اور نہ ہی اسے پنپنے یا جڑیں پھیلانے کا موقع دیا، کیونکہ آپ ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ بہیمانہ طبیعت کے مالک گناہ گار مجرم کے ساتھ کسی بھی قسم کی درگزر کا نتیجہ ہزاروں بے گناہ انسانوں کے حقوق کی پامالی کی صورت میں نکلے گا۔ ہمیں انتہائی افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑرہا ہے کہ ماضی کی بہ نسبت دورِ حاضر میں اس قسم کی زیادتیوں کی مثالیں کافی زیادہ تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ ہم نے انتشار پسندوں اور اسلامی عقائد، ورثے اور ماضی کے دشمنوں سے درگزر کے نتائج کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے اور آج بھی کررہے ہیں، جس کی تکلیف سے ہمارے دل پارہ پارہ ہیں۔ اگر رحمت وشفقت کو میانہ روی کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے تو انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کے انتہائی برے نتائج برآمد ہوتے ہیں، تاہم رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں رحمت کے منفی استعمال کی ایک بھی مثال کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ انسانیت کے ساتھ جان سوزی کی حد تک محبت کرتے تھے۔ آیت مبارکہ ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ (الکہف: ٦) "(اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم ان کے پیچھے رنج کرکر کے اپنے تئیں ہلاک کردو گے۔" میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے، نیز جب نبوت کی بادِ نسیم کے جھونکے

آپ ﷺ کو محسوس ہوئے اس وقت آپ ﷺ ایک غار میں معتکف تھے اور وہیں آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کو انسانیت سے محبت تھی اور آپ نے اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا تصورِ جہاد بھی چشمہ رحمت سے پھوٹتا ہے، بعض اوقات لوگوں کو جہاد کی وجہ سے کچھ دنیوی نقصان پہنچتا ہے، لیکن اس کے بدلے انہیں اخروی زندگی میں اس قدر نفع پہنچتا ہے کہ اس کے مقابلے میں یہ نقصان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی تلوار کی دھار سے جنت کے راستے کھولتے تھے، لہٰذا یہ بھی آپ ﷺ کی عالمگیر رحمت کا ایک پہلو ہے۔

د: بردباری

گزشتہ فصل میں ہم نے اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خدائی شانِ رحمانیت ورحیمیت کے بہترین ترجمان تھے اور آپ ﷺ نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنی اعلیٰ ترین فراست کے ذریعے رحمانیت ورحیمیت کے بارے میں توازن کو برقرار رکھا۔ اگرچہ ان تمام حقائق کا احاطہ کر کے انہیں کماحقہ پیش کرنا انتہائی دشوار ہے، تاہم ہم نے اختصار کے ساتھ ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس فصل میں ہم رسول اللہ ﷺ کی رحمت کے ایک اور پہلو کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ پہلو آپ ﷺ کی بردباری اور نرم مزاجی ہے۔

بردباری نبی کریم ﷺ کو عطا کی گئی ایک اور سنہری کنجی ہے، جس کے ذریعے آپ ﷺ بہت سے دلوں کو جیت کر ان میں جلوہ گر ہو گئے۔ اگر آپ ﷺ کی بردباری نہ ہوتی تو نرمی سے نا آشنا بہت سے نفوس کو خشونت کا سامنا کرنا پڑتا، جس کے نتیجے میں وہ نبی کریم ﷺ سے دور ہو کر دشمنانِ اسلام کی صفوں میں جا کھڑے ہوتے، لیکن آپ ﷺ کی بردباری کی وجہ سے ایسا نہ ہوا، بلکہ لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ بردباری اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو عطا کردہ اہم ترین وصف ہے، جو آپ ﷺ پر رحمت خداوندی کا عکاس ہے۔ قرآن کریم اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) ''(اے محمد) خدا کی مہربانی سے تمہاری افتادِ مزاج ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوئی ہے اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ تو ان کو معاف کردو اور ان کے لیے (خدا سے) مغفرت مانگو اور اپنے کاموں میں ان سے مشاورت لیا کرو اور جب (کسی کام کا) عزم مصمم کر لو تو خدا پر بھروسا رکھو۔ بیشک خدا بھروسا رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

قرآن کریم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بردباری کا سرچشمہ رحمت خداوندی ہے، اگر رسول اللہ ﷺ درشت مزاج اور سنگ دل ہوتے، اگرچہ آپ ﷺ ایسے ہرگز نہ تھے، تو لوگ آپ ﷺ سے دور ہو جاتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ کا تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ ﷺ کو اس قدر نرم مزاج بنایا جائے کہ آپ ﷺ کو تکلیف پہنچانے کے لیے اٹھنے والے ہاتھوں نے جنہیں شدید ترین ردِ عمل کی

توقع تھی، آپ ﷺ کی طرف سے نرمی اور مہربانی ہی پائی، جو لوگ آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے ان کے لیے آپ سراپا لطف وعنایت تو تھے ہی۔

یہ آیت مبارکہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے جنگ کی حکمت عملی واضح طور پر بیان فرمادی تھی، تاہم بعض حضرات نبی کریم ﷺ کی طرف سے دیئے گئے احکامات کو اچھی طرح نہ سمجھ پائے اور اپنی جگہیں چھوڑنے کا حکم ملنے سے پہلے، اپنی جگہیں چھوڑ دیں، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، اگرچہ یہ شکست فاش نہ تھی، لیکن فتح مبین بھی نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ نے بہت سے مسلمانوں کے دل توڑ کر انہیں بے حوصلہ کر دیا، چنانچہ صحابی رسول انس بن نضر مسلمانوں سے کہتے پھرتے تھے: ''آپ ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ اٹھو اور اس مقصد کی خاطر کٹ مرو جس کی خاطر رسول اللہ ﷺ نے موت کو گلے لگایا ہے۔''[408] چنانچہ وہ صحابہ کرام اٹھے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جس راستے میں رسول اللہ ﷺ کی موت واقع ہوئی ہو اسی راستے میں مرنا صحابہ کرام کا نصب العین تھا۔

اگر مسلمان نبی کریم ﷺ کے احکامات پر عمل درآمد کرتے تو انہیں فتح حاصل ہو سکتی تھی، لیکن آپ ﷺ کے حکم سے تھوڑے سے انحراف کی وجہ سے انہیں اس قدر المناک نتیجے کا سامنا کرنا پڑا۔ ذرا غور فرمایئے اگر اس موقع پر مسلمانوں کی قیادت رسول اللہ کے سوا کسی اور کے پاس ہوتی تو وہ احکامات کی اطاعت نہ کرنے والے ان لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا؟ کیا ان کے ساتھ اس کا برتاؤ ایسے ہی ہوتا جیسے اس نے ان کو کسی قسم کی ہدایات دی ہی نہ ہوں؟ پھر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے مادی وروحانی قائد بھی تھے، انہیں ہر قسم کی بھلائی اور باعث فضیلت بات رسول اللہ ﷺ کے ذریعے معلوم ہوئی تھی، وہ سینکڑوں بار دیکھ چکے تھے کہ آپ ﷺ ہر معاملے میں درست فیصلہ فرماتے ہیں، ایسی عظیم ہستی نے انہیں سختی سے ہدایت کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ اب وہ آپ ﷺ کے حکم کی مخالفت کا انجام دیکھ رہے تھے۔ شہداء کے علاوہ تقریباً کوئی بھی زخموں سے محفوظ نہ تھا حتی کہ رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک زخمی اور دانت مبارک شہید ہو گیا اور خون سے آپ کا جسم مبارک رنگین ہو گیا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی جگہ اس وقت کوئی اور قائد ہوتا تو کیا اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار نہ ہوتے؟ کیا وہ کم از کم یہ کہہ کر ان پر اظہارِ برہمی نہ کرتا کہ کیا میں نے تمہیں فلاں فلاں ہدایات نہ دی تھیں؟ کیا وہ انہیں ان کی غلطیاں یاد نہ کراتا؟ لیکن اوپر ذکر کردہ آیت مبارکہ آپ ﷺ کو خطاب کر کے پہلے سے ہی آپ ﷺ کے دل میں اس قسم کے خیالات کے آنے کا سدباب کر دیتی ہے۔

یہ انتہائی نازک اور حساس لمحات تھے، اس وقت کسی بھی کلام یا اشارے کے اثرات کئی گنا شدت سے ظاہر ہوتے، اس لیے کسی بھی ایسے تصرف سے بچنا ضروری تھا، جس سے صحابہ کی دل شکنی ہو سکتی تھی، اسی لیے آیت مبارکہ ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آلِ عمران: ۱۵۹) ''(اے محمد) خدا کی مہربانی سے تمہاری افتادِ مزاج ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوئی ہے اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔'' نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں صحابہ کرام کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ ہمیشہ آپ ﷺ کے گرد جمع رہے اور آپ کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے رہے۔

آپ ﷺ کے اخلاق قرآن کا عملی نمونہ تھے،(409) خود قرآن اس خدائی خلق کی تعلیم دیتا ہے۔ کیا ہم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی سرکشی و نافرمانی کے باوجود انہیں رزق پہنچاتے رہتے ہیں؟ اگرچہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ پر بہتان طرازی کرتے ہوئے دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں یا اس کے لیے بیٹا یا بیوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنی شانِ رحمانیت کے صدقے انہیں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتے ہیں۔ سورج روزانہ انہیں روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے، بادل ان کی نفع رسانی کے لیے بارش برساتے ہیں اور طرح طرح کی نباتات انہیں لذیذ پھل مہیا کرتی ہیں، لیکن وہ ان تمام نعمتوں کا بدلہ ناقابلِ فہم انکار کی صورت میں دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے لاکھویں حصے کا بھی شکر ادا نہیں کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی بردباری کی وجہ سے انہیں فوراً سزا دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی غلطیوں کی پاداش میں اپنا قانون بدلتے ہیں، بلکہ ان پر روزی اور انعامات کی بارش جاری رکھتے ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ خدائی صفات اور اسمائے حسنیٰ کے آئینہ دار تھے، اس لئے آپ ﷺ خدائی اخلاق سے آراستہ تھے، چنانچہ قرآن کریم آپ ﷺ کے بارے میں کہتا ہے: ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبة: ۱۲۸) ''مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔'' یہ صرف آپ ﷺ کی ہی خوبی نہ تھی، بلکہ آپ ﷺ کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی یہی شان تھی، چنانچہ قرآن کریم ان کے بارے میں کہتا ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ﴾ (هود: ۷۵) ''بے شک ابراہیم بڑے تحمل والے، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام بردباری کے اتنے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ وہاں تک کسی اور کے لیے پہنچنا ممکن نہ تھا۔ آپ علیہ السلام ان لوگوں پر بھی رحم کھاتے تھے، جنہوں نے آپ کو جلانے کے لئے آگ میں پھینکا تھا۔ آپ علیہ السلام کو فکر رہتی کہ کہیں ان پر خدا کی طرف سے کوئی مصیبت نہ

آجائے، اس مقصد کے لیے وہ ساری ساری رات جاگتے اور ان کی خاطر آہ وزاری کرتے۔ وہ ہر گھڑی اللہ کی طرف متوجہ رہتے، اسی کے ساتھ لو لگاتے اور اسی کی چوکھٹ پر ڈرتے دل اور بہتی آنکھوں کے ساتھ کھڑے رہتے۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دیا کرتے تھے۔ (410) بلاشبہ آپ ﷺ بردباری اور نرم مزاجی میں اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر تھے۔

حق کے علمبرداروں کے لیے بردباری بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ کینے اور ناپسندیدگی کے جذبات سے بھرے ہوئے انسانوں کے ساتھ بھی بردباری سے پیش آئے۔ حسین بن منصور حلاج نے ان لوگوں کو بھی معاف فرمادیا تھا، جنہوں نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے تھے، اسی طرح بیسویں صدی کے عظیم داعی (411) جنہیں ایک شرپسند مجرم کی طرح اپنے وطن سے جلاوطن کردیا گیا اور ان کی ساری زندگی ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل ہوتے گزری، نے اپنے اوپر ظلم وستم ڈھانے والوں کے خلاف بددعا کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت اور ان کے ایمان کی حفاظت کی دعا کر کے بردباری کی عمدہ مثال قائم کی۔ کاش ان کے بعد آنے والے ان کی بردباری کی سحر انگیزی کو سمجھ سکتے۔

ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے کی طرف دوبارہ آتے ہیں۔ آپ علیہ السلام کے دشمنوں نے انہیں آگ میں پھینک دیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آگ کو ان کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی والی بن جانے کا حکم دیا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ﴾ (الأنبياء: ٦٩) ''ہم نے حکم دیا اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی (بن جا)۔'' یعنی ان کے لیے گرم رہو اور نہ ٹھنڈی، بلکہ سلامتی والی بن جاؤ، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح اپنے آپ کو اہل جہاں کے لیے آراستہ کیا تھا۔ آپ ان پر ناراض ہوتے اور نہ ہی ان کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتے۔ چونکہ آپ علیہ السلام سلامتی کے حامل انسان تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو خدائی اخلاق اپناتے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کسی اور طرح کا معاملہ فرماتے۔ ''السلام'' اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، اس لیے آگ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے سلامتی والی بن گئی۔

جس بردباری کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا نبی کریم ﷺ نے اسے کمال کی چوٹیوں تک پہنچادیا۔ جب آپ ﷺ اپنے دشمنوں کا مکمل طور پر صفایا کرنے پر قادر ہو گئے، تب بھی آپ ﷺ نے مروت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اگر آپ ﷺ مجرموں کو سزا دینا چاہتے تو بھلا کون آپ کو روک سکتا تھا؟ بلکہ اس کے برعکس حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسے سینکڑوں صحابہ ہمہ وقت رسول

اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانے یا آپ کے دل کے تکدر کا باعث بننے والی ہر چیز کے خاتمے اور اس کا ارتکاب کرنے والے کی گردن اڑانے کے لیے تیار اور اس کی اجازت کے منتظر رہتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اپنے صحابہ کا جوش ٹھنڈا کرتے اور انہیں بردباری اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ منافقین نے آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ پر بہتان طرازی کی، جبکہ آپ ﷺ کو ان کی پاکدامنی وشرف پر پورا اعتماد تھا۔ اگر آپ ﷺ کسی بھی مسلمان کو ہلکا سا اشارہ فرماتے تو کئی منافقوں کی گردنیں کٹ جاتیں۔ کوئی بھی مسلمان آپ ﷺ کے حکم کے نفاذ میں پس وپیش نہ کرتا۔ کئی دن گزر گئے، لیکن آپ ﷺ خاموشی کے ساتھ کڑوے گھونٹ پیتے اور دل میں شدید تکلیف محسوس کرتے رہے یہاں تک کہ وہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں، جنہوں نے عائشہ صدیقہؓ کی برأت کا اعلان کیا، حالانکہ صحابہ کرام آپ ﷺ کے ہونٹوں سے ایک بھی حرف نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ بعض اوقات لوگ آپ ﷺ کے پاس آتے اور آپ سے سختی کے ساتھ پیش آتے، بلکہ بسا اوقات تو تکلیف دہ گفتگو کرتے۔ اگر آپ ﷺ اپنی انگشت مبارک کا ہلکا سا بھی اشارہ فرماتے تو ایسے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے لیے سینکڑوں تلواریں نکل آتیں، لیکن آپ ﷺ نے تو تہیہ کر رکھا تھا کہ اس قسم کے امور کا ہمیشہ نرمی اور بردباری سے سامنا کرنا ہے۔ آپ ﷺ اس بات کی کوشش فرماتے کہ آپ کی وجہ سے کسی کو خوف یا ڈر لاحق نہ ہو۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”کسی مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان کو خوف زدہ کرنا جائز نہیں۔“(412) ایک اور موقع پر آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ”تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی طرف اسلحہ کے ساتھ اشارہ نہ کرے۔“(413) ایسے انسان سے کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے انسان پر ناحق اور ظلماً زیادتی کرے؟

چونکہ آپ ﷺ انتہائی لطیف ذوق کے مالک تھے، اس لیے آپ ﷺ ان درشت اور احمقانہ حرکات سے بہت زیادہ متاثر ہوتے، جن کا ارتکاب بعض لوگ آپ ﷺ کے سامنے کرتے، لیکن آپ ﷺ ایسی حرکات کا سامنا انتہائی بردباری سے فرماتے، انہیں برداشت فرماتے اور ان کا جواب نرمی سے دیتے۔ آپ ﷺ کے احساسات وجذبات کی دنیا اس قدر وسیع تھی کہ آپ ﷺ کو کوئی بھی تکلیف دوسرے مریضوں کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی بیماری کی حالت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حاضر ہوئے، انہوں نے آپ کے دست مبارک کو چھوا تو انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے اسے آگ لگی ہو۔ انہوں نے عرض کی: ”یارسول اللہ! آپ کو تو شدید بخار ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں مجھے تم میں سے دو آدمیوں جتنا بخار ہوتا ہے۔“(414) رسول اللہ کا

اعصابی نظام انتہائی حساس تھا۔ ہوسکتا ہے آپ ﷺ کو انگلی پر چبھنے والے کانٹے سے اتنی تکلیف پہنچتی ہو جتنی کسی اور کو جسم میں چھری گھونپنے سے محسوس ہوتی ہے، تاہم پیغام رسالت کی ادائیگی کے لیے اس قسم کی حساسیت ناگزیر تھی۔ ایسی حساس شخصیت کو درشت اور احمقانہ حرکتوں سے عام لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تکلیف محسوس ہوتی ہے، نیز ایسی حساس طبیعت کے لوگ آئے روز نئی نئی مشکلات پیدا اور طوفان برپا کرتے رہتے ہیں، لیکن آپ ﷺ کا طرزِ عمل ایسا نہ تھا۔ آپ ﷺ انتہائی بردبار اور متوازن انسان تھے۔ کفار کی گمراہی سے آپ ﷺ کو اس قدر تکلیف پہنچتی تھی کہ آپ پر گریہ طاری ہوجاتا تھا اور آپ ﷺ انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے پوری کوشش فرماتے تھے، لیکن جب شرعی حدود کے نفاذ کی بات ہوتی تو مجرم آپ ﷺ کا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہوتا آپ ﷺ اس کے بارے میں کسی قسم کی نرمی گوارا نہ فرماتے تھے، تاہم آپ ﷺ جن جرائم اور گناہوں پر سزا دیتے تھے، ان میں سے کسی کا بھی آپ ﷺ کی ذات سے تعلق نہ ہوتا تھا۔ آپ ﷺ اپنے اوپر زیادتی کرنے والوں سے ہمیشہ درگزر فرماتے۔ کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ کسی نے آپ ﷺ کی ذات سے متعلق کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو، لیکن پھر آپ ﷺ نے اس سے درگزر کر کے اسے معاف نہ فرما دیا ہو۔

آپ ﷺ کی دینی زندگی میں بھی ہمیں یہی بات نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ اپنے لیے مشکل مگر دوسروں کے لیے آسان امور کا انتخاب فرماتے تھے حتیٰ کہ آپ سنتیں گھر میں ادا فرماتے تاکہ ان کی فرضیت کا تاثر پیدا ہو کر امت پر گراں نہ گزرے۔ آپ ﷺ جس قدر طویل نوافل ادا فرماتے کسی اور کے لئے اس قدر طویل نوافل پڑھنا ممکن نہ تھا۔

بعض اوقات آپ ﷺ مسلسل روزے رکھتے۔ اس قسم کے امور میں جو دوسرے لوگوں کی طاقت سے باہر تھے، آپ ﷺ منفرد نظر آتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے تھے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل سے آپ ﷺ میں کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہ فرمائی تھی۔ اس سے واقعہ معراج سے متعلق اس حدیث مبارک کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ ایک روحانی عمل جراحی سے گزرے تھے،(415) جس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتوں نے آپ ﷺ کے سینہ مبارک کو چاک کر کے اسے دھویا، غالباً اس سے آپ ﷺ کے نفس مبارکہ کو پاکیزہ بنانا مقصود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کبھی بھی کسی گناہ کا صدور ہوتے نہیں دیکھا گیا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ روزانہ ستر سے زائد مرتبہ استغفار فرمایا کرتے تھے۔(416) بلاشبہ آپ ﷺ انتہائی متواضع اور اپنے نفس کی نگرانی اور محاسبہ کرنے والے انسان تھے۔

چونکہ ہر لحظہ آپ ﷺ کے قربِ الٰہی میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، اس لیے آپ ﷺ قربِ الٰہی کے نئے مقام کے تناظر میں سابقہ مقام پر استغفار فرماتے تھے، دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ گزشتہ کل کو یاد فرما کر اس پر استغفار فرماتے تھے۔ گناہوں سے پاک ایسے انسان کا محض لوگوں کے درمیان موجود رہنے کو برداشت کرنا ہی اس کی بردباری کی وسعت کی دلیل ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر آپ ﷺ کو احترام اور اعلیٰ ذوق سے خالی حرکتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، جن کا آپ ﷺ انتہائی بردباری سے جواب دیتے تھے۔

بخاری و مسلم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے درج ذیل واقعہ نقل کیا ہے:

ایک دن رسول اللہ ﷺ کوئی چیز تقسیم فرما رہے تھے کہ بنو تمیم کا ذوالخولصیرۃ(417) نامی ایک آدمی آیا اور رسول اللہ ﷺ سے بات کرتے ہوئے بے حیائی سے کہنے لگا: ''اے محمد! انصاف کرو۔'' اگر ہم سے کوئی ایسے انداز میں گفتگو کرتا تو اگرچہ ہم عملی طور پر ناانصافی کے مرتکب بھی ہو رہے ہوتے، تب بھی ہم غصے سے کانپ اٹھتے، لیکن یہ بات تو ایسے نبی سے کہی گئی تھی، جس کا وظیفہ زندگی ہی دنیا میں عدل وانصاف کا بول بالا کرنا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو اس موقع پر موجود تھے، نے عرض کی: ''مجھے اس منافق کی گردن زنی کی اجازت دیجیے۔'' لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسے پسند نہ فرمایا، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور پاس بیٹھے دیگر صحابہ کرام کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے بعد اس شخص سے فرمایا: ''تیرا ناس ہو! اگر میں انصاف نہ کروں گا تو پھر اور کون انصاف کرے گا؟''(418) ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے یوں فرمایا: ''اگر میں نے انصاف نہ کیا تو میں ناکام و نامراد ہو جاؤں گا۔''(419) ایک دوسری روایت کے الفاظ کچھ یوں ہے: ''اگر میں نے انصاف نہ کیا تو تم ناکام و نامراد ہو جاؤ گے۔''(420) یعنی چونکہ میں نبی ہوں، اس لیے تم ہر معاملے میں میری پیروی کرنے کے پابند ہو، لہٰذا اگر نعوذ باللہ میں منصف مزاج نہ ہوا تو تم ناکام و نامراد ہو جاؤ گے، کیونکہ اس صورت میں تم راہِ حق و عدل کے پیرو نہ رہو گے۔ سراپا حلم و بردباری ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے حسبِ عادت اس کے قتل کی اجازت نہ دی۔

تاہم آپ ﷺ نے اپنی امت کو یہ بات بتانے میں کوتاہی نہ کی کہ یہ شخص مستقبل میں ایک بڑے فتنے کا باعث بنے گا۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کی روشنی میں جانتے تھے کہ اس قسم کے لوگ مستقبل میں اس امت کے خلاف بہت بڑے فتنے کی قیادت کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی جلد ہی پوری ہوگئی، چنانچہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آنے والے معرکہ نہروان میں شریک اکثر خوارج اسی قسم کے انسان تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس گستاخ شخص سے کچھ بھی نہیں فرمایا۔ اگر آپ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجویز پر اپنا سر اثبات میں ہلا دیتے یا محض خاموشی ہی اختیار فرماتے تو اس بے حیا شخص کی گردن اڑا دی جاتی، لیکن رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق رویہ اختیار فرماتے اور جاہلوں سے نہ الجھتے تھے۔ قرآن کریم آپ ﷺ سے کہتا ہے: ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (الأعراف: ۱۹۹) ''اور جاہلوں سے کنارہ کرلو۔'' یعنی انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے۔ نہ ان سے الجھئے اور نہ ہی ان کی فکر کیجئے۔ جاہل تو جاہلانہ حرکات کرتا ہے، لیکن چونکہ آپ جاہل نہیں ہیں، اس لیے آپ جہالت کا جواب جہالت سے ہرگز نہ دیجئے۔ آپ تو نرم مزاج اور بردبار ہیں، جو بند دلوں کے آپ کے لیے وا ہو جانے اور ان میں آپ کی محبت کے جاگزیں ہونے کا راز ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس قرآنی ہدایت پر عمل کر کے دکھایا اور آپ ﷺ کی بردباری کی وجہ سے ایسے ایسے لوگوں نے اسلام قبول کر کے اپنے دل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیئے، جن کے قبولِ اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیبر کی فتح کے بعد ایک یہودی عورت نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک زہر آلود بکری ہدیہ میں پیش کی، جس سے ایک صحابی بشر بن براء نے ایک ہی لقمہ لیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس یہودی عورت نے کس قدر طاقت ور زہر اس بکری کے گوشت میں شامل کی تھی۔ وہ عورت نبی کریم ﷺ کو زہر دینا چاہتی تھی، تاہم چونکہ اس واقعے کا معجزاتی پہلو ہماری گفتگو کا موضوع نہیں ہے، اس لیے اسے ہم یہاں زیر بحث نہیں لائیں گے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے ایک لقمہ تناول فرمایا تو بکری کے گوشت نے خود ہی آپ ﷺ کو بتا دیا کہ وہ زہر آلود ہے۔ آپ ﷺ نے گوشت کو اٹھانے اور اس عورت کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اس عورت نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا اور بتایا کہ اس نے ایسا رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے کیا تھا۔ دوسری روایات سے پتا چلتا ہے کہ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب میں نبی کریم ﷺ سے کہا: ''میں جاننا چاہتی تھی کہ اگر آپ نبی ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو معاملے کی حقیقت سے آگاہ فرما دیں گے اور اگر (نعوذ باللہ) آپ جھوٹے ہیں تو لوگوں کو آپ سے نجات مل جائے گی۔'' صحابہ کرام اسے فوراً قتل کرنا چاہتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنا حق معاف فرما دیا اور بشر بن براء کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی۔ اس عورت کے انجام کے بارے میں دو قسم کی روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت بشر کے ورثہ نے اسے قصاصاً قتل

کر دیا تھا، جبکہ دوسری روایت کے مطابق اسے ہدایت نصیب ہوئی اور وہ اسلام لے آئی، جس کے نتیجے میں مقتول کے ورثہ نے اسے معاف کر دیا اور اس طرح اسلام اس کی نجات کا سبب بن گیا۔(421)

اس واقعے سے رسول اللہ ﷺ کی بردباری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے قتل کی سازش کرنے والی یہودی عورت کو معاف فرما دیا۔ بردباری کا یہ کتنا اعلیٰ مقام ہے۔ بلاشبہ بردباری کی جس صفت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مکمل صورت میں شروع کیا تھا، اسے سید المرسلین ﷺ نے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

ابوداؤد اور نسائی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسجد میں بیٹھا کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ اٹھتے تو ہم بھی اٹھ جاتے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اٹھے تو ہم بھی آپ کے ہمراہ کھڑے ہو گئے، جب آپ ﷺ مسجد کے درمیان میں پہنچے تو ایک آدمی آیا اور اس نے آپ ﷺ کی چادر کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا، آپ ﷺ کی چادر کھردری تھی، جس کی وجہ سے آپ کی گردن سرخ ہوگئی پھر وہ آدمی کہنے لگا: "اے محمد! میرے ان دو اونٹوں پر سامان لاد دو، کیونکہ تم اپنا یا اپنے باپ کا مال نہیں دیتے۔"

یہ کس قدر گستاخی اور بے ادبی پر مشتمل گفتگو تھی، جس کا آغاز نبی کریم ﷺ کو محض نام سے پکارنے سے ہوتا ہے اور ہر ہر لفظ میں بے ادبی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ بدوی کی یہ گفتگو سن کر ہم اس کی طرف دوڑے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف التفات فرما کر ارشاد فرمایا: "جو بھی میری بات سن رہا ہے، اسے میں حکم دیتا ہوں کہ جب تک میں اسے اجازت نہ دوں اپنی جگہ سے نہ ہلے۔" پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے فرمایا: "اے فلاں! اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دو۔" اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی برکت کے ہمراہ لوٹ جاؤ۔"(422)

ذرا غور فرمائیے کہ ایک ایسا شخص جو آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہو کر آپ کی رقت انگیز گفتگو سن چکا ہے، وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس قدر درشت رویے سے پیش آتا ہے۔ اس کے سینے میں کس قدر سخت دل ہوگا؟ نبی کریم ﷺ کی مجلس کو کسی بڑے سے بڑے ولی و مرشد کی مجلس سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی ہمارے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے اس کا نقشہ کھینچنا ممکن ہے، تاہم اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے تجلیاتِ الٰہیہ کے آئینہ دار دل کے ذریعے اپنے سامعین کو ایک ہی دفعہ میں اعلیٰ ترین مقام پر پہنچا سکتے تھے۔ آپ ﷺ کی مجلس میں تبدیلی اور تاثر کی قابلیت ناقابلِ تصور حد تک زیادہ

تھی، جو ایک مرتبہ آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتا وہ وہاں سے ایک صاف دل پاکیزہ فرشتہ بن کر نکلتا۔ اولیائے کرام کے صحابہ کرام کے مقام تک نہ پہنچ سکنے کے پیچھے تبدیلی اور تاثر کی اسی قابلیت کا راز پنہاں ہے۔ دورِ حاضر کے ایک مشہور عالم لکھتے ہیں:

ایک روز میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ محی الدین ابن عربی جیسے لوگ صحابہ کرام کے مرتبے کو کیوں نہیں پہنچتے؟ پھر میں نے نماز کے دوران سجدے میں "سبحان ربی الأعلی" کہتے ہوئے محسوس کیا کہ اس پاکیزہ جملے کے معانی کے عظیم الشان حقائق کا کچھ حصہ مجھ پر منکشف ہوا ہے۔ میں نے دل میں کہا کاش مجھ پر ساری نماز کے دوران اس کے معانی کا اسی طرح انکشاف ہوتا، جس طرح اس مبارک جملے کے معانی کا انکشاف ہوا ہے۔ یقیناً ایسی نماز سال بھر کی نفلی عبادات سے بہتر ہے۔ نماز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ خیال اور کیفیت میرے مذکورہ بالا سوال کا جواب ہے اور عبادت میں کسی اور کے لیے صحابہ کرام کے درجے تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنے تابناک انوارات کے ذریعے جس عظیم اجتماعی تبدیلی کی داغ بیل ڈالی تھی اس نے مختلف متضاد چیزوں کے درمیان اس قدر واضح خطِ امتیاز کھینچ دیا تھا کہ ہر قسم کی برائی اپنی تمام تر تاریکیوں اور متعلقات کے ساتھ بھلائی و کمالات اور ان کے انوارات وثمرات کے بالمقابل آ کھڑی ہوئی۔ خیر وشر کے جذبات کو ان کی بندشوں سے آزادی دلوانے کا محرک بننے والی اس کیفیت کے دوران اہل خیر کے جذبات بیدار ہو گئے، وہ ذکر وتسبیح سے اس کے تمام تر معانی اور تر وتازہ تعبیرات کے ساتھ لطف اندوز ہونے لگے اور نہ صرف ان کے حساس جذبات اور پاکیزہ لطائف، بلکہ ان کے خیالات نے بھی اپنے اپنے لطیف ذوق کے مطابق ان اذکار کے بعض اعلیٰ ترین معانی کی شراب نوش کی۔ ان حکمتوں کی بنا پر جب انتہائی حساس جذبات اور بیدار احساسات ولطائف کے مالک صحابہ کرام ایمان اور تسبیح وتحمید کے انوارات پر مشتمل ان مبارک کلمات کا ذکر کرتے تو انہیں ان کے تمام معانی کا ادراک ہوتا اور اپنے حساس لطائف کے ذریعے ان اذکار سے اپنا پورا پورا حصہ وصول کرتے۔(423)

ممکن ہے آسمان کا کوئی دروازہ کھلا ہو اور اس عظیم ہستی پر الہام ہوا ہو کہ اس کا یہ سجدہ صحابہ کرام کے سجدے کی طرح تھا۔ حاصل یہ کہ یہ عظیم ہستی ہم سے یہ کہنا چاہتی ہے کہ وہ اس قسم کی ایک رکعت کے بدلے اپنی ساری عبادات دینے کے لیے تیار ہے، نیز جب میں نے اس کے ایک پیروکار شاگرد کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو مجھے اپنی نماز پر شرم آنے لگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور صحبت نبویہ کا مقام کس قدر بلند تھا کہ نماز کا جو مقام ہمیں ایک رکعت میں بھی نصیب نہ ہو سکا انہیں وہ ہر نماز میں حاصل تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست فیض حاصل کرتے تھے، نیز اس وقت دین کے احکامات بھی نئے نئے اور تر و تازہ تھے۔ ایک دن ان کے کانوں میں اذان کی صورت میں ایک نئی آواز پڑتی، جس سے ان پر وجد طاری ہو جاتا اور ان کے جذبات ابھر آتے تو کسی دوسرے دن خدائی دستر خوان پر کوئی اور نئی چیز آ جاتی اور دین کا کوئی اور حکم موسم کے پہلے پھل کی طرح ان کے سامنے پیش کیا جاتا، جس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں عشق الٰہی رچ بس جاتا اور وہ اس کے کیف و سرور میں سرشار ہو جاتے۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود بعض ایسے بہرے دل بھی تھے، جو نہ سنتے تھے، نہ سمجھتے تھے اور نہ نرم پڑتے تھے۔ ایسے مردہ دل لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سختی اور بے ادبی سے پیش آتے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ ان سے درگزر فرماتے اور ان سے بردباری اور نرمی سے پیش آتے، جس کے نتیجے میں ہر درشت رویہ آپ ﷺ کی بردباری کے سمندر میں پگھل جاتا۔ رسول اللہ ﷺ کوئی بھی کام کرتے وقت حاضر و مستقبل کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اگر آپ ﷺ سختی برتتے تو لوگ قرآنی پیش گوئی کے مطابق آپ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ یقیناً آپ ﷺ کی بردباری لوگوں کے آپ کے گرد جمع ہونے کا اہم ترین محرک تھی۔ آپ ﷺ لوگوں پر سختی کرنے اور معاشرے کو انتشار میں مبتلا کرنے کے لیے تشریف نہ لائے تھے، بلکہ آپ ﷺ تو ساری انسانیت کو دنیا و آخرت کی سعادتوں سے نوازنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ انسانیت صرف آپ ﷺ کے راستے پر چل کر ہی ابدی زندگی پا سکتی ہے اور ابدیت صرف آپ ﷺ کے سلوک کے ضمن میں پائی جاتی ہے۔ آپ ﷺ اپنے تمام امور کو اسی مفہوم کے تناظر میں ترتیب دیتے تھے۔

اگرچہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جنگ احد میں مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا، لیکن جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قبولِ اسلام کا اعلان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ اس قدر اچھا برتاؤ کیا کہ وہ دوسرے ہی دن اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے جسم کا ٹکڑا محسوس کرنے لگے حتی کہ جب مسلمانوں نے ان کے قبولِ اسلام کے بعد پیش آنے والے پہلے معرکے میں انہیں شریک نہیں کیا تو یہ بات ان پر اس قدر گراں گزری کہ وہ رات بھر غم سے روتے رہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ انہیں انتہائی مختصر مدت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس قدر قلبی لگاؤ ہو گیا تھا۔

حضرت عمرو بن عاص اور عکرمہ رضی اللہ عنہما نے قبولِ اسلام سے پہلے نبی کریم ﷺ کو سخت تکلیفیں پہنچائی تھیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی بردباری کی وجہ سے نہ صرف ان کے دل نرم ہوئے اور انہوں نے قبول کر لیا، بلکہ وہ کفر اور کافروں کے خلاف سخت ترین موقف رکھنے والے صحابہ ثابت

ہوئے۔ اگر رسول اللہ ﷺ انہیں ایمان کے ایسے بلند مقام تک پہنچانے کے لیے منصوبہ بندی نہ فرماتے تو ایسے لوگوں کا صحابہ کی صفوں میں شامل ہونا ممکن نہ ہوتا۔

ابن ہشام کو تو سبھی جانتے ہیں۔ وہ ابوجہل کے بھائی اور حضرت عکرمہ کے سسر تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال سے کچھ ہی عرصہ پہلے اسلام لائے تھے اور آخر کار جنگ یرموک میں ایسی حالت میں شہید ہو کر اپنے پروردگار سے جا ملے کہ ان کا تقریباً ہر ہر جوڑ کاٹ دیا گیا تھا۔ ان کے آخری لمحات میں جب حضرت حذیفہ عدوی نے پانی ان کے منہ کے قریب کیا تو انہیں اپنے قریب سے ایک اور شخص کی ہلکی سی آواز سنائی دی جو پانی مانگ رہا تھا۔ ابن ہشام نے برتن اپنے منہ سے ہٹا دیا اور اس دوسرے شخص کو پانی دینے کے لیے کہا۔ یہ واقعہ سب جانتے ہیں کہ جب پانی اس دوسرے شخص کے منہ کے قریب کیا گیا تو اس نے پانی مانگنے کی ایک آواز سنی اور پانی اسے دینے کا اشارہ کیا، لیکن وہ تیسرا آدمی پانی پہنچنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گیا اور جب پانی پلانے والا لوٹا تو پہلے دو حضرات کی روح بھی پانی پیئے بغیر ہی جسد عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ (424)

ایثار رسول اللہ ﷺ کی امتیازی صفت تھی اور آپ ﷺ کی پیروی میں صحابہ کرام بھی اس صفت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ دوسروں کو حقیقی زندگی عطا کرنے کے لیے جیتے تھے اور اس مقصد کے لیے ناقابل یقین قربانیاں دیتے تھے۔ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ؓ قربانیاں پیش کرنے والے انسان تھے۔ مذکورہ بالا واقعہ اس کی زندہ مثال ہے۔

یہودی عالم زید بن سعنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک مخصوص مدت تک ادھار ثمن کے عوض رسول اللہ ﷺ کو کوئی چیز فروخت کی، لیکن انہوں نے مدت پوری ہونے سے پہلے ہی آ کر ثمن کی ادائیگی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''ابھی تک مدت پوری نہیں ہوئی۔'' اس پر زید نے کہا: ''اے بنو عبدالمطلب! تم ٹال مٹول کرنے والے لوگ ہو۔'' یہ سن کر صحابہ کرام نے ان کی سرزنش کرنے کا ارادہ کیا، لیکن آپ ﷺ نے انہیں روک دیا اور زید کے ساتھ بردباری کا برتاؤ فرمایا۔ یہ دیکھ کر زید نے کہا: ''سوائے ایک علامت کے میں آپ کی نبوت کی تمام علامات دیکھ چکا تھا، وہ ایک علامت یہ تھی کہ جاہلانہ برتاؤ کے نتیجے میں ان کی بردباری میں اضافہ ہی ہو گا۔ میں یہ علامت بھی دیکھنا چاہتا تھا، کیونکہ تورات کی ایک آیت میں ہے: ''اس کی بردباری اس کی جہالت پر غالب ہو گی اور جاہلانہ برتاؤ کے نتیجے میں اس کی بردباری میں اضافہ ہی ہو گا۔'' اس کے بعد وہ اسلام لے آئے۔ (425)

رسول اللہ ﷺ نے بردباری کے ذریعے یہودی عالم زید بن سعنہ کا دل جیت لیا، جس کے نتیجے میں وہ اسلام لے آئے۔ کسی اور کے لئے رسول اللہ ﷺ جتنی بردباری اور نرم مزاجی کا مظاہرہ کرنا ممکن نہیں، تاہم آپ ﷺ کی بردباری بھی متوازن تھی۔ ایک طرف تو آپ ﷺ اپنی ذات کے ساتھ کی جانے والی ہر اہانت اور طیش دلانے والی حرکت کا بردباری سے جواب دیتے، لیکن دوسری طرف اگر دوسروں کے حقوق پامال کیے جاتے تو آپ ﷺ شیر کی طرح غضبناک ہو جاتے اور جب تک حق والے کو حق دلا نہ دیتے، قطع نظر اس سے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون، اس وقت تک آپ ﷺ چین سے نہ بیٹھتے۔ آپ ﷺ کے لیے دونوں پہلو ایک جیسے تھے۔ اگر معاملہ اللہ تعالیٰ کی کسی حرمت کی پامالی کا ہوتا تب بھی جب تک آپ ﷺ حق کو اس کا صحیح مقام نہ دلاتے اس وقت تک آرام نہ فرماتے۔ یہ آپ ﷺ کے ایک متوازن شخص ہونے کی دلیل ہے۔ بعض اوقات ایسا طرزِ عمل تضادات کا شاہکار معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ توازن رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی ایک خصوصیت تھی۔ اس کی وضاحت کے لیے ہم ذیل میں چند مزید مثالیں پیش کرتے ہیں۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''یارسول اللہ! فلاں آدمی کے لمبی لمبی نمازیں پڑھانے کی وجہ سے میں نماز نہیں پڑھ پاتا۔'' میں نے رسول اللہ ﷺ کو وعظ کہتے ہوئے اس دن سے زیادہ غصے میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! تم دوسروں کو (دین سے) متنفر کرتے ہو۔ جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو مختصر نماز پڑھائے، کیونکہ ان میں مریض، کمزور اور ضرورت مند لوگ بھی ہوتے ہیں۔''(426) رسول اللہ ﷺ خود بھی اس بات کی رعایت فرماتے تھے، چنانچہ جماعت میں شریک لوگوں کی رعایت سے کبھی مختصر اور کبھی لمبی نماز پڑھایا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بہت محبت فرماتے تھے، لیکن جب لوگوں نے ان کی شکایت کی کہ وہ عشاء کی نماز بہت لمبی پڑھاتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بہت برہم ہوئے اور اپنے اس انتہائی محبوب صحابی سے تین مرتبہ فرمایا: ''کیا تم فتنہ انگیز ہو؟''(427)

حضرت اسامہ بن زیدؓ ایک جنگی مہم کی قیادت کررہے تھے کہ ان کا ایک آدمی سے سامنا ہوا۔ اس آدمی نے کہا: ''میں صابی ہو گیا ہوں۔'' دراصل وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، لیکن حضرت اسامہ نے اسے حقیقی ایمان کی بجائے خوف کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اس آدمی نے ''لاالٰہ الااللہ'' پڑھا تھا۔ پہلی روایت کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت

اسامہ کی رائے میں اس کی گفتگو سے اس کا مسلمان ہونا ثابت نہیں ہوتا تھا، تاہم دوسری روایت کے مطابق حضرت اسامہ نے یہ سمجھا ہوگا کہ اس نے قتل سے بچنے کے لیے شہادت کا اعتراف کیا ہے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت اسامہ کو بلایا اور ان سے وضاحت چاہی۔ حضرت اسامہ نے سارا واقعہ سنا دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے غصے میں ارشاد فرمایا" کیا اس کے "لا الہ الا اللہ" کہنے کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر دیا؟" حضرت اسامہ نے عرض کی: "یا رسول اللہ ﷺ! اس نے یہ بات اسلحے کے خوف سے کہی تھی۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا، جس سے تمہیں علم ہوا کہ اس نے یہ بات کس ارادے سے کہی تھی؟" اسامہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ بات اتنی دفعہ دہرائی کہ میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش میں اس دن اسلام لایا ہوتا۔ (428) یعنی اگر چہ ان کی پرورش رسول اللہ ﷺ کی گود میں ہوئی تھی اور رسول اللہ ﷺ انہیں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی طرح چاہتے تھے، لیکن پھر بھی ان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش وہ اس دن تک اسلام نہ لائے ہوتے تا کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی اس ناراضی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

حضرت ابوذر نے ایک دن حضرت بلال سے کہا: "اے حبشن کی اولاد!" حضرت بلال نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ اس پر ناراض ہوئے اور ابوذر سے فرمایا: "اے ابوذر! کیا تم نے اسے اس کی ماں کی وجہ سے عار دلائی ہے۔ تم میں ابھی تک جاہلیت کے اثرات باقی ہیں۔" (429)

ایک دفعہ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما میں جھگڑا ہو گیا، جس میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر کو کوئی تکلیف دہ بات کہہ دی، اگر چہ نبی کریم ﷺ حضرت عمر سے بہت محبت کرتے تھے، لیکن آپ نے ان پر اظہارِ ناراضی فرمایا اور ان سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حق دلوایا۔ (430)

ان جیسی دسیوں مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بردباری میں توازن کا پہلو بڑا اہم تھا۔ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح اس بارے میں بھی آپ ﷺ صراط مستقیم کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ آپ ﷺ بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ذات کے خلاف کیے جانے والے ہر برے سلوک سے درگزر فرماتے، لیکن دوسروں کے حقوق کی ذرا سی پامالی بھی گوارا نہ فرماتے، خواہ دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے والا شخص کوئی بھی ہوتا آپ ﷺ صاحب حق کو اس کا حق دلوانے کے لیے اس کا مقابلہ کرتے۔

۵: آپ ﷺ کی سخاوت اور تواضع پسندی

نئے موضوع کو شروع کرنے سے پہلے ہم ایک چھوٹی سی یاددہانی کرانا چاہتے ہیں۔ اوپر ہم "الفطنة الکبیرة" کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، یہاں ہم یہ بات پھر دہراتے ہیں کہ "الفطنة" سے ایسی الہامی اور نبوی فراست مراد ہے، جس کے سامنے عقل بے بس اور زبان گنگ ہو جائے۔ بعض اوقات عقل استقامت دکھاتی ہے، لیکن کسی مخصوص مقام پر پھسل جاتی ہے، بسا اوقات سائنس کسی خاص نقطے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، لیکن اس سے آگے نہیں بڑھ پاتی، تاہم اوپر ذکر کردہ تعریف کے مطابق نبوی منطق اور فراست ان تمام بلندیوں سے بالاتر پرواز کرتی ہے، جن تک پہنچنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ یہ آپ ﷺ کی نبوت کی ایک اور دلیل ہے۔

ہم رسول اللہ ﷺ کی ہر صفت سے آپ ﷺ کی نبوت پر دلیل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جب ہم آپ ﷺ کے صبر کو دیکھتے ہیں تو ہم آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ صبر کی پیشانی پر "محمد رسول اللہ ﷺ" لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ تمام انصاف پسند انسان یہ تحریر پڑھ سکتے ہیں۔ جس شخصیت نے اس انداز میں تمام ہلاکت خیزیوں کو للکارا اور ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ کیا وہ یقیناً رسولِ خدا ہے۔ اگر ہم آپ ﷺ کی صفت رحمت کے پہلو سے آپ کی سیرت پر غور کریں تو بھی یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہو کر سامنے آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی رحمت کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ آپ بارش سے بھرے بادلوں سے بڑھ کر مجسم رحمت تھے۔ خلاصہ یہ کہ آپ رحمتہ للعالمین تھے۔ آپ ﷺ کی رحمت صرف انسانیت تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ کائنات کے ذرے ذرے نے آپ کی رحمت سے فائدہ اٹھایا ہے اور صبح قیامت تک فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ جب ہم آپ ﷺ کی رحمت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں ہمیں آپ ﷺ کی رسالت بھی دکھائی دیتی ہے، جسے ہم دوسروں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں ہم نے آپ ﷺ کی بردباری پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ آپ ﷺ کی رحمت کا ہی ایک پہلو ہے، تاہم آپ ﷺ کی دیگر صفات کی طرح اسے آپ ﷺ کی فراست کا ایک پہلو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ﷺ کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو علیحدہ علیحدہ زیر بحث لایا جائے تو اس سے آپ ﷺ کی فراست کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱- آپ ﷺ کی سخاوت کی ایک جھلک

رسول اللہ ﷺ کی رحمت اور فراست کا ایک پہلو سخاوت بھی ہے۔ ذیل میں ہم اس موضوع پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں گے:

سخاوت بھلائی اور دینے کے جذبے سے عبارت ہے۔ سخاوت عربوں کے ہاں پسندیدہ خصلت شمار ہوتی تھی۔ اگر زمانہ جاہلیت کے اشعار کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو عربی انسان مہمانوں کی خاطر بکری یا اونٹ ذبح کرنے پر فخر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ قبیلوں اور خاندانوں کے درمیان سخاوت پر مقابلہ بازی ہوتی تھی۔ یقیناً اس قسم کی سخاوت کا مظاہرہ فخر اور انا پرستی کے جذبے سے ہوتا تھا۔

ایسا ماحول میں جہاں سخاوت کو پسندیدہ خصلت اور فخر کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، سخیوں کے سخی کا ظہور ہوا اور جب لوگوں نے آپ کی سخاوت دیکھی تو حیرت سے ان کی زبانیں گنگ رہ گئیں، تاہم اس سخی کی سخاوت صرف رضائے الٰہی کے لیے تھی۔ اگر آپ ﷺ ساری دنیا بھی کسی کو ہدیے میں دیتے تو اس کا تذکرہ فرماتے اور نہ ہی اس پر کسی قسم کا فخر فرماتے، بلکہ آپ ﷺ کو شعراء کے کلام میں اپنی سخاوت کا تذکرہ کیا جانا بھی پسند نہ تھا۔ آپ ﷺ شعراء کے فخریہ کلمات کو سب سے بڑے سخی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر محمول کرتے تھے۔

آپ ﷺ ایک شفاف آئینہ تھے، جس پر اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ''الکریم'' کا پرتاو پڑا تھا۔ دوسری صفات کی طرح اس صفت میں بھی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے اعلیٰ ترین نمائندہ تھے۔ روئے زمین پر آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی سخی نہ تھا۔ محمد ﷺ سخاوت کا راستہ ہیں اور سخاوت جنت کا راستہ ہے، جبکہ بخل جسے قرآن کریم نے ''الشح'' سے تعبیر کیا ہے، جہنم کا راستہ ہے۔ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو دور سے بھی دیکھا ہے وہ آپ کی صفات کی بنا پر جان چکے ہیں کہ صرف آپ ﷺ ہی انسانیت کی جنت کے راستے کی طرف راہنمائی اور جنت کے دروازوں پر لوگوں کے حق میں ''شفاعت عظمیٰ'' کرنے والے ہیں، اس لیے ہر انسان کو آپ ﷺ کا احسان مند رہنا چاہیے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کو آپ ﷺ کی طرف منسوب کرکے آپ کو ''اکرم الاکرمین'' کہہ سکتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ اپنی سخاوت کے ذریعے تمام انسانی معیاروں سے بلند ہو کر سخاوت میں اپنے پروردگار کے خلیفہ بن گئے تھے۔ آپ ﷺ اپنی سخاوت کے ذریعے ایسے ایسے دلوں کو جیتنے میں کامیاب ہو گئے، جنہیں کسی اور ذریعے سے جیتنا ممکن نہ تھا، گویا آپ کی رحمت بخارات کی صورت میں بلند ہوئی اور اوپر جا کر بادلوں کی صورت اختیار کر گئی اور پھر کائنات پر سخاوت کی بارش کی صورت میں برسی، جس سے سخت سے سخت دل بھی نرم پڑ گئے اور زمین کا سینہ چاک کر کے چھوٹے چھوٹے پودوں کے نکلنے کے لیے فضا سازگار بن گئی، دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ نے اپنی بردباری کے ذریعے دلوں کو جیتا اور پھر اپنی سخاوت کے ذریعے ان میں جا بسے۔ اگر آپ نبی کریم ﷺ کے ان دو پہلوؤں کو بیک وقت پیش نظر نہ رکھیں تو آپ نبی کریم ﷺ کو کما حقہ نہ پہچان سکیں گے۔

اگر آپ ﷺ چاہتے تو دنیا کے امیر ترین انسان بن سکتے تھے۔ دعوت اسلام کے آغاز میں ہی قریش نے دعوت سے دستبردار ہونے کی شرط پر آپ کو مال و دولت کی پیش کش کی تھی۔[431] اس کے بعد بھی مسلمان جو کچھ راہِ خدا میں خرچ کرتے وہ آپ ﷺ کے ہاتھوں سے گزرتا تھا۔ مختلف حکمرانوں اور بادشاہوں کی طرف سے آنے والے تحفے تحائف اس کے علاوہ تھے، لیکن آپ ﷺ نے ان کی طرف توجہ کی اور نہ ہی آپ ﷺ کے دل میں کبھی ایسا خیال گزرا، بلکہ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو ہمیشہ دنیا میں ایک مسافر سمجھا اور یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھی کہ ایک دن اس زندگی کو چھوڑنا ہے اور یہ دنیا محض اس درخت کی طرح ہے، جس کے سائے تلے مسافر طویل سفر کے دوران کچھ دیر سستاتا ہے۔

آپ ﷺ کی یہ ذمہ داری تھی کہ اس طویل سفر کے دوران آپ کا دل اہم امور میں مشغول رہے، آپ انسانیت کو صحیح راستہ دکھائیں اور اس درخت کے نیچے مقررہ وقت گزارنے کے بعد اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔[432] آپ ﷺ کا ہدف بہت اونچا تھا۔ اللہ تک پہنچنا آپ ﷺ کا اولین مقصد تھا پھر دوسرے انسانوں کو بھی اس ہدف تک پہنچانا آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی۔ اس مقصد کو پانے کے لیے آپ ﷺ کا دل جوش و ولولے سے لبریز تھا۔ ایسی ہستی کو دنیا سے کیا کام؟ اور دنیا کی اس کے نزدیک کیا اہمیت؟ اس کے نزدیک دنیا کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی دنیا اس کی مستحق ہے کہ وہ اس میں دل لگائے۔

اپنی ذاتی زندگی کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فقر کو پسند فرمایا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ سارے انسانوں کو فقراء دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ سارے انسان پیٹ کی خواہشات سے مغلوب ہو جائیں۔ آپ ﷺ کی برکت سے مسلمان تھوڑے ہی عرصے میں ایک امیر ترین قوم بن گئے یہاں تک کہ مسلم معاشرے میں کوئی زکوٰۃ یا صدقہ قبول کرنے والا نہ ملتا۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے معیارِ زندگی کے بلند ہونے کا نتیجہ تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں ایسے زاہد لوگ بھی تھے کہ اگر ان کے پاس ایک دن کی روزی موجود ہوتی تو وہ پرکشش سے پرکشش ہدیے کو بھی قبول نہ کرتے تھے۔ یہ ایک قسم کا ایثار اور روحانی بلندی ہے۔ وہ دوسروں کی خاطر اپنی زندگی وقف کر کے زندگی کے مزوں کو خیر آباد کہہ دیتے۔ جس شخص نے اس قسم کے جذبات محسوس کیے ہوں اور نہ ہی اس کا دل ان سے آشنا ہو وہ انہیں نہیں سمجھ سکتا۔ ایک مرتبہ افطار کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ٹھنڈے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، لیکن جونہی انہوں نے اسے اپنے ہونٹوں کی طرف بلند کیا تو رونے لگے۔ ان سے رونے کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: ”ایک

مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ٹھنڈے پانی کا پیالہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اس میں سے نوش فرمایا اور پھر رونے لگے اور ارشاد فرمایا: ''یہ ان نعمتوں میں سے ہے، جن کے بارے میں ہم سے بازپرس ہوگی ﴿ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ (التکاثر:۸) ''پھر اس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی۔'' مجھے اس بات کا خیال آ گیا، جس پر مجھے رونا آیا۔[433]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امور میں مشغول ہونے سے پہلے تجارت کیا کرتے تھے۔ آپ کی رہائش ''سنخ'' میں تھی۔ بیعت کے بعد بھی آپ چھ ماہ تک ''سنخ'' میں ہی قیام پذیر رہے۔ روزانہ پیدل مدینہ آتے۔ بعض اوقات اپنے گھوڑے پر بھی تشریف لاتے۔ آپ کے بدن پر گیرو سے رنگے ہوئے کپڑے کی دو چادریں ہوتیں۔ آپ مدینے تشریف لا کر مسلمانوں کو نمازیں پڑھاتے اور عشاء کی نماز پڑھا کر واپس اپنے اہل خانہ کی طرف ''سنخ'' لوٹ جاتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب موجود ہوتے تو خود نماز پڑھاتے اور آپ کی عدم موجودگی میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ امامت کے فرائض سرانجام دیتے۔ آپ بازار کی طرف نکل جاتے اور وہاں خرید و فروخت کرتے۔ آپ کا بکریوں کا ایک ریوڑ تھا، جسے کبھی خود چراتے اور کبھی آپ کی طرف سے کوئی اور چراتا۔ آپ اپنے قبیلے کی بکریاں بھی دوہا کرتے تھے۔ جب آپ خلیفہ بن گئے تو قبیلے کی ایک بچی کہنے لگی: ''اب تو آپ ہمارے گھر کی بکریاں نہیں دوہا کریں گے۔'' حضرت ابوبکر نے یہ سن کر فرمایا: ''میری جان کی قسم! میں تمہارے لیے اب بھی دودھ دوہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ میرے کندھوں پر جو ذمہ داری آئی ہے اس کی وجہ سے میری سابقہ عادات تبدیل نہ ہوں گی۔'' چنانچہ آپ بدستور ان کے لیے دودھ دوہا کرتے تھے۔ چھ ماہ تک آپ ''سنخ'' میں رہے اور پھر مدینے میں سکونت اختیار کر لی۔ غور و فکر کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ عامتہ الناس کا کام اور تجارت ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ عامتہ الناس کی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ مکمل فراغت کے ساتھ ان کے معاملات کی دیکھ بھال کی جائے، لیکن دوسری طرف اہل و عیال کی کفالت کے لیے پیسوں کی بھی ضرورت تھی، چنانچہ آپ نے تجارت چھوڑ دی اور اپنے اور اہل و عیال کی روزمرہ ضروریات اور حج و عمرہ کے لیے بیت المال سے نفقہ لینے لگے۔ مسلمانوں نے آپ کے لیے سالانہ چھ ہزار درہم مقرر کیے تھے۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے فرمایا: ''ہمارے پاس مسلمانوں کا جو مال ہے، وہ واپس کر دو، کیونکہ مجھے اس مال میں سے کچھ بھی لینا پسند نہیں اور فلاں فلاں مقام پر جو میری زمینیں ہیں، وہ مسلمانوں کے مال کے بدلے ان پر وقف

ہیں۔ ''جب حضرت عمر کو خلافت ملی تو (سرکاری طور پر) ان کے حصے میں ایک اونٹنی، ایک غلام، ایک تلوار اور ایک چادر آئی، جس کی قیمت پانچ درہم ہوگی۔ یہ دیکھ حضرت عمر نے فرمایا: ''انہوں (ابوبکر) نے اپنے بعد والوں کو مشکل میں ڈال دیا۔(434)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسی زاہدانہ زندگی رسول اللہ ﷺ سے سیکھی تھی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اسوہ حسنہ کے ذریعے اپنے صحابہ کو اس قسم کی زاہدانہ زندگی گزارنے کی تعلیم دی تھی۔ حکم خداوندی کے مطابق مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مقرر تھا، جس میں آپ ﷺ اپنی مرضی سے تصرف کر سکتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے اور آپ کے بدن مبارک پر ایک چادر کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ کے پہلو پر چٹائی کے نشانات نظر آرہے تھے۔ ساتھ ہی تقریباً ایک صاع جو پڑے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں سلم کے پتے رکھے تھے اور ایک طرف ایک کھال لٹک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اے ابن خطاب! تم کیوں رو رہے ہو؟'' میں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! بھلا میں کیوں نہ روؤں؟ اس چٹائی سے آپ کے بدن پر نشانات پڑ گئے ہیں اور آپ کے دولت کدے میں جو سامان دیکھ رہا ہوں وہ یہی کچھ ہے، جو میرے سامنے ہے۔ قیصر و کسریٰ تو نہروں اور باغات کے مزے لوٹ رہے ہیں، لیکن اللہ کا نبی اور اس کا انتخاب ہونے کے باوجود آپ کی کل متاع یہی کچھ ہے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہمارے لیے آخرت ہو اور ان کے لیے دنیا؟''(435a)

رسول اللہ ﷺ کی اس گفتگو کی حیثیت اس فقیر کی بات کی سی ہرگز نہیں جو کوئی اور اختیار نہ ہونے کی وجہ سے ایسی بات کہنے پر مجبور ہو، کیونکہ ہم اوپر ذکر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ چاہتے تو دنیا کے امیر ترین شخص بن سکتے تھے۔ اس کی چھوٹی سی دلیل کے طور پر ہم ذیل میں صرف ایک معرکے میں مسلمانوں کو حاصل ہونے والے مال غنیمت کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔ جنگ حنین میں چالیس ہزار بکریاں، چوبیس ہزار اونٹ، چار ہزار اوقیہ چاندی (ایک اوقیہ چاندی تقریباً چار بکریوں کی قیمت کے برابر ہوتی ہے) اور چھ ہزار قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے۔(435b) یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کا حق تھا۔

اگر ہم دوسرے معرکوں میں حاصل ہونے والے مال غنیمت اور بادشاہوں کے ہدایا کو بھی پیش نظر رکھیں تو کوئی وجہ نہیں بنتی کہ آپ ﷺ انتہائی آسودہ اور پر تعیش زندگی نہ گزار سکتے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے اور جو کچھ آپ کے پاس آتا اسے لوگوں میں تقسیم فرما دیتے۔ آپ ﷺ مجسم سخاوت تھے۔ کسی اور کے لیے اتنی سخاوت کا مظاہرہ کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ ظاہری اور باطنی لحاظ سے انتہائی متوازن انسان تھے، جس طرح آپ ﷺ کی ظاہری ہیئت بارعب، خوبصورت اور دلفریب و دلکش تھی، اسی طرح آپ ﷺ کی باطنی دنیا بھی دلوں کو اپنے سحر میں گرفتار کیے ہوئے تھی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ خوبصورت انسان تھے۔''(436) یعنی صورت اور سیرت دونوں لحاظ سے حسین ترین انسان تھے۔ حضرت جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ایک دفعہ میں نے نبی کریم ﷺ کو چودھویں تاریخ کی رات میں نے دیکھا آپ ﷺ نے سرخ جوڑا زیب تن فرما رکھا تھا۔ میں ایک نظر آپ کی طرف دیکھتا اور دوسری نظر چاند کی طرف۔ یقین مانیے! آپ ﷺ مجھے چاند سے زیادہ حسین لگ رہے تھے۔''(437) ایک شاعر اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی کہتا ہے: ''مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ دی تھیں، اگر وہ میرے سرتاج کو دیکھ لیتیں تو اپنے ہاتھوں میں موجود چھریاں اپنے سینوں میں گھونپ دیتیں۔''

مشہور شاعر ندیم کہتا ہے: ''پورا ملک عجم استنبول کے ایک پتھر پر قربان!'' اگر یہ شاعر رسول اللہ ﷺ کو صحیح طرح پہچانتا تو یوں کہتا: ''ساری دنیا رسول اللہ ﷺ کے ایک بال پر قربان۔'' آپ ﷺ سارے انسانوں سے بڑھ کر حسین و جمیل تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''آپ سب سے بڑھ کر سخی تھے۔''(438)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی سخاوت کے بارے میں کہتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ بھلائی کے معاملے میں سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں آپ ﷺ کی سخاوت پورے عروج پر ہوتی تھی۔'' پھر رمضان میں آپ ﷺ کی جود و سخا کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ بھلائی کے کاموں میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوتے تھے۔''(439) یعنی آخر میں آپ ﷺ کے دست مبارک میں جو کچھ بچ جاتا اس کی بھی سخاوت فرما دیتے۔ یہ آپ ﷺ کی ارادی اور قلبی کیفیت تھی۔ آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے نہ جیتے تھے، بلکہ عمر بھر دوسروں کی نیک بختی کے لیے جیئے۔

آپ ﷺ کو اپنی ذات کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ آپ کو سب سے زیادہ خوشی دوسروں کو خوش دیکھ کر ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کے گھر والوں اور عزیز و اقارب کو آپ کے ایثار میں سے سب سے آخر میں حصہ ملتا تھا۔ جب آپ ﷺ مال غنیمت تقسیم فرماتے تو شہدائے بدر اور احد کے گھروں سے ابتدا فرماتے اور اگر دیگر تمام لوگوں کو دینے سے پہلے اپنے گھر والوں کو کوئی چیز عنایت فرماتے تو اس پر معذرت فرماتے۔(440)

دیگر تمام صفات عالیہ کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ سب سے بڑھ کر بہادر اور شجاع بھی تھے۔ آپ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے، بلکہ جب لوگوں پر خوف طاری ہوتا اس وقت آپ ﷺ غضبناک شیر کی طرح تنِ تنہا خطرات اور وحشی دشمنوں کی طرف بڑھ جاتے۔(441) اس موضوع پر ہم بعد میں دوبارہ روشنی ڈالیں گے۔ جن دلوں کو رسول اللہ ﷺ بردباری اور دیگر اخلاق عالیہ کے ذریعے نہ جیت سکے، انہیں آپ نے سخاوت کے ذریعے تسخیر کرلیا۔ اس کی بہترین مثال صفوان بن امیہ ہیں۔ امام مسلم نے ابن شہاب سے روایت کی ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح فرمایا اور پھر مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے۔ حنین کے مقام پر جنگ ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔ اس دن رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ کو سو سو کر کے تین دفعہ بکریاں دیں۔ صفوان خود کہتے ہیں۔ ''بخدا رسول اللہ ﷺ نے مجھے بہت زیادہ نوازا۔ آپ میرے نزدیک ناپسندیدہ ترین انسان تھے، لیکن آپ ﷺ مجھے نوازتے رہے یہاں تک کہ آپ میری نظروں میں پسندیدہ ترین انسان بن گئے۔''(442)

آپ ﷺ سے جو چیز مانگی جاتی، اگر آپ ﷺ کے پاس ہوتی تو دے دیتے، ورنہ وعدہ فرما لیتے۔ بعض اوقات آپ سے کوئی شخص مانگتا اور آپ اسے اپنی واحد چادر بھی عنایت فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بدوی آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور آپ سے کوئی چیز مانگی، آپ ﷺ نے اسے وہ چیز عطا فرما دی۔ وہ دوبارہ آپ ﷺ کے پاس آیا آپ نے پھر وہ چیز اسے عنایت فرمائی، وہ تیسری بار پھر آیا، اس بار آپ ﷺ نے اس سے وعدہ فرمایا، کیونکہ اب آپ کے پاس اسے دینے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔ بدوی کے رسول اللہ ﷺ سے اس طرح بار بار اصرار کرنے سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دکھ ہوا۔ انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کی: ''ایک بار آپ سے کسی چیز کا سوال کیا گیا آپ نے وہ چیز عطا کر دی، پھر آپ سے سوال کیا گیا آپ نے پھر وہ چیز عطا فرما دی، آپ سے تیسری بار سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے وعدہ فرمایا۔''، لیکن رسول اللہ کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ بن خدافہ سہمی اٹھے اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! خوب خرچ کیجئے اور عرش والے سے کمی کا اندیشہ نہ

رکھیے۔" اس پر رسول اللہ ﷺ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا: "مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے۔"(443) فرزدق نے کیا خوب کہا ہے:

ما قال: "لا" قط الا فی تشهّده   لو لاالتشهّد کان لاؤه "نعم"

آپ ﷺ نے تشہد کے سوا کبھی "لا" (نہیں) نہیں کہا، اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کا "لا" (نہیں) بھی "نعم" (ہاں) ہوتا۔

آپ ﷺ ہر سائل کے جواب میں "نعم" (ہاں) فرماتے، بشرطیکہ وہ سوال شریعت کے دائرے میں ہوتا۔ جود و سخا میں آپ کی کوئی مثال نہ تھی۔ آپ ﷺ اس قدر سخی تھے کہ آپ کی سخاوت کی نبوت کے سوا کوئی توجیہ ممکن نہیں۔ جب سخاوت قربِ خداوندی کا ذریعہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سخی نہ ہوتے۔ آپ ﷺ کو جبرائیل علیہ السلام سے بھی زیادہ قربِ الٰہی حاصل تھا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "سخی انسان اللہ سے، جنت سے اور لوگوں سے قریب ہوتا ہے اور جہنم سے دور ہوتا ہے، جبکہ بخیل انسان اللہ سے، جنت سے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے اور جہنم سے قریب ہوتا ہے۔"(444)

بعض کتابوں میں شجرہ طوبیٰ کی تصویر یوں بنائی گئی ہے کہ اس کی جڑیں ہوا میں ہیں اور شاخیں نیچے کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ کیا شجرہ طوبیٰ ایسا ہی ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ تاہم مجھے اتنا یقین ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس جنت کے ایسے گھنے درخت کی مانند ہے، جو ہم پر سایہ افگن ہے۔ وہ لوگ کس قدر خوش بخت ہیں، جو اس درخت کے سائے اور حفاظت میں آ گئے۔

رسول اللہ ﷺ اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام پسند فرمایا ہے۔ سو تم اسلام کی رفاقت کو سخاوت اور حسن اخلاق کے ذریعے عمدہ بناؤ۔" اسلام سخاوت اور حسن اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر تمہارے پاس کمال کے اعلیٰ مراتب طے کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے تو تم حسن اخلاق کے ذریعے ان مراتب تک پہنچ سکتے ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام پسند فرمایا ہے۔ سو تم اسلام کی رفاقت کو سخاوت اور حسن اخلاق کے ذریعے عمدہ بناؤ، سنو! سخاوت جنت کا ایک درخت ہے، جس کی شاخیں دنیا میں ہیں۔ تم میں سے جو سخی ہو گا وہ اس کی شاخ سے چمٹا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں پہنچا دیں گے۔ سنو! کمینہ پن جہنم کا ایک درخت ہے، جس کی شاخیں دنیا میں ہیں، تم میں سے جو کمینہ ہو گا، وہ اس کی شاخ سے چمٹا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں پہنچا دیں گے۔"(445)

جس طرح بخل بے اعتدالی کی ایک صورت اور تفریط کی ایک قسم ہے، اسی طرح فضول خرچی بھی افراط کی ایک قسم ہے۔ دونوں عدم اعتدال کی صورتیں ہیں۔ نبوی فراست جود وسخا کو دین خدا کی سربلندی کے لیے استعمال کرتی تھی، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے نرم مزاجی اور رحم دلی کے ذریعے دلوں میں اپنی جگہ بنائی تھی، اسی طرح آپ ﷺ نے غافل اور سخت دلوں کو فتح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا بھرپور استعمال فرمایا تھا۔

ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلی مسلمان خاتون تھیں۔ لفظ خدیجہ کا معنی ہوتا ہے: ''صبح کے وقت پیدا ہونے والی بچی''۔ حضرت خدیجہ رسول اللہ ﷺ سے پندرہ سال پہلے پیدا ہوئی تھیں اور سب سے پہلے اسلام لائی تھیں اس اعتبار سے آپ اسم بامسمّٰی تھیں۔ مکہ مکرمہ کی اس امیر ترین خاتون نے اپنی ساری دولت خدا اور اس کے رسول کے راستے میں لٹا دی یہاں تک کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی میراث میں کفن کی قیمت بھی نہ تھی۔ شاید رسول اللہ ﷺ نے کسی سے قرض لے کر ان کے کفن کا بندوبست فرمایا ہو۔ ان کی وفات کی یہی سب سے مناسب صورت تھی۔ انہوں نے اپنا آخری درہم بھی راہِ خدا میں خرچ کر دیا تھا۔[446] حضرت خدیجہ صراط مستقیم پر چلنے والوں کے لیے ایک اور اسوہ حسنہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سخاوت کو بڑی فراست سے استعمال فرمایا تھا۔ آپ کی سخاوت رائیگاں نہیں گئی، بلکہ آپ ﷺ نے اس سے اسلام کی قوت بڑھانے کا کام لیا۔

۲- آپ ﷺ کی تواضع پسندی

رسول اللہ ﷺ کی فراست کا ایک درخشاں پہلو تواضع بھی ہے۔ جوں جوں لوگوں میں آپ ﷺ کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا توں توں آپ ﷺ کی تواضع بھی بڑھتی گئی۔ آپ ﷺ آغاز زندگی سے ہی متواضع انسان تھے اور وفات تک ایسے ہی رہے۔ آپ ﷺ کا مشہور ارشاد ہے: ''جو خدا کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند کرتے ہیں۔[447] آپ ﷺ نے اپنے ارشاد پر خود عمل کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ اپنے آپ کو ہمیشہ ایک عام انسان سمجھتے تھے۔ آپ نے اپنے آپ کو کبھی بھی دوسروں سے ممتاز نہیں سمجھا۔ آپ ﷺ اس ضرب المثل کا بہترین نمونہ تھے: ''لوگوں کے درمیان ایک عام فرد بن کر رہو۔''

انسان کو اپنے مقام ومنصب سے دھوکا کھا کر اپنی اصلیت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ تمام انسان بشر ہیں۔ منصب سے انسان بدلتا ہے اور نہ ہی کوئی اور مخلوق بنتا ہے۔ اس لیے انسان کو یہ کبھی

نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح ایک فرد ہے۔اگر بعض لوگوں کے خیال کے مطابق جمہوریت بہترین نظام ہے تو اسلام اس نظام کو صدیوں پہلے متعارف کراچکا ہے،تاہم ہم اسلامی نظام پر جمہوری نظام کے اطلاق کے حق میں نہیں ہیں۔

ذیل میں ہم اسلامی نظام کی چند معاشرتی مثالیں پیش کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک ذمی فریق مخالف کے ساتھ،جس نے عدالت میں ان کے خلاف دعوی دائر کیا تھا،قاضی شریح کے سامنے پیش ہوئے۔قاضی شریح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اس پیش کش کو قبول نہ کیا،کیونکہ آپ کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ خود تو بیٹھیں اور ان کا فریق مخالف کھڑا رہے۔ان کے رائے میں یہ بات خلافِ عدل تھی۔ذرا تصور کیجئے یہ بات حضرت علیؓ نے اس وقت فرمائی تھی جب آپ مسلمانوں کے خلیفہ یعنی سربراہ مملکت تھے۔(448)

رسول اللہ ﷺ بے تکلفانہ زندگی گزارتے اور لوگوں میں گھل مل کر رہتے۔بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہونے والا شخص آپ ﷺ کو صحابہ کے درمیان اس وقت تک نہ پہچان سکتا جب تک وہ صحابہ کرام کے رویے اور طرزِ عمل سے اندازہ نہ لگالیتا یا رسول اللہ ﷺ صحابہ سے گفتگو نہ فرمانے لگتے۔ہجرت کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینے پہنچے تو بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہوا نہ تھا اور نہ ہی آپ کو پہچانتے تھے،بھاگے بھاگے آئے اور حضرت ابوبکر کو نبی کریم ﷺ سمجھ کر ان کی دست بوسی کرنے لگے،لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پنکھا لے کر رسول اللہ ﷺ کو جھلنے لگے تو لوگوں کو پتا چلا کہ ان میں سے نبی کریم ﷺ کون ہیں۔اس اشتباہ کی وجہ یہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی ایسا طرز اختیار نہیں کیا ہوا تھا،جس سے آپ ﷺ حضرت ابوبکر سے ممتاز نظر آتے۔(449)

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کے مکہ میں داخل ہونے کی کیفیت تو معروف ہے اور سبھی جانتے ہیں۔آپ ﷺ اپنی سواری پر اس قدر جھکے ہوئے تھے کہ زین آپ کی پیشانی مبارک پر لگنے لگی تھی۔نبی کریم ﷺ اس قدر تواضع کے ساتھ اس شہرِ مکرم میں داخل ہوئے۔(450) ایک حدیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے بارے میں فرماتی ہیں:''آپ ﷺ اہل خانہ کے کاموں میں مصروف رہتے اور جب نماز کا وقت شروع ہوتا تو نماز کے لیے چلے جاتے۔''ایک اور روایت میں ہے:''آپ ﷺ عام انسانوں کی طرح رہتے،اپنے کپڑے سی لیتے،اپنی بکری کا دودھ دوہ لیتے اور اپنے کام خود ہی کر لیتے تھے۔''(451)

آپ ﷺ یہ کام اس زمانے میں کرتے تھے جب اسلام اور آپ کے نام کا مختلف ممالک میں چرچا تھا۔ آپ ﷺ کا نظام الاوقات اتنا عمدہ تھا کہ آپ کو اپنے بڑے بڑے کاموں اور ذمہ داریوں کے باوجود ایسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی فرصت مل جاتی تھی۔ یقیناً آپ ﷺ ہر خوبی کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔

الف: لوگوں کے درمیان

بڑے لوگوں میں تواضع عظمت کی اور تکبر چھوٹے پن کی علامت ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ سب سے عظیم انسان تھے، اس لیے آپ ﷺ میں تواضع بھی سب سے زیادہ پائی جاتی تھی۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران جہاں دوسرے لوگ محنت اور کام کر رہے تھے وہیں آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ ایک فرد کی حیثیت سے اینٹیں اٹھا رہے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران صحابہ کرام کے ساتھ نبی کریم ﷺ بھی اینٹیں اٹھا رہے تھے۔ میرا رسول اللہ ﷺ سے سامنا ہوا، آپ ﷺ اپنے پیٹ سے ایک اینٹ ٹیکے ہوئے تھے۔ میں سمجھا شاید آپ ﷺ کے لیے اسے اٹھانا دشوار ہو رہا ہے، اس لئے میں نے آپ سے عرض کی: ''یا رسول اللہ! یہ مجھے پکڑا دیجئے۔'' لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابو ہریرہ! اس کے سوا کوئی اور اینٹ اٹھا لو، کیونکہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔''(452) خندق کی کھدائی کے دوران ہر صحابی نے اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر باندھا ہوا تھا، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے دو پتھر باندھ رکھے تھے۔(453) ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو دیکھ کر آپ کی ہیبت سے کانپنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اطمینان رکھو۔ میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ٹکڑے کیا ہوا گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔''(454) یقیناً آپ ﷺ سب سے زیادہ متواضع انسان تھے۔ جو لوگ محفلوں میں غرور و تکبر سے ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر بیٹھتے ہیں، میں انہیں نفسیاتی مریض تصور کرتا ہوں۔ حضور ﷺ تو عام لوگوں کی طرح بیٹھتے اور انہیں کی طرح رہتے تھے، لیکن آداب کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔ آپ کی نظر اکثر زمین پر رہتی اور جب آپ ﷺ اپنی پیشانی سجدے میں رکھتے، اس وقت آپ کی عظمت کا ظہور ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتے ہیں اور جو تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پست کر دیتے ہیں۔''(455)

تواضع اور انکسار دو ایسے پر ہیں، جن کے ذریعے انسان بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اسی تواضع کی بدولت رسول اللہ ﷺ انسانیت کے ابدی رہبر قرار پائے۔ آپ ﷺ کے متواضعانہ رویے کی

بدولت ہی لوگوں کے لیے آپ کا سامنا کرنا، آپ سے اطمینان وسکون سے گفتگو کرنا، آپ کے سامنے اپنی مشکلات پیش کرنا اور آپ سے سوالات پوچھنا ممکن ہوسکا۔

قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ ایک عورت جس کا دماغی توازن کچھ ٹھیک نہ تھا، آپ ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اے ام فلاں! مدینے کی جس گلی میں چاہو بیٹھ جاؤ میں تمہارے پاس اس وقت تک بیٹھا رہوں گا جب تک تمہارا کام نہ کردوں۔'' چنانچہ وہ بیٹھ گئی اور آپ ﷺ بھی اس کے ساتھ بیٹھے رہے یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری ہوگئی۔[(456)]

رسول اللہ ﷺ کا اس طرح کے کام کرنا خست یا چھوٹے پن کی وجہ سے نہ تھا۔ آپ ﷺ تو سب سے زیادہ بہادر انسان تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ کفر کے سامنے انتہائی جرأت اور بہادری سے ڈٹ گئے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بارے میں فرماتے ہیں: ''جنگ بدر میں ہم مسلمان رسول اللہ ﷺ کی پناہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ آپ دشمن کے سب سے زیادہ قریب تھے اور اس دن سب سے زیادہ شدت سے جنگ لڑ رہے تھے۔[(457)] آپ ﷺ کے تکبر سے پاک اعمال آپ کی تواضع کے چشمے سے پھوٹتے تھے اور آپ کی موجودگی سے گردوپیش میں اطمینان وسکون پھیلتا تھا۔

ب: فطرت سے ہم آہنگ رویہ

تواضع ذلت کا باعث ہے اور نہ ہی تکبر وقار کی علامت۔ رسول اللہ ﷺ اپنے دیگر اخلاق اور رویوں کی طرح تواضع کے بارے میں بھی اس قدر متوازن شخصیت کے مالک تھے کہ یہ بات آپ ﷺ کی رسالت کی دلیل قرار دی جاسکتی ہے۔

اگر قاضی کمرہ عدالت میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرے تو یہ وقار کہلاتا ہے، لیکن اگر وہ یہی رویہ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ اختیار کرے تو اسے تکبر کہیں گے، کیونکہ انسان پر لازم ہے کہ وہ گھر میں ایک عام فرد کی طرح رہے۔ یہ اسلامی دستور ہے، جسے رسول اللہ ﷺ نے سب سے بہتر طریقے سے اپنایا اور آپ کے بعد آنے والے لوگوں نے آپ کی پیروی کی۔ آپ ﷺ ہر کسی کی نظر میں عظیم ترین ہستی تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''تم میں سے کسی کو بھی اس کے عمل کی وجہ سے نجات نہ ملے گی۔'' صحابہ نے دریافت کیا: ''آپ کو بھی یا رسول اللہ؟'' آپ نے

فرمایا: ''ہاں مجھے بھی میرے عمل کی وجہ سے نجات نہ ملے گی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل و رحمت سے ڈھانپ لیں۔''(458) فطرت سے اس قدر ہم آہنگی کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی، کیونکہ آپ ﷺ اپنے آپ کو ایک عام انسان اور فرد سمجھتے اور اسی اصول کی بنیاد پر اپنے طرز عمل اور رویوں کو تشکیل دیتے تھے۔

ایک بار حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عمرہ کرنے کی اجازت چاہی۔ صحابہ کرام عمرہ کی ادائیگی کے لیے بھی آپ ﷺ سے اجازت مانگا کرتے تھے، کیونکہ وہ ایک نظام کے پابند تھے اور ہر معاملے اور پیش آمدہ مشکل کے سلسلے میں فوراً رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے، مثلاً اگر کسی کی بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ جاتی تو وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا: ''میری بیٹی بالغ ہو چکی ہے۔ مجھے اس کے لیے مناسب رشتے کی تلاش ہے۔'' اگر کوئی اپنا باغ راہِ خدا میں وقف کرنا چاہتا تو پہلے اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرتا، اسی طرح اگر کوئی اعتکاف یا سفر کرنے کا ارادہ کرتا تو آپ ﷺ سے اجازت چاہتا اور آپ ﷺ بھی کسی کی درخواست کو رد نہ فرماتے، چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمرہ کی ادائیگی کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک ایسی بات ارشاد فرمائی، جسے حضرت عمر نے عمر بھر یاد رکھا۔ وہ بات یہ تھی: ''اے میرے بھائی! ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا اور ہمیں بھولنا مت۔'' یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو انتہائی خوشی ہوئی اور فرمایا کہ اگر مجھے ساری دنیا بھی دے دی جاتی تو مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی مجھے آپ ﷺ کی اس بات سے ہوئی تھی۔(459)

ج: تواضع اور عبدیت

آپ ﷺ کی تواضع نے دلوں کو ایک بار پھر جیت لیا۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کا ہاتھ تھام کر اسے ترقی اور بلندی کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔ حضرت عمر ایک ہی جست میں اعلیٰ مرتبے پر پہنچ گئے، تاہم رسول اللہ ﷺ عموماً اپنے صحابہ کو بتدریج بلندی کی طرف لے گئے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک بدو قوم کو رہبر و ہادی بنا دیا۔ ایک طرف آپ اپنی امت کو بلندیوں کی طرف لے گئے تو دوسری طرف آپ کا اپنا ارتقا اس سے بھی بلند و بالا تھا۔ آپ ﷺ جس قدر بلندیوں کو چھوتے گئے آپ کی تواضع میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا اور جب آپ ﷺ اپنی ذات کی طرف دیکھتے تو اسے اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کے جذبے سے سرشار پاتے۔

امام احمد بن حنبل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرائیل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ انہوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ آسمان سے اتر رہا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ جب سے اس فرشتے کی تخلیق ہوئی ہے، اس گھڑی سے پہلے کبھی بھی زمین پر نہیں اترا۔ جب وہ فرشتہ اتر آیا تو اس نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''اے محمد ﷺ! مجھے آپ کے پروردگار نے آپ کی طرف یہ پوچھنے کے لیے بھیجا ہے کہ آپ کو نبوت و بادشاہت کا امتزاج پسند ہے یا رسالت و عبدیت کا؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے پروردگار کے سامنے تواضع اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ قرآن کریم نے بھی رسول اللہ ﷺ کو یہی ہدایت کی ہے: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الشعراء: ۲۱۵) ''اور جو مؤمن تمہارے پیرو ہو گئے ہیں، ان سے بتواضع پیش آؤ۔'' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرشتے کو یہی جواب دیا کہ میں رسالت و عبدیت کے امتزاج کو پسند کرتا ہوں۔ [460] چونکہ آپ ﷺ نے عبدیت کو پسند فرمایا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عبدیت کو آپ کیلئے باعث فخر بات بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر آپ ﷺ کے بارے میں عبدیت کے تناظر میں گفتگو کی ہے اور مسلمان بھی تشہد میں آپ کی عبدیت و رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور آپ کی عبدیت کو آپ کی رسالت سے پہلے ذکر کرتے ہیں۔

بعض لوگ دوسروں کے بندے بن کر اپنی گردنوں میں ان کی غلامی کا طوق ڈال لیتے ہیں، لیکن محمد ﷺ اول و آخر اللہ کے بندے تھے۔ آپ ﷺ زندگی کے کسی بھی حصے میں کسی دوسرے انسان کے تابع رہے اور نہ ہی کسی کے آگے جھکے۔ صرف خدا تعالیٰ کی عبدیت کا جذبہ آپ ﷺ کے رگ و ریشے میں پیوست تھا۔ آپ ﷺ کی عبدیت کا اظہار کرنے کے لیے ہی روزانہ پانچ مرتبہ میناروں پر سے عالم بھر میں اس گواہی کا اعلان کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآن آپ ﷺ کے اسی وصف کا ذکر کرتا ہے: ﴿وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ (الجن: ۱۹) ''اور جب خدا کے بندے (محمد) اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے تو کافر ان کے گروہ ہجوم کر لینے کو تھے۔'' یہ بات اتنی اہم نہیں کہ جو لوگ آپ ﷺ کے گرد ہجوم کر لینے کو تھے وہ جن تھے یا قریش؟ ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ قرآن پاک نے یہاں رسول اللہ ﷺ کو 'عبداللہ' کے وصف سے ذکر کیا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں جب اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کیسے کلامِ خداوندی ہے

اور جسے اس کے کلام خداوندی ہونے میں شک ہے وہ اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آئے، تو وہاں بھی آپ ﷺ کے لیے عبدیت کے وصف کو اختیار کیا گیا ہے: ﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ ()فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ﴾ (البقرہ:۲۳-۲۴) ''اور اگر تم کو اس (کتاب) میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد عربی) پر نازل فرمائی ہے، کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو، لیکن اگر (ایسا) نہ کر سکو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے (اور جو) کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔'' اسی طرح قرآن کریم واقعہ معراج کے تناظر میں بھی نبی کریم ﷺ کے وصف عبدیت کا تذکرہ کرتا ہے: ﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الاسراء:۱) ''وہ (ذات) پاک ہے، جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔''

پہلے مقاطعے اور پھر آپ ﷺ کی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کی وفات کے حادثے نے آپ ﷺ کو تنہا اور بے یار و مددگار کر دیا تھا، لیکن جب تمام اسباب اور سہارے یکے بعد دیگرے ختم ہو گئے تو مسبب الاسباب کی طرف سے احدیت کے برج پر رحمت الٰہیہ کا ظہور ہوا۔ دورِ حاضر کے مفکر سعید نورسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احدیت کے برج پر توحید کا نور چمکا اور رسول اللہ ﷺ کو اپنے پروردگار اور مالک وخالق سے ملاقات کے لیے ساتوں آسمانوں میں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے بلایا گیا۔''

چونکہ یہاں واقعہ اسراء ومعراج پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں، اس لیے ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے، تاہم ہم اس طرف قارئین کی توجہ ضرور مبذول کرانا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اہم ترین معجزے کے ضمن میں آپ ﷺ کو قرآن، تورات یا انجیل میں ذکر کردہ کسی نام مثلاً محمد، احمد یا احید سے پکارنے کی بجائے ''عبدہ'' سے پکارا ہے، گویا جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں۔'' تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا: ''چونکہ آپ نے عبدیت کو پسند کیا ہے، اس

لیے میں عبدیت کو آپ کا اعلیٰ ترین مقام بنادوں گا، جہاں بھی آپ کی قدر و منزلت کا اظہار کروں گا وہاں آپ کی عبدیت کا تذکرہ کروں گا اور ہر مسلمان کو آپ کی رسالت سے پہلے آپ کی عبدیت کی گواہی دینے کا پابند بناؤں گا۔ عنقریب زمین و آسمان اس گواہی سے گونج اٹھیں گے۔''

و: حاصل گفتگو

شمائل کی کتابوں نے آپ ﷺ کے بدنی اوصاف سے لے کر اخلاق اور گہری روحانیت جیسے شمائل کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ ﷺ ہر اعتبار سے کامل ترین انسان تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ ہاتھ کے سب سے زیادہ سخی، دل کے سب سے زیادہ مطمئن، گفتگو میں سب سے زیادہ سچے، طبیعت کے سب سے زیادہ نرم اور خاندانی لحاظ سے سب سے زیادہ باعزت انسان تھے، جو شخص آپ ﷺ کو اچانک دیکھتا وہ آپ سے مرعوب ہو جاتا اور جو آپ سے گھل مل جاتا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا۔''(461)

ماضی میں لوگوں نے کسی سے آپ ﷺ جتنی محبت کی ہے اور نہ مستقبل میں کریں گے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ آپ ﷺ حبیب پروردگار عالم جو تھے۔

پانچویں فصل: عصمت

عصمت بھی انبیائے کرام علیہم السلام کی اہم ترین صفت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا انبیائے کرام کو چھوٹے بڑے ہر قسم کے گناہوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھنا مراد ہے۔ ان شاء اللہ ہم اس کتاب کی دوسری جلد میں اس موضوع پر ایک مستقل بحث کے تحت گفتگو کریں گے۔

دوسرا حصہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مربی

پہلی فصل: نبی کریم ﷺ بحیثیت مربی اور سربراہ خانہ

نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کے سب سے بہتر نمائندہ تھے حتیٰ کہ تمام انبیائے کرام میں سے آپ ہی اس صفاتی نام کے سب سے بہتر نمائندہ تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو امتیازی فطرت سے نوازا تھا۔ بلاشبہ نبی کریم ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام انبیاء کے بعد افضل ترین انسان تھے، لہٰذا ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم جیسی ہستیوں کی مثال ملنا ممکن نہیں۔

صرف یہی چار صحابہ کرام نہیں، بلکہ کسی بھی صحابی کے مرتبے کو پہنچنا ناممکن ہے، کیونکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زیرنگرانی تربیت حاصل کی تھی۔ کچھ اور ہستیوں نے بھی اسی نبوت کے ماحول میں تربیت پائی اور بعد کے ادوار میں بکھرے ہوئے موتیوں کی صورت میں چمکے، ان کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے تربیت پائی اور انسانیت کے لیے باعث فخر قرار پائے۔ فضیل بن عیاض، بشر حافی، ابویزید بسطامی، جنید بغدادی، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام ربانی، امام غزالی، مولانا جلال الدین رومی، شاہ گیلانی، شاذلی، شیخ نقشبندی، احمد رفاعی اور بدیع الزمان سعید نورسی جیسی بہت سی ہستیوں کی نظیر پیش کرنا یا کسی کی ان جیسی تربیت کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے نظام تربیت کے مطابق پرورش پائی اور نبی کریم ﷺ سے فیض یاب ہوئے۔ سند کے اعتبار سے ایک ضعیف حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔''(462)

عمومی فضیلت کے لحاظ سے تو کوئی بھی انبیائے کرام علیہم السلام کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا، البتہ بعض خاص پہلوؤں سے اوپر ذکر کردہ حضرات کا انبیائے کرام کے مقام کو پہنچنا ممکن ہے۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے حضرات کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہستیاں ہمارے لیے باعث فخر ہیں۔ اگر ان کے خلا کو کسی اور ہستی سے پر کرنا مطلوب ہوا تو اس کے لیے فرشتوں کو آسمان سے زمین پر اتارنا پڑے گا، کیونکہ صرف فرشتے ہی ان کے خلا کو پر کر سکتے ہیں۔

یہ صرف نبی کریم ﷺ کی تربیت کی برکت ہے، کیونکہ صرف آپ ﷺ کے ساتھ انتساب ہی اس قدر ثمر آور ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ کی نوازشوں کا یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ ہم قحط الرجال کے جس دور سے گزر رہے ہیں، نہ جانے اس کے بعد کیسی کیسی پاکیزہ صفات اور عظیم قلبی و روحانی کیفیات کی حامل شخصیات ظہور پذیر ہوں گی۔ ہماری امیدیں ایسی ہی عظیم ہستیوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں تو اپنے ہوش سنبھالنے کے وقت سے ان سے امید وابستہ کیے ان کے انتظار میں ہوں۔

آپ ﷺ کے عمومی تربیتی اصولوں کے تذکرے سے پہلے ہم آپ ﷺ کے اہل خانہ کی تربیت کے اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ بیوی بچوں اور نواسے نواسیوں پر مشتمل خاندان کے سربراہ تھے۔

الف: نبی کریم ﷺ بحیثیت سربراہ خانہ

اس میں کچھ شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ کا خاندان تاریخ میں دنیا کا سب سے زیادہ باسعادت اور مبارک خاندان تھا۔ سعادت و نیک بختی اس خاندان میں ہمیشہ رہی... اگرچہ مادی لحاظ سے یہ خاندان دنیا کے تنگ دست ترین خاندانوں میں سے تھا، کیونکہ مہینوں گزر جاتے، لیکن آپ کے گھر کوئی بھی کھانا نہ پکتا تھا۔(463)

آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے مکانات چھوٹے چھوٹے حجروں پر مشتمل تھے، جن میں سے ہر ایک کو ایک ایک حجرہ حاصل تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کی خوش نصیب ازواجِ مطہرات آپ ﷺ کے ساتھ گزری ہوئی ایک گھڑی کے عوض پوری دنیا کو بھی لینا گوارا نہ کرتی تھیں... وہ سب اسی حال پر مطمئن اور خوش تھیں اور اس میں لطف محسوس کرتی تھیں۔ حضرت فاطمہ کے سوا آپ ﷺ کی تمام اولاد آپ ﷺ کی زندگی میں ہی وفات پا گئی تھی۔ حضرت فاطمہ نے بھی تنگ دستی میں زندگی بسر کی اور رسول ﷺ نے بھی ان کے لیے آسودہ زندگی کا انتظام نہیں فرمایا، حالانکہ رسول ﷺ اور آپ کی ازواجِ مطہرات کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بہت زیادہ محبت تھی، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کو گھر کے تمام افراد کے دلوں میں جو مقام حاصل تھا اسے مکمل طور پر بیان کرنا ممکن نہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی وفات کے بعد کئی روز تک آنسو بہاتی رہیں(464) کسی اولاد نے اپنے والد سے ایسی محبت کی جیسی محبت حضرت فاطمہ کو اپنے والد یعنی حضور ﷺ سے تھی اور نہ ہی کسی والد کو اپنی اولاد سے ایسی محبت ہوئی جیسی محبت آپ ﷺ کو اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تھی۔(465) کسی بیوی نے اپنے خاوند سے ایسی محبت کی جیسی محبت ازواجِ مطہرات کو رسول اللہ ﷺ سے تھی اور نہ ہی کوئی خاوند اپنی بیویوں کے ہاں اتنا محبوب بنا جتنے رسول اللہ ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات کے ہاں محبوب تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے گرد اس حلقۂ محبت کا سبب وہ اصول ہیں، جن کے مطابق آپ ﷺ نے اپنے قریب رہنے والے لوگوں کی تربیت فرمائی، جس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ سے محبت و تعلق کا یہ ہالہ پیدا ہوا اور پھر آپ ﷺ کی محبت آپ ﷺ کے گردوپیش کے تنگ دائرے سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گئی۔ یہ آپ ﷺ کی فراست کا ایک اور پہلو ہے۔

ذرا تصور کیجئے کہ جب رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کے لیے ایک مکمل گھر بھی نہ چھوڑا تھا، بلکہ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات نے آپ ﷺ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کمروں میں زندگی بسر کی اور انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے وراثت میں یہی

کمرے ملے... سید الرسل حضرت محمد ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات کو اس قدر فقر اور تنگ دستی کی حالت میں چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن اس کے باوجود ازواجِ مطہرات کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا۔ اگر چہ دو ایک ازواجِ مطہرات کے دل میں اس قسم کا خیال پیدا ہوا تھا، لیکن قرآن کریم کی تنبیہ نے اس خیال کو بھی ان کے دلوں سے نکال دیا۔[466]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ازواجِ مطہرات کے لیے بیت المال میں سے اتنا ہی وظیفہ مقرر فرمایا جتنا ایک عام مسلمان کو دیا جاتا تھا۔ یہ آپ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا کہ آپؓ نے ازواج مطہرات کے لیے سابقین فی الاسلام صحابہ کرام کے وظیفہ سے بہت کم وظیفہ مقرر فرمایا، لیکن جب حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے صف اوّل کے مسلمانوں کے وظائف کی فہرست میں ازواجِ مطہرات کے وظائف کو بھی شامل فرمایا، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ازواجِ مطہرات اگر چہ سابقین فی الاسلام میں سے نہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ قرب اور قیامت تک امہات المؤمنین ہونے کی وجہ سے سابقین فی الاسلام کے وظائف کے برابر وظائف کی حقدار ہیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا، جو اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع نہیں۔ اس مقام پر ہمارا مطلوب اس بلند مقام کی نشاندہی کرنا ہے، جسے ازواجِ مطہرات نے رسول اللہ ﷺ کی تربیت کے نتیجہ میں پایا اور جب ان کے دل و دماغ رسول اللہ ﷺ کی تربیت میں ڈھلے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر چیز سے غافل ہو گئیں، حالانکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت میں زیادہ عرصہ گزرا تھا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے انہیں بہت زیادہ مال و دولت سے نوازا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بالکل منفرد جاذبیت حاصل تھی، جس سے ہر چیز مسحور ہو جاتی۔ یہ بھی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ایک پہلو ہے۔

تعددِ ازواج بھی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی دلیل ہے۔ چونکہ اس موضوع پر ہم بعد میں مستقل طور پر گفتگو کریں گے، اس لیے اس مقام پر ہم اس موضوع سے صرف نظر کرتے ہیں، البتہ ہم اس مقام پر اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا گھر عورتوں سے متعلق مسائل کی درسگاہ تھا۔ آپ ﷺ کے مخصوص حالات کا علم اسی مخصوص شخصی ماحول کے ذریعے ہوا اور پھر بعد میں آپ کی امت اس سے واقف ہوئی۔ گھریلو زندگی سے متعلق نوے فیصد مسائل کا علم آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے ذریعے ہوا۔ اس لیے مختلف معاشروں سے تعلق رکھنے والی مختلف صلاحیتوں کی حامل عورتوں کا آپ ﷺ کے گھر میں ہونا ضروری تھا، چنانچہ عورتوں اور خاندانی زندگی سے متعلق دینی احکام کی تعلیم کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ترپن سال کی عمر کے بعد متعدد عورتوں سے شادی کرنے کو قبول فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے گھر میں متعدد ازواجِ مطہرات کا ہونا اس لیے بھی ضروری تھا کہ مرد ہمہ وقت

مسجد میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے تعلیم حاصل کرتے اور اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر نہ ہو سکتا تو وہ دوسرے صحابہ کرام سے پوچھ کر اس کا تدارک کر لیتا، لیکن چونکہ عورتوں کو ہمہ وقت رسول اللہ ﷺ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل نہ تھا، اس لئے وہ اس امتیاز سے محروم تھیں۔ عام دینی احکام خصوصاً عورتوں سے متعلق مسائل عورتوں کو کون بتاتا؟ اور آپ ﷺ کے مخصوص حالات اور کمرہ آرام کی مخصوص زندگی سے امت کو کون آگاہ کرتا؟ کیا اکیلی عورت ان تمام دینی احکام کو تمام اصول و آداب کے ساتھ سمجھ کر ان سے امت کو آگاہ کر سکتی تھی؟ چونکہ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو بھی انسانی فطرت کی وجہ سے عام عورتوں کی طرح نسوانی عوارض کا سامنا تھا، اس لیے اس ذمہ داری کو نبھانا کسی ایک عورت کے بس میں نہ تھا اور نہ ہی اکیلی عورت ان مسائل و احکام کی وضاحت کرنے کے لیے کافی تھی، لہٰذا ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت میں بہت ساری ازواجِ مطہرات ہوں، جو آپ ﷺ کی اندرونِ خانہ زندگی کا قریب سے بغور مطالعہ کر کے امت کو اس سے آگاہ کریں۔ تعددِ ازواج محض ایک دینی ضرورت تھی، جس کا رسول اللہ ﷺ کے بشری تقاضے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہی دینی ضرورت رسول اللہ ﷺ کے لیے اس بھاری بوجھ کو برداشت کرنے کا سبب بنی تھی۔

مزید براں ازواجِ مطہرات اپنی اپنی قوم اور قبیلے کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رشتہ قرابت میں جوڑنے اور ہزاروں احادیث مبارکہ کی حفاظت کا ذریعہ بنیں۔ ہم پورے وثوق اور اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تمام عورتیں ازواجِ مطہرات کے زیر بار احسان ہیں اور وہ کسی بھی طرح ازواجِ مطہرات کی خدمات کا حق ادا نہیں کر سکتیں۔ یہ وہ مقام ہے، جو ازواجِ مطہرات نے خدمت دین کے سلسلے میں حاصل کیا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ازواجِ مطہرات کے ساتھ عقد نکاح کرنا بشری یا جسمانی تقاضے سے نہ تھا، کیونکہ جزیرہ نمائے عرب جیسے گرم علاقے میں کسی شخص کو ترپن سال کی عمر کے بعد بشری تقاضے سے متعدد عقد نکاح کرنے کی ضرورت پیش آنا ممکن نہیں۔ اسی طرح ازواجِ مطہرات کا آپ ﷺ سے نکاح کرنا بھی کسی دنیوی یا جسمانی تقاضے کے پیش نظر نہ تھا، کیونکہ آپ ﷺ انتہائی فقر و فاقہ کی زندگی گزراتے تھے۔ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود آپ ﷺ سے رشتہ ازدواج میں منسلک رہنے کی خواہشمند تھیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات کے درمیان مکمل برابری فرماتے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس ہفتہ میں صرف ایک دن قیام فرماتے، لیکن اس کے باوجود ازواجِ مطہرات کی رائے میں رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں پر سب سے زیادہ شفقت کرنے والے اور بشاشت اور خندہ پیشانی سے پیش آنے والے تھے۔

کیا ان عورتوں کو گھر میں لمبے عرصے تک کھانے پینے کی اشیاء مہیا نہ ہونے اور ایک ہی قسم کا لباس

لمبے عرصے تک استعمال کرنے پر کچھ ناراضی اور ترش مزاجی کے اظہار کا حق حاصل نہ تھا؟ تاریخ وسیرت سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود ازواجِ مطہرات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خوش وخرم تھیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی شخصیت کے وقار اور رعب کے باوجود ازواجِ مطہرات کے ساتھ خوش طبعی فرماتے اور انہیں اپنے قرب اور توجہ کا احساس دلاتے،لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے ہمیشہ تعلق مع اللہ کا ایک حائل برقرار رکھا، جس کے نتیجے میں آخرت کی زندگی آپ ﷺ کی نظروں سے کبھی اوجھل نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ نبی تھے اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات سب سے پہلے آپ ﷺ کی امت کا حصہ تھیں۔ آپ ﷺ کے ازواجِ مطہرات کے ساتھ تعلق میں موجود خلا کو پر کرنا ممکن نہ تھا، کیونکہ اس لحاظ سے آپ ﷺ منفرد اور ممتاز تھے، چنانچہ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات آپ کے سوا کسی کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے عقد نکاح فرمایا اور وہ آپ کی دوسری زوجہ محترمہ اور ام المؤمنین بن گئیں،لیکن کسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے انہیں طلاق دینے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو جب اس کا علم ہوا تو یہ بات ان پر بجلی بن کے ٹوٹی۔ انہوں نے فوراً اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے بات کرنے کے لیے ایک شخص بھیجا اور پھر خود ہی جلدی سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ میری دنیا میں ایک ہی خواہش ہے کہ قیامت کے دن میرا شمار آپ کی ازواجِ مطہرات میں ہو اور مجھے آپ کی بیویوں کی طرح اجر وثواب عطا ہو۔'' حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی۔ (467)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سودہ بن زمعہ کی خواہش کا احترام فرمایا اور انہیں اپنے عقد نکاح میں رکھا۔ یہ وہ مقام تھا جو رسول اللہ ﷺ کو اپنی بیویوں کے ہاں حاصل تھا۔ اگر آپ ﷺ اپنی بیویوں میں سے کسی کو طلاق دیتے تو وہ عمر بھر آپ ﷺ کے گھر کی چوکھٹ پر آپ کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے کچھ ناگواری محسوس کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر حفصہ کی خواہش ہو تو میں اسے چھوڑ دوں۔'' آپ ﷺ کی صرف اتنی سی بات سے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی دنیا بدل گئی اور ثالثوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے انہیں طلاق نہ دینے کی درخواست کی کہ وہ نیک اور صوم وصلاۃ کی پابند خاتون ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو اپنے رشتہ ازدواج میں برقرار رکھا۔ (468)

رسول اللہ ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات آپ ﷺ کے فراق کو موت سے زیادہ کڑوا محسوس کرتیں۔ یہ بات سب میں قدرِ مشترک تھی اور اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ تھی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کو اپنی

ازواجِ مطہرات کے ہاں جو مقام حاصل تھا اس کا کوئی بدل یا عوض نہ تھا۔ آپ ﷺ اپنی بیویوں کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ انتہائی معتدل اور فطری زندگی بسر کی اور ان کے ساتھ انتہائی اچھے اخلاق کے ساتھ رہے۔ اگر وہ آپ ﷺ سے جدا ہو جاتیں تو ہوا سے محروم ایسے شخص کی طرح ہو جاتیں جو سانس گھٹنے سے مرنے والا ہو۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی دردانگیز جدائی کا یہی مظہر ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ جب بھی حضرت ابوبکر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما امہات المؤمنین میں سے کسی کے پاس تشریف لے جاتے تو انہیں روتا دیکھ کر خود بھی بیٹھ کر رونے لگتے۔ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کا یہ حال آخر دم تک رہا... یہ وہ لازوال اثر تھا جو رسول اللہ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے دلوں پر چھوڑا تھا... آپ ﷺ تھوڑی سی مدت میں اپنی ازواجِ مطہرات کے لیے چشمہ حیات بن گئے... یہی وہ حقیقت ہے، جسے ہم یہاں ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی اپنے خاندان کی سربراہی آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتی ہے۔

آپ ﷺ نے ایک لمبا عرصہ اپنی نو ازواجِ مطہرات کے ساتھ گزارا، لیکن اس دوران گھر میں کبھی کوئی سنجیدہ مشکل پیش نہ آئی... آپ ﷺ نرم دل، کامیاب اور محبوب سربراہ خانہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے چند دن پہلے لوگوں سے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا: ''اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا۔ اس بندے نے آخرت کو پسند کرلیا۔'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو انتہائی زیرک اور معاملہ فہم انسان تھے، یہ سن کر زاروقطار رونے لگے،(469) کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ جس بندے کو اختیار دیا گیا ہے وہ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ آپ ﷺ کا مرض روز بروز بڑھتا گیا اور آپ ﷺ شدید درد سر کے باعث بستر پر کروٹیں لینے لگے... لیکن ایسی حالت میں بھی اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ ﷺ کے نرم رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور آخر کار جب سب ازواجِ مطہرات کے پاس جانے کی ہمت نہ رہی تو ان سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں آرام فرمانے کی اجازت مانگی، جسے سب ازواج مطہرات نے بخوشی قبول کرلیا، اس طرح آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گزارے۔(470) آپ ﷺ نے مشکل ترین حالات میں بھی اپنی ازواج مطہرات کے حقوق کی مکمل رعایت فرمائی... اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ کس قدر روحانیت اور نرم مزاجی کے حامل اور آداب کا کس قدر لحاظ رکھنے والے انسان تھے۔

ب: رسول اللہ ﷺ کی نظر میں ازواجِ مطہرات کی قدر ومنزلت

رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو جو مقام دیا تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اگر آپ ﷺ کسی رات کسی ایک زوجہ محترمہ کے پاس اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے تشریف لے جاتے تو دوسری ازواجِ مطہرات کے پاس بھی جاتے۔ آپ ﷺ رہن سہن میں ازواجِ مطہرات کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ فرماتے۔ آپ ﷺ کی بے مثال مروت کا ہی نتیجہ تھا کہ ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ قریب سمجھتی تھی۔

جو چیز انسان کے بس میں نہ ہو وہ اس کے کرنے کا مکلّف بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ انسان اپنے دلی جذبات کے بارے میں بے بس ہوتا ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات کے درمیان باریاں مقرر کرکے برابری کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہوئے فرماتے: ''یا اللہ جو برابری میرے بس میں تھی وہ میں نے کردی اور جس بات پر آپ قادر ہیں، لیکن میں قادر نہیں اس پر مجھے ملامت نہ کیجئے۔''(471)

یہ کس قدر لطف وکرم، نرم مزاجی اور اعلیٰ ظرفی ہے! کیا آپ لوگ اپنی اولاد کے ساتھ برتاؤ میں اتنی باریکیوں کا خیال رکھتے ہیں؟ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی طرف سے اس سوال کا جواب نفی میں دوں، بلکہ اس کا جواب ہزار بار نفی میں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر ہم اپنے جذبات کے اظہار پر قابو پالیں تو اسے باعث فخر اور قوتِ ارادی کے مضبوط ہونے کی نشانی خیال کرتے ہیں اور بعض اوقات بڑے فخر سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کی طرف کچھ زیادہ قلبی میلان ہونے کے احتمال پر بھی اپنے پروردگار سے معافی مانگ رہے ہیں۔

آپ ﷺ کی نرم دلی اور آداب کی رعایت ازواجِ مطہرات کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی۔ آپ ﷺ کی جدائی سے ان کے قلب و وجدان پر کبھی نہ مندمل ہونے والا زخم لگا۔ اگر اسلام میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جاتیں۔ آپ کی مفارقت کے بعد دنیا ان کے لیے غم کدہ اور اجنبی بن گئی۔

درحقیقت آپ ﷺ تمام عورتوں کے حق میں باوقار اور نرم مزاج تھے اور دوسروں کو بھی یہی طرزِ عمل اپنانے کا حکم فرماتے۔ آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ اس رویے کو عملاً اپنا کر دکھایا، جس کی مثال درج ذیل واقعہ ہے، جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے محمد بن سعد عن ابیہ سعد بن ابی وقاص کی سند سے نقل کیا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

ایک مرتبہ چند عورتیں رسول اللہ ﷺ سے بلند آواز میں بہت زیادہ باتیں پوچھ رہی تھیں کہ اسی اثنا میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجلس میں حاضری کی اجازت چاہی۔ حضرت عمر کو دیکھ کر تمام عورتوں نے جلدی سے پردہ کرلیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر کو حاضری کی اجازت دی تو وہ اندر داخل ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کو ہنستے ہوئے پایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ تعالیٰ آپ کو ہنستا رکھے، آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے ان عورتوں پر حیرت ہے، جو تمہاری آواز سن کر فوراً پردے میں چلی گئی ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''آپ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ آپ سے ڈرا جائے۔'' پھر وہ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کہا: ''اے اپنی جان کی دشمنو! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو اور رسول اللہ ﷺ سے نہیں ڈرتیں؟ اس پر ان عورتوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سخت مزاج ہیں۔''[472]

حقیقت میں حضرت عمر سخت گیر یا درشت مزاج نہ تھے، بلکہ وہ عورتوں کے ساتھ نرم مزاجی سے پیش آتے تھے، لیکن جس طرح اگر حسین ترین شخص کا موازنہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا جائے تو وہ بدصورت دکھائی دے گا، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نرم مزاجی حضور ﷺ کی بردباری اور نرم مزاجی کے مقابلے میں درشت مزاجی محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سختی حقیقی نہ تھی بلکہ اضافی تھی۔ چونکہ ازواجِ مطہرات رسول اللہ کے اخلاق کی عادی ہوچکی تھیں، اس لیے انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اخلاق میں سختی دکھائی دی، باوجود اس کے کہ حضرت عمرؓ مستقبل میں رسول اللہ ﷺ کی خلافت کے اہل بننے والے تھے اور جب انہوں نے عملاً خلافت کا کام سنبھالا تو انبیائے کرام کے بعد سب سے بہتر اسوہ پیش کیا، کیونکہ حق اور انصاف کی جستجو آپ کی فطرت میں ودیعت تھی اور آپ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی شمشیر براں تھے۔ ان کے اسی مخصوص مزاج نے انہیں منصب خلافت کا اہل بنایا۔ بعض لوگ اسے سختی خیال کرتے ہیں، لیکن درحقیقت یہی مخصوص مزاج امورِ خلافت کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دینے میں آپ کا ممد و معاون ثابت ہوا۔

ج: ازواجِ مطہرات کے ساتھ مشاورت

رسول اللہ ﷺ ازواجِ مطہرات کے ساتھ بیٹھتے اور ان کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ بعض اوقات کسی مسئلے پر ان کے ساتھ تبادلہ خیالات بھی کرتے۔ اگرچہ وحی کی تائید حاصل ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو ان سے رائے لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن درحقیقت آپ ﷺ اس طرزِ عمل سے اپنی امت کو عورت کی قدرومنزلت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے عورت کو معاشرے میں یہ مقام حاصل نہ تھا۔ آپ ﷺ نے عملی طور پر اس کا آغاز اپنے گھر سے فرمایا۔

مسلمانوں پر صلح حدیبیہ اس قدر گراں گزری تھی کہ کسی میں اپنی جگہ سے کھڑے ہونے کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ اسی دوران رسول اللہ ﷺ نے عمرے کے ارادے سے آنے والوں کو اپنے قربانی کے جانور ذبح کرکے احرام سے نکلنے کا حکم دیا، لیکن صحابہ نے اس خیال سے اس حکم کی تعمیل میں تاخیر کی کہ شاید اس حکم میں کوئی تبدیلی ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ حکم ارشاد فرمایا، لیکن صحابہ کرام کو ابھی بھی حکم کے تبدیل ہونے کی امید تھی۔ خدانخواستہ یہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ماننے سے انکار نہ تھا، بلکہ وہ کسی اور حکم کے منتظر اور امیدوار تھے، کیونکہ وہ مدینے سے طوافِ کعبہ کے ارادے سے نکلے تھے اور ان کے خیال میں صلح حدیبیہ کے عملی طور پر نافذ ہونے سے پہلے اس میں تبدیلی کا امکان موجود تھا۔

جب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کا یہ طرزِ عمل دیکھا تو آپ اپنے خیمے میں تشریف لے گئے اور اپنی زوجہ محترمہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا۔ حضرت ام سلمہ بہت صاحب فراست خاتون تھیں۔ اگرچہ وہ جانتی تھیں کہ رسولِ اللہ ﷺ کو ان کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ اپنی بیوی سے مشورہ کرکے اپنی امت کو ایک معاشرتی اصول سمجھانا چاہتے ہیں، لیکن انہوں نے مشورے کا حق ادا کرنے کے لیے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "اے خدا کی نبی! اگر آپ پسند فرمائیں تو باہر نکلیے اور کسی سے کوئی بات کیے بغیر اپنے قربانی کے اونٹ کو ذبح فرما دیجئے اور اپنے حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوا دیجئے۔" رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں بھی یہی بات آ رہی تھی، چنانچہ آپ ﷺ چھری لے کر باہر نکلے، اپنے قربانی کے اونٹ کو ذبح فرمایا اور اپنے سر کو منڈوا دیا۔ جب صحابہ کرام نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی اٹھے، قربانی کے جانور ذبح کیے اور ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے حتی کہ یوں لگتا تھا کہ وہ غم کی شدت میں ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے۔(473) اب انہیں پتا چل گیا تھا کہ یہ فیصلہ اٹل ہے، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

میں آپ حضرات سے پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کتنے لوگ اپنی بیویوں سے اس انداز سے مشورہ کرتے ہیں؟ کتنے سربراہانِ خانہ خاندان کا نظام چلانے میں اپنی بیوی سے مشاورت کو روا رکھتے ہیں؟ ہم اس قسم کے سوالات معاشرے کی تمام اکائیوں کی سطح پر اٹھا سکتے ہیں۔ وہ لوگ اس واقعے کو غور سے سنیں جو اس بات کا واویلا مچاتے ہیں کہ اسلام عورت کو قیدی بناتا ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ حقوقِ نسواں کے کون سے علمبردار اسے اس قدر بلند مرتبہ عطا کر سکتے ہیں؟

بھلائی کے دوسرے کاموں کی طرح مشاورت کا عملی آغاز بھی رسول اللہ ﷺ کے گھر سے ہوا۔ آپ ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات سے مشاورت فرمایا کرتے تھے۔ ہم ابھی تک اس مقام تک پہنچے ہیں اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس پراسرار دروازے کے تالوں کو کیسے کھولیں، بلکہ ہم نے تو ابھی تک اس دروازے پر دستک بھی نہیں دی۔ عورت کو ابھی تک ان لوگوں کے ہاں بھی دوسرے درجے کے انسان کی حیثیت حاصل ہے، جو اس کے حقوق کی حفاظت کے دعویدار ہیں، لیکن ہم عورت کو ایک اکائی کے نصف کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ عورت ایسا نصف ہے، جس کے بغیر دوسرا نصف بے کار ہے۔ ان دونوں نصفوں کے ملاپ سے انسانی اکائی تشکیل پاتی ہے۔ اس اکائی کی غیر موجودگی میں کسی بھی چیز کے بارے میں گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اس کے بغیر انسانیت، نبوت، ولایت، اسلام اور امت کے مفاہیم بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ عورتوں سے نرمی سے پیش آتے تھے اور اپنی احادیث کے ذریعے دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔ آپ ﷺ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: ''کامل ترین مؤمن عمدہ ترین اخلاق والا مؤمن ہے اور تم میں سے اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والے سب سے بہتر اخلاق والے انسان ہیں۔''[474] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ میں اگر عورت کا مسئلہ صحیح طریقے سے حل ہوا ہے تو عہدِ نبوی میں حل ہوا ہے۔

د: واقعہ تخییر

یہ وہ واقعہ ہے، جس میں رسول اللہﷺ نے اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا اختیار دیا تھا۔اس واقعے کا پیش خیمہ کچھ بھی ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہﷺ کو حکم تھا۔اس بارے میں درج ذیل قرآنی آیت نازل ہوئی تھی: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحاً جَمِيلاً ()وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْراً عَظِيماً﴾ (الأحزاب:٢٨۔٢٩.) ''اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت وآرائش کی خواستگار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کر دوں اور اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر (یعنی بہشت) کی طلب گار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں، ان کے لیے خدا نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

ازواجِ مطہرات نے نبی کریمﷺ سے خرچے میں اضافے کا مطالبہ کیا تھا۔ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دوسرے مسلمانوں کی طرح وہ بھی کچھ آسودہ حالی سے رہیں مثلاً روزانہ ایک پلیٹ ''حساء'' نامی حلوے کی کھائیں اور ان کا لباس پہلے سے بہتر ہو وغیرہ وغیرہ۔چونکہ یہ مطالبات جائز اور حلال تھے، اس لیے ان کی نظر میں یہ فطری اور درست تھے، لیکن ان کی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل ہوگئی کہ وہ ایسے گھر میں ہیں، جو قیامت تک کے لیے مسلمان گھرانوں کے لیے مثالی نمونہ ہے اور وہ مسلمان گھرانوں کے مرکز ودل کی نمائندگی کر رہی ہیں۔اس لیے انہیں دیگر مسلمان عورتوں کی طرح نہیں رہنا چاہیے۔وہ مقرّب خواتین ہیں۔دوسروں کی نیکیاں ان کے حق میں بدیاں شمار ہوں گی۔

جونہی رسول اللہﷺ نے یہ بات محسوس کی، آپﷺ نے ان کے بارے میں ایک فیصلہ کرلیا، چنانچہ آپﷺ نے ان سے علیحدگی اختیار فرمائی اور ان پر شدّتِ ناراضی کے باعث قسم اٹھائی کہ ایک ماہ تک ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔اس دوران آپﷺ اپنے گھر کے بالاخانے میں اعتکاف بیٹھ گئے۔یہ خبر جلد ہی ہر طرف پھیل گئی۔سب لوگ پریشان ہوگئے اور روتے ہوئے مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔مسلمانوں کو رسول اللہﷺ کے ساتھ اس قدر لگاؤ تھا کہ آپﷺ کو پہنچنے والے معمولی سے غم پر بھی رونے لگتے اور آپﷺ کے گھر کی فضا میں پیدا ہونے والے معمولی سے تکدر کی اطلاع پر بھی انتہائی پریشان ہو جاتے اور بے صبری سے اس تکدر کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگتے تھے۔اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔رسول اللہﷺ کے اس طرز عمل کو

''واقعہ ایلاء'' بھی کہتے ہیں۔ بعض حضرات جن میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے اس واقعے کو ایک اور تناظر میں دیکھ رہے تھے، کیونکہ ان دونوں کی بیٹیاں ازواجِ مطہرات میں شامل تھیں، لہٰذا جونہی ان حضرات کو اس واقعے کی اطلاع ملی دوسرے مسلمانوں کی طرح وہ بھی فوراً مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔

انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی، لیکن انہیں اجازت نہ ملی، چنانچہ دوسرے مسلمانوں کی طرح وہ بھی مسجد میں انتظار کرنے لگے۔ تیسری مرتبہ میں انہیں حاضری کی اجازت مل گئی اور ان میں سے ہر یک نے اپنی اپنی بیٹی کی گردن دبوچ لی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم دیکھ رہے ہو کہ یہ میرے گرد بیٹھی خرچے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔'' حالانکہ قرآن ان سے کہتا ہے: ﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (الأحزاب: ۳۲) ''اے پیغمبر کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔''

دوسرے لوگوں کی نجات کے لیے تو صرف فرائض کی ادائیگی بھی کافی ہوتی ہے، لیکن جو خاتون خدا کے نبی کی زوجیت کے مقام پر فائز ہو، اس کے حرم میں داخل ہو اور بہت سے امور کے اسرار سے واقف ہو اس پر لازم ہے کہ اس مقام کی خاطر اپنی ذات کی قربانی پیش کرے تاکہ مرکز مضبوط رہے۔ یقیناً نبی کی بیوی ہونے کے بہت سے فضائل ہیں، لیکن اس کی ذمہ داریاں بھی بہت بھاری ہیں۔ نبی کریم ﷺ انہیں اسوہ حسنہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے ان کی تربیت فرماتے تاکہ درج ذیل قرآنی آیت کے مطابق انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے: ﴿أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا﴾ (الأحقاف: ۲۰) ''تم اپنی دنیا کی زندگی میں لذتیں حاصل کر چکے۔''

چونکہ رسول اللہ ﷺ انہیں اس نقصان سے بچانا چاہتے تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کے گھر میں بعض پہلوؤں سے تنگی پائی جاتی تھی۔ اس تنگی کے نتیجے میں بعض اوقات اشارۃً یا صراحۃً بعض مطالبات کی آواز اٹھتی، لیکن ان کا مقام دوسری عورتوں جیسا نہ تھا، بلکہ انہیں ایک خاص مقام حاصل تھا، جس کے بعض مخصوص تقاضے تھے۔ انہیں دوسروں کی طرح ہنسنے اور کھانے کی اجازت نہ تھی۔ تاریخ میں بعض ایسے عظیم زاہد بھی گزرے ہیں، جو عمر بھر دو ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں ہنسے اور عمر بھر پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

فضیل بن عیاض کے ایک ساتھی کہتے ہیں: ''میں فضیل بن عیاض کے ساتھ تیس سال رہا، لیکن میں نے انہیں اپنے بیٹے کی وفات کے دن کے سوا کبھی ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا۔ میں نے ان سے اس دن ہنسنے کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے: ''اللہ تعالیٰ نے ایک بات پسند کی، میں نے اللہ کی پسند کو اپنی پسند بنا لیا۔''(475)

جب دینی لحاظ سے بڑے لوگوں کی یہ کیفیت ہے تو سب سے عظیم انسان اور رسولوں کے سردار کی ازواجِ مطہرات کی کیفیت فطری طور پر عام عورتوں سے مختلف ہونی چاہیے تھی۔

چونکہ دنیا یا آخرت میں رسول اللہﷺ کی مصاحبت کی اہلیت کے مقام کا حصول آسان نہیں، اس لیے قرآنی اشارے کے مطابق ان ممتاز خواتین کے عزم وارادے کا امتحان لیا گیا، چنانچہ رسول اللہﷺ نے انہیں اپنے ساتھ فقر وفاقہ کی زندگی بسر کرنے اور دنیا کی زیب وزینت اور لذات کے درمیان اختیار دیا۔ اگر وہ دنیا کو ترجیح دیں گی تو رسول اللہﷺ کچھ سامان دے کر انہیں اچھے طریقے سے رخصت کر دیں گے اور اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کریں گی تو انہیں اپنے موجودہ معیارِ زندگی پر راضی رہنا پڑے گا، کیونکہ اس مقدس گھر میں رہنے کا یہی تقاضا تھا۔ جب وہ گھر ممتاز اور منفرد مقام کا حامل ہے تو اس کے باسیوں کو بھی ممتاز اور منفرد ہونا چاہیے۔ جب سربراہِ خانہ امتیازی حیثیت کا حامل ہے تو اس کی بیویوں اور اولاد کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

رسول اللہﷺ نے اس بارے میں سب سے پہلے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو کی اور ان سے فرمایا: ''اے عائشہ! میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں، لیکن اپنے والدین سے مشورہ کیے بغیر جلد بازی میں اس کا جواب نہ دینا۔'' اس کے بعد آپﷺ نے ان کے سامنے درج ذیل آیت تلاوت فرمائی: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحاً جَمِيلاً ()وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْراً عَظِيماً﴾ (الأحزاب: ۲۸۔۲۹) ''اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت وآرائش کی خواستگار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کردوں اور اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر (یعنی بہشت) کی طلبگار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں، ان کے لیے خدا نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''کیا اس معاملے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ میں تو اللہ، اس کے رسول اور آخرت کی زندگی کو پسند کرتی ہوں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اس کے بعد رسول اللہﷺ کی دوسری بیویوں نے بھی وہی جواب دیا جو میں نے دیا تھا۔''[476]

رسول اللہﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات نے ایک ہی جواب اس لیے دیا تھا کہ وہ رسول اللہﷺ کے ساتھ یک جان ہو چکی تھیں اور ان کا مزاج مکمل طور پر آپﷺ کے مزاج سے ہم آہنگ

ہو چکا تھا۔ ان کے لیے کوئی اور بات کہنا ممکن ہی نہ تھی حتی کہ اگر رسول اللہ ﷺ انہیں عمر بھر روزہ رکھنے اور کبھی بھی افطار نہ کرنے کا کہتے تو اس حکم کو قبول کرنے میں انہیں ذرا سا بھی تردد نہ ہوتا اور وہ بخوشی اسے قبول کر کے اس پر عمل کرتیں، چنانچہ انہوں نے عمر بھر ہر قسم کی تکالیف برداشت کیں اور موت تک اس طویل روزے کو افطار نہ کیا۔

بعض ازواجِ مطہرات ایسی بھی تھیں جو شاہی محلات میں رہ چکی تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی ایسی ہی خاتون تھیں۔ غزوہ خیبر میں وہ اپنے والد اور خاوند سے محروم ہو چکی تھیں جو خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔ انہیں قید کر لیا گیا تھا جو ان پر بہت گراں گزرا تھا۔ جب تک انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نہ تھا اس وقت تک آپ ﷺ ان کی نظر میں ناپسندیدہ ترین انسان تھے، لیکن آپ ﷺ کو دیکھتے ہی آپ کے بارے میں ان کے احساسات و جذبات بدل گئے۔ (477)

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جیسی ازواجِ مطہرات جو پہلے شاہی محلات میں زندگی گزار چکی تھیں، انہیں رسول اللہ ﷺ کے گھر میں پیٹ بھر کر کھانا بھی میسر نہ تھا اور اس طرز زندگی میں وہ دیگر ازواجِ مطہرات کے ساتھ برابر کی شریک تھیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اخلاق کریمانہ کے باعث ان کے دلوں میں اس قدر گھر کر چکے تھے کہ انہوں نے ہر قسم کے فقر و فاقہ کے ساتھ بھی آپ ﷺ کی مصاحبت کو ترجیح دی... بلکہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک آپ ﷺ کے ساتھ رہنا ان کی زندگی کا مقصد وہدف بن چکا تھا۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا پہلے یہودیہ تھیں۔ ایک دفعہ دو ازواجِ مطہرات نے دورانِ گفتگو انہیں یہودیت پر عار دلاتے ہوئے کہا: ''اے یہودی کی بیٹی!'' حضرت صفیہ نے اس بات کی رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی تو آپ ﷺ نے ان کی دلجوئی کے لیے ان سے ارشاد فرمایا: ''تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہا کہ تم مجھ سے کیسے بہتر ہو سکتی ہو جبکہ محمد میرے خاوند، ہارون میرے باپ اور موسیٰ میرے چچا ہیں؟'' جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا یہ بات سن کر آپ ﷺ کے پاس سے اٹھیں تو انتہائی خوش اور پر مسرت تھیں۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ آخر ان کے خاوند حضرت محمد ﷺ جو تھے۔ نہ جانے کتنی بار اس بات کو دہرا کر وہ زیر لب مسکرائی ہوں گی۔

حاصل یہ کہ رسول اللہ ﷺ سب سے مکمل اور مثالی سربراہِ خانہ تھے۔ آپ ﷺ کا اس قدر آسانی اور سہولت سے اپنی ازواجِ مطہرات کے معاملات کو سلجھانا اور ان کے دلوں میں آپ کا

اس قدر محبوب ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ آپ ﷺ ان کے محبوب، ان کے ذہنی معلم اور روحانی مربی تھے۔ ان ذمہ داریوں کو سرانجام دیتے ہوئے آپ ﷺ ریاست اور امت کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں میں سرِ مو کوتاہی نہ فرماتے۔ یہ آپ ﷺ کی رسالت کی کھلی دلیل ہے۔ اگر آپ ﷺ کی نبوت کی کوئی اور دلیل نہ ہوتی تو بھی سربراہ خانہ کی حیثیت سے آپ ﷺ کا طرزِ عمل ہی آپ کی نبوت کی کافی دلیل ہوتی۔

دوسری فصل: نبی کریم ﷺ بحیثیت باپ

نبی کریم ﷺ زندگی کے ہر شعبے اور معاملے میں بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اگر لوگ آپ ﷺ کی شخصیت پر تحقیق کرنا چاہیں تو انہیں چاہیے کہ آپ ﷺ کی شخصیت کے بارے میں اپنے یا اپنے زمانے کے عظیم لوگوں کے معیار کے مطابق تحقیق نہ کریں، بلکہ اس کے لیے اعلیٰ ترین معیار قائم کریں اور اپنی فکر کی پرواز کو عصری معیاروں سے بلند کریں تاکہ آپ ﷺ کی عظمت اور قدرومنزلت کو سمجھنے میں کوتاہی نہ ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر میدان میں اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے نوازا تھا اور آپ ﷺ عام انسانوں کی بہ نسبت بہت بلند مقام پر فائز تھے، اس لئے آپ ﷺ کی شخصیت کے بارے میں آپ ﷺ کے آفاق کے دائرے میں ہی تحقیق کرنی چاہیے۔

فخرِ انسانیت ﷺ آسمانِ نبوت پر مثلِ آفتاب چمکے اور پھر اس جہان سے پردہ فرما گئے۔ انسانیت نے آپ ﷺ سے پہلے یا آپ کے بعد آپ کی نظیر نہیں دیکھی، اسی طرح آپ کے معاصرین اور قریبی لوگوں نے بھی آپ جیسی کوئی اور شخصیت نہیں دیکھی۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو دنیا سے آپ ﷺ کے پردہ فرمانے کا احساس اس وحشت سے ہوا ہو جو انہوں نے آپ ﷺ کے بعد اپنے دلوں میں محسوس کی تھی، بالکل اس پھول کی طرح جس کی زندگی سورج کی شعاعوں پر موقوف ہوتی ہے اور اسے سورج کے غروب ہونے کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب سورج کی شعاعوں کے منقطع ہونے سے اس پر پژمردگی چھانے لگتی ہے۔ لوگوں کو وحشت محسوس ہوئی، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا... یہ فطری بات ہے کہ روز بروز آپ ﷺ کو سمجھنے اور پہچاننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود ہم حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہن وغیرہ کو ''اپنی ماں'' کہتے ہیں اور اس میں اپنی حقیقی ماؤں کو پکارنے سے زیادہ لذت اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔ یقیناً اس لذت اور مسرت کا احساس اُس دور میں زیادہ گہرا، گرم جوش اور پر خلوص ہوگا۔ اس کا سبب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ کو جنہیں انہوں نے اپنی گود میں پالا تھا ''یا اُمّی'' کہہ کر پکارتے تھے، کیونکہ آیت کریمہ میں ہے: ﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُم﴾ (الأحزاب:٦) ''اور پیغمبر کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔''

لیکن امت کی طرف سے ملنے والے اس سارے احترام اور محبت کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے فراق کے غم والم میں کوئی فرق نہ پڑا اور فتوحات کے زمانے کے بعد کے پر عیش ایام بھی اس گہرے غم کو

ہلکانہ کر سکے، بلکہ یہ غم ان کی زندگی کے اختتام تک ان کے ساتھ لگا رہا۔ جس طرح آپ ﷺ اپنی بیویوں کے لیے مثالی خاوند تھے، اسی طرح آپ مثالی باپ اور بے مثال نانا بھی تھے۔

آپ ﷺ اپنی اولاد اور نواسے نواسیوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے، لیکن انہیں یہ شفقت دیتے وقت ان کی نظریں آخرت اور بلند مقاصد کی طرف متوجہ کرانا نہ بھولتے تھے۔ آپ ﷺ انہیں سینے سے لگاتے، انہیں دیکھ کر مسکراتے اور ان کے ساتھ کھیلتے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آخرت سے متعلق ان کے کسی معاملے سے ہرگز چشم پوشی نہ فرماتے۔ اس بارے میں آپ ﷺ انتہائی واضح اور صاف گو تھے۔ آپ ﷺ اپنے اور اپنے خالق کے درمیان تعلق کے بارے میں بہت پروقار، بارعب اور سنجیدہ تھے۔ ایک طرف آپ ﷺ انہیں اچھے انسانوں والی زندگی گزارنے کے لیے آزادی اور اس بارے میں ہدایات فراہم کرتے تو دوسری طرف آپ ﷺ انہیں نظم وضبط کی خلاف ورزی کرنے اور بے پروائی کے راستے پر چلنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپ ﷺ انہیں کسی بھی اخلاقی کمزوری کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے انتہائی باریکی سے پوری سعی وکاوش فرماتے اور انہیں اخروی زندگی کے لیے تیار فرماتے۔ تربیت کے دوران آپ ﷺ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اعتدال اور صراطِ مستقیم کو اختیار فرماتے۔ یقیناً تربیت رسول اللہ ﷺ کی فراست کا ایک اہم پہلو ہے۔

الف: آپ ﷺ کا اپنی اولاد اور نواسے نواسیوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ

صحیح مسلم میں دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرنے والے صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر گھر والوں پر مہربان کوئی انسان نہیں دیکھا۔''(478) آپ ﷺ اپنے دل کی گہرائیوں سے پھوٹنے والے حقیقی جذبات اور شفقت و رحمت پر مبنی ایسا برتاؤ کرتے کہ سربراہِ خانہ یا باپ کی حیثیت سے کسی اور کے لیے اس کی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں۔

اگر یہ بات صرف ہم نے ہی کہی ہوتی تو شاید اس کی اتنی زیادہ اہمیت نہ ہوتی، لیکن یہ بات تو آپ ﷺ کی امت کے ان لاکھوں افراد نے بھی کہی ہے، جن کے دلوں میں اس قدر رحمت و شفقت کے جذبات پائے جاتے ہیں کہ وہ چیونٹی کو بھی تکلیف پہنچانے سے احتراز کرتے ہیں۔ وہ سب اس بات کا اعتراف اور اعلان کرتے ہیں کہ ساری کائنات کے بارے میں رحمت و شفقت بھرا رویہ رکھنے میں آپ ﷺ کی کوئی نظیر نہیں۔ یہ درست ہے کہ آپ ﷺ کو ایک انسان کی حیثیت سے تخلیق کیا گیا، لیکن تمام انسانیت سے مضبوط تعلق استوار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل میں ساری کائنات کی خیر خواہی کا جذبہ ودیعت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا دل اپنے اہل خانہ اور دوسرے انسانوں کے بارے میں خیر خواہی کے جذبات سے لبریز تھا۔

آپ ﷺ کی نرینہ اولاد آپ ﷺ کی زندگی میں ہی انتقال کر گئی۔(479) ام المؤمنین حضرت ماریہ کے ہاں آپ ﷺ کا ایک بیٹا پیدا ہو، لیکن وہ بھی بچپن میں فوت ہو گیا۔ یہ آپ ﷺ کا آخری بیٹا تھا۔ آپ ﷺ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے بیٹے کو دودھ پلانے والی خاتون کے گھر تشریف لے جاتے، اپنے بیٹے کو گود میں اٹھاتے، اسے بوسے دیتے، اس کے ساتھ کھیلتے، اسے سونگھتے اور اس سے محبت کا اظہار فرماتے۔(480)

جب آپ ﷺ کے بیٹے کا انتقال ہو گیا تب بھی آپ نے اسے اپنی گود میں لیا۔ آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا، جو آپ کی حالت غم پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے: ''آنکھیں اشکبار ہیں اور دل غمگین، لیکن زبان سے ہم وہی بات کہیں گے، جس پر ہمارا پروردگار راضی ہے۔ اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی پر غمگین ہیں۔'' ایک دوسری روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسوؤں پر عذاب دیتے ہیں اور نہ ہی دل کے غم پر۔'' اور پھر اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''لیکن اس کی وجہ سے عذاب دیتے ہیں۔''(481)

ہم ایک بار پھر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سب سے بڑھ کر مہربان، رحم دل اور شفیق تھے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کی پشت پر سوار ہو جاتے اور آپ انہیں اٹھا کر چکر لگاتے۔ کیا آپ لوگ اس قدر بلند مرتبہ شخص کے بارے میں تصور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے نواسے کو اپنی پشت پر بٹھا کر لوگوں کے سامنے اس کے لیے سواری بنے؟ گویا آپ ﷺ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار فرما کر مستقبل میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو حاصل ہونے والے خصوصی مقام کا اعلان فرما رہے تھے۔ ایک دن حضرات حسنین رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کی پشت مبارک پر سوار تھے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرات حسنین سے فرمایا: "تم کتنے عمدہ گھوڑے پر سوار ہو۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "شہسوار بھی تو کتنے اچھے ہیں۔"(482)

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کی بات سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں اتنی بات یقینی ہے کہ یہ بات فرما کر آپ ﷺ ان کی تعریف فرما رہے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے کندھے پر سوار تھے کہ کسی نے کہا: "اے لڑکے! تم بڑی عمدہ سواری پر سوار ہو۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے۔"(483)

اگرچہ رسول اللہ ﷺ تمام اہل بیت اور اولیائے کرام کو توجہ دیتے، لیکن آپ ﷺ اہل بیت میں سے دو اماموں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ، جنہیں قیامت تک آنے والے اولیائے کرام کے آباواجداد ہونے کا شرف واعزاز حاصل ہے، کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ اکثر انہیں اپنے کندھے پر اٹھائے رکھتے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں اور آپ ﷺ کی پشت پر حضراتِ حسنین سوار ہیں اور آپ ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں: "تمہارا اونٹ کتنا عمدہ ہے اور تم کتنا عمدہ بوجھ ہو۔"(484) آپ ﷺ کی نظر میں اپنی اولاد اور نواسوں کا یہ مقام تھا، اسی لیے ان کے دلوں میں بھی آپ ﷺ کی اتنی شدید محبت تھی کہ وہ اولاد اور نواسوں کے تعلق سے ماورا محبت کا مظہر بن گئی۔

دیگر امور کی طرح بچوں کی تربیت کے معاملے میں بھی آپ ﷺ نے میانہ روی کا راستہ اختیار فرمایا تھا۔ آپ ﷺ اپنی اولاد اور نواسے نواسیوں سے بہت زیادہ محبت فرماتے اور ان کے سامنے اس محبت کا اظہار بھی فرماتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے انہیں اس محبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کبھی اجازت نہ دی۔ اگرچہ آپ ﷺ کی اولاد اور نواسوں میں کوئی ایسا فرد نہ تھا، جس نے کبھی ایسا کرنے کی

کوشش کی ہو، تاہم اگر ان میں سے کسی سے بلاقصد کوئی غلطی ہو جاتی تو آپ ﷺ کے طرزِ عمل سے یوں لگتا، گویا ایک پروقار کہر نے اس گہری محبت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور آپ ﷺ فوراً انہیں شبہات کی حدود میں داخل ہونے سے روک دیتے، مثلاً ایک دفعہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بچپن میں صدقے کی ایک کھجور کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آپ ﷺ نے جلدی سے ان کے منہ سے وہ کھجور نکال کر ارشاد فرمایا: ''کیا تمہیں علم نہیں کہ آلِ محمد کے لیے صدقہ حلال نہیں؟''(485) آپ ﷺ نے شروع سے ہی انہیں حرام سے بچنے اور اس بارے میں انتہائی حساس رہنے کی تربیت دی تھی۔ یہ بچپن سے ہی تربیت میں توازن قائم کرنے کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ مدینے میں داخل ہوتے تو آپ ﷺ کے ہمراہ آپ کی سواری پر بچے بھی سوار ہوتے تھے۔(486) آپ ﷺ کی محبت صرف اپنی اولاد اور نواسوں تک محدود نہ تھی، بلکہ آپ ﷺ اپنے پڑوسیوں اور دوسرے لوگوں کے بچوں سے بھی محبت فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کی محبت وشفقت صرف اپنے بیٹوں اور نواسوں کے لیے ہی نہ تھی، بلکہ آپ اپنی نواسی اُمامہ سے بھی ایسے ہی محبت فرماتے جیسے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے فرماتے تھے۔ کئی دفعہ دیکھا گیا کہ آپ ﷺ نے گھر سے نکلتے ہوئے حضرت امامہ کو اپنے کندھے پر اٹھایا ہوا ہے۔ بعض اوقات آپ ﷺ نفل نماز کے دوران انہیں اپنی پشت پر اٹھا لیتے، جب رکوع فرماتے تو انہیں اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو انہیں اٹھا لیتے۔(487) رسول اللہ ﷺ ایسے معاشرے میں حضرت امامہ سے محبت کا اظہار فرماتے، جس میں لوگ ماضی قریب میں اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے رہے تھے، لہٰذا آپ ﷺ کا یہ طرزِ عمل بالکل نیا تھا، جسے اس سے پہلے کسی اور نے اختیار نہ کیا تھا۔

ب: رسول اللہ ﷺ کی حضرت فاطمہ سے محبت وشفقت

اسلام کی نظر میں مرد اور عورت کا مقام برابر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس اصول کو عملی طور پر اپنا کر دکھایا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی بیٹی ہیں۔ چونکہ وہ قیامت تک آنے والے اہل بیت کی ماں ہیں، اس لئے وہ ہماری بھی ماں ہیں۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو ملنے کے لیے جاتیں تو آپ ﷺ ان کے اعزاز کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان کے ہاتھ کو پکڑتے، انہیں اپنے پہلو میں بٹھاتے، ان کی مزاج پرسی فرماتے، ان کے حالات پوچھتے اور ان سے محبت کا اظہار فرماتے اور جب وہ جانے کے لیے اٹھتیں تو آپ بھی کھڑے ہو جاتے اور انہیں انتہائی محبت کے ساتھ رخصت فرماتے۔(488)

ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ درست ہے کہ وہ خاتون اپنے بھائی حضرت عکرمہ کی طرح اسلام قبول کر کے نورانی قافلے میں شامل ہو چکی تھیں، لیکن اس شادی سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تکلیف پہنچ سکتی تھی، شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذہن اس طرف نہ گیا ہو کہ اس شادی سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا پہنچے گی، لیکن جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بات کی اطلاع دی اور اس پر اپنے غم کا اظہار کیا تو آپ ﷺ کو اس پر رنج ہوا اور آپ نے منبر پر چڑھ کر ارشاد فرمایا: "بنو ہشام بن مغیرہ نے علی بن ابی طالب کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کی مجھ سے اجازت مانگی ہے۔ میں انہیں اس بات کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیتا، الا یہ کہ ابن ابی طالب میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی بیٹی سے شادی کرنے کو پسند کرے۔ میری بیٹی میرے جسم کا ٹکڑا ہے، جو بات اسے ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند ہے اور جس بات سے اسے تکلیف پہنچتی ہے وہ میرے لیے بھی باعث تکلیف ہے۔"(489) سامعین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنا ارادہ فوراً بدل لیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رشتہ ازدواج برقرار رکھا۔(490)

بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کی بہت عزت فرماتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی تھیں۔ درحقیقت یوں لگتا ہے کہ اس نرم دل خاتون کا مقصد حیات یہی تھا کہ وہ تمام اولیاء واصفیاء کے لیے بیج بنیں۔ ان کی ساری توجہ اپنے والد محترم اور ان کی دعوت پر مرکوز تھی۔ جب ان کے والد نے اپنی

زندگی کے آخری ایام میں انہیں بتایا کہ وہ عنقریب دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو وہ زار و قطار رونے لگیں، لیکن جب ان کے والد نے انہیں بتایا کہ وہ سب سے پہلے ان سے آملیں گی تو وہ خوشی و مسرت سے سرشار ہو گئیں۔ (491)

ان کے والد ان سے اور وہ اپنے والد سے انتہائی محبت کرتی تھیں، لیکن رسول اللہ ﷺ اس محبت کے ساتھ ساتھ بخوبی جانتے تھے کہ توازن کو کیسے برقرار رکھنا ہے اور اس جہان تک پہنچانے کے لیے ان کی تربیت کیسے کرنی ہے، جس تک پہنچنے کی ہر روح میں خواہش اور تڑپ ہونی چاہیے، کیونکہ ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ تو وہیں نصیب ہوگا۔ اس دنیا میں تو رسول اللہ ﷺ اور ان کی بیٹی صرف پچیس سال اکٹھے رہے، کیونکہ اپنے والد کی وفات کے چھ ماہ بعد صرف پچیس سال کی عمر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا تھا۔ (492)

ج: رسول اللہ ﷺ کا اپنی اولاد کو ابدی زندگی کے لیے تیار کرنا

رسول اللہ ﷺ ابدی زندگی کے طلبگار تھے، یعنی اس فطرت کے طلبگار تھے، جو اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں میں ودیعت کی ہے۔ انسان ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لیے ہے۔ چونکہ اس انسان کو ابدی زندگی اور اس کے مالک کے سوا کوئی چیز سیر نہیں کر سکتی، اس لیے وہ شعوری یا لاشعوری طور پر صرف اور صرف ابدیت کا طلبگار رہتا ہے۔ انسان کو کچھ بھی عطا کر دیا جائے، لیکن جب تک اسے ابدی زندگی نہ ملے اس وقت تک اس کی تشنگی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی خواہشات اور آرزوؤں کی کوئی حد نہیں، اس لیے کوئی بھی چیز اس کی تشنگی کو ختم نہیں کر سکتی، اسی لیے تمام انبیاء و مرسلین کے پیغام رسالت کی بنیاد اخروی زندگی کے تصور پر مشتمل نظام پر تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے جس رسول ﷺ نے انسانیت کو اطمینان و سکون کے گلدستے پیش کیے اس کے لئے انسانیت کو ابدی سعادت اور سکون حاصل کرنے کی تربیت دینے میں غفلت برتنا ممکن نہ تھا۔ درج ذیل واقعے سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

ایک دفعہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ان کی گردن میں سونے کی زنجیر تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ”اے فاطمہ! کیا تم اس وجہ سے دھوکے میں مبتلا ہو کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی ہے، حالانکہ تمہارے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہے۔“ یہ فرما کر آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور ان کے پاس نہ بیٹھے۔ جہاں رسول اللہ ﷺ ان کا احترام فرماتے تھے، وہیں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کی اخروی زندگی کے لیے تیار اور اللہ کی طرف متوجہ بھی کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وہ زنجیر بازار بھیج کر فروخت کر دی اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے فاطمہ کو آگ سے بچا لیا۔“ (493) یقیناً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا سونے کی زنجیر سے زینت اختیار کرنا حرام نہ تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ انہیں مقربین کے حلقے میں شامل رکھنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ کی اس تنبیہ کو اسی تقویٰ اور قربِ الٰہی کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ تقویٰ اور قربِ الٰہی سے دنیا کی زیب و زینت اور مشاغل کے اہتمام میں کمی آتی ہے، لیکن یہاں شاید سب سے اہم پہلو ان کا اہل بیت کی والدہ ہونے کی حیثیت سے اسوہ حسنہ ہونا اور نبی کریم ﷺ کا اس معاملے کی حساسیت کو اجاگر کرنا ہے۔ حضراتِ حسنین اور ان کے بعد حضرت زین العابدین جیسے مشہور عابدوں کی ماں ہونے کا اعزاز حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، جو انسانیت کے لیے منارۂ ہدایت تھے۔ رسول اللہ ﷺ انہیں پہلے اہل بیت اور پھر شیخ عبدالقادر جیلانی، محمد بہاء الدین

نقشبندی، احمد رفاعی اور شیخ شاذلی جیسی عظیم ہستیوں کی ماں بننے کے اعزاز کے لیے تیار فرما رہے تھے، گویا آپ ﷺ ان سے ارشاد فرما رہے تھے: ''اے میری پیاری بیٹی! تم ایک ایسے گھر میں دلہن بن کر جانے والی ہو، جہاں تمہاری نسل سے ایک سنہری سلسلہ جاری ہوگا۔ تم اس سونے کی زنجیر کو چھوڑ کر اپنی اولاد کے اس سنہری سلسلے کی ماں بن جاؤ۔'' دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ انہیں نقشبندی، رفاعی اور شاذلی سلاسل کی عظیم ہستیوں کے سنہری سلسلے کی ماں بننے کے لئے کہہ رہے تھے۔

اولیاء واصفیاء اور ابرار ومقربین کی ماں ہونے کا اعزاز حاصل کرنا کوئی آسان بات نہ تھی، اسی لیے آپ ﷺ اپنے گھرانے کے بارے میں بہت ہی حسّاس اور محتاط تھے۔ آپ ﷺ کی اس حساسیت واحتیاط اور رحمت وشفقت کا مقصد انہیں عالم آخرت کی طرف متوجہ کرنا اور ان کے سامنے چھوٹے سے چھوٹے گناہ، برائی اور شر کے دروازوں کو بند کرنا تھا تاکہ ان کی پوری توجہ عالم آخرت کی طرف مبذول رہے۔ گویا آپ ﷺ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے: ''صرف اللہ ہی تمہاری غایت ہونی چاہیے۔'' آپ ﷺ کی امت کے ایک شاعر نے کہا ہے:

''جس جنت کا لوگ تذکرہ کرتے ہیں،
وہ تو چند محلات اور حوروں پر مشتمل ہے۔
اے اللہ! جنہیں جنت مطلوب ہے، انہیں جنت دے دیجئے،
لیکن میری تمناؤں کا مرکز تو صرف اور صرف آپ کی ذات ہے۔''

وہ اپنی ساری زندگی اسی اخروی زندگی کے زیرِ سایہ گزارتے تھے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ جن سے محبت فرماتے تھے انہیں اس محبت کے تقاضے کے تحت دنیا کی گندگی سے دور اور پاک رکھتے، ان کی نگاہیں اور توجہ عالم آخرت کی طرف پھیرتے اور انہیں وہاں اپنی رفاقت کے لیے تیار کرتے، کیونکہ آخرت میں انسان اسی کے ساتھ ہوگا، جس کے ساتھ اسے محبت ہوگی۔ (494)

اگر آپ کو محمد ﷺ سے محبت ہے تو آپ ان کے راستے پر چلیں گے اور اگر آپ ان کے راستے پر چلیں گے تو آخرت میں آپ ان کے ساتھ ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی اولاد کے ساتھ محبت بھی فرماتے، لیکن انہیں اپنی رفاقت کے لیے تیار بھی فرماتے۔ آپ ﷺ کے دل میں محبت بھی تھی اور شفقت بھی، لیکن آخرت کے کسی معاملے میں کوتاہی کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ یہی صراطِ مستقیم ہے اور میانہ روی ہی سب سے بہتر اور منصفانہ راستہ ہے، جس کا آغاز رسول اللہ ﷺ سے ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے نظامِ تربیت کی ایک جھلک بخاری و مسلم کی اُس روایت میں بھی دکھائی دیتی ہے، جسے حضرت علی بن ابی طالب نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے چکی پیسنے سے پڑنے والے نشانات کی شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے تو وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، لیکن آپ ﷺ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کی حضرت عائشہ سے ملاقات ہوئی اور انہیں صورتحال بتائی۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد کی اطلاع دی۔ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم اس وقت اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ میں آپ ﷺ کے خیر مقدم کے لیے اٹھنے لگا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی جگہ لیٹے رہو۔'' آپ ﷺ ہمارے درمیان بیٹھ گئے حتی کہ مجھے آپ ﷺ کے قدموں کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس ہونے لگی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں تمہیں اس چیز سے بہتر بات نہ سکھاؤں جو تم نے مجھ سے مانگی ہے، جب تم اپنے بستروں پر لیٹا کرو تو چونتیس بار اللہ اکبر، تینتیس بار سبحان اللہ اور تینتیس بار الحمد للہ پڑھا کرو۔ یہ تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔''(495)

یعنی میں تمہاری توجہ عالم آخرت کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ اس عالم میں مجھ تک پہنچنے اور میری رفاقت حاصل کرنے کے لیے تمہارے سامنے دو راستے ہیں:

ایک یہ کہ بغیر کسی کمی کوتاہی کے اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔

دوسرا یہ کہ اپنے خاوند کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرو۔

اپنے خاوند کی جو خدمت تم پر لازم ہے، اگر اسے خادم نے سرانجام دیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے اندر کوئی کمی ہے۔ تمہیں دونوں پہلوؤں کی رعایت کرنی چاہیے، یعنی تمہیں جہاں ان امور کی جستجو ہونی چاہیے، جن سے انسان خدا کا بندہ کامل بنتا ہے، وہیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ بغیر کوتاہی کے اپنی تمام ذمہ داریاں کیسے سرانجام دی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کامل بندی بنو اور اس کی بندگی کی تمام ذمہ داریوں کو ادا کرو اور پھر اپنے خاوند علیؓ جس کی پشت سے قیامت تک آنے والے مقربین خدا کا ظہور ہوگا، کے تمام حقوق ادا کر کے انسانِ کامل بنو۔ افضل اور کامل لوگوں کی جنت کے حصول کے لیے یہ کام کرنے ضروری ہیں۔

میں یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بعض خوبیوں اور خصوصیات کا تذکرہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی تردد کے اپنی بیٹی کی ان سے شادی کی تھی، کیونکہ آپ ﷺ

انہیں حضرت فاطمہ کا خاوند بننے کا اہل پاتے تھے نیز وہ سلطان الاولیاء تھے، جن کی تخلیق ہی اولیاء کا باپ بننے کے لیے کی گئی تھی۔ ایک ضعیف حدیث میں رسول اللہ ﷺ حضرت علی سے فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی اولاد کو اس کی پشت میں رکھا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اولاد کو علی بن ابی طالب کی پشت میں رکھا ہے۔''(496)

یعنی تم سے میری نسل چلے گی اور جب لوگ میرا ذکر کریں گے تو آلِ بیت کے ضمن میں تمہارا بھی ذکر کریں گے۔ لہٰذا اگر ہم اس پہلو سے دیکھیں تو جس نے حضرت علی کی اطاعت کی اس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اور جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، نیز عمومی الفاظ میں خاوند کے حقوق بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''اگر میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کو سجدہ کرنے کا کہتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے خاوندوں کے بہت زیادہ حقوق عائد کیے ہیں۔''(497)

اگر یہ بات جائز ہوتی تو اس بات کے سب سے زیادہ حق دار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوتے۔ حضرت فاطمہ کا خادم کی خدمات حاصل کرنا اپنے ایک پر کو توڑنے کے مترادف تھا اور صرف ایک پر کے ذریعے ان کے لئے حضراتِ حسنین، شیخ عبدالقادر جیلانی اور قیامت تک آنے والے قطبوں، مجددین اور مجتھدین کی ماں بننے کا اعزاز حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا، اس لیے ان کی توجہ دنیا سے مکمل طور پر ہٹا کر آخرت کی طرف مبذول کرانا ضروری تھا۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمایا اور آپ کی اسی انداز سے تربیت فرمائی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سے پہلے ہی آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ جب آپ ﷺ نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو آپ ﷺ باپ کے سہارے سے محروم تھے کہ جس سے آپ ﷺ مدد لیتے پھر چھ برس کی عمر میں دوسرے سہارے سے بھی محروم ہو گئے۔ آغازِ حیات سے ہی آپ ﷺ کے سامنے توحید کے نور اور احدیت کے راز تک پہنچانے والے راستے کھل گئے تھے۔ یہ درست ہے کہ آپ ﷺ کو کچھ عرصہ تک عبدالمطلب کی حمایت حاصل رہی، لیکن ایک پہلو سے یہ حمایت محض عزت و عظمت خداوندی کا پردہ تھا(498) تو دوسری طرف حمایت کرنے والے کے لیے ایک اعزاز تھا، ورنہ اسباب کے درجے میں یہ حمایت کوئی قابل ذکر اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ بعد میں ابو طالب کی ظاہری حمایت اپنے بھتیجے کی حمایت کرنے اور اس کا خیال رکھنے سے زیادہ نہ تھی، لیکن اس کا اخروی پہلو یہ ہے کہ ابو طالب کو حضرت علی کا باپ بننے کی نعمت حاصل ہوئی۔ اسی نیکی کے سبب وہ دن بھی آیا جب نبی کریم ﷺ نے حضرت علی

کو اپنی کفالت میں لے کر ان کی تربیت شروع کی اور انہیں اتنی بلندیاں عطا کیں کہ وہ حیدرِ کرار، شیرِ خدا اور سلطان الاولیاء کہلائے۔[499] اللہ تعالیٰ نے یوں آپ ﷺ کی تربیت فرمائی اور آپ ﷺ کو صرف اپنی ذات کی طرف متوجہ رکھنے اور آپ ﷺ پر آیت مبارکہ ﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ (الممتحنة: ٤) ''اے ہمارے پروردگار! تجھی پر ہمارا بھروسا ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ کر آنا ہے۔'' کا راز فاش کرنے کے لیے تمام اسباب جمع فرمادیئے۔ آپ ﷺ کے لیے صرف اللہ پر بھروسا اور اعتماد کرنا ضروری تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی آخر آپ ﷺ کی بیٹی تھیں، اس لئے آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ آپ ﷺ اپنی بیٹی کی بھی ویسی ہی تربیت فرماتے جیسی تربیت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی فرمائی اور آپ کی توجہ صرف اللہ اور آخرت کی طرف مبذول کرائی۔

د: آپ ﷺ کے گھر میں تربیت کی عمومی فضا

رسول اللہ ﷺ کے گھر مبارک کی فضا میں تقویٰ اور خوفِ خدا کا رنگ غالب تھا۔ یہ رنگ اس گھر کی ہر حرکت میں پایا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں میں جنت کا شوق اور جہنم کا خوف واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ آپ ﷺ نماز کے دوران کبھی تو خوفِ خدا سے کانپتے ہوئے پیچھے ہٹتے اور کبھی محبت الٰہیہ سے سرشار ہوکر آگے بڑھتے۔ اس قسم کے مناظر اس گھر کی زندگی کا حصہ تھے۔ جو بھی آپ ﷺ کو دیکھتا اسے خدا یاد آ جاتا۔ نسائی میں حضرت مطرف اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے اور آپ ﷺ کے سینے سے ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز آ رہی تھی۔'' یعنی آپ ﷺ رو رہے تھے۔(500)

رسول اللہ ﷺ ہمیشہ نماز میں گریہ وزاری فرماتے اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اللہ رب العزت کی طرف متوجہ رہتے۔ کتنی ہی دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو بستر سے غائب پاتیں اور پھر دیکھتیں کہ آپ ﷺ حالت سجدہ میں خشوع وخضوع سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں۔(501)

تربیتی پہلو سے نبی کریم ﷺ کی اس کیفیت کے آپ ﷺ کے گھر والوں پر بہت گہرے اور مثبت اثرات پڑنا بالکل فطری بات تھی، چنانچہ اس تقویٰ، خشوع اور خوفِ خدا کی جھلک آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور اولاد کی زندگیوں میں بھی نظر آتی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی گفتار و کردار میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ گفتار و کردار کی ہم آہنگی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے اپنے گھر والوں کو جس قدر متاثر کیا کسی اور کے لیے ممکن نہیں اگر تمام ماہرین تربیت ونفسیات تمام نظامہائے تربیت کی تمام معلومات اکٹھی کر کے انہیں کام میں لائیں تو بھی ان کے اثرات رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے اپنے گھر والوں پر پڑنے والے اثرات کے عشرِ عشیر کو نہیں پہنچ سکتے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے مافی الضمیر کو پہلے اپنے اعمال اور طرزِ عمل سے لوگوں تک پہنچاتے اور پھر ان کے سامنے اپنے اعمال اور طرزِ عمل کی وضاحت فرماتے تھے۔ آپ ﷺ عملی طور پر انہیں دکھاتے کہ خوفِ خدا کیسا ہوتا ہے؟ اور کیسے رات کی تاریکی میں اپنے رب کے سامنے آہ و زاری کرنی چاہیے؟ رسول اللہ ﷺ یہ تمام امور بذاتِ خود اپنے گھر میں سرانجام دیتے اور اپنے صحابہ کو سکھاتے کہ وہ کیسا طرزِ عمل اختیار کریں؟ کیسے اپنے بچوں کی تربیت کریں؟ اور کیسے ہر معاملے میں حق کے آئینہ دار بنیں؟ آپ ﷺ کے

مبارک ارشادات کی بازگشت آپ کے گھر میں اور صحابہ کی مجالس میں دلوں پر اثر کرتے ہوئے سنائی دیتی تھی۔

سب سے پہلے تو نبی کریم ﷺ ایک بے مثال والد اور نانا تھے۔ معاشرتی پہلو سے دیکھیں تو بعض اوقات باپ یا نانا ہونا بالکل معمول کی بات محسوس ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ انسانی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس مرحلے کو سہولت اور کامیابی کے ساتھ طے کرنے والوں کی صفِ اوّل میں شامل تھے اور سب سے بہتر باپ اور نانا تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی اولاد اور نواسے نواسیوں کی تربیت فرمائی جن کی نسل سے ایسی ہستیوں کا سنہری سلسلہ جاری ہوا جو اسلامی تاریخ میں آسمانِ ہدایت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں۔ اللہ تعالیٰ کے انعام واحسان سے یہ نبی کریم ﷺ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ آپ ﷺ کی نسل کے افراد کی تعداد لاکھوں میں ہے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کی نسل میں سے کبھی کوئی فرد مرتد نہیں ہوا۔ یہ آپ ﷺ کا ایک اور امتیاز ہے۔

روحانی اعتبار سے بلند مقام پر فائز بہت سی ایسی ہستیاں گزری ہیں، جو اپنی اولاد کی کامیاب تربیت نہ کر سکیں۔ ان کی اولاد نے سرکشی و گمراہی کا راستہ اختیار کیا اور شیطان کے جال میں پھنس گئی، لیکن رسول اللہ ﷺ کی اولاد یا نواسے نواسیوں میں سے کسی نے بھی جس گھر میں پرورش پائی تھی اس سے پھوٹنے والی ہدایت وراستی سے انحراف نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اس مبارک گھرانے کے وفادار رہے۔[502] یہ آپ ﷺ کی نبوت کی ایک اور دلیل ہے، کیونکہ کوئی انسان کتنی ہی ذہانت اور عبقری صلاحیتوں کا مالک کیوں نہ ہو تربیت کے اتنے بلند مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

تیسری فصل: نبوی تربیت اور اس کا طریق کار

رسول اللہﷺ کی تربیت کے طریق کار پر عمومی انداز میں گفتگو کرنے سے پہلے درج ذیل آیت مبارکہ کی تفسیر پر اجمالی نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ آپﷺ کے مخاطبین اور زیر تربیت افراد کی ذہنی سطح سے واقفیت حاصل کیے بغیر تربیتی میدان میں آپﷺ کو حاصل ہونے والی کامیابیوں کی رفعتوں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ آیت ملاحظہ فرمائیے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (الجمعة: ٢) ''وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔''

اس آیت مبارکہ کے بعض الفاظ توجہ طلب ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت مبارکہ کا آغاز غائب کی ضمیر ''ھــــو'' سے ہوا ہے، کیونکہ اس دور کے لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے محروم تھے۔ وہ جاہل، بدوی اور پس ماندہ تھے۔ ان کے دل خدائی تجلی سے نا آشنا تھے۔ آیت مبارکہ ان کے اللہ تعالیٰ سے اس قدر دور ہونے کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس میں انہیں براہ راست خطاب کرنے کی بجائے غائب کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آیت میں انہیں ''اُمیّون'' یعنی ایسے لوگ قرار دیا گیا ہے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور نہ ہی خدا اور اس کے رسول سے واقف ہیں۔ ایسی ان پڑھ اور سخت مزاج قوم جس سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی، کی طرف فولادی عزم، اعلیٰ روحانیت اور وسیع ظرف کے حامل انسان کو رسول بنا کر بھیجا گیا، جس نے اس بدو قوم کی تربیت کر کے اسے انسانیت کی رہبر و راہنما بنا دیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ لکھنے پڑھنے اور قلم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ قوم ان خوبیوں سے کوسوں دور تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ رسول کے ''انہی میں سے'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ان کی طرح جاہل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہﷺ کو خود ''امی'' رہنا پسند تھا، کیونکہ مستقبل میں خود اللہ تعالیٰ آپﷺ کے معلم و مربی بن کر آپ کو اس ''امی قوم'' کی طرف معلم کی حیثیت سے مبعوث کرنے والے تھے۔

''یتلو علیھم آیاتہ'' کا مطلب یہ ہے کہ آپﷺ ان کے سامنے ایک ایک کر کے اللہ تعالیٰ کی

آیاتِ بینات تلاوت فرماتے، ان کی وضاحت فرماتے اور ان کے مطابق ان کی تربیت فرما کر انہیں انسانی کمالات کی معراج تک پہنچا دیتے تھے۔ ''وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین'' کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے گمراہی، جہالت اور انحراف کا شکار تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک ایسا امی نبی بھیجا جو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتا، ان کا تزکیہ کرتا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا تھا۔ یہاں کتاب کی تعلیم سے قرآنِ کریم کی تعلیم مراد ہے۔ جس طرح قرآن کریم نے اس قوم کی تربیت کر کے اسے انسانی بلندیاں عطا کیں بالکل اسی طرح وہ آئندہ نسلوں کے کام بھی آ سکتا ہے۔ دورِ حاضر کے پرکشش افکارِ نو بالکل اسی طرح یکے بعد دیگرا اپنی موت آپ مر جائیں گے، جس طرح بادِ صرصر کے سامنے شمعیں بجھ جاتی ہیں۔ صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے، جو روشنیوں کے جہان میں سارے آفتابوں سے کہہ سکتی ہے: ''میں وہ آفتاب ہوں جو کبھی غروب نہیں ہوتا۔'' صرف اسی کا پرچم سربلند رہے گا اور ساری انسانیت اپنی گردنوں سے غلامی کا طوق نکال کر اس کی طرف لپکیں گی۔ ابھی سے اس کے واضح طور پر آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اگر آپ روس اور چین کے موجودہ اور دس سال پہلے کے حالات کا موازنہ کریں تو آپ موجودہ حقائق پر یقین نہ کریں گے اور ان باتوں کو خواب وخیال سمجھیں گے۔ بڑی بڑی ہیبت ناک اور جابر حکومتوں کا خاتمہ ہو رہا ہے اور پہلی سلطنتیں یکے بعد دیگرے منہدم ہو کر زمین بوس رہی ہیں۔ قرآن کریم راکھ میں سلگتے انگارے کی مانند ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ توحید کے ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور ظلم واستبداد کے باوجود اسلام کی پختہ اور تروتازہ روح اطرافِ عالم میں پھیل کر دلوں کے سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بن رہی ہے۔

اس آیت مبارکہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تعلیم کردہ کتاب منیر کے ذریعے لوگوں کی تربیت فرمائی اور ان کی انسانِ کامل کے مرتبے تک پہنچانے والے راستوں کی طرف راہنمائی فرما کر انہیں انسان کے شایانِ شان مقام عطا فرمایا۔ جس طرح نبی کریم ﷺ خود شب معراج کو بلندیوں پر پہنچے اسی طرح گمراہ اور جادۂ حق سے منحرف قوم کو روحانی اعتبار سے بلندیاں عطا کر کے ان کے دل کی گہرائیوں میں روحانی اور معنوی معراج کو وجود بخشنا بھی آپ ﷺ کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کوئلے سے ہیرا اور مٹی سے سونا چاندی بنا دیتے ہیں، بلکہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ نے کوئلے کی مانند سیاہ دل قوم کو ایسے الماسی دل عطا کیے کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کردہ ''سنہری نسل'' آج تک انسانیت کی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کے صدقے ملنے

والا خدائی فضل ہے۔ مذکورۃ الصدر بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہی وہ عظیم ترین انسان ہیں، جنھوں نے انسان کو اس کے شایانِ شان مقام عطا کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی بھی انسان ولایت اور نیکی وتقویٰ کے ذریعے قربِ الٰہی کی منازل طے کرتا ہے تو قربِ الٰہی کے اعلیٰ ترین مقامات پر محمد ﷺ کے لہلہاتے پرچم اور ترقی کے زینوں پر چڑھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے نشاناتِ قدم دیکھتا ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت صرف دلوں کے تزکیے تک محدود تھی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا تربیتی نظام متعارف کرایا تھا، جس میں عقل، روح اور دل کو بیک وقت مخاطب کیا جاتا ہے۔ یہی شان قرآن کریم کے جامع حقائق کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ الہامی صفات کی حامل اس عقل کو شوق ورغبت دلا کر اعلیٰ ترین مقام پر پہنچا دیتے ہیں پھر آپ ﷺ روح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسے اتنے بلند مقام پر پہنچا دیتے ہیں، جس تک کسی بھی ماہر تربیت کی رسائی ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ دل کو اس جہان میں پہنچا دیتے ہیں، جس کے شوق واشتیاق سے وہ لبریز ہوتا ہے اور پھر انسانی جذبات واحساسات کو بھی ایسے جہانوں میں پہنچا دیتے ہیں جن تک خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے شاگردوں کی روحانی، عقلی اور قلبی سطح کو بلند کرنے کے بعد ان کے سامنے علمی، اقتصادی، معاشرتی، انتظامی، عسکری اور سیاسی اداروں کی داغ بیل بھی ڈالی، کیونکہ آپ ﷺ کا پیغام رسالت بہتر منتظمین، ماہرین معیشت وسیاست اور عسکری قیادت فراہم کرسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک ایسا جامع نظام لائے تھے، جو معیشت وتجارت، تعلیم وتربیت، عدل وانصاف، امورِ انتظامیہ اور بین الاقوامی قوانین پر مشتمل ہے۔ مختصر یہ کہ آپ ﷺ کا لایا ہوا نظام ترقی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے، کیونکہ اگر آپ ﷺ کے پیغام رسالت میں کسی بھی پہلو سے کوئی نقص ہوتا تو آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد پورا نہ ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”میری اور مجھ سے پہلے انبیائے کرام کی مثال اس شخص جیسی ہے، جس نے ایک انتہائی خوبصورت گھر بنایا، لیکن ایک کونے میں ایک اینٹ کے جگہ خالی چھوڑ دی۔ لوگ اس گھر کے گرد چکر لگا کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھنے لگے: ”اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟“ میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔“(503)

قرآنِ کریم اس بارے میں کہتا ہے: ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ﴾ (المائدہ:۳) ”آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا۔“ سارے انبیاء، اصفیاء اور اولیاء پوچھتے تھے کہ اس عمارت کی تکمیل کب ہوگی؟ میں نے آپ کو اس عمارت کی تکمیل کے لیے نبی کامل بنا کر بھیجا ہے، جس طرح

میں نے تمہارے لیے اس دین کو پسند کیا ہے، اسی طرح میں نے اسے انسانوں کی نظروں میں پسندیدہ بنیادوں پر استوار کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے تشریف لائے تھے، جو لوگ آپ ﷺ کے پیغام رسالت میں عیب تلاش کرتے ہیں انہیں پہلے اپنے دل و دماغ کے سقم تلاش کرنے چاہئیں۔ آپ ﷺ نے تو اتمام و تکمیل اور اصلاح فرمائی اور ہر معاملے کو اس کے کمال تک پہنچایا۔

ہر کج روی کو درست کرنا، ہر عیب کو دور کرنا اور ہر کمی کو پورا کرنا آپ ﷺ کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔ آپ ﷺ نے اس ذمہ داری کو بخوبی سرانجام دیا۔ کسی بھی مربی کی شخصیت کی عظمت کا درج ذیل امور سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

الف: روحانی، قلبی اور فکری بلندی

سب سے پہلا معیار انسان کی روحانی، قلبی اور فکری بلندی اور اس کے اعلیٰ ترین ممکنہ نقطے تک رسائی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے شاگردوں اور متعلقین کو مطلوبہ ہدف تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔

قرآنِ کریم میں نفس امارہ کا ذکر ملتا ہے۔ یہ نفس انسانی رفعت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اسے بلند مقام تک پہنچنے سے روکنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، جس کے نتیجے میں اسے عالم روحانی کے مشتاق حقیقی انسان کی بجائے صرف اپنی جسمانی ضروریات پوری کرنے والا انسان بنا دیتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اسی نفس سے اللہ کی پناہ مانگی تھی: ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي﴾ (یوسف:۵۳) ''نفس (امارہ انسان کو) برائی ہی سکھاتا رہتا ہے، مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے۔'' برائی کی ترغیب دینا نفس کی فطرت میں داخل ہے، تاہم بحیرہ لوط کی طرح کے اس گہرے کنویں میں گرنے سے بچنا اور مرحلہ وار بلندی اور رفعت کی طرف بڑھنا ممکن ہے۔ قرآن کریم نفس کی انہی کیفیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ (الفجر:۲۷-۲۸) ''اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔''

قرآنِ کریم اس کیفیت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، جس میں نفس امارہ، نفس لوامہ یعنی اپنا محاسبہ کرنے والے نفس میں بدل جاتا ہے۔ چونکہ یہ نفس ایک خاص مرتبے کا حامل ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی قسم بھی اٹھاتے ہیں: ﴿وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (القیامۃ:۲) ''اور ہم کو نفس لوامہ کی قسم۔''

نفس کی ایک قسم ''نفس صافیہ'' ہے۔ یہ مقربین کا نفس ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا نفس اس قدر صاف اور شفاف ہوتا ہے کہ انہیں دیکھنے سے خدا یاد آجاتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے نفس کی بھی یہی شان تھی۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بہت سے باکمال اور باصلاحیت صحابہ کو ان کی قابلیت وصلاحیت کے مطابق اس درجے کا حامل بنایا، اسی طرح آپ ﷺ نے توفیق خداوندی سے ان کے نفوس کی مسلسل تربیت اور تزکیہ کر کے انہیں نفس انسانی کے اعلیٰ ترین ممکنہ ہدف تک پہنچا دیا۔ یہ آپ ﷺ کے بے مثال و یکتا مربی ہونے کی دلیل ہے۔ دورِ نبوی کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے عقل اور نفس کی بلندی اور انہیں کمال تک پہنچانے کے سلسلے میں کسی قسم کا تربیتی خلا نہیں چھوڑا۔

ب: نبوی دعوت کی عالمگیریت

دوسرا معیار یہ ہے کہ مربی کی کامیابی اور کمال کا اندازہ اس کی دعوت کی عالمگیریت اور جامعیت نیز اس کے پیروکاروں کی تعداد و نوعیت سے لگایا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے تربیت کردہ معلموں اور مرشدوں نے مراکش سے لے کر بخارا کے قریب واقع دریائے آموتک کے وسیع علاقے میں حق کی نشر و اشاعت کی۔ اس وقت اس سارے علاقے میں نبی کریم ﷺ ہی واحد مربی تھے اور آپ ﷺ کا لایا ہوا نظام اس سرزمین کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی مختلف قوموں کی مشکلات کا کافی و شافی حل پیش کرتا تھا۔

ایرانی، ترکی اور چینی اقوام اپنی ثقافت، ذوق اور مزاج کے اختلاف کے باوجود آپ ﷺ کی شخصیت اور تعلیمات کو قبول کرنے کے لیے ان کی طرف دوڑ پڑیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پیش کردہ نظام تربیت ایک عالمی نظام ہے، جو ساری انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تاثیر اور مصداقیت کے لحاظ سے تاریخ میں آپ ﷺ سب سے عظیم مربی تھے۔ مربیوں کی عظمت کا اندازہ ان کے تربیتی نظاموں کی بقا اور ثبات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اتنی صدیاں بیت چکنے کے باوجود نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے نظام تربیت کے مطابق انسانیت کی تربیت کرنے والے حضرات اپنے اخلاق کی بدولت رشکِ ملائکہ بنے ہوئے ہیں اور آپ ﷺ کے پیش کردہ نظام تربیت کے تحت آج تک نسل در نسل تربیت کا سلسلہ جاری ہے۔

ذرا سوچیے! نبی کریم ﷺ کا ایک اجڈ، پس ماندہ اور درندہ صفت قوم میں ظہور ہوا، لیکن آپ ﷺ نے ایسی قوم میں سے صدیوں تک انسانیت کی بھلائی کی طرف راہنمائی کرنے والے پاکیزہ راہنما تیار کیے۔ آپ ﷺ کا پیغام رسالت انسانیت کی نجات کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر باطل کی تصویر کشی کو پسند نہیں کرتا، لیکن اس موقع پر میں بعض ایسے مناظر پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں، جن سے اس بگڑے ہوئے معاشرے پر روشنی پڑتی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہوا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا ظہور ایک ایسے معاشرے میں ہوا تھا، جس کے افراد کے دلوں میں درندگی رچ بس کر فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ سرِعام شراب پیتے، جوا کھیلتے اور زنا کرتے، لیکن ان برائیوں کو معیوب نہ سمجھتے۔ زنا اس قدر عام تھا کہ سرِعام ہونے لگا تھا۔ بدکاری کے مخصوص اڈے تھے، جن کے سامنے جھنڈے نصب ہوتے تھے... (504)

فحاشی کی اس قدر کثرت تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت پر شرم آنے لگے۔ اگر حیا مانع نہ ہوتی تو میں کچھ اور باتوں کا بھی ذکر کرتا۔ پھر وہ ایسے لوگ تھے، جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی مشکلات اور تنازعات کھڑے کر دیتے تھے۔ انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے آپس میں ملانا اور ان کے دلوں کو ایک کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں گروہ بندی اور بغض و عداوت اس قدر عام تھی کہ اسے ناقابل علاج تصور کیا جاتا تھا۔ غرض ہر قسم کی برائی ان میں موجود تھی اور ان کا نبی کریم ﷺ کی بات سننا بالکل محال تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایک ایک کر کے ان سے بری عادات نکالیں اور انہیں ایسے بلند اخلاق و کردار کا حامل بنایا کہ وہ ساری قوموں پر سبقت لے کر ان کے معلم و استاد بن گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسی اجڈ اور درندہ صفت قوم کو ایسی متمدن قوم بنا دیا کہ موجودہ متمدن قومیں اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ مولیر (Moliere) نے صحیح کہا ہے: ''پیغمبر اسلام کو جس ناقابل اصلاح قوم سے واسطہ پڑا تھا اس جیسی کسی اور قوم کا پایا جانا اور پھر ایسی قوم کی تیئیس سال کے مختصر عرصے میں اصلاح کر کے اسے انسانوں کی صف میں لا کھڑا کرنا محال ہے، محمد ﷺ کے سوا کوئی اور یہ کام سرانجام نہ دے سکا۔''

ایک اور مغربی مفکر لکھتا ہے: ''انسانیت اپنے آغاز سے محمد ﷺ کے دور تک اپنے مقدر کی ترقی کا ۲۵ فیصد حاصل کر سکی، لیکن عہد نبوی میں اس نسبت میں عموداً اضافہ ہوا اور یہ ۵۰ فیصد تک پہنچ گئی اور عہد نبوی کے بعد سے اب تک تمام تر کوششوں کے باوجود یہ نسبت صرف ۷۵ فیصد تک بلند ہو سکی ہے۔''

اس پر خلوص اعتراف کا حاصل یہ ہے کہ جتنی کامیابی تمام انبیائے کرام، فلاسفہ، بڑے بڑے علماء، حکمرانوں اور سیاست دانوں نے حاصل کی تھی، اتنی کامیابی رسول اللہ ﷺ نے صرف ۲۳ سال کے عرصے میں حاصل کر لی اور چودہ صدیوں میں سائنس و ٹیکنالوجی کی تمام تر ترقی کے باوجود انسانیت صرف اتنی ہی ترقی حاصل کر سکی، جتنی ترقی رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں حاصل کر لی تھی۔ یہ ترقی پچیس فیصد تھی۔ باقی پچیس فیصد ترقی انسانیت اپنی بقیہ عمر میں حاصل کرے گی... یہ محمد ﷺ کی شخصیت ہے۔ آپ ﷺ کی انسانی خدمات کا پرتو زندہ دل اور باضمیر انسانوں پر پڑتا ہے۔ ''انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا'' کا مقالہ نگار لکھتا ہے: ''انسانی تاریخ میں بشمول انبیائے کرام بہت سے مصلحین گزرے ہیں۔ انہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی، لیکن جو کامیابی محمد ﷺ کے حصے میں آئی وہ ان میں سے کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔''

ایک انصاف پسند محقق وہل (W a h l) لکھتا ہے۔ "ہر عظیم انسان اپنے بعد آثار چھوڑتا ہے۔ نبی، مصلح، مجدد اور بڑے حکمران کے اپنے اپنے آثار ہیں۔ محمد ﷺ نے بھی اپنے بعد آثار چھوڑے ہیں، لیکن آپ کے آثار اس قدر عظیم ہیں کہ ان کا کسی اور کے ساتھ موازنہ ممکن نہیں اور جب ہم آثار کا لفظ بولتے ہیں تو ذہن فوراً آپ کے آثار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔" یہ مصنف ایک صاحب علم شخصیت ہے، جسے علمی انعامات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ دوست و دشمن آپ ﷺ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن نہ جانے پھر بھی ہمارے ہاں کے بعض جاہل قسم کے لوگ آپ ﷺ کی عظمت کا انکار کیوں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذات کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ﴾ (الأنعام: ٩٥) "وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور وہی بے جان کا جاندار سے نکالنے والا ہے۔" گویا اللہ تعالیٰ اپنے رسول محمد ﷺ کے سامنے اپنی حیرت انگیز صفات کا تذکرہ فرما کر ان کا غم ہلکا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس وحشتناک صحراء میں اجڈ اور پس ماندہ قوم کی صورت میں مٹی، پتھر اور دھاتیں دیں تاکہ آپ ایسے لوگوں سے قیامت تک ابو بکر، عمر، عثمان، علی، خالد بن ولید، عقبہ بن نافع اور طارق بن زیاد رضی اللہ عنہم جیسے خالص سونے کے لوگ تیار کریں۔

جب سیدنا محمد ﷺ کا نبی اور رسول کی حیثیت سے اس معاشرے میں ظہور ہوا اور آپ کا اپنے معاصرین سے تعارف ہوا اس وقت آپ ﷺ کے معاصرین مخصوص قلبی، روحانی اور عقلی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی ان صلاحیتوں کو ختم یا کمزور کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ آپ ﷺ نے انہیں کام میں لاتے ہوئے، انہیں تحریک دی، انہیں مزید قوت بخشی اور ان کے ذریعے بہت بڑی طاقت وقوت حاصل کی۔ ایک عظیم مفکر(505) اسلام سے پہلے اور بعد کے عمر رضی اللہ عنہ کو بطور نمونے کے پیش کرتے ہیں: "اسلام سے پہلے کا عمر عظیم انسان بننے کی اہلیت کا حامل ایک جابر اور بارعب شخص تھا۔ شاید بچپن سے ہی دوسروں کے ساتھ مقابلہ بازی اور اونٹوں کی گردنیں پھیر نے اور انہیں پچھاڑنے میں ان کے پوشیدہ اوصاف کی طرف اشارہ ہے۔ اسلام کے بعد کے عمر ایک نرم دل اور حساس انسان تھے، جو ایک چیونٹی کو بھی پاؤں تلے روندھنے سے احتراز کرتے تھے۔ وہ اس قدر حساس اور شفیق تھے کہ فرمایا کرتے تھے: "بخدا اگر فرات کے کنارے ایک اونٹ بھی گم ہو کر مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے اس پر باز پرس نہ فرمائیں۔"(506) نبی کریم ﷺ کی تربیت کی بدولت حضرت عمر اور دیگر صحابہ عام انسانوں سے بہت بلند مقام پر پہنچ گئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسی اجڈ اور پس ماندہ قوم جو اپنی عادات اور اکھڑ مزاجی کو حیرت انگیز تعصب کی حد تک پکڑے ہوئے تھی، میں سے مذکورۃ الصدر حضرات جیسی شخصیات کی تربیت فرمائی۔ ذیل میں ہم ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعے اس موضوع پر کچھ مزید روشنی ڈالنا چاہیں گے:

''حکومت اپنے تمام وسائل، ذرائع اور مشینری استعمال کر کے تمباکو نوشی جو ایک معمولی عادت سمجھی جاتی ہے کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن نہ صرف یہ کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتی، بلکہ تمباکو نوشی کے بلند گراف کو معقول حد تک نیچے لانے میں بھی ناکام رہتی ہے۔ اس ناکامی میں دنیا بھر کی حکومتیں شریک ہیں، حالانکہ اس عادت کے خاتمے کے لیے لیکچرز دیئے جاتے ہیں، مقالات پڑھے جاتے ہیں اور سیمینارز منعقد کیے جاتے ہیں۔ سائنس اور طبی علوم واضح طور پر کہتے ہیں کہ تمباکو نوشی گلے، پھیپھڑوں اور تالو کے کینسر کا باعث بنتی ہے اور جائزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بیماریوں میں مبتلا ہونے کی شرح بہت زیادہ ہے، جو بعض اوقات پچانوے فیصد تک پہنچ جاتی ہے، لیکن یہ تمام کوششیں، معلومات اور جائزے تمباکو نوشی کے مقابلے میں بے اثر دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف دسیوں مضر عادات دورِ جاہلیت کے لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر کے تمباکو نوشی کی بہ نسبت کہیں زیادہ شدت اختیار کر چکی تھیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی پھونک سے ان مضر عادات کو ختم فرما کر ان کی جگہ ایسی اچھی عادات، اخلاق حسنہ اور عمدہ خصلتیں پیدا فرما دیں کہ ان پر آسمان کے فرشتے بھی رشک اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے: ''عجیب بات ہے! یہ فرشتے تو نہیں ہیں، لیکن فرشتوں سے بھی افضل ہیں۔'' میدانِ محشر میں جب ان ہستیوں کی نورانیت سے دوزخ کی آگ بھی بجھنے لگے گی تو فرشتے حیرت زدہ ہو کر کہیں گے: ''یہ کون لوگ ہیں؟ آیا یہ انبیاء ہیں یا فرشتے ہیں؟ (507) وہ انبیائے کرام ہوں گے اور نہ ہی فرشتے، بلکہ محمد ﷺ کے امت کے ایسے افراد ہوں گے، جنہوں نے آپ ﷺ کی تربیت کے اصولوں کے مطابق تربیت پائی ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ (508) نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے صحابہ اور شاگردوں میں شامل فرما کر اتنا عظیم مرشد بنا دیا کہ انہیں کوفی مکتبِ فکر کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مکتب فکر سے علقمہ، حماد، ثوری اور ابوحنیفہ جیسے حضرات وابستہ تھے، جن میں سے ہر ایک آسمانِ علم کا درخشاں ستارہ تھا۔ ان کے زیادہ تر علوم کا سرچشمہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ذات تھی، جو زمانہ جاہلیت میں اونٹ اور بکریاں چرایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بکریوں کے چرواہے کو ایسی عبقری شخصیت بنا دیا۔

بعض علمائے اسلام برسہا برس سے مغربی علماء کی تحقیقات کا موضوع ہیں اوران پر کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ایسے علماء میں سے ایک عالم ابوحنیفہ بھی ہیں۔ ایک مفکر کی رائے میں سولون (Solon) اور ''حمورابی'' ان کے سامنے شاگرد کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن یہ عظیم ہستی بکریوں کے چرواہے اوررسول اللہ ﷺ کے شاگردابن مسعود کے شاگرد کے شاگرد تھے۔ میرا مقصودامام ابوحنیفہ کی تنقیص کرنانہیں، بلکہ میں ان کے استاذ کی عظمت بیان کرنا چاہتا ہوں۔رسول اللہ ﷺ کی تربیت وپرورش کے نتیجے میں ناقابل ذکرلوگ عظیم ہستیوں کی صورت میں ظاہر ہوئے، گویامردہ سے زندہ کاظہور ہوااورکوئلے سے ہیرابن گیا۔

اسی تربیت کے نتیجے میں ایک بربری غلام نے ''برج ہرقل'' کوعبورکرکے اس کانام تبدیل کیا تاکہ سمندر پارلوگوں کوایسی باتیں بتائے، جنہیں ان کے کانوں نے اس سے پہلے نہ سنا تھااوران کے سامنے ایسے حقائق پیش کرے، جن کے ادراک سے ان کی عقلیں قاصر تھیں۔اسلام کے بارے میں جاننے سے پہلے یورپ شہادت کے شوق، موت کی رغبت اور زندگی کوحقیر سمجھنے کے جذبے سے ناآشنا تھا،اسی لیے وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ طارق بن زیاد کیونکرصرف بارہ ہزارسپاہیوں کی ہمراہی میں کشتیوں کوجلاکرنوے ہزار سے ایک لاکھ تک کے ہسپانوی دشمنوں کے لشکر کے ساتھ خونریز جنگ میں گھس جاتا ہےاورانتہائی مشکل اورناامیدی کی حالت میں بھی جنگ جاری رکھتا ہے۔ یورپ ایسے شخص کودیکھ کرحیران تھا، جواپنے لشکر سے نوگنا بڑے لشکر سے نبردآزماہوتا ہےاوراپنے لشکرکو جمع کرکے کہتا ہے: ''اے لوگو!اب کوئی راہِ فرارنہیں ہے، تمہارے پیچھے سمندراورسامنے دشمن ہے۔تمہارے لیے سچائی اورصبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔خوب جان لو! تم اس جزیرے میں کمینے شخص کے دسترخوان پر یتیموں سے زیادہ بےبس ہو۔''

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ جنگ صرف چند گھنٹے جاری رہی اوراس کے بعد طارق بن زیاد کے لشکرکودشمن پرشاندارفتح حاصل ہوئی۔تھوڑی ہی دیر بعدطارق بن زیاد طلیطلہ (Toledo) کے محل میں موجودتھا، جہاں ہسپانوی بادشاہ کےخزانے تھے۔اس قائدکودیکھئے جوپہلےایک غلام تھا۔اسے دیکھنے سے آپ کومعلوم ہوگا کہ جب اسلام کے حقائق لوگوں کے دلوں میں اتر جاتے ہیں تو ان سے کیسے کیسے معجزات رونما ہوتے ہیں۔طارق بن زیاد نے شاہی خزانوں پراپنے قدم رکھتے ہوئے کہا تھا: ''اے طارق!توپہلے ایک غلام تھا۔اللہ تعالیٰ نے تجھے آزادکرکے قائد بنایا۔اس کی مدد سے تونے اندلس فتح کیااوراب توشاہی محل میں ہے،لیکن یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ کل تجھے بارگاہِ خداوندی میں پیش ہونا ہے۔''

سبحان اللہ! کتنا گہرا فہم ہے! عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جب ایک چھوٹے درجے کا آدمی اونچے مرتبے پر پہنچتا ہے تو اس میں یہ خرابی در آتی ہے کہ وہ تکبر وغرور کا اظہار کرتا ہے اور ہمیشہ اپنی ذات پر فخر اور لوگوں کے سامنے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ آج بھی امت کی گردنوں پر مسلط لوگوں میں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کس قدر حیرت انگیز تربیت تھی، جس نے ایک غلام کو اپنے نفس کی نگرانی کرنے والا معزز اور عمدہ انسان بنا دیا، حالانکہ ایسے مواقع پر دوسرے لوگ گھٹیا پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے تربیتی نظام کے زیر سایہ پرورش پانے والوں میں عقبہ بن نافع بھی تھے، جنہوں نے سارے کا سارا افریقہ فتح کیا اور جب بحر اٹلانٹک کے کنارے پہنچے تو اپنے گھوڑے کو گھٹنوں تک سمندر میں داخل کر کے کہنے لگے: ''اے پروردگار! اگر یہ سمندر میرے سامنے حائل نہ ہوتا تو میں تیری راہ میں جہاد کرتے ہوئے ملکوں کو فتح کرتا جاتا۔''(509)

ترکی شاعر عبدالحق حامد اپنے مشہور ڈرامے ''طارق بن زیاد'' میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: ''میں نہیں جانتا کہ عقبہ بن نافع کی یہ بات زیادہ بلند ہے یا آسمان میں فرشتوں کی گفتگو؟(510) یہ عقبہ بن نافع محمد ﷺ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد تھے۔

رسول اللہ ﷺ انسان کے تمام عقلی، قلبی، روحانی اور وجدانی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے اور کسی بھی انسانی صلاحیت کو نظر انداز یا ختم نہ فرماتے، بلکہ اس کی تمام صلاحیتوں کو فعال و متحرک کر کے بدترین انسان کو بہترین انسان بنا دیتے۔ لوگوں کی تربیت اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے میں اس قدر کامیابی و کامرانی آپ ﷺ کی نبوت کی ایک اور دلیل ہے۔ اس بارے میں اور توجیہ پیش کرنا ممکن نہیں، کیونکہ تربیت کے میدان میں آپ ﷺ نے کبھی بھی ناکامی اور نامرادی کا سامنا نہیں کیا۔

ج: حرکت اور عمل

رسول اللہ ﷺ کام اور نشاط کے بارے میں ایک حدیث میں جو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے، ارشاد فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ صاحب پیشہ مؤمن بندے سے محبت فرماتے ہیں۔"(511) اس کے سوا کوئی اور بات کہنا ممکن نہیں، کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾ (التوبة:١٠٥) "اور ان سے کہہ کہ عمل کیے جاؤ، خدا اور اس کا رسول اور مؤمن (سب) تمہارے عملوں کو دیکھ لیں گے۔" یعنی تمہارے عمل کو ایک متعین کسوٹی اور معیار پر پرکھا جائے گا اور یہ سارے اعمال عنقریب قیامت کے دن لوگوں کے سامنے پیش کیے جائیں گے، جہاں وہ ان کا مشاہدہ کریں گے اور یہ دیکھنے کے لیے ان کا باریک بینی سے جائزہ لیں گے کہ آیا یہ اعمال کہلائے جانے کے لائق ہیں یا نہیں، لہٰذا لوگوں کو یہ بات پیش نظر رکھ کر اعمال کرنے چاہئیں۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔"اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کوئی کام کرے تو اسے مہارت سے سرانجام دے۔"(512) مذکورہ بالا آیت مبارکہ کام کی ترغیب دینے والی اہم ترین آیت ہے۔میری رائے میں اسے ہر کتاب کے صفحہ عنوان پر لکھا جانا چاہیے۔حدیث مبارکہ: "اللہ تعالیٰ صاحب پیشہ مؤمن کو پسند فرماتے ہیں۔" اسی آیت مبارکہ کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے مؤمن کو پسند فرماتے ہیں جو شریعت کی رو سے جائز کاموں میں محنت ومشقت کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اپنے ہاتھ کی کمائی سے حاصل کیے ہوئے کھانے سے بہتر کھانا کسی نے نہیں کھایا۔اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔"(513) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: "تم میں سے کسی کا اپنی پشت پر لکڑیاں چننا اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے، جس کے نتیجے میں وہ اسے کچھ دے دے یا انکار کردے۔"(514)

ہم اس موضوع پر سورہ عصر کی روشنی میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں: ﴿وَالْعَصْرِ() إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ() إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (العصر:١-٣) "عصر کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔"

ایمان، عمل صالح اور حق وصبر کے ساتھ تعلق وارتباط اور ان کی ایک دوسرے کو تاکید وتلقین عمل اور

حرکت کی مختلف صورتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے کام سرانجام دینے والے لوگوں کو پسند فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق کام اور نشاط بہترین عمل اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کا تیزترین ذریعہ ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ راہب بن کر اپنی زندگی گرجا گھروں میں گزارو، شادی بیاہ سے بچو، کھانے پینے کی پاکیزہ اشیاء سے دور رہو اور دنیا کی فکر نہ کرو، بلکہ رضائے الٰہی کے حصول اور خدا کے وصال کے لیے اسے چھوڑو۔

رسول اللہ ﷺ نے جنسی خواہش کو نظرانداز کرنے کی بجائے اسے درست سمت عطا کی ہے: آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے شادی کیا کرو۔''[515] ایک اور حدیث مبارک میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنی تعداد بڑھانے کے لیے نکاح کرو، کیونکہ میں تمہارے ذریعے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔''[516] یعنی تمہاری تعداد میں جس قدر اضافہ ہوگا، اسی قدر مجھے خوشی و مسرت ہوگی اور جب میں پیچھے مڑ کر ایک جم غفیر کو خشوع و خضوع کے ساتھ رکوع وسجود کرتے اور تکبیر و تہلیل پڑھتے دیکھوں گا تو مجھے انتہائی مسرت ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے جنسی جذبے کو دبانے اور روکنے کی کوشش کی اور نہ ہی کوئی ایسی تدبیر اختیار فرمائی، جس سے انسان نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو، بلکہ آپ ﷺ نے اس جذبے کو ایک نظام کے تحت لاکر صحیح رخ پر ڈالا اور ایسے طریقے تجویز فرمائے، جن پر چل کر امت مسلمہ رضائے الٰہی حاصل کرسکتی ہے۔ نبوی تربیت کا حاصل انسانی فطرت کو ایسی سمت عطا کرنا ہے، جس سے اخلاقیات کے اعلیٰ ترین مقاصد حاصل ہوسکیں۔

د: تجارت، زراعت اور جہاد

مختلف اشیاء کے درمیان موازنہ کرنے میں رسول اللہﷺ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایک حدیث میں آپﷺ فرماتے ہیں: ”جب تم بیع عینہ کرنے لگو گے، بیلوں کی دموں کو پکڑلو گے، کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط فرمائیں گے، جو اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک تم دوبارہ دین کی طرف نہ لوٹو گے۔“(517) بیع عینہ کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص سے کوئی چیز ادھار خریدے پھر اس چیز کو اسی شخص کے ہاتھ کم نرخ پر نقد فروخت کردے۔

خواہ خرید وفروخت کے اس طریقے کو مخفی سود کی ایک صورت کہا جائے یا کچھ اور، اتنی بات یقینی ہے کہ شریعت کی نظر میں یہ طریقہ پسندیدہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے اس حدیث کا حقیقی مفہوم سمجھا ہے تو صنعتی انقلاب کے بعد سمجھا ہے۔ ہم جہاد کو بھول چکے تھے اور جب صنعت کی طرف متوجہ ہوئے تو مختلف معاملات کے درمیان درست توازن قائم نہ کرسکے، جس کے نتیجے میں ہم نے زراعت اور حیوانات کی پرورش کو نظرانداز کردیا۔

رسول اللہﷺ نے چودہ صدیاں پہلے ہمیں اُن کاموں کے بارے میں بتادیا تھا، جن کا کرنا ہمارے لیے ضروری تھا۔ دوسرے امور کی طرح اس معاملے میں بھی آپﷺ کی رائے بڑی متوازن تھی۔ زراعت اور مویشیوں کی پرورش ہونی چاہئے اور اس کی دلیل وہ احادیث مبارکہ ہیں، ن میں ان کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن اگر ہم اپنی ساری توجہ صرف انہیں دوشعبوں پر مرکوز کردیں گے تو ہمارا یہ اقدام یقیناً غلط ہوگا۔

اس حدیث کے ضمن میں وہ لوگ بھی داخل ہیں، جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر پرسکون زندگی گزارنے اور وہاں تنہائیوں میں اپنے خیالات کی دنیا میں گم رہنے کے لیے شہروں کو خیرآباد کہہ دیتے ہیں نیز اس حدیث کے دائرے میں ایسے کاشت کار اور مویشی پالنے والے بھی داخل ہیں، جو اپنے پیشے کو نشاط اور تندہی سے اختیار نہیں کرتے۔ اس جامع حدیث میں ہمارے لیے معیشت کے بارے میں بڑا اہم سبق موجود ہے۔

رسول اللہﷺ ہم سے فرمارہے ہیں: ”اگر تم نے جہاد کو ترک کردیا اور بین الاقوامی توازن میں مناسب مقام حاصل کرنے کے لیے ضروری قوت حاصل نہ کی تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط

فرما دیں گے، جس سے تم آسانی سے نجات نہ پا سکو گے اور تم اس وقت تک ظلم واستبداد کی چکی میں پستے رہو گے، جب تک اسلام کی طرف لوٹ کر صحیح اسلامی زندگی اختیار نہ کرو گے۔ یہ معانی اس حدیث مبارک کے بحرِ بے کراں کا صرف ایک چلو ہیں۔ اس موضوع سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی اور احادیث بھی ہیں، لیکن ہم صرف اسی ایک حدیث کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے دیگر انسانی صلاحیتوں، قابلیتوں اور استعدادوں پر پابندیاں عائد کر کے انہیں محدود نہیں کیا، اسی طرح آپ ﷺ نے جسمانی قوت وطاقت کو بھی تحقیر وحقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ اس کے برعکس آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''طاقتور مؤمن کمزور مؤمن کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے۔''(518)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ بننا چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ روحانی اور جسمانی لحاظ سے طاقتور بنیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم سے یہ نہیں چاہتے کہ ہم روزوں کے ذریعے جسمانی طور پر کمزور ہو کر رضائے الٰہی حاصل کریں، بلکہ آپ ﷺ نے فطرت الٰہیہ کے قوانین کے ذریعے رہبانیت کا مقابلہ کیا اور ہماری بھی انہی فطری قوانین کی طرف راہنمائی فرمائی۔

۵:   علم سے متعلق ایک ملاحظہ

علم اور فکری زندگی سے متعلق نبی کریم ﷺ کی تعلیمات و خدمات آپ ﷺ کے ہمہ گیر اور عالمی پیغام رسالت کا مظہر ہیں۔ قرآن کریم علم پر توجہ دیتا ہے اور ساری انسانیت کو علم کے حصول کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الزمر: ۹) ''بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ نے اہل علم کا مرتبہ غیر اہل علم سے بلند بنایا ہے۔ ایک دوسری آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (فاطر: ۲۸) ''خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں، جو صاحب علم ہیں۔ بیشک خدا غالب (اور) بخشنے والا ہے۔''

جو علماء اللہ تعالیٰ کی عظمت کا زیادہ علم رکھتے ہیں، وہی اللہ تعالیٰ سے کماحقہ ڈرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی طرف اس آیت مبارکہ کی ایک شاذ قراءت بھی منسوب ہے، جس میں لفظ جلالہ کو مرفوع پڑھا گیا ہے۔ اس قراءت کے مطابق آیت کا معنی یوں ہوگا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف علماء کا احترام کرتے ہیں۔'' یقیناً یہ احترام اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے مناسب حال ہی ہوگا، تاہم یہ قراوت شاذ ہے،(519) اگرچہ مفہوم کے اعتبار سے یہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر غور و فکر کیا جائے۔

امام فخر الدین رازی ایک علمی بحث کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک انتہائی لطیف نکتے پر پہنچتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''فقہ مالکی کے سوا دیگر تینوں فقہی مذاہب کی رو سے کتا نجس العین ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ کتے کے تمام اجزاء ناپاک ہیں، اس لیے اسے گھروں میں رکھنا درست نہیں، لیکن اگر کتا معلّم ہو یعنی اسے شکار کرنے اور بکریوں کی رکھوالی کرنے کی تعلیم و تربیت دی گئی ہو تو اس کے احکام بدل جائیں گے، چنانچہ اس کے منہ میں پکڑے ہوئے شکار کو کھانا حلال ہوگا، جن جگہوں سے اس کا گزر ہوگا اور جن چیزوں سے اس کا جسم چھوئے گا انہیں پاک تصور کیا جائے اور اسے گھروں میں رکھنا جائز ہوگا۔''

اس کے بعد امام فخر الدین رازی ایک سوال اٹھاتے ہیں: ''اگر ایک کتا شکار کی تعلیم پانے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اپنی نجاست سے نجات حاصل کر لیتا ہے، بلکہ گھر کا ایک فرد بن جاتا ہے تو ایک صاحب علم انسان کا کیا مقام ہوگا اور وہ کمال کی کتنی بلندیوں پر پہنچ سکتا ہوگا؟''

یہ شریعت کا نقطہ نظر اور حضرت محمد ﷺ کا پیغام رسالت ہے۔ جو لوگ اللہ جل شانہ کی معرفت سے محروم ہیں وہ جاہل ہیں اور جو خدا کو پہچان کر اس کی اطاعت بجالاتے ہیں وہ علماء ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اللہ اور اس کے رسول کی معرفت سے محروم لوگوں پر علماء کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن جن لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی معرفت حاصل ہے، وہ علماء کہلائے جانے کے مستحق ہیں، اگرچہ ظاہری علوم ان کے پاس کم ہی کیوں نہ ہوں اور اگر ہم شاذ قراءت کے مطابق لفظ "یخشی" کو "یحترم" کے معنی میں لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے مناسب حال ایسے لوگوں کا احترام کرتے ہیں جو اللہ، اس کے انبیائے کرام، کتابوں، آخرت، حشر ونشر اور جنت ودوزخ پر ایمان رکھتے ہیں۔ غور وفکر کے موضوع پر میں صرف ایک حدیث شریف کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ ارشادِ نبوی ہے: ''ایک گھڑی کا غور وفکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔''(520) اہل مغرب اس قسم کی باتوں سے آشنا ہیں اور نہ ہی اس مرحلے تک ابھی ان کی رسائی ہوئی ہے۔ اگر آپ ایک گھڑی منظم انداز میں غور وفکر کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کسی بات تک پہنچتے ہیں تو آپ اسے انسانیت کی بھلائی کے لیے پیش کر سکتے ہیں، نیز اگر آپ صحیح اور درست انداز میں اپنی روحانی اور قلبی زندگی یا اپنی اخروی اور ابدی حیات کی اصلاح کی خاطر ایک گھڑی غور وفکر کرتے ہیں تو یہ آپ کے لیے ایک سال کی عبادت سے بہتر اور زیادہ باعث ثواب ہو سکتا ہے۔

برسہا برس سے ہم منظم انداز میں غور وفکر اور گہرائی کی حامل عبادت سے دور ہیں یا دور کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں اسلام کا کوئی قصور نہیں، بلکہ مسلمان ہی قصوروار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تو ﴿ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ﴾ (الحجر: ٤٦) ''ان میں سلامتی (اور خاطر جمع) سے داخل ہو جاؤ۔'' فرما کر غور وفکر کے تمام دروازے اور راہیں کھول دی تھیں۔

جس قدر ہمیں علم سے اجنبیت ہو رہی ہے، اسی قدر ہمارے سطحی پن میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہم مغرب کے سامنے بین الاقوامی توازن کے سلسلے میں اپنے مفادات کے دفاع سے عاجز آ رہے ہیں۔ بات اُنہی کی مانی جاتی ہے اور ہم صرف ان سے احکامات لیتے ہیں، تاہم مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ امت اٹھے گی اور اقوامِ عالم میں اپنے شایانِ شان مقام حاصل کر لے گی۔

رسول اللہ ﷺ ایک اخلاقی اور تربیتی پیغام لائے تھے، تاہم آپ ﷺ نے انسان کی تربیت کے دوران ہر ہر فرد کی قابلیت وصلاحیت کے مطابق کامیابی حاصل کی اور اس قابلیت وصلاحیت کو بگاڑنے یا اس کی راہ میں حائل ہونے کی بجائے انسان کے ساتھ اس کی فطرت کے مطابق برتاؤ کیا، جس کے

نتیجے میں لوگ آپ ﷺ کی طرف کھچے چلے آئے اور آپ کا تربیتی انداز ان کے لیے ایک قوتِ محرکہ کی حیثیت اختیار کر گیا، کیونکہ وہ انسانی فطرت کی راہ میں حائل ہوا اور نہ ہی اس نے انسانی فطرت سے الجھاؤ اور مخالفت کا راستہ اختیار کیا۔ آپ ﷺ کی ایک ایک تعلیم ایک محرک عامل تھی، حالانکہ آپ ﷺ نے اپنا نظام تربیت ایک ایسے معاشرے میں متعارف کرایا تھا، جو اخلاق، تربیت اور اعلیٰ کردار کے مفاہیم سے نا آشنا تھا۔ آئندہ صفحات میں ذکر کردہ چند مثالوں سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کی تربیت کا آغاز کہاں سے کیا اور آخر کار انہیں کہاں پہنچا دیا۔

چوتھی فصل: نبوی نظامِ تعلیم و تربیت کی بعض مثالیں

الف: مسجد میں پیشاب کرنے والے بدوی سے آپ ﷺ کا برتاؤ

بخاری و مسلم دونوں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے درج ذیل واقعہ نقل کرتے ہیں:

ہم مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ بیٹھے تھے کہ ایک بدوی مسجد میں آیا اور اس نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے اسے روکنا چاہا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے نہ روکو، بلکہ اسے (اپنے حال پر) چھوڑ دو۔'' چنانچہ صحابہ نے اسے کچھ نہ کہا یہاں تک کہ وہ پیشاب سے فارغ ہو گیا پھر رسول اللہ ﷺ نے اسے بلا کر ارشاد فرمایا: ''یہ مساجد پیشاب اور گندگی کے لیے نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ کے ذکر، نماز اور تلاوتِ قرآن کیلئے ہیں۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو حکم دیا، جس نے پانی کا ایک ڈول لا کر اس پر بہا دیا۔[521]

اس دور کے اکثر لوگ ابتدا میں اس قدر اجڈ اور پسماندہ تھے کہ مسجد میں پیشاب کرنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے ایسے اجڈ لوگوں کے ذریعے ایک عظیم مثالی معاشرہ تشکیل دیا۔ کون جانتا ہے اس بدوی کی نسل میں سے کتنے عظیم لوگ پیدا ہوئے ہوں گے؟

ب: رسول اللہ ﷺ کی نظر میں عورت کا مقام

ماضی نے جاہلیت کے تاریک دور کو اپنے صفحات میں لپیٹ لیا تھا۔ جب زمانہ جاہلیت کا تذکرہ ہوتا تو ہونٹوں پر کڑواہٹ اور حقارت کے اثرات محسوس ہوتے تھے۔ ایسے میں ایک دن ایک بدوی دیہات سے مسجد نبوی میں آیا اور رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرنے لگا۔ دورانِ گفتگو اس نے آپ ﷺ سے کہا: "یا رسول اللہ! جب ہم جاہلیت اور بتوں کی عبادت میں مبتلا تھے اس وقت ہم اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ میری ایک بیٹی تھی، جب وہ میری باتوں کا جواب دینے اور میرے بلانے پر خوش ہونے لگی تو ایک دن میں نے اسے بلایا... وہ میرے پیچھے چل پڑی، جب میں گھر کے قریب واقع ایک کنویں کے پاس پہنچا تو میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کنویں میں پھینک دیا۔ اس کی سب سے آخری بات جو میں نے سنی وہ اس کی یہ پکار تھی: "او میرے پیارے باپ! او میرے پیارے باپ!" یہ سن کر رسول اللہ ﷺ زاروقطار رونے لگے۔ حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا: "تم نے رسول اللہ ﷺ کو غمزدہ کر دیا۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ٹھہر جاؤ! وہ اپنے لیے باعث تشویش بات کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے۔" پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "اپنی بات دوبارہ سناؤ۔" چنانچہ اس نے اپنا واقعہ دوبارہ سنایا، جس پر آپ ﷺ اتنا روئے کہ آپ کے آنسو داڑھی مبارک پر بہنے لگے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: "چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ جاہلیت کے اعمال کو کالعدم قرار دیا ہے، اس لیے تم نئے سرے سے عمل کرو۔" (522)

یہ اس دور کے لوگوں کی حالت تھی۔ عورت کو جینے کا حق حاصل نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ایسی قوم میں ظہور ہوا۔ آپ ﷺ نے جہاں دوسری چیزوں کو ان کے حقوق دلوائے، وہیں عورت کو بھی اونچا مقام عطا کیا۔ وہ عورت جو اپنے باپ کی نظروں میں بھی حقیر و ذلیل تھی اور عورتیں اپنی بیٹیوں کو ان کے باپ سے چھپاتی پھرتی تھیں، نبی کریم ﷺ نے اسے اس کے شایانِ شان قدر و منزلت عطا کی۔ اگرچہ اس وقت اعداد و شمار محفوظ رکھنے کا رواج نہ تھا، لیکن میرے خیال میں اس دور میں زندہ بچ جانے والی پچاس فیصد بچیاں ایسی ہوں گی، جنہیں ان کی ماؤں نے ان کے باپ سے چھپالیا ہوگا۔

اس قتل اور زندہ درگور کرنے کے عمل کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے چند گنے چنے سلیم الطبع لوگوں کے سوا کوئی بھی ناپسند نہ کرتا تھا۔ اسلام کی روشنی سے محروم رہنے والے اکثر نوجوان اپنی بیٹیوں کے قاتل تھے۔ ایسے معاشرے میں نبی کریم ﷺ نے عورت کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔

نسائی اور مسند احمد میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی درج ذیل واقعے پر بھی ذرا غور فرمائیے:

ایک نوجوان عورت حضرت عائشہ کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''میرے باپ نے میرے ذریعے اپنے بھتیجے کی دناءت کم کرنے کے لیے اس کے ساتھ میرا نکاح کر دیا ہے، حالانکہ میں اس پر راضی نہیں ہوں۔'' حضرت عائشہ نے فرمایا: ''نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے تک ٹھہرو۔'' چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس نے آپ ﷺ کو اپنی بات سنائی۔ آپ ﷺ نے پیغام بھجوا کر اس کے باپ کو بلوایا اور اس عورت کو اپنے معاملے کا اختیار دے دیا، اس پر اس عورت نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے باپ کے فیصلے کو برقرار رکھتی ہوں۔ میرا مقصد تو عورتوں کو اس مسئلے سے آگاہ کرنا تھا۔(523)

وہ عورت جسے پہلے زندہ درگور کیا جاتا اور معاشرے میں اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ رکھا جاتا اب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوری آزادی سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی اور یہ جاننا چاہتی کہ آیا اس کے والد کو اس کے ہونے والے شوہر کے تعین میں قوت کے استعمال کا اختیار حاصل ہے یا نہیں؟ اگر زمانہ نبوت سے چند سال پہلے کسی کو مستقبل میں اس قسم کی تبدیلی کے وقوع پذیر ہونے کا بتایا جاتا تو وہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا اور ایسی بات بتانے والے کو پاگل ٹھہراتا۔

ج: پیکر استغنا

امام مسلم، ابن ماجہ اور ابوداؤد حضرت عوف بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس سات، آٹھ یا نو آدمی بیٹھے تھے اور ہم نے کچھ عرصہ پہلے ہی آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اسی دوران آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہ کروگے؟'' ہم نے عرض کی: ''یارسول اللہ! ہم تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔'' آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''کیا تم اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہ کروگے؟'' ہم نے پھر عرض کی: ''یارسول اللہ! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔'' لیکن آپ ﷺ نے تیسری بار پھر فرمایا: ''کیا تم اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہ کروگے؟'' اس بار ہم نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر عرض کی: ''یارسول اللہ! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ بتایئے اب ہم کس بات پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس بات پر کہ تم اللہ کی عبادت کروگے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے، پانچ وقتہ نمازیں ادا کروگے، اطاعت اختیار کروگے اور (پھر آہستہ سے فرمایا) لوگوں سے سوال نہ کروگے۔'' میں نے ان میں سے بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ اگر ان کے ہاتھ سے چابک گر پڑتا تو کسی دوسرے کو پکڑانے کے لیے نہ کہتے۔''[524] رسول اللہ ﷺ نے آخری جملے کو آہستہ آواز سے کہا گویا آپ ﷺ اسے دوسروں کو سنانا نہ چاہتے ہوں۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کو مشکل میں نہ ڈالنا چاہتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے بارے میں انتہائی حساس واقع ہوئے تھے۔

اس واقعے پر برسہابرس بیت گئے اور ان میں سے کئی ایک صحابہ کو فقر و فاقہ کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن انہوں نے اس عہد کو نہیں بھلایا اور اس بات کی پوری کوشش کی کہ کسی سے مانگنے کی نوبت نہ آئے حتی کہ اگر ان میں سے کوئی اپنی اونٹنی یا گھوڑے پر سوار ہوتا اور اس کے ہاتھ سے چابک گر پڑتا تو وہ کسی کو اٹھانے کے لیے نہ کہتا، بلکہ اسے اٹھانے کے لیے خود سواری سے نیچے اترتا۔ ہم بجا طور پر یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جن حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر مذکورۃ الصدر بیعت کی تھی انہوں نے عمر بھر کسی سے پانی کا ایک گلاس بھی نہ مانگا ہوگا۔

امام بخاری اور امام ترمذی حکیم بن حزام سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی چیز مانگی۔ آپ ﷺ نے وہ چیز مجھے عطا فرما دی۔ میں نے آپ ﷺ سے پھر سوال کیا۔ آپ ﷺ

نے میرے سوال کو پورا فرمایا اور پھر مجھ سے ارشاد فرمایا: ''اے حکیم! یہ مال سرسبز اور میٹھی چیز ہے۔ اگر اسے دل کے استغنا سے حاصل کیا جائے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور اگر اسے اشرافِ نفس سے لیا جائے تو بے برکتی کا باعث ہوتا ہے اور یہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کوئی آدمی کھاتا جائے لیکن سیر نہ ہو۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔'' میں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق مبعوث فرمایا ہے۔ آپ کے بعد موت تک کسی سے سوال نہ کروں گا۔'' چنانچہ حضرت ابوبکر حضرت حکیم کو وظیفہ دینے کے لیے بلاتے، لیکن وہ ان سے کوئی چیز قبول کرنے سے انکار فرما دیتے۔ اس کے بعد حضرت عمر نے بھی انہیں وظیفہ دینے کے لیے بلایا، لیکن انہوں اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا: ''اے مسلمانو! میں مالِ فے میں سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا مقرر کردہ حصہ ان کے سامنے پیش کر رہا ہوں، لیکن وہ لینے سے انکار کر رہے ہیں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے بعد وفات تک انہوں نے کبھی کسی سے سوال نہ کیا۔(525)

د: دورِ جاہلیت کی ایک جھلک

رسول اللہ ﷺ دورِ جاہلیت کی ہزاروں عادات کے خلاف جدوجہد کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ جاہلیت کی تاریکی کو اسلام کی روشنی میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔اس بات کی وضاحت کے لیے ذیل میں ہم جعفر بن ابی طالب کی نجاشی کے ساتھ ہونے والی گفتگو ذکر کرتے ہیں:

''اے بادشاہ! ہم جاہل قوم تھے۔بتوں کی پوجا کیا کرتے،مردار کھایا کرتے،بے حیائیوں کا ارتکاب کیا کرتے،قطع رحمی کرتے اور پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک روا رکھتے تھے۔ہم میں سے طاقت ور کمزوروں پر ظلم ڈھایا کرتا تھا۔ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ہم میں سے ہی ایک رسول بھیجا جس کے حسب ونسب،صداقت،امانت داری اور پاکدامنی سے ہم بخوبی واقف تھے۔اس نے ہمیں اللہ کو ایک ماننے،اس کی عبادت کرنے اور پتھر کے بتوں کی پوجا چھوڑ دینے کی دعوت دی۔اس نے ہمیں سچ بولنے اور حرام کاموں اور خون ریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔اس نے ہمیں بے حیائی،جھوٹ بولنے،یتیموں کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر بہتان طرازی سے منع کیا۔اس نے ہمیں صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے،اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے،نماز پڑھنے،زکوۃ ادا کرنے اور روزہ رکھنے کا بھی حکم دیا۔

نجاشی کے سامنے اسلام کے دیگر احکام بھی بیان کرنے کے بعد حضرت جعفر نے کہا:''ہم نے اس کی تصدیق کی،اس پر ایمان لائے اور اس کے بتائے ہوئے احکامات کی پیروی کرنے لگے۔ہم نے صرف ایک اللہ کی عبادت شروع کی،اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرایا۔جو چیزیں اس نے ہم پر حرام قرار دیں ہم نے انہیں حرام سمجھا اور جنہیں اس نے حلال قرار دیا ہم نے بھی انہیں حلال سمجھا،لیکن ہماری قوم ہمارے درپے ہوگئی۔انہوں نے ہمیں تکلیفیں پہنچائیں اور ہمارے دین کی وجہ سے ہمیں آزمائش میں مبتلا کیا تاکہ ہم ایک اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت کی طرف لوٹ آئیں اور جن بری باتوں کو پہلے حلال سمجھتے تھے انہیں پھر سے حلال سمجھنے لگیں۔جب انہوں نے ہم پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالا،ظلم وستم کی انتہا کردی،ہمارے لئے مشکلات پیدا کیں اور ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان حائل ہوگئے تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے۔ہم نے دوسروں کی بہ نسبت آپ کو ترجیح دی اور آپ کے پڑوس کو پسند کیا۔اے بادشاہ سلامت! ہمیں امید ہے کہ آپ کے ہاں ہمیں کسی قسم کے ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔''(526)

یہ گفتگو بتاتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کس قدر گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور جاہلی معاشرہ کیسے فحاشی اور فساد کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ وہاں زنا حلال تھا، چوری بہادری اور شجاعت سمجھی جاتی تھی اور شاید ہی کوئی آدمی شراب نوشی سے محفوظ ہو۔ ایسے بگڑے ہوئے وحشتناک معاشرے میں رسول اللہ ﷺ نے دلوں سے فساد کا خاتمہ کر کے انہیں بلند اخلاق، عمدہ خصلتوں اور اعلیٰ انسانی اقدار سے آراستہ کیا، گویا آپ ﷺ نے حقیقت میں اس ''مثالی شہر'' کو وجود بخشا جس کا خواب افلاطون (Platon) نے اپنی کتاب ''جمہوریت'' میں اور تھامس مور (Thomas More) جیسے دیگر مفکرین نے دیکھا تھا۔

کسی بگڑی ہوئی پس ماندہ اور درندہ صفت قوم کو تمدن اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف راہنمائی کرنے والی قوم میں تبدیلی کرنا دراصل اسے تاریکی سے روشنی میں لانا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ معجزہ دکھا کر اپنے صاحبِ اعجاز ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ہم جو اپنے عمر بھر کے ساتھیوں کی کسی ایک بری خصلت کی اصلاح نہیں کر سکتے، حضرت محمد ﷺ کے حضور بصد احترام وخشوع کھڑے ہو کر ان کی رسالت کی صداقت وحقانیت کی گواہی دیتے ہیں۔

میں نے اپنے وضع کردہ مثالی نظامِ تربیت کے ذریعے، جسے میں نے پورے وثوق کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے اخذ کیا ہے، اپنے قریب ترین احباب کو قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے لوگوں کو اچھی باتوں کی طرف بلانے کی انتھک کوشش کی، لیکن میں ان کی توجہ اس طرف مبذول نہ کرا سکا۔ رسول اللہ ﷺ کس قدر عظیم قدرت وطاقت کے مالک تھے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو پس ماندہ اور وحشتناک زندگی اور دناءت سے نکال کر تمدن اور بلندی عطا کی، بلکہ جاہلیت میں مبتلا لوگوں کو متمدن قوموں کا معلم وراہنما بنا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے جیسے لوگ جو اپنے گھر کے تین چار افراد کو بھی اپنی بات کا قائل نہیں کر سکتے، وہی رسول اللہ ﷺ کے اس عظیم کارنامے کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ آپ نے سوائے ان لوگوں کے جو تعصب وعناد کا شکار تھے ایک پوری قوم کو نشیب سے اٹھا کر فراز پر پہنچا دیا اور اس کی روح میں اپنے دل کی بات ڈال دی۔

عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں ایرانی اور ترک اقوام سے روابط قائم ہوئے۔ ایرانی، طورانی، ترک اور رومی اقوام مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کا پیغامِ رسالت ان میں سے ہر ایک کے اس قدر مناسبِ حال تھا کہ گویا وہ پیغام صرف اسی کے لیے نازل ہوا ہے۔ سارے عالم

کو پیش نظر رکھ کر اس کے مختلف اطراف و اکناف میں اپنی رسالت کو نافذ کرنا جہاں رسول اللہ ﷺ کا عظیم معجزہ ہے، وہیں یہ آپ کی نبوت کی دلیل بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اثبات ہمیشہ ہمارا مطلوب رہا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے اندر چھپی ہوئی اعلیٰ صلاحیتوں کا ادراک اور اپنے زمانے سے واقفیت حاصل کر لے، مثلاً ممکن ہے اسکندر نے اپنے دور کو ایک خاص حد تک سمجھا ہو۔ قیصر نے اپنے زمانے کی حدود پھلانگ کر مستقبل میں جھانکا ہو یا نپولین (Napoleon) نے اپنے عہد کا فہم وادراک حاصل کیا ہو، لیکن اپنے بعد آنے والے ادوار اور اقوام کو سمجھنا اور ان سب کے مناسب حال اوران کے لیے قابل قبول پیغام پیش کرنا رسول اللہ ﷺ کا خصوصی امتیاز ہے۔ ہم اس کامیابی کو معجزہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے، کیونکہ اسے تعبیر کرنے کے لیے اس لفظ کے سوا کوئی اور مناسب لفظ ہے ہی نہیں۔ رسول خدا حضرت محمد ﷺ سے چار پانچ صدیاں بعد کے بادشاہ ''الپ ارسلان'' نے آپ ﷺ کے پیغام رسالت کو اپنے دل و جان کے مناسب پا کر اس کی صدقِ دل سے تصدیق کی، اسی طرح تاریخ کے عظیم سپہ سالار اور فاتح سلطان محمد فاتح، جنہوں نے تاریخ کے ایک دور کو ختم اور دوسرے کا آغاز کیا، (527) نے اپنے اسلاف کی طرح نبی کریم ﷺ کے پیغام رسالت کو قبول کر کے آپ ﷺ کے راستے کی پیروی اختیار کی۔ تاریخ کی عظیم ترین شخصیات ہونے کے باوجود انہوں نے نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنے میں ذرا پس و پیش نہ کی۔

آج ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کا پیغام رسالت آج بھی تر و تازہ، سرسبز و شاداب اور ہماری روحوں، عقلوں اور دلوں سے ہم کلام ہے، کیونکہ یہ پیغام ایسی ذات کی طرف سے آیا ہے، جسے ہمارے رازوں اور سرگوشیوں تک کا علم ہے، ورنہ کوئی انسان خواہ کتنی ہی ذہانت اور عبقریت کا مالک کیوں نہ ہو، اس کے لیے ہر دور کے مناسب حال نظام تشکیل دینا ممکن نہیں۔

ہم رسول اللہ ﷺ کے تربیتی نظام کی تفصیلات قرآن و سنت میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا کام قرآن کریم کی تبلیغ اور لوگوں کو اس کا قائل کرنے تک محدود ہوتا تب بھی یہ انتہائی شاندار کام ہوتا۔ اگرچہ اس وقت قرآن کریم میری گفتگو کا موضوع نہیں ہے، لیکن میں موقع کی مناسبت سے اس موضوع پر کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کا ظہور ایک ایسے ان پڑھ اور جاہل معاشرے میں ہوا تھا جو مدارس اور لکھنے پڑھنے کے تصور سے نا آشنا تھا، لیکن جب آپ ﷺ رفیق اعلیٰ سے جا ملے، اس وقت آپ ﷺ کے صحابہ کرام میں عنفوانِ شباب میں داخل ہونے والے نوجوانوں سے لے کر زندگی کے آخری مراحل میں پہنچے ہوئے بوڑھوں تک کوئی بھی لکھنے پڑھنے سے نا آشنا نہ تھا۔ دوسری طرف دورِ حاضر میں ہر قسم کے وسائل کی دستیابی اور تمام تر کوششوں بلکہ بعض اوقات جبر کے باوجود اہل وطن کی ایک بڑی تعداد لکھنا پڑھنا نہیں جانتی، حالانکہ ترکی کو لاطینی حروفِ تہجی اختیار کیے ہوئے پینسٹھ برس گزر چکے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے بیس بائیس سال کے مختصر عرصے میں نہ صرف یہ کہ انسانوں کو ایمان و عرفان سے متعارف کرایا، بلکہ انہیں لکھنا پڑھنا بھی سکھایا۔ میرے خیال میں جب رسول اللہ ﷺ نے دنیا سے دار الخلود کی طرف رحلت فرمائی ہوگی، اس وقت کوئی صحابی بھی قرآن کریم کی قراءت سے ناواقف نہ ہوگا۔ بات صرف قرآنِ کریم پڑھنے کی نہیں ہے، بلکہ مدینے کے کاشتکار اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے قرآن کریم کی سات یا دس قراءتوں کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے۔ بد قسمتی سے راقم الحروف بھی ان قراءتوں کے علم سے ناواقف ہے، جسے ''علم الوجوہ'' کہا جاتا ہے۔ اس علم کے ماہرین کی تعداد بہت کم ہے۔

یہ درست ہے کہ اُس دور کے لوگ فطری طور بہت زیادہ ذہانت اور قوتِ یادداشت کے مالک ہوتے تھے، لیکن صرف ذہانت اور قوتِ یادداشت سے اس حقیقت کی توجیہ ممکن نہیں۔ اس کی توجیہ صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کے اس تعلیمی نظام کے ذریعے کی جاسکتی ہے، جس نے قرآن اور لوگوں کے دلوں میں گہرا تعلق قائم کر دیا تھا۔

اگرچہ ان کے دل ہر قسم کے فسق و فجور کی آماجگاہ بن چکے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنے حیرت انگیز اور دلکش اقدامات کے ذریعے نہ صرف ان کی تمام بری عادات کا ازالہ فرمایا، بلکہ انہیں ایک نئی خوبصورت زندگی عطا کی، مثلاً قرآن کریم میں ہے: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (الاسراء: ۲۳) ''اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔'' اس آیت مبارکہ نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ جو لوگ پہلے اپنے والدین پر ظلم و ستم ڈھاتے اور انہیں قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے اچانک تبدیل ہو گئے حتی کہ ایک شخص آ کر رسول اللہ ﷺ سے پوچھتا کہ اگر وہ اپنے والد کی نگاہوں کا جواب مسکراہٹ کے ساتھ نہ دے تو اس پر اسے کوئی سزا تو نہ ملے گی؟

قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ﴾ (الأنعام: ١٥٢) ''اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔'' اس آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو ہو کر اپنے قبضے میں موجود یتیموں کا مال آپ ﷺ کے حوالے کرنے لگے۔ اگر آیت مبارکہ میں غور وفکر کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ آیت صرف یہ نہیں کہتی کہ یتیموں کا مال نہ کھاؤ، بلکہ اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو، اس لیے جب اس آیت مبارکہ نے اس معاملے میں اس قدر حساسیت کا اظہار کیا تو حساس دل کے حامل صحابہ کرام نے اپنے ذمے موجود یتیموں کے مالوں سے بری الذمہ ہونے کا عزم کر لیا۔ کس چیز نے ان لوگوں کو جو پہلے یتیموں کے اموال کھاتے اور انہیں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے اموال کے ساتھ ملا لیتے تھے، اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے طرز عمل میں اتنی بڑی تبدیلی لائیں؟

اس معاشرے میں زنا عام تھا اور اسے جائز سمجھا جاتا تھا۔ شاید ہی کوئی اس گناہ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہوگا، لیکن جب قرآن کریم نے اپنے سلسلہ نزول کے کچھ ہی عرصہ بعد اعلان کیا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَى﴾ (الاسراء: ٣٢) ''اور زنا کے بھی پاس نہ جانا۔'' تو اس نے تمام ناجائز اور موجب گناہ تعلقات کا قلع قمع کر دیا۔ اس کے بعد عہدِ نبوی میں زنا کے دو تین واقعات کے سوا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

لوٹ مار اور چوری اس دور میں بہادری اور شجاعت کی علامت سمجھی جاتی تھی، لیکن جب آیت مبارکہ ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدہ: ٣٨) ''اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔'' نازل ہوئی تو ہر چیز میں بنیادی تبدیلی واقع ہو گئی۔ میرے علم میں اس پورے عہد میں چوری کے دو تین واقعات کے سوا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔[528]

جن لوگوں کے نزدیک قتل انتہائی معمولی بات تھی، ان سے قرآن کریم نے کہا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ﴾ (الاسراء: ٣٤ والأنعام: ١٥٢) ''اور کسی جان (والے) کو جس کے قتل کو خدا نے حرام کر دیا ہے قتل نہ کرنا۔'' اس ایک ارشاد مبارک سے قتل کے جرائم کا بالکل سد باب ہو گیا۔ اس پورے عرصے میں قتل کے جرائم کے دو واقعات کے سوا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ان میں سے ایک جرم کا ارتکاب ایک یہودی نے قصداً کیا[529] جبکہ دوسرے جرم کا ارتکاب ایک مسلمان سے غلطی سے ہوا۔[530]

ذرا غور فرمائیے! تئیس سال پر مشتمل عہد نبوی کے طویل دور میں ایک زنا کے واقعے جس میں زانی نے خود اعتراف جرم کیا، ایک یہودی کے قتل کے واقعے اور ایک چوری کے واقعے جس میں چوری کرنے والی خاتون کا ہاتھ کاٹا گیا، کے سوا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ چند ایک واقعات ایک ایسے

معاشرے میں پیش آئے، جس میں چند سال پہلے لوگ مردار کھاتے اور خون کے پیاسوں کی طرح ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے۔ ایسے معاشرے سے رسول اللہ ﷺ نے آبِ زلال جیسا معاشرہ تشکیل دیا۔ ایسے بگڑے ہوئے، گندے، بدبودار اور متعفن معاشرے میں رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر، ابوہریرہ، ماعز اور غامدیہ جیسے انسانوں کی تربیت فرما کر ایک پاکیزہ اور نورانی معاشرے کی داغ بیل ڈالی۔ اگر یہ کارنامہ معجزہ نہیں تو پھر معجزہ کسے کہتے ہیں؟

اس وسیع وعریض موضوع کی تمام تفصیلات پیش کرنا اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اس وقت میرے لیے ممکن نہیں، تاہم آئندہ صفحات میں میں نبی کریم ﷺ کے اقدامات کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے بعض اخلاقِ عالیہ اور خصالِ حمیدہ کے مبادی ایک ایک دو دو مثالوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

۵: سخاوت اور ایثار

اس معاشرے میں ذاتی مصلحت اور مفاد کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہ تھی، حتیٰ کہ سخاوت کو بھی مصیبت زدہ کی اعانت کی بجائے تفاخر اور شہرت کا ذریعہ بنالیا گیا تھا، باقی ایثار کا تو ان کے ہاں رواج ہی نہ تھا۔ جس طرح نبی کریم ﷺ کے پیغام رسالت نے اس معاشرے کی دیگر بہت سی چیزوں کو بدلا اسی طرح اس نے اس پہلو سے بھی تبدیلی لائی اور بخل کا ازالہ کر کے اس کی جگہ سخاوت اور ایثار کو جگہ دی اور دیگر تمام امور کی طرح انہیں بھی صرف رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ قرار دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''میں حاجت مند ہوں۔'' آپ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کے گھر پیغام بھیجا۔ انہوں نے جواب بھیجا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث کیا! میرے پاس پانی کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے دوسری زوجہ محترمہ کی طرف پیغام بھیجا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا حتیٰ کہ تمام ازواجِ مطہرات کی طرف سے یہی جواب ملا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث فرمایا! میرے پاس پانی کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آج کی رات اس شخص کی مہمان داری کون کرے گا؟ اللہ اس پر رحم کرے؟'' ایک انصاری صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! میں اس کی مہمان داری کروں گا۔'' چنانچہ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے پوچھا: ''کیا تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''نہیں، صرف بچوں کے لیے کھانا پڑا ہے۔'' انصاری صحابی نے کہا: ''انہیں بہلا پھسلا کے سلا دو۔ جب مہمان داخل ہو اور کھانا شروع کرنے لگے تو تم چراغ کو درست کرنے کے بہانے کھڑی ہونا اور اسے گل کر دینا۔ ہم مہمان پر یہ ظاہر کریں گے کہ ہم بھی کھانا کھا رہے ہیں۔'' چنانچہ جب وہ کھانے کے لیے بیٹھے تو انہوں نے ایسے ہی کیا اور مہمان نے کھانا کھا لیا۔ صبح کو جب وہ صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''رات کو مہمان کے ساتھ تمہارے برتاؤ پر اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔'' اُس صحابی کے اس ایثار کے واقعہ کے بارے میں درج ذیل آیت کا نزول ہوا: ﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (الحشر: ۹) ''اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔''(531)

رسول اللہ ﷺ نے اس طرح اپنے صحابہ اور امت کو ایثار کی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے

انہیں بتایا کہ ایمان تسلیم ورضا کا تقاضا کرتا ہے۔ تسلیم ورضا توکل کے متقاضی ہیں اور توکل دنیا وآخرت کی سعادت کا باعث بنتا ہے، لہٰذا اگر تم مؤمن ہو تو لازم ہے کہ تم اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر کے اس پر اعتماد اور بھروسا کرو، جس کے نتیجے میں تمہیں دنیا وآخرت کی سعادت ملے گی۔

و: حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی شجاعت

زمانہ جاہلیت میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کی تعلیمات کو جاننے، قرآن کریم کے مضامین کو سننے اور ان کے لیے اپنے دل کے دریچے کھولنے سے پہلے حضرت خنساء نے اپنے بھائی صحر کی موت پر کہے گئے اشعار کے ذریعے زمانے بھر کو رُلا دیا تھا، لیکن جب انہوں نے قرآن سنا، اسے پہچانا اور ان کے دل میں اس نے جگہ بنالی تو اچانک ان میں تبدیلی آگئی اور یہ انقلاب اس قدر شدید تھا کہ وہ عورت جس نے دورِ جاہلیت میں اپنے بھائی کی موت پر دسیوں اشعار کہے تھے اس نے جنگِ قادسیہ میں یکے بعد دیگرے اپنے چار بیٹوں کی شہادت کو غیر معمولی صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ انہیں الہام کے ذریعے ہر بیٹے کی شہادت کا علم ہو جاتا اور تکلیف سے بل پیچ کھاتیں، لیکن انہوں نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کیے رکھا اور سارے بیٹوں کی شہادت کے بعد فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ان کی شہادت کا شرف بخشا۔ مجھے اپنے پروردگار سے امید ہے کہ وہ ہم سب کو اپنی جوارِ رحمت میں جمع کرے گا۔''(532)

نبی کریم ﷺ نے کتنی بڑی تبدیلی لائی تھی۔ یہ تاریکی سے روشنی نکالنے کے مترادف ہے۔ میں ایک بار پھر پوچھتا ہوں کہ اتنی مختصر مدت میں لوگوں میں اتنی عظیم تبدیلی برپا کرنا اگر معجزہ نہیں تو پھر معجزہ کیا ہے؟

ز: مہاجر سوار

فتح مکہ کے بعد عکرمہ فرار ہو گئے تھے۔ ان کی بیوی نے بڑی مشکل سے انہیں واپس آنے پر قائل کیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے، لیکن جب وہ واپس آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے اور ان الفاظ کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا: "مرحباً بالراکب المهاجر!" (533) 'مہاجر سوار کو خوش آمدید' اس استقبال نے ان کا دل جیت لیا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے راہِ خدا میں جہاد کرنے کا عہد کیا۔ جب وہ جنگِ یرموک میں زخمی حالت میں شہادت کے منتظر تھے، اس وقت انہیں اپنے اکلوتے بیٹے عامر کی شہادت کی خبر ملی۔ کون جانتا ہے کہ اس وقت حضرت عکرمہ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک ظاہر ہوا ہو اور انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کی ہو: ''کیا میں نے آپ سے جہاد کرنے کا عہد نہیں کیا تھا؟ کیا مہاجر سوار نے اپنا عہد پورا نہیں کر دیا؟

ابوجہل کا وہ بیٹا جس نے ساری زندگی رسول اللہ ﷺ کی دشمنی اور آپ کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے کی کوشش میں صرف کی کیسے مہاجر ہو سکتا ہے؟ (534) کیا برائی کے عنوان کو بھلائی کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے؟ تاہم عملاً ایسا ہوا ہے۔

دورِ جاہلیت میں جو شخص مالدار اور طاقتور ہوتا وہ کمزوروں پر ظلم و ستم ڈھاتا، لیکن کمزوروں خاص طور پر عورتوں کا کوئی حامی و ناصر نہ ہوتا۔ عورتوں کو تو جینے کا حق بھی حاصل نہ تھا۔ بچوں کو بلاسبب قتل کر دیا جاتا۔ اس دور میں بعض قوانین اور رسم و رواج تھے، لیکن وہ سب کمزوروں کے خلاف استعمال ہوتے اور آج تک ہو رہے ہیں۔ ایسے پس ماندہ، درندہ صفت اور حق و انصاف سے محروم معاشرے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی نسل تیار کی جو انصاف سے محروم معاشرے میں انصاف کے اعلیٰ ترین معیاروں پر پوری اترتی تھی۔

ح: حق پر قائم رہنے والا

حضرت عمر بن خطاب وہ عظیم خلیفہ تھے، جن کی خلافت یمن سے بخارا کے قریب واقع دریائے آمو تک پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمر اور ابی بن کعب کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو گیا۔ حضرت عمر نے ابی بن کعب سے فرمایا: ''اپنے اور میرے درمیان کسی شخص کو ثالث بنا لو۔'' چنانچہ انہوں نے حضرت زید بن ثابت کو ثالث بنایا اور ان کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت عمر نے ان سے کہا: ''ہم آپ کے پاس اپنا فیصلہ کرانے کے لیے آئے ہیں۔'' حالانکہ خود حضرت عمر کے گھر میں فیصلے ہوتے تھے۔ جب دونوں حضرات زید بن ثابت کے کمرے میں داخل ہوئے تو حضرت زید نے بستر کے اگلے حصے کو حضرت عمر کے لیے خالی کر کے انہیں اس پر بیٹھنے کی دعوت دی، لیکن حضرت عمر نے ان سے فرمایا: ''تم نے اپنے فیصلے میں یہ پہلے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں اپنے فریقِ مخالف کے ساتھ بیٹھوں گا۔''(535)

ط: واقعہ ماعز اور ضمیر کی نگرانی کا نظام

واقعہ ماعز کا ایک حصہ قارئین کے پیش خدمت ہے۔ یہ واقعہ ضمیر کی نگرانی کی حیرت انگیز مثال ہے:

ماعز بن مالک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا ناس ہو! لوٹ جا اور توبہ واستغفار کر۔'' چنانچہ وہ تھوڑی دور لوٹ کر گئے اور پھر آ کر کہنے لگے: ''یا رسول اللہ ﷺ! مجھے پاک کیجئے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا ناس ہو! لوٹ جا اور توبہ واستغفار کر۔'' چنانچہ وہ تھوڑی دور لوٹ کر گئے اور پھر آ کر عرض کی: ''یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے۔'' نبی کریم ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ جب چوتھی بار انہوں نے وہی بات دہرائی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''میں تمہیں کس چیز سے پاک کروں۔'' انہوں نے جواب دیا: ''زنا سے۔'' رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا: ''کیا یہ پاگل ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ وہ پاگل نہیں پھر آپ نے پوچھا: ''کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟'' ایک آدمی نے کھڑے ہو کر انہیں سونگھا، لیکن اسے ان سے شراب کی بو نہ آئی پھر آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''کیا تم نے زنا کیا ہے؟'' انہوں نے اثبات میں جواب دیا، چنانچہ آپ ﷺ کے حکم پر انہیں رجم کیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق جب انہیں پتھر لگے تو وہ گھومے اور شور مچایا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا؟''

دو تین دن اسی طرح گزر گئے ایک دن صحابہ کرام بیٹھے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور فرمایا: ''ماعز بن مالک کے لیے دعائے مغفرت کرو۔'' چنانچہ صحابہ نے ماعز بن مالک کے لیے دعائے مغفرت کی پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے ایک پوری امت پر تقسیم کیا جاتا تو اسے کافی ہو جاتی۔''

اس کے بعد قبیلہ ازد کی ذیلی شاخ غامد (536) سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا ناس ہو! لوٹ جا اور توبہ واستغفار کر۔'' اس پر اس نے کہا: ''کیا آپ مجھے بھی ماعز بن مالک کی طرح لوٹانا چاہتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' اس نے بتایا کہ وہ زنا کے نتیجے میں حاملہ ہے۔ آپ ﷺ نے تصدیق چاہی: ''کیا تم؟'' اس نے کہا: ''ہاں۔'' اس پر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''وضع حمل تک ٹھہر جا۔'' ایک انصاری صحابی نے وضع حمل تک اسے اپنی کفالت میں لے لیا۔ وضع

حمل کے بعد وہ صحابی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور غامدیہ کے وضع حمل کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم اسے ایسی حالت میں رجم نہیں کریں گے کہ اس کے چھوٹے سے بیٹے کی کوئی پرورش کرنے والا ہی نہ ہو۔'' اس پر ایک انصاری صحابی نے کھڑے ہو کر کہا: ''اے اللہ کے نبی! اس کی پرورش میں اپنے ذمے لیتا ہوں، چنانچہ آپ ﷺ نے اسے رجم کرنے کا حکم دے دیا۔

رجم کے دوران اس کے خون کے چھینٹے حضرت خالد بن ولید کے چہرے پر پڑے جس پر انہوں نے اسے گالی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے گالی کے الفاظ سنے تو ارشاد فرمایا: خالد! ٹھہر جاؤ! اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو اس کی بھی بخشش ہو جاتی۔'' پھر آپ ﷺ کے حکم پر صحابہ کرام نے اس کی نماز جنازہ پڑھ کر اسے دفن کر دیا۔[537]

اس کی توبہ کو یہ مقام اس لیے حاصل ہوا کہ اس نے ایک گناہ ایسے خفیہ طریقے سے کیا تھا کہ کسی کو اس کا علم نہ ہوا، لیکن اس نے یہ پسند نہ کیا کہ اس کا حساب وکتاب اس کے ذمے باقی رہے، جسے قیامت کے دن ادا کرنا پڑے، بلکہ اس نے گناہ کے اعتراف کے نتائج سے واقف ہونے کے باوجود اس کا اعتراف کیا اور جب تک اس پر حد جاری نہ ہوئی اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ اور معاشرے کے خلاف کیے گئے جرم کے ارتکاب پر شرمسار اور اپنے ضمیر کی ملامت کا نشانہ بنی رہی۔ اگرچہ اس سے لغزش ہو گئی تھی، لیکن اس نے دین میں اپنی نجات کا راستہ تلاش کر لیا۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاقی نظام کے تمام اصولوں کا ذکر ممکن نہیں، کیونکہ ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ ہم یہاں صرف چند ایک کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں۔ اگر ان تمام اخلاقی اصولوں کو ذکر کرنا ہمارے لیے ممکن ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کی مافوق الفطرت کامیابیوں کو زیادہ بہتر طریقے سے جانا جا سکتا۔ اُس دور کا انسان اِن اخلاقی اصولوں سے متضاد صفات سے متصف تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ ان اخلاقی برائیوں کا خاتمہ کیا، بلکہ ان کی جگہ تمام اخلاق حمیدہ کو پروان چڑھایا۔

رسول اللہ ﷺ نے تربیت کے میدان میں بھی معجزہ کر دکھایا۔ آپ ﷺ نے انسانی تربیت کے گہرائی اور گیرائی کے حامل چند ایسے اصول وقواعد وضع فرمائے جو ہر دور اور زمانے میں ساری انسانیت کے کام آتے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں اگر ہم ان اصولوں میں پنہاں گہرے افکار کا فہم وادراک کر لیں تو ہمیں ایسا مقام حاصل ہوگا جس پر فرشتے بھی رشک کریں گے، لیکن جیسا کہ حمیدہ قطب نے لکھا ہے ہم ابھی تک راستے میں ہیں۔

ایک دفعہ حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے حیرت واستعجاب سے پوچھا: ''اے پروردگار! کتنے ہی لوگوں کو میں دیکھتا ہوں کہ وہ ہدایت پا کر آپ کے راستے پر چلنے لگتے ہیں، لیکن پھر نہ جانے کیوں راستہ بدل کر دوسری جہات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: ''اے موسی! یہ لوگ میری طرف متوجہ ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے مجھے پایا تھا۔ وہ آدھے راستے میں تھے اور وہیں سے انہوں نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔'' (اللہ تعالیٰ ہمیں راستے میں پھسلنے اور گمراہ ہونے سے محفوظ رکھے)

اس بات کی کوئی ضمانت نہیں۔ کوئی بھی راہِ سلوک طے کرتے ہوئے منحرف نہ ہونے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، اس لیے ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں گمراہی وانحراف سے محفوظ رکھے اور ہمیں پلک جھپکنے کی مقدار بھی نفس کے حوالے نہ کرے، نیز اس عظیم امت کو جس کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی مثال ملتی ہے، اقوام عالم میں اس کے شایاں مقام عطا فرمائے۔

جب اس امت کو اس کا تاریخی اور مناسب مقام حاصل ہوگا تو ہمیں اسلامی اور قرآنی اخلاق کی تبلیغ کے زیادہ بہتر، اعلیٰ اور باعث اطمینان مواقع میسر آئیں گے۔ اس وقت انسانیت دیکھے گی کہ اسے جن ''مثالی شہروں'' کی تلاش تھی ان کی تکمیل وتشکیل تو مدتوں پہلے ہو چکی ہے۔ اس انکشاف پر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ ''جمہوریت افلاطون'' میں ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے افلاطون فلاسفہ کے امورِ سلطنت چلانے کا تذکرہ کرتا ہے... اسے رہنے دو، کیونکہ ایک دور میں امورِ سلطنت ایسے عمدہ طریقے سے چلائے جا چکے ہیں کہ وہاں تک فلاسفہ کے وہم وگمان کی بھی رسائی نہیں۔ ابتدائے اسلام کا زمانہ اور دولت عثمانیہ کا دور کتنا شاندار تھا۔ اگر فرشتے آسمان پر کوئی ریاست تشکیل دیتے تو وہ بھی اسی معیار تک پہنچ پاتے۔

جب تک ہم اس معیار کے مطابق اسلام کو پیش نہیں کریں گے اس وقت تک اقوام عالم اپنے کان بند رکھیں گی اور ہماری بات ہرگز نہ سنیں گی۔ اگرچہ چند افراد قرآنِ کریم کی ذاتی قوت وتاثیر کے باعث اسلام قبول کر سکتے ہیں، لیکن یہ اقوام اجتماعی طور پر اسلام کی طرف اسی وقت متوجہ ہوں گی جب امت مسلمہ اقوام عالم کے درمیان اپنے شایاں مقام حاصل کر کے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرے گی۔

ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے پھر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جاہلانہ عادات میں ٹھوڑی تک دھنسے ہوئے جاہل معاشرے میں زندگی کے تمام شعبوں پر محیط حیران کن انقلاب برپا کیا۔

انسانی تاریخ میں بہت سی عبقری شخصیات گزری ہیں، جن میں سے کچھ کو زندگی اور معاشرے کے بعض شعبوں میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی، مثلاً بعض اوقات معاشرتی علوم میں کسی ایسی عبقری شخصیت کا ظہور ہوتا ہے، جو اپنے پیروکاروں کو اس میدان میں ایک خاص بلندی تک لے جاتی ہے، لیکن معیشت، تربیت اور علم نفسیات کے میدان میں اس کی کسی قسم کی خدمات نہیں ہوتیں اور روحانیات کے شعبے میں تو بالکل ہی ناکام رہتی ہے اور کسی قسم کی خدمات پیش نہیں کرسکتی، اسی طرح بعض اوقات علم معاشیات کے میدان میں کسی عبقری انسان کا ظہور ہوتا ہے، جو ملک کی معاشی سطح کو ایک خاص حد تک بلند کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، لیکن تربیت، نفس کے محاسبہ ومراقبہ اور دیگر معاشرتی شعبوں میں ملک کی کوئی خدمت نہیں کرسکتا۔ کوئی بھی انسان زندگی کے تمام شعبوں میں کمال کی حدود کو نہیں چھوسکتا۔ یہ صرف حضرت محمد ﷺ کا ہی امتیاز ہے کہ آپ ﷺ نے زندگی کے تمام شعبوں، اکائیوں اور پہلوؤں پر توجہ دے کر نہ صرف انہیں کمال تک پہنچایا، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی بقا کی بھی ضمانت دی۔ آپ ﷺ معیشت، معاشرت، فنونِ حرب، محاسبۂ نفس، دنیا و آخرت کے درمیان توازن قائم کرنے، معاملات کی تہہ تک پہنچنے اور ماوراء الوجود کا ادراک کرنے غرض ہر چیز میں کمال کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ آپ ﷺ کے نظام تربیت میں کسی انسانی صلاحیت کی اہمیت کو کم کیا گیا اور نہ ہی کسی معاملے میں غفلت برتی گئی، بلکہ آپ ﷺ نے ہر ذریعہ اختیار کرکے انسانی صلاحیتوں کو جلابخشی اور اس کے سامنے ترقی اور کمال کے راستے کھولے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی مدد اور فضل سے رسول اللہ ﷺ نے ہر میدان اور شعبے میں اعلیٰ ترین انسانی مثالیں پیش کیں۔

پانچویں فصل: رسول اللہ ﷺ کے تیار کردہ روحانی ماحول میں تربیت پانے والی عبقری شخصیات

رسول اللہ ﷺ مستقبل کا ایسے ہی ادراک رکھتے تھے جیسا کہ حال کا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اسے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح پہچانتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت تھی۔ صلح حدیبیہ کے واقعے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایسے نئے نئے قوانین جاری فرماتے جن کی افادیت صدیاں بیتنے کے باوجود قرار رہتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی افادیت کے نئے نئے پہلوؤں کا ظہور ہوتا رہتا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور کے لوگوں تک اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ دینی اصول پہنچائے اور انہیں ان کی تعلیم دی پھر ان حضرات نے وہ اصول ہم تک پہنچائے، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو جائے۔ قرآن کریم ہمیں صاحب فضل لوگوں کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے حق میں درج ذیل دعا کرنے کی تعلیم دیتا ہے: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا﴾ (الحشر: ١٠) ”اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔“ ہم اپنے تمام اسلاف خاص طور پر صحابہ کرام کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور جب ہم کسی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو درحقیقت ہم ان کے احسانات کا اعتراف کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے بے مثال کامیابیوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سی حکومتیں قائم کیں۔ ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

”محمد ﷺ بجا طور پر عظیم انسان تھے، کیونکہ وہ بہت سی تہذیبوں کے بانی تھے اور ان کے وضع کردہ اصولوں، نظاموں اور دستوروں کی بنیاد پر سو کے قریب ریاستیں قائم کی جا چکی ہیں۔ آپ نے کامیاب ترین اور باصلاحیت سپہ سالاروں کی قیادت میں اپنی فوجیں اطراف عالم میں بھیجیں۔ وہ سپہ سالار صرف فاتح ہی نہ تھے، بلکہ وہ اپنے ساتھ علم کی مشعلیں بھی لے گئے اور دنیا کے کونے کونے کو علم وعرفان کی روشنی سے منور کر دیا۔“

بغداد اور وسط ایشیاء میں عبادت گاہوں، جامعات، ہسپتالوں اور جامع مسجدوں کی صورت میں ہمارے آثار مٹانے کی دشمن کی ہزار کوششوں کے باوجود موجود ہیں۔ اندلس کے آثار قدیمہ سائنس و آرٹ کے ماہرین کے لیے آج بھی باعث حیرت بنے ہوئے ہیں۔ اس کی ثقافت، آرٹ، اخلاق، عمومی انسانی اقدار کے احترام اور پانچ سو سال سے زائد بے وفا زمانے میں بتدریج کم ہونے والے آثار کو دیکھ آج بھی عقل دنگ ہے۔ ان دلفریب آثار کے بارے میں ماہرین فنون لطیفہ، ماہرین تعمیرات اور علم جمالیات میں اختصاص رکھنے والے حضرات کے توصیفی کلمات کے بارے میں کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

آپ ﷺ کے بعد آپ کے نظام کی بنیاد پر جہاں ہزاروں تعلیم گاہیں قائم ہوئیں، جن میں ہزاروں اصحاب علم اور ماہرین فن تیار ہوئے، وہیں سینکڑوں ریاستیں بھی وجود میں آئیں، جن میں سے چند ایک امویوں، عباسیوں، سلجوقیوں، قرۃ خانیین اور عثمانیوں کی ریاستیں ہیں۔ اس بارے میں عیسائیت کو اسلام کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں، کیونکہ عیسائیت کبھی بھی کنیسہ کی حدود سے باہر نہیں نکل سکی۔ اس میں امور سلطنت یا تو تھیوکریسی یعنی احبار و رہبان کے اجتہادات کے مطابق چلائے جاتے رہے یا پھر انسان کے وضع کردہ دنیوی نظام اور مادی فلسفے کے تحت، لیکن محمدی پیغام رسالت اور دین کا معاملہ اس سے مختلف تھا، کیونکہ اس کی بنیاد کتاب وسنت کے وسیع و عمیق اور ایسے حیات افروز اصولوں پر رکھی گئی تھی، جو اجتہاد کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے ہمیشہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہتے ہیں۔ زمانے کے بدلنے کی وجہ سے بعض اوقات اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن اس کی اصل روح اور مشمولات باقی رہتے ہیں۔ جونہی اس دنیا میں ایک تہذیب یا ریاست کا سورج غروب ہوتا ہے، ایک اور تہذیب اور ریاست کا ظہور ہو جاتا ہے۔ سینکڑوں ریاستوں نے اپنی روح، فلسفہ اور بقا کی معنویت رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے اخذ کی۔ رسول اللہ ﷺ نے وحی ربانی کی حمایت یافتہ اپنی گہری بصیرت کی مدد سے ریاست کے بنیادی اصول وضع فرمائے، انہیں ان کے صحیح مقام پر استعمال فرمایا اور امورِ سلطنت کو سنبھالنے والے قائدین اور اہل علم وفن تیار فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں بہت سے سپہ سالاروں اور اصحابِ سلطنت کی تربیت فرمائی، جن میں خالد بن ولید، عقبہ بن نافع اور احنف بن قیس سے لے کر طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم جیسے سپہ سالار شامل تھے۔ اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے، گویا آپ ﷺ کی ساری عمر صرف جنگوں میں ہی گزری ہوگی۔ عباس محمود عقاد جیسی دورِ حاضر کی بہت سی شخصیات کی رائے میں نبوی دور عظیم انسانی قابلیتوں اور عبقری صلاحیتوں کی نشوونما کا دور تھا۔

محمدی درسگاہ وہ واحد درسگاہ تھی، جس نے انسانی کمالات اور صلاحیتوں کو اعلیٰ ترین مقام

تک پہنچایا۔ جس نے بھی اس درسگاہ کا رُخ کیا اسے اپنی قلبی، روحانی، عقلی اور دیگر تمام صلاحیتوں کو ممکن ترین حد تک ترقی دینے میں کامیابی ہوئی۔

خلفائے راشدین جنگ، علم اور امور سلطنت کا نظام چلانے میں عبقریت کے حامل تھے۔ خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ، علاء حضرمی اور قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم اور ان جیسے سینکڑوں اور حضرات جنگ و حرب میں عبقری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ عباقرہ کا دور تھا، بلکہ زیادہ درست الفاظ میں ایسا دور تھا، جس میں انسانی کمالات اور صلاحیتوں میں ذرہ برابر بھی غفلت نہیں برتی گئی تھی، بلکہ ان کی صحیح نشوونما کر کے سینکڑوں کی تعداد میں عباقرہ پیدا کیے گئے تھے۔

اگر عقبہ بن نافع جنہوں نے مختصر سے عرصے میں سارے کے سارے افریقہ کو فتح کر ڈالا عبقری شخصیت نہ تھے تو پھر کون ہوگا؟ عقبہ پندرہ سال کی عمر میں شہسوار بنے اور مختلف خلفاء کے دور میں کئی اہم مہمات سر کرتے ہوئے بحر اٹلانٹک تک جا پہنچے، جسے بحر ظلمات بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے اس کے پانی میں اپنے گھوڑے کو داخل کر کے درج ذیل مشہور فقرہ کہا تھا: ''اے پروردگار! اگر یہ سمندر نہ ہوتا تو میں تیری راہ میں جہاد کرتے ہوئے ملک فتح کرتا جاتا۔''(538)

اسی درسگاہ سے طارق بن زیاد نکلے، جو ایک بربر غلام تھے۔ انہوں نے اپنے بارہ ہزار نفوس پر مشتمل لشکر کے ذریعے نوے ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان سپاہیوں پر مشتمل ہسپانوی لشکر کو شکست دی اور مختصر سی مدت میں طلیطلہ (Toledo) کے شاہی محل تک جا پہنچے۔(539)

طارق بن زیاد ایک عبقری سپہ سالار اور عظیم شہسوار تھا۔ یہی بات عظیم شہسوار علاء حضرمی پر بھی صادق آتی ہے حتی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں کہا جاتا تھا کہ علاء حضرمی کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ انہیں بحرین میں جنگ چھیڑنے سے روکنے کے لیے حکم نامہ جاری کرنا پڑا۔ ان کی زندگی میں عبرت کا بڑا سامان ہے۔ مؤرخین کی رائے میں اگر کسی جنگ میں حضرت خالد بن ولید کو حضرت علاؤالدین کی جگہ اور حضرت علاؤالدین کو حضرت خالد بن ولید کی جگہ متعین کر دیا جاتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ ایک ہی دور میں اتنی عظیم اور عبقری شخصیات کا کیسے ظہور ہوا؟ رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوعبیدہ بن جراح، شرحبیل بن حسنہ، یزید بن ابی سفیان جیسی عبقری شخصیات کا ایک پورا سلسلہ ہے۔ اگر یہ شخصیات نہ ہوتیں تو صحراؤں کو عبور کر کے چین کی سرحدوں اور جبل طارق تک

پہنچنا، پچیس سال سے بھی کم عرصے میں اتنے بڑے علاقے کو فتح کر کے وہاں عمدہ نظم و نسق کے ساتھ امن و سکون کی فضا قائم کرنا اور تمام دنیا اور مذاہب کی معاندانہ کوششوں کے باوجود اس نظام کو بارہ صدیوں تک کامیابی کے ساتھ قائم رکھنا ممکن نہ ہوتا۔

وحی کے سرچشموں سے فیض یاب ہونے والی ان شخصیات نے نبوی نظام کی پیروی کرتے ہوئے صدیوں تک دنیا پر حکمرانی کی، دوسرے لفظوں میں ان عبقری شخصیت میں سے ہر ایک نے آفتاب رسالت محمد ﷺ سے روشنی حاصل کر کے بین الاقوامی سطح پر بڑی بڑی مہمات سرانجام دیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے لیے ایسے دور کا تصور بھی کرنا ممکن ہے۔ میں نے یہاں مشاہدہ کے بجائے تصور کی تعبیر قصداً اختیار کی ہے۔ اوپر ذکر کردہ شخصیات اور ان کے کارناموں میں سے ہر ایک اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر مستقل تحقیق کی جائے۔ ہم نے یہاں اسلام کی تیار کردہ عسکری اور انتظامی اعتبار سے چند عبقری شخصیات کا صرف سرسری تذکرہ کیا ہے، باقی ان کے مکمل تعارف کے لیے تو متعدد کتابیں درکار ہیں۔ اس کے لیے یہ مختصر فصل بالکل ناکافی ہے۔ ہم نے اس موضوع پر رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ضمناً گفتگو کی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اہل اختصاص اٹھیں اور ان موضوعات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں، تاکہ محمدی درسگاہ کے تمام پہلو نکھر کر سامنے آئیں اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیں۔

الف: علمی میدان میں محمدی درسگاہ کی عبقری شخصیات

جس طرح اس درسگاہ کے دروازے حرب وسیاست کے عباقرہ کے لیے کھلے تھے، اسی طرح اس کے دروازے علم کے پیاسوں کے لیے بھی وا تھے، چنانچہ بہت سے علماء، مفکرین، مقننین، مجتہدین اور مجددین نے اس درسگاہ میں تربیت پائی۔ خلفائے راشدین کے زمانے سے لے کر آئندہ تین صدیوں تک تیار ہونے والے تمام اہل علم کے ناموں کی صرف فہرست پیش کرنا بھی ہمارے لیے یہاں ممکن نہیں، تاہم ہم یہاں بطور نمونے کے صرف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تذکرے پر اکتفا کریں گے، جو پہلے مکہ میں بکریاں چراتے تھے، لیکن بعد میں ان کی بدولت کوفہ علم کا مرکز بن گیا اور ان کی درسگاہ میں اسود بن یزید، علقمہ بن قیس نخعی، ابراہیم نخعی، حماد بن ابی سلیمان اور ابوحنیفہ جیسی فقہ، حدیث اور علم کلام کی عظیم علمی شخصیات تیار ہوئیں۔ وہ سب ان کے فضل وشرف کا اعتراف کرتے تھے۔ اگر ہم اس اہم حقیقت کو بھلا بھی دیں تب بھی تاریخ اسے محفوظ رکھے گی اور مخالفین کی ناپسندیدگی کے باوجود تاریخ کے اوراق میں یہ بات لکھی جاتی رہے گی۔

۱- علم فقہ

یہاں ہم ان عظیم اہل علم میں سے چند ایک کی مثالیں پیش کریں گے۔ جن کا ذکر ہم یہاں نہیں کر سکتے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

ابوحنیفہ کون تھے؟ وہ عظیم عالم اور ہمارے فقہی مکتب فکر کے بانی تھے۔ انہوں نے اس ابتدائی دور میں درس وتعلیم کے حلقوں میں اپنے گرد ذہین وفطین لوگوں کو جمع کر لیا تھا، جب علم وثقافت کی ترویج حلقہ درس میں تقریر واملا کے ذریعے ہوتی تھی۔ آپ کے ایک طالب علم ابویوسف چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ کے دیگر مایہ ناز شاگردوں میں محمد بن حسن شیبانی اور امام زفر شامل ہیں۔ امام وکیع نے بھی آپ کے سامنے زانوائے تلمذ طے کیے، جن سے بعد میں امام شافعی نے علم حاصل کیا۔ حاصل یہ کہ آپ استاذ الاساتذہ تھے۔ آپ کی بات کو ہر زمانے میں سند کی حیثیت حاصل رہی۔ آپ نے آئندہ آنے والی نسلوں سے خطاب کیا اور کروڑوں مسلمانوں کے امام رہے۔ آپ نے اپنے ابتدائی تلامذہ خصوصاً امام محمد کو جو علوم لکھوائے، شمس الائمہ امام سرخسی نے تیس جلدوں پر مشتمل اپنی مشہور کتاب ''المبسوط'' میں ان کی تشریح وتوضیح کی۔ (540) درحقیقت امام سرخسی نے یہ کتاب ایسی حالت میں املا کروائی تھی جب وہ ایک کنویں میں قید تھے اور ان کے شاگرد اس کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی مروی ہے کہ امام سرخسی کے ایک شاگرد نے ایک دن ان سے کہا کہ امام شافعی کوحدیث کے تین سوصحیفے زبانی یاد تھے۔اس پرامام سرخسی نے انتہائی عاجزی سے فرمایا: ''اگر یہ بات ہے تب توانہیں میری یادداشت میں محفوظ احادیث کی صرف زکوٰۃ کی بقدر احادیث یاد تھیں۔'' (541)

امام مالک،امام شافعی اور امام احمد بن حنبل بھی انتہائی بلندمرتبہ،علمی اورعبقری شخصیات تھیں۔ہم ایک بار پھر پوچھتے ہیں: ''ابوحنیفہ کون تھے؟'' کیا وہ ابن مسعود جیسے کسی صحابی رسول اللہﷺ کے شاگرد تھے؟یاعلقمہ جیسے کسی تابعی کے شاگرد تھے؟نہیں،ہرگزنہیں،بلکہ وہ توان کے شاگردحماد بن ابی سلیمان کے شاگرد تھے۔یقیناً حماد بھی بہت بڑے فقیہ تھے،لیکن وہ رسول اللہﷺ کے شاگرد کے شاگرد تھے۔

جب ساری دنیاانتہائی مایوسی کی حالت میں جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اس وقت عالم انسانیت کومنورکرنے والے یہ نابغہ روزگار علمائے کرام رسول اللہﷺ کی درسگاہ میں تیار ہورہے تھے۔اپنے علم وعرفان کی روشنی سے زمانے بھرکومنورکرنے والے یہ عظیم علمائے کرام اپنی کثرت کے باوجود قدرومنزلت کے بلندترین مقام پر فائز تھے۔ان کی قدرومنزلت ان کی کمیابی کے باعث نہ تھی، کیونکہ امام ابوحنیفہ کے دورمیں کوفہ میں ان کے پائے کے تقریباً پچاس کبارعلمائے کرام کا نام لیا جاسکتاہے،نیزاس مظہرکی کوئی جغرافیائی یازمانی توجیہ بھی نہیں کی جاسکتی،بلکہ یہ سراسررسول اللہﷺ کی قائم کردہ درسگاہ کے نورانی فیوض وبرکات کانتیجہ تھا کہ آپﷺ کی بدولت ایک اجڈمعاشرے سے علمائے کرام کی ایک ایسی جماعت پیداہوئی،جس نے چودہ صدیوں تک اطراف عالم میں روشنی پھیلائی اوران شاءاللہ قیامت تک پھیلاتی رہے گی۔

۲۔ علم تفسیر

علم تفسیر ہمارے اعتبار سے ایک بحرِ بے کراں ہے،لیکن رسول اللہﷺ کے علم کے سمندر کے سامنے ایک قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ قطرہ رسول اللہﷺ کے سمندرجیسے علم کی عکاسی وغمازی کرتاہے۔اس کا آغاز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوتاہے اورپھرابن عباس رضی اللہ عنہ،مجاہد،سعید بن جبیر،ابن جریر،فخرالدین رازی اورابن کثیرکے ہاں سے گزرتاہواہمارے دورکے مشاہیرمفسرین تک پہنچتا ہے۔یہ ایسی عظیم عبقری شخصیات کاایک مربوط نورانی سلسلہ ہے،جن کامحض رسول اللہﷺ کی طرف انتساب ہی آپﷺ کی نبوت اورآپ کے نبیوں اورانسانیت کے سردارہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ابن جریرعبقریت وذہانت کانشان تھے۔ان کی تفسیر کامطالعہ کرنے سے پتاچلتاہے کہ وہ زمانے

کی حدود سے بالاتر ہو کر آیات واحادیث کی تشریح وتوضیح کرتے تھے۔ انہوں نے ان آیات مبارکہ کی وضاحت کی جو زمین وآسمان اور ان کے یک جان ہونے اور پھر پھٹنے کا ذکر کرتی ہیں، نیز وہ ہواؤں کے چلنے اور بارش کے برسنے کے بنیادی اصولوں کو بھی زیرِ بحث لائے ہیں، گویا انہوں نے ایسے موضوعات پر بھی گفتگو کی ہے، جنہیں ایک ہزار برس کے بعد ہی صحیح طور پر سمجھا گیا ہے۔ ان کی تالیفات کے بارے میں کی جانے والی علمی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں پندرہ صفحات یومیہ لکھتے تھے، لہٰذا اگر ابن جریر عبقری شخصیت نہ ہوں گے تو پھر کون ہوگا؟

اگر تفسیر کے میدان میں ہم ابن جریر سے فخر الدین رازی کی طرف اور ان سے امام سیوطی کی طرف آئیں، جنہوں نے سینکڑوں تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد ضخیم کتابیں تالیف کیں اور پھر ان سے دورِ حاضر کے کبار علمائے کرام کی طرف آئیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ تفسیر کے میدان میں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے اور انہوں نے اس میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی یورپ میں ظہور ہوتا تو وہ اس کے مجسمے نصب کرتے اور اس کے ذریعے زمانے بھر میں فخر کرتے۔

۳- علم حدیث

علم حدیث کے اکابرین کو بھی ممتاز اور بلند مقام حاصل ہے۔ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد بن حنبل، دارقطنی، بیہقی اور دارمی میں سے ہر ایک کے تذکرے اور ان کے علمی مقام کے تجزیے کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہ ہمارے ہدف سے خارج ہے، تاہم ہم یہاں یہ بات کہنے پر اکتفا کریں گے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث زبانی یاد کرنے کے بعد ان میں سے صرف چار ہزار غیر مکرر احادیث اپنی صحیح بخاری میں ذکر کی ہیں۔ وہ حدیث قبول کرنے میں انتہائی احتیاط اور دقت کا مظاہرہ کرتے اور ہر حدیث کو لکھنے سے پہلے وضو کر کے دو رکعات نماز ادا کرتے تھے۔[(542)] اتنا عظیم امام محض رسول اللہ ﷺ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد تھا۔ ایک مرتبہ وہ کئی روز کے پُرمشقت اور جاں گسل سفر کے بعد ایک شخص کے پاس ایک حدیث لینے کے لیے پہنچے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ شخص اپنے گھوڑے کو بلانے کے لیے اپنی خالی جھولی پھیلا کر اس پر یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں جو ہیں تو وہ اس سے گفتگو کیے اور اس سے وہ حدیث لیے بغیر لوٹ آئے، جس کی خاطر انہوں نے اتنا طویل سفر کیا تھا اور جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا: ''جو شخص اپنے گھوڑے کو دھوکا دینا چاہتا ہے وہ مجھے بھی دھوکا دے سکتا ہے۔'' کون جانتا ہے کہ کتنے علمائے حدیث نے احادیث کی جمع وتدوین کے دوران اس قدر باریکی وحرص کا اہتمام کیا ہوگا۔

۴- وضعی علوم

قدیم و جدید علوم کی تاریخ پر لکھی گئی متعدد جانبدارانہ اور غیر جانبدارانہ کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان ہمارے عظیم ماضی پر فخر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسلمانوں نے اپنے سنہری دور میں طب، ریاضی، ہندسہ اور دیگر تمام طبعی علوم میں اتنی کتابیں لکھیں کہ وہ بجا طور پر تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ ان علوم کے ماہرین میں علم جبر کے بانی جابر، ابن سینا، خوارزمی اور علم جراحت کے ماہر زہراوی شامل تھے، جن کی علم جراحت پر لکھی گئی کتابیں کئی صدیوں تک مغرب میں پڑھائی جاتی رہی ہیں یہاں تک کہ ایک علمی رسالے نے ان کا تذکرہ ''ہزار برس تک زندہ رہنے والا عالم'' کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں نہیں، ہزاروں علماء رسول اللہ ﷺ کی درسگاہ کے تیار کردہ تھے۔

کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ دور حاضر میں مسلمانوں کی اکثریت ایسے علماء کے حالات سے واقف کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان ہستیوں کے نظر نہ آنے کی وجہ ہماری حس کی خرابی ہے۔ مغرب میں ان ہستیوں کا نظروں سے اوجھل ہونا ممکن نہیں، کیونکہ وہاں ان کی حیثیت میدانی علاقے میں واقع ایسے ٹیلوں کی مانند ہے، جن کے زیادہ بلند نہ ہونے کے باوجود، ان سے نظر چوک نہیں سکتی، جبکہ ہمارے ہاں ان کی حیثیت ایسی مسلسل اور ایک جیسی چوٹیوں کی سی ہے، جن کی بلندی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور یہی ان سے ناواقفیت کا باعث ہے، دوسرے لفظوں میں وہ قریب قریب واقع ایسی چوٹیوں کی مانند ہیں ، جن کے درمیان وادیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بلندی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ہم وفا کی خوبی سے بھی ناآشنا ہو گئے ہیں، جس کی وجہ سے ہم ان آثار کی قدر و منزلت نہ پہچان سکے، لیکن مغرب ان سے استفادہ کر کے اپنے ہاں نشاۃ ثانیہ کا آغاز کرنے میں کامیاب ہو گیا، لہٰذا خرابی اصولوں میں نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں میں ہے، جو ماضی کے دست نگر بن کر زندگی گزارتے رہے، لیکن سمندر میں ہونے کے باوجود اس کی قدر و منزلت کا اندازہ نہ کر سکے۔

ب: روحانی دنیا کے ہیرو

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا ایک پہلو ولایت ہے۔ ولایت کے سلسلے میں آپ ﷺ نے بہت سے حضرات کی تربیت کی اور ان کے سامنے انسانی کمال کے اس مقام تک پہنچنے کا راستہ کھول دیا، جہاں پہنچ کر ان میں سے ایک شخصیت نے یہاں تک فرمایا دیا تھا: ''اگر میرے سامنے سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوگا۔''(543) بعض کو عالم غیب کے بعض حالات نظر آنے لگے اور بعض حضرات نے ساری زندگی قرآن وسنت کے اسرار ورموز کی تحقیق میں گزار دی۔ جلجلوتیہ، نہج البلاغۃ، مثنوی، فتوح الغیب، فصوص اور فتوحات اسی قسم کی کتابیں ہیں۔

ایڈیسن (Edison) نے احسان شناسی کی کسی کیفیت میں کہا تھا: ''میں نے بجلی کی دریافت کا طریقہ محی الدین بن عربی کی فتوحاتِ مکیہ سے سیکھا ہے۔''

اسرار ورموز کا شاہکار فتوحاتِ مکیہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن کریم کی پُراسرار تعبیرات سے بجلی، الیکٹرانز اور بجلی کے بلب کی دریافت کی صحت کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن جن آیات کی تفسیر واضح ہوچکی ہوان کے بارے میں اختلاف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انسان بہت سے بھیدوں سے ولایت یا سائنسی تجربہ گاہوں کے ذریعے پردہ اٹھا سکتا ہے۔ اگر ہم ماضی وحال میں اس میں ناکام رہے ہیں تو اس کا سبب منطقی اندازِ فکر سے محرومی، کم ہمتی اور عزم وارادے کی کمزوری کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ ابن عربی، مولانا جلال الدین رومی، امام ربانی اور بدیع الزمان سعید نورسی جیسی ہستیوں کو سمجھنا جن کی نظر اپنے زمانے سے بہت آگے تھی، کوئی آسان کام نہیں، بلکہ ان کے انکشافات کو سمجھنا بھی سہل نہیں۔ شیخ نقشبندی، معروف کرخی، شاذلی، شیخ عبدالقادرؒ جیلانی اور شیخ حرانی کو کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ تو رسول اللہ ﷺ کی درسگاہ کے شاگرد تھے، جو شمع رسالت کے گرد پروانوں کی طرح چکر لگاتے رہے۔ وہ اس روشنی کے عاشق تھے، جس کی بدولت ان کی آنکھیں عالم غیب کا مشاہدہ کر لیتیں۔ امام سیوطی کہتے ہیں کہ انہوں نے حالت بیداری میں کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی ہے۔(544) ان کی آنکھوں کی یہ بینائی رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی بدولت تھی اور ان کا روشنی کی طرف لپکنا رسول اللہ ﷺ کی کشش کا نتیجہ تھا۔

ہم مکان کے تین بعدوں اور زمان کے اضافی بعد کے اسیر بنے ہوئے ہیں، لیکن وہ زمان ومکان کے ابعاد کو عبور کر کے ایک ایسے بعد میں داخل ہو چکے تھے، جس سے ہم ناآشنا ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کے

شاگرد تھے اور مستقبل میں بھی ایسے شاگرد پیدا ہوتے رہیں گے۔ ولایت میرا میدان نہیں۔ میں تو اولیائے کرام کے قدموں کی خاک ہوں، تاہم مجھے ان سے محبت ضرور ہے۔ ان شاءاللہ جب بہت سے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھیں گے تو وہ حقائق کو دیکھ کر میری بات کی تصدیق کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ اتنے عظیم مرشد تھے کہ ان کے شاگرد روحانیت اور تربیت نفوس کے میدان میں ماضی وحال کے تمام مدعیانِ دعوت وارشاد پر سبقت لے گئے۔ اگر معاملات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہے تو وہ ابھی سے کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل ہمارا ہے۔ محی الدین بن عربی نے مغرب کو اس قدر مسحور کیا ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں جرمن افراد کو ان تعلیمات کی برکت سے ایمان کی روشنی نصیب ہوئی، جنہیں ابن عربی اور ان جیسی دیگر شخصیات نے پھیلایا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی، جلال الدین رومی، امام ربانی اور بدیع الزمان سعید نورسی اپنے مرشد واستاذ حضرت محمد ﷺ سے حاصل کردہ مقدس قوت کے ذریعے ہی لوگوں کے دلوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیرتے تھے۔

مولانا جلال الدین رومی بہت بلند پایہ انسان تھے، اگرچہ بعض لوگوں نے ان کے بارے میں غلو سے بھی کام لیا ہے، تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ ان عظیم ہستیوں میں سے تھے، جن کے دل غیر متناہی جہان کے لیے وا تھے اور ان کی فکر عالم ملکوت میں محو پرواز رہتی تھی۔ وہ عشق الٰہی کے نمائندہ اور اخلاص وللٰہیت کے نمونہ تھے۔ وہ حقیقت مطلقہ تک پہنچانے والے راستوں کے سب سے بڑے دریافت کنندہ اور امثال وقصص کے ذریعے ان کی نشاندہی کرنے والے عظیم ترین راہنما تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فن خطابت کے شہسوار تھے اور اپنی تقریر کے جادو سے دلوں کو مسحور کر لیتے تھے۔

ج: خطباء

رسول اللہ ﷺ فصحائے عرب و عجم کے سردار تھے۔ ہمارے اس دعوے پر ہزاروں شہادتیں موجود ہیں، چنانچہ حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ سے لے کر کعب بن زہیر بن ابی سلمٰی تک، لبید سے لے کر خنساء بنت زہیرۃ تک اور پھر اموی، عباسی اور سلجوقی دور کے تمام اہل فصاحت و بلاغت رسول اللہ ﷺ کو بلاغت کے اونچے ترین مقام پر فائز سمجھتے اور اپنے کلام کو آپ ﷺ کی فصیح اور جامع گفتگو سے مزین کرتے رہے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں آپ ﷺ کے بارے میں ادب واحترام کا اظہار کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتتے۔

ایرانی شعراء کے ہاں یہ بات واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ حیدر بامّا د جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) کا درج ذیل مقولہ نقل کرتے ہیں: ''اسلامی تاریخ خصوصاً عباسیوں، سلجوقیوں اور ایرانیوں کے دورِ حکومت میں ایران میں بڑے بڑے شعراء کا ظہور ہوا ہے، لیکن عالم اسلام نے ان میں سے صرف چار پانچ شعراء کا انتخاب کیا ہے۔''

گوئٹے (Goethe) جس نے اپنے ''Faust'' نامی ڈرامے کے ذریعے جرمن ادب کو ایک نئے دور میں داخل کیا تھا مزید لکھتا ہے: ''اس ملک میں بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے ہیں، لیکن عالم اسلام نے ان میں سے صرف پانچ رومی، حافظ، فردوسی، انوری اور نظامی کو اہمیت دی ہے اور دیگر شعراء کو نظرانداز کردیا ہے، حالانکہ ان میں ایسے ایسے ادباء گزرے ہیں کہ میں ان کے سامنے زانوائے تلمذ طے کرنے کا خواہش مند ہوں۔

آپ حیرت زدہ نہ ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ آپ کو ان حضرات کا بھی علم ہونا چاہیے، جنہیں ہم تعریف کے پل باندھ کر غبارے کی طرح پھلا دیتے ہیں اور ان حضرات کا بھی علم ہونا چاہیے، جنہیں ہم نے نظرانداز کررکھا ہے۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہونی چاہیے کہ یورپ کا کوئی شاعر ایسا نہ ہوگا جو حافظ شیرازی کی تقلید نہ کرتا ہو۔ عثمانی ادب بھی حافظ کی روح اور جہان سے بہت متاثر ہے۔ یہ تمام شعراء خواہ ایرانی ہوں، عربی ہوں یا ترکی، رسول اللہ ﷺ کی درسگاہ کے شاگرد ہیں، کیونکہ انہوں نے اس درسگاہ میں سیکھے ہوئے معانی کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے اور بھی بہت سے پہلوؤں کو میں یہاں اجاگر کرنا چاہتا تھا، لیکن طوالت کے خوف سے میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔

تیسرا حصہ

مشکلات کا حل پیش کرنے میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ثانی نہ تھا
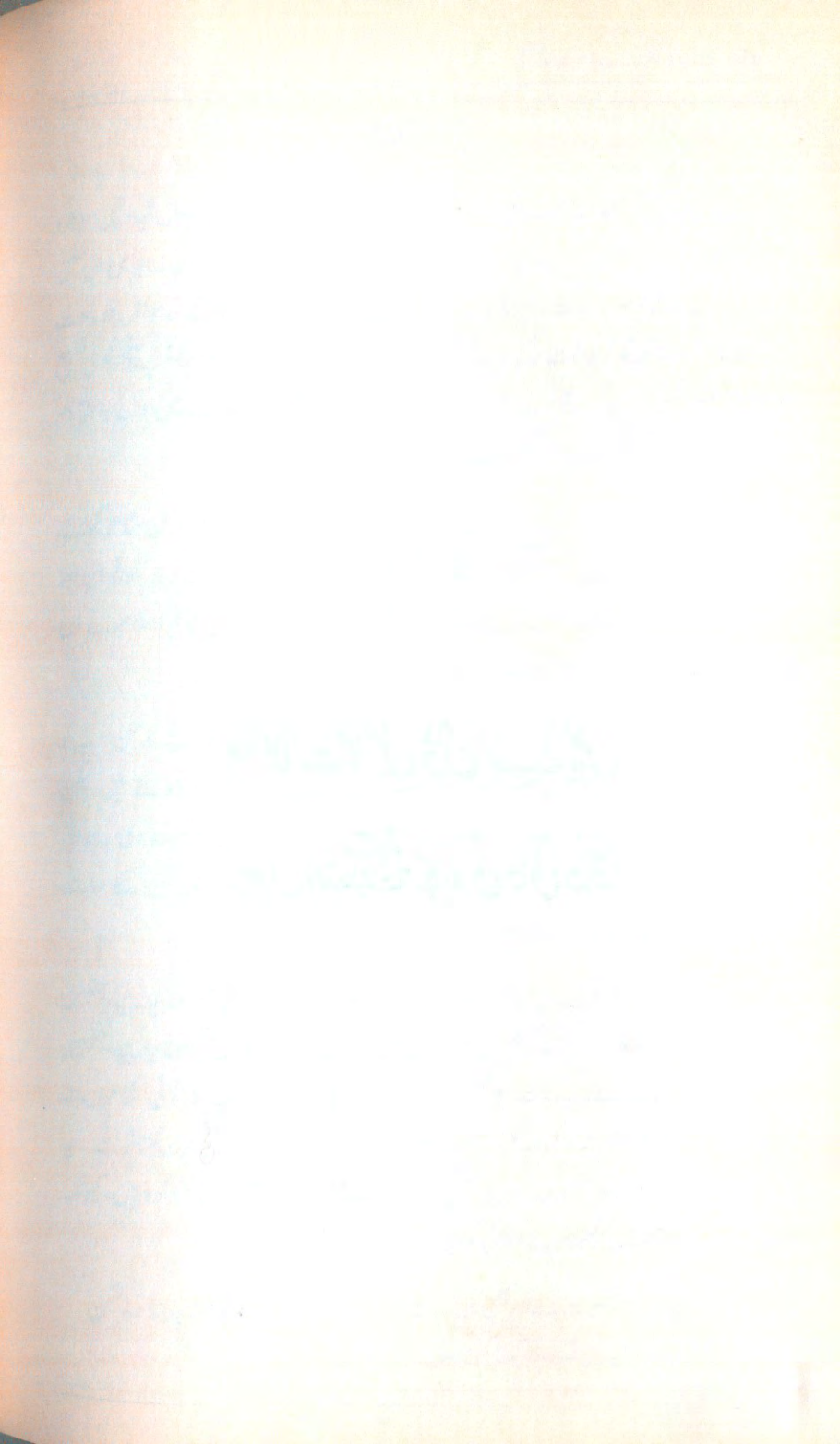
تمہید

رسول اللہ ﷺ کی فراست کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ آپ ہر قسم کی مشکلات کا حل اتنی آسانی سے تلاش کر لیتے تھے جیسے کوئی مکھن سے بال نکال لے۔ یہ آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کی دلیل ہے۔ذیل میں ہم بعض ان اہم اوصاف کا تذکرہ کریں گے، جن کا ہر کامیاب منتظم اور راہنما میں پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

۱- قائد کا پیغام اس کی عملی زندگی سے متصادم نہ ہو۔ وہ اپنی دعوت پر سختی سے کاربند ہو اور اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کی دعوت حال و مستقبل کے لیے مناسب ہے۔ جس طرح کوئی بھی انسان اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے واقعے کو پورے وثوق اور تفصیل سے بیان کر سکتا ہے اور اسے اپنی شہادت کے جھٹلائے جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا، کیونکہ اسے اپنی ذات پر اعتماد اور اپنی بات پر اطمینان ہوتا ہے، اسی طرح قائد اور راہنما کو اپنے پیغام کی صحت اور حقانیت پر اتنا ہی اعتماد و یقین ہونا چاہیے، نیز صرف اعتماد کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا پیغام اس کی زندگی سے متصادم نہ ہو، یعنی اس کی زندگی کی گاڑی اس کے مطابق چلتی ہو۔

۲- راہنما پر لازم ہے کہ وہ اپنی کوششوں کو افراد سازی پر مرکوز کرے، ہمیشہ انسانیت کو مقدم رکھے اور تعلیم و تربیت کو اپنے ہاں اہم مقام دے۔

۳- راہنما کو اپنی جماعت کے تمام افراد سے بخوبی واقف ہونا چاہیے اور لوگوں کو کوئی ذمہ داری سونپنے سے پہلے ان کے کام کرنے کی صلاحیت سے آگاہ ہونا چاہیے اور ایسے انداز سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہیے کہ اس کے لائحہ عمل سے معاشرے کے افراد کو کوئی مشکل پیش آئے اور نہ ہی متحرک و سرگرم افراد کو دقت ہو۔

۴- راہنما کو اپنے پیروکاروں کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ مشکلات انفرادی بھی ہو سکتی ہیں اور خاندانی بھی، انتظامی بھی ہو سکتی ہیں اور قانونی بھی، معاشی بھی ہو سکتی ہیں اور معاشرتی بھی۔ غرض راہنما میں ہر قسم کی مشکلات کو حل کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔

۵- قائد کی تعلیمات و ہدایات قابل عمل ہونی چاہئیں۔ کامیاب راہنما ہمیشہ ناقابل عمل خیالی

تعلیمات اور تجاویز سے اجتناب کرتا ہے۔ قائد کو زمانہ حال کے واقعات و موضوعات کو ماضی کی روشنی میں سمجھنا چاہیے اور زمانہ حال میں مستقبل کے بارے میں اندازہ لگا کر اپنے منصوبوں کو دور اندیشی کے ساتھ عملی جامہ پہنانا چاہیے، تاکہ حال کے منصوبوں پر مستقبل میں کام کرنے میں رکاوٹ پیش نہ آئے، ورنہ اس کے حال و مستقبل کے منصوبوں میں تصادم پیدا ہو جائے گا اور ایک کے نتائج دوسرے کے خلاف نکلیں گے۔ اس لیے حقیقی راہنما کے لیے ضروری ہے کہ وہ موجودہ دور میں پیش آنے والے معاشرتی واقعات کی مستقبل میں پیش آنے والی صورتوں سے واقف ہو، تاکہ مستقبل کی کوئی ناگہانی صورتِ حال اس کے کاموں اور منصوبوں پر پانی نہ پھیر دے۔

قائد کے حقیقی اور غیر خیالی اصولوں کو فرسودہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ان کی تروتازگی اور فعالیت ہمیشہ برقرار رہنی چاہیے، تاکہ کسی بھی دور کا انسان انہیں اپنائے تو وہ ان میں اپنی مشکلات کا حل ایسے ہی پائے جیسے وہ آبِ حیات نوشِ جاں کر رہا ہو۔ ایسے اصول زمانے کے لیے ناقابل شکست ہوتے ہیں، زمانے کے بدلنے سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، بلکہ ہر گزرتے دن ان کی قوت و فعالیت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ قائد اپنی تعلیمات و تجاویز کو سب سے بہتر انداز میں عملی جامہ پہیناتا ہے۔ وہ ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ان کی رعایت کرتا ہے۔

جب ہم کامیاب قیادت کے لیے شرائط کی حیثیت رکھنے والے مذکورہ بالا اصول و مبادی کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تاریخ جس میں انبیائے کرام بھی شامل ہیں کے سب سے بڑے راہنما محمد ﷺ تھے۔ آپ ﷺ اتنے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ کسی بھی انسان کے لیے کامیاب قیادت کے تمام اصول و مبادی کو عملی جامہ پہنانے کی اس حد تک پہنچنا ممکن نہیں۔

اگرچہ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے، تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ مغرب کو کمپیوٹر اور الیکٹرانک آلات کے استعمال سے اس حقیقت کا ادراک ہونے لگا ہے۔ بہت سے لوگوں کے لئے انتہائی غیر متوقع طور پر پیش آنے والے اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے ایسے امتیازی اوصاف کو جمع کیا، جن کی بدولت بہت سے لوگ صاحب عظمت کہلائے اور پھر ان معلومات کو ان اعظیم شخصیات کی عظمت کے لحاظ سے درجہ بندی کرنے کے لیے کمپیوٹر میں منتقل کیا۔ جب ایک طویل اور پُر مشقت عمل کے بعد یہ کام مکمل ہوا تو اسکرین پر رسول اللہ ﷺ کا اسم گرامی ظاہر ہوا۔ اس سے ان لوگوں پر بھی واضح ہو گیا کہ سب سے بڑے قائد و راہنما اور سب سے عظیم ہستی رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے۔[545] آئندہ صفحات میں ہم اوپر ذکر کردہ اوصاف پر مثالوں کے ذریعے روشنی ڈالیں گے۔

پہلی فصل: قائد اور پیغامِ زندگی

رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کے لیے بہت سے اصول پیش فرمائے، جن میں سے کوئی بھی اصول زندگی سے متصادم یا متعارض نہیں پھر رسول اللہ ﷺ نے انہیں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی صحت کے بارے میں آپ ﷺ کو ذرا بھی شک وشبہ یا تردد نہ تھا۔

آپ ﷺ نے اپنی احادیث مبارکہ میں عرش سے فرش، جنت سے جہنم اور پہلے انسان سے لے کر قیامت تک تقریباً ہر موضوع پر عموماً اور اپنی امت کو پیش آنے والے حالات وواقعات پر خصوصاً اتنی تفصیلی گفتگو فرمائی ہے کہ بعض اوقات اعداد وشمار اور اسماء کا تذکرہ بھی فرمایا دیا حتی کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ یہ سب کچھ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر دیکھ کر بغیر کسی تشویش کے بتا رہے ہیں۔ آپ ﷺ کو اپنی ہر بات پر یقین تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سامنے کتابِ مبین اور امام مبین کو کھول کر رکھ دیا تھا اور آپ کو تقدیر کے صحیفوں میں سے بہت سے امور دکھا دیئے تھے، جہاں سے دیکھ کر آپ ﷺ ان کی وضاحت فرما دیتے تھے، لہٰذا اتنی عظیم ہستی کے لائے ہوئے اصول ومبادی بجا طور پر ابدی نوعیت کے ہوں گے۔ سلطان الشعراء نجیب فاضل نے کیا خوب کہا ہے:

مستقبل ہمارا ہے اور یقیناً ہمارا ہے۔
سورج طلوع ہو یا غروب، دوام ہمارا ہے۔

شاعر کے ان الفاظ سے اپنے عقیدے اور اصولوں پر اعتماد جھلکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی روشنی میں ان پر غور وفکر کرنے سے ان کی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ آفتاب طلوع وغروب ہوتا رہے گا، دن سالوں میں اور سال صدیوں میں ڈھلتے رہیں گے، لیکن رسولِ خدا محمد ﷺ کا لایا ہوا پیغام پائندہ وتابندہ رہے گا۔

الف: آپ ﷺ کی شخصیت: پرعزم و پُراعتماد

ابن اسحاق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قریش رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے ابوطالب کے پاس آئے۔ ابوطالب نے نبی اکرم ﷺ کو بلا کر ان سے کہا: "یہ تمہاری قوم کے شرفا جمع ہوئے ہیں تا کہ کچھ تمہاری بات مانیں اور کچھ اپنے مطالبات منوائیں۔" رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذات پر اعتماد اور اپنے مقصد کا علم تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میں ان سے صرف ایک بات کہلوانا چاہتا ہوں، جس کی بدولت ان کی عرب و عجم پر حکمرانی قائم ہو جائے گی۔" یہ سن کر وہ لوگ خوش ہو کر کہنے لگے: "ہماری جانیں آپ پر قربان! بھلا بتایئے وہ کیا بات ہے؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لا الہ الا اللہ کہہ دو عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے۔"(546) اور بعد میں عملاً ایسا ہی ہوا۔

کتنی ہی سلطنتیں اور قومیں اسلام کے سائے میں آنے کے لیے لپکیں۔ ہماری ترک قوم بھی زیادہ وقت ضائع کیے بغیر گیارہ صدیاں قبل آغاز میں ہی مشرف بہ اسلام ہوگئی تھی۔ ذرا غور فرمایئے کہ ایک ہزار خیموں پر مشتمل قوم بغیر جبر و اکراہ کے صرف ایک سال کے عرصے میں اسلام لے آئی۔ اسی پرخلوص قبولِ اسلام کا نتیجہ تھا کہ یہ قوم بارہ صدیوں تک سارے عالم میں اسلام کے پرچم کی سربلندی و حفاظت میں مشغول رہی۔ اس قوم میں اسلام کے ایسے ہی علمبردار پیدا ہوئے جیسے نبی کریم ﷺ کے دور میں حمزہ، مصعب، زبیر اور ابن جحش جیسے ابتدائی علمبردار پیدا ہوئے تھے۔ یہ لوگ صدیوں تک اس پرچم کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے کوہ ہمالہ کے دامنوں سے آئے۔ (ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شریف الاصل قوم کی ایمان اور قرآن کے دفاع کی راہ میں حفاظت فرمائے۔)

رسول اللہ ﷺ کسی بات پر سمجھوتہ کیے اور کسی بات سے دستبردار ہوئے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے پروردگار کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ آپ ﷺ کو اپنے حال و مستقبل پر تمہارے مطیع ہو جائیں گے اور بیت اللہ الحرام امن کا گہوارہ اور لوگوں کا مرکز بن جائے گا۔" مناسب وقت پر آپ ﷺ کی تمام پیش گوئیاں پوری ہوئیں، چنانچہ ہر سال لاکھوں انسان ایسے ہی بیت اللہ الحرام کا طواف کرتے ہیں جیسے پروانے نور کے ہالے کی طرف کھچے چلے آتے ہیں، لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی اس وقت آپ ﷺ کی بات کی تائید میں کوئی ہلکا سا اشارہ یا قرینہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو اعتماد میں لینے کے لئے قائد و راہنما کا خود پراعتماد ہونا ضروری ہے۔

حاکم نے مستدرک میں عدی بن حاتم کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جسے میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، لیکن میں یہاں اس کا دوبارہ تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ عدی حاتم طائی کے بیٹے تھے، جس کی جود و سخا کا عرب کی تاریخ میں شہرہ تھا۔ عدی بن حاتم اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جب ان کی نبی اکرم ﷺ سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ متذبذب سے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''شاید تمہیں قبولِ اسلام سے یہ چیز مانع ہے کہ تم میرے اردگرد غریب لوگوں کا جھرمٹ دیکھتے ہو اور دیکھتے ہو کہ لوگ ہمارے خلاف متحد ہیں۔'' پھر آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم نے حیرہ شہر دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کی: ''دیکھا تو نہیں ہے، لیکن مجھے اس کے محل وقوع کا علم ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب ایک پردہ نشین عورت بغیر کسی ہم سفر کے حیرہ سے چلے گی اور بیت اللہ کا طواف کرے گی نیز کسریٰ کے خزانے ہمارے لیے کھل جائیں گے۔'' میں نے عرض کی: ''کیا آپ کی مراد کسریٰ بن ہرمز سے ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، کسریٰ بن ہرمز ہی مراد ہے اور عنقریب آدمی کو اپنے مال کی زکوٰۃ دینے کے لیے فقیر نہیں ملے گا۔'' چنانچہ میں نے پردہ نشین خاتون کو سفر کرتے ہوئے دیکھا ہے اور میں بقسم کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے سچے فرمان کے نتیجے میں کسریٰ کے خزانے بھی ضرور فتح ہوں گے۔ (547)

رسول اللہ ﷺ اس قدر اعتماد کے ساتھ اپنے صحابہ اور اپنے اردگرد موجود لوگوں سے گفتگو فرماتے تھے اور کسی کے دل میں آپ ﷺ کے ارشادات کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور وقت آنے پر زمانہ بھی آپ ﷺ کے ارشادات کی تائید کرتا تھا۔

ب: مالداروں کا امتیازی برتاؤ کا مطالبہ

سب سے پہلے غریب طبقے نے رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہا، جن کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی، جبکہ قریش کے مالدار مشرکوں کے ذہن کفر کے تکلیف دہ سانچے میں پختہ ہو چکے تھے، لیکن جب آیت مبارکہ ﴿رَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾ (النصر: ۲) ''اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔'' کا راز کھلا تو انہیں دین خدا میں داخل ہونے کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا، لیکن ابتدا میں آپ ﷺ کا ساتھ غریب نوجوانوں نے ہی دیا۔

مکہ کے شرفا، مالدار اور سردار اس صورت حال پر خوش نہ تھے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر اپنے لیے ایک دن مخصوص کرنے کا مطالبہ کرتے، جس میں کوئی اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر نہ ہو۔ انہیں بلال، عمار، یاسر اور خباب جیسے فقراء کا اپنی موجودگی میں حاضر ہونا ناپسند تھا۔ بھلا شرفائے قوم غریب اور بازاری لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔(548) چونکہ وہ اس معاشرے میں اس قسم کے برتاؤ اور سلوک کے عادی تھے، اس لیے ان کی نظر میں ان کا یہ مطالبہ بالکل درست اور بجا تھا، لیکن حقیقت ایسے نہ تھی جیسا کہ وہ خیال کر رہے تھے۔ اگرچہ انہیں رسول اللہ ﷺ سے اپنے مطالبے کو بخوشی منظور کر لینے کی توقع تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو درج ذیل آیت مبارکہ میں تنبیہ فرمادی: ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الأنعام: ۵۲) ''اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں (اور) اس کی ذات کے طالب ہیں ان کو (اپنے پاس سے) مت نکالو۔ ان کے حساب (اعمال) کی جوابدہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جوابدہی ان پر کچھ نہیں (پس ایسا نہ کرنا) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔''

یعنی آپ نے تو بڑے بڑے کام اور مہمات سرانجام دینی ہیں، اس لیے آپ اپنے آپ کو مالداروں کی ہدایت کی خاطر غریب اہل ایمان کو دھتکارنے جیسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں مت الجھائیں۔ یہ ظلم ہے، جس سے آپ کوسوں دور رہتے ہیں۔ بلاشبہ مالداروں کو خوش کرنے کے لیے فقراء کو دھتکارنا ناانصافی کی بات تھی، جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ انصاف پسند نبی کو ابتدا سے ہی محفوظ رکھا۔

اللہ تعالیٰ اسی موضوع کو سورہ کہف میں دہراتے ہیں: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا﴾ (الکہف:۲۸) ''اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، ان کے ساتھ صبر کرتے رہو اور تمہاری نگاہیں ان سے (گزر کر اور طرف) نہ دوڑیں کہ تم آرائش زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہنا نہ ماننا۔''

گویا قرآن کریم آپ ﷺ سے کہہ رہا ہے: ''ہمیشہ اپنے پروردگار کو پکارنے اور یاد کرنے والے لوگوں کے ساتھ رہیے اور ان سے اپنی نگاہیں مت پھیریئے، کیونکہ ایسے لوگوں کو رحمت خداوندی کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ عمار، یاسر، بلال، علی، خباب اور ابن مسعود جیسے حضرات کے صدقے اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں پر رحم فرماتے ہیں۔ یہ لوگ رحمت الٰہیہ کی نظروں کا مرکز ہیں اور ان کے صدقے اللہ تعالیٰ مصیبتوں کو ٹال دیتے ہیں، گویا یہ لوگ مصائب کو روکنے کا ذریعہ ہیں۔'' قرآن کریم نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب رسول اللہ ﷺ کے گرد صرف چار یا پانچ فقراء تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ مستقبل کے بارے میں پرامید اور پراعتماد تھے اور آپ کو یقین تھا کہ عنقریب یہ سرکش و نافرمان لوگ اطاعت اختیار کر کے اسلام قبول کر لیں گے اور قرآن کریم کو اپنے سینوں سے لگائیں گے پھر بھلا رسول اللہ ﷺ ایسے لوگوں کی خاطر اپنے گرد جمع غریب اہل ایمان کو کیوں دھتکارتے؟ رسول اللہ ﷺ سے ان لوگوں کو دور کرنا کیسے ممکن تھا، جبکہ خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''تین افراد علی، عمار اور سلمان کے لئے تو جنت بھی مشتاق ہے۔''(549)

سبحان اللہ! سارے لوگ جنت کے مشتاق ہیں، لیکن جنت خود ان حضرات کی مشتاق ہے۔ جنت انہیں ایسے ہی چاہتی ہے، جیسے عاشق معشوق کو، آنکھ حسن کو، وجدان دیدار کو اور دل مشاہدے کو چاہتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ میرے گرد موجود جماعت اس پائے کی ہے کہ میں اس کے ذریعے سارے جہان پر حکومت قائم کر کے ایک عظیم انقلاب برپا کر سکتا ہوں، چنانچہ آپ ﷺ اپنے اس علم کے مطابق طرز عمل اختیار فرماتے اور آپ کو اس بارے میں لمحہ بھر کے لیے تردد نہ تھا کہ مشرق و مغرب میرے لائے ہوئے اصولوں اور حقائق کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ چونکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر پورا یقین اور اطمینان تھا، اس لیے آپ ﷺ نے مشرکین کے مطالبے کو ناقابل التفات سمجھتے ہوئے رد فرما دیا اور ان فقراء کو اپنی محبت و شفقت کے دامن میں سمیٹے رکھا۔

دوسری فصل: قائد اور انسانی پہلو

رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں کبھی بھی انسانی پہلو کو نظر انداز نہیں فرمایا حتیٰ کہ جب آپ ﷺ صحابہ کرام کو محاذِ جنگ پر بھیجتے تو اس وقت بھی اعلیٰ انسانی معیارات کی پاسداری فرماتے اور آپ ﷺ سے ایسا طرزِ عمل ہی ممکن تھا، کیونکہ قرآن کریم آپ ﷺ سے کہتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ (التوبة:۱۲۲) ''اور یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے۔''

جب اہل ایمان جہاد میں مصروف ہوں اس وقت بھی دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے ایک گروہ کا پیچھے رہنا ضروری ہے تاکہ وہ دینی تعلیمات کی نشر و اشاعت کرسکیں حتیٰ کہ جہاد کے فرضِ عین ہونے کی صورت میں بھی علم و ثقافت کے مراکز کے دروازے مکمل طور پر کھلے رہنے چاہئیں، کیونکہ دشمن کے مسلمانوں کا ہر طرف سے گھیراؤ کر لینے کی صورت میں اگر علم و ثقافت کے تمام ادارے بند کر دیئے گئے تو مادی طور پر دشمن پر فتح حاصل کر لینے کے باوجود علم و ثقافت کے میدان میں مسلمانوں کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ایسے ناخوشگوار حالات میں بھی لوگوں کی ایک جماعت کو علم و ثقافت کی تحصیل کے لیے پیچھے رہنے اور محاذِ جنگ پر نہ جانے کی تاکید کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مشکل ترین حالات میں بھی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور محاذِ جنگ پر نہ جانے والے حضرات نے اپنے آپ کو علم و ثقافت کی تحصیل میں مصروف رکھا۔ یہ بات ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ دعوتِ اسلام کے ابتدائی دور میں پڑھے لکھے لوگوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا، لیکن دعوتِ اسلام کے آغاز کے صرف بیس سال بعد کوئی بھی ایسا آدمی نہ تھا، جو لکھنے پڑھنے سے ناآشنا ہو۔ یہ سب رسول اللہ ﷺ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

آپ ﷺ نے کبھی بھی انسانی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ فردکی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو کیسے پروان چڑھانا ہے اور امت کی کیسے درست اور صحیح تربیت کرنی ہے۔ آپ ﷺ نے خود بھی تعلیم کو رواج دیا اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے نظری اشیاء کو عملی صورت بخشی اور ایک معلم کی حیثیت سے شاگردوں کی تربیت کی، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے ایک خوابیدہ و پژمردہ قوم سے علم و ایمان سے مزین معاشرہ تشکیل دیا۔

پہلے معمار اور بانی کے بعد معاشرہ اپنے افراد میں سے خود بھی اچھے منتظمین تیار کر سکتا ہے، تاہم اسے پہلے کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

علم وفکر اور ٹیکنالوجی میں مصروف معاشرے کا انتظام معاشرے کے چند نمائندہ افراد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یہ نمائندگان معاشرے کی کریم ہوتے ہیں۔ اگر عمل، ثقافت اور ٹیکنالوجی کا سلسلہ جاری رہے تو معاشرے کی یہ کریم مسلسل تیار ہوتی رہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ درج ذیل مختصر مگر جامع جملے میں اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں: ''کما تکونوا یولی علیکم۔'' ''جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسے ہی تمہارے حکمران ہوں گے۔''(550)

بہت سے قرآنی آیات مبارکہ انسانی پہلو کا لحاظ کرتی اور اس کا اہتمام کرنے کی دعوت وترغیب دیتی ہیں۔ اس قسم کے تمام آیات مبارکہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام انسان کا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ چونکہ ہم اس موضوع کی گہرائی اور تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، اس لیے اس بارے میں سادہ سا خاکہ پیش کرنے کے لیے صرف دو ایک آیتوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔ وہ آیات حسب ذیل ہیں: ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران: ١٠٤) ''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے، جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔'' ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (آل عمران: ١١٠) ''(مؤمنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہ اور اس قسم کی دیگر آیات انسان اور علم پر زور دینے کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسلام نے انسانی دل، روح، احساسات، جذبات اور فکر کو بڑے متوازن انداز میں زیر بحث لا کر انہیں انسانی تخلیق کے ہدف کی سمت پر ڈالا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس بارے میں بے توجہی اور بے اعتدالی کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ تمام احساسات وجذبات کو وجود کے پردوں سے ماوراء دیکھنے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری حیات طیبہ میں اس بارے میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ کسی بھی مرشد کے لیے یہ بات انتہائی اہم ہے۔

کتنے ہی مرشد حضرات انسانی پہلوؤں اور دستیاب صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھاسکنے کی وجہ سے ناکامی سے دوچار ہوئے اور کامیابی کی دہلیز پر پہنچ کر بھی لغزش سے محفوظ نہ رہ سکے۔ جو لوگ نوجوانوں کے مظاہروں سے شاہراہوں کو بھر دیتے ہیں وہ صرف ان کے جذبات کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے اور ان سے کھیلتے ہیں، حالانکہ دوام و تسلسل کے متقاضی امور میں صرف جذبات پر توجہ دینا مفید ثابت نہیں ہوتا، نیز رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے احساسات وجذبات برانگیختہ کرکے انہیں اپنے پیچھے لگانے کا کبھی نہیں سوچا، کیونکہ جو لوگ کسی ایک جذبے کے تحت جمع ہوتے ہیں وہ کسی دوسرے جذبے کے تحت آدمی کا ساتھ چھوڑ کر اسے تنہا بھی کر سکتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے مشکل اور سنگین ترین حالات میں بھی آپ ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا، بلکہ وہ آپ ﷺ پر اپنی جانیں نچھاور کرتے اور آپ ﷺ کی دعوت کی خاطر موت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔

کسی بھی شہر کی رونقیں وہاں کے انسانوں کے باعث ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی کچھ کرکے دکھایا۔ اطرافِ عالم میں آپ ﷺ کے بھیجے ہوئے افراد نے نہ صرف مدارس اور علم کے مراکز قائم کیے، بلکہ سلطنتوں اور قوموں کا نظام چلانے میں بھی اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں کا لوہا منوایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ اور پیروکاروں کی تربیت میں بھرپور کامیابی حاصل ہوئی تھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انسان پر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ توجہ دی ہے۔

تیسری فصل: قائد اور مناسب مقام پر صلاحیتوں کا استعمال

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ اور پیروکاروں کی صلاحیتوں سے کماحقہ کام لیا اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے مناسب حال کام سونپا۔ آپ ﷺ کا کسی کو کوئی ذمہ داری سونپنا اس بات کی دلیل ہوتا تھا کہ وہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے مناسب ترین فرد ہے۔ آپ ﷺ کے احکامات اس بات کے شاہد عدل ہیں، حتی کہ اگر آپ ﷺ کی نبوت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو آپ ﷺ کا افراد کی صلاحیتوں کا ادراک کرنا، ان میں سے ہر ایک سے صحیح اور مناسب موقع پر کام لینا، ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے ان میں سے ہر ایک کو اس کے مناسب حال کام سونپنا اور اس بارے میں کبھی غلطی کا شکار نہ ہونا یعنی تاحیات انہیں وہ ذمہ داری سونپے رکھنا، سوائے ان چند لوگوں کے جنہیں آپ ﷺ نے تالیف قلب یا ان کی نفسیاتی کیفیت کی رعایت کی بنا پر کوئی ذمہ داری سونپی، رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی مستقل دلیل ہے، جس کے نتیجے میں ہم آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اسلام کے ابتدائی ایام مصائب و آلام اور سخت حالات سے عبارت تھے۔ پانچ چھ سال کے عرصے میں مسلمانوں کی تعداد صرف چالیس تک پہنچی تھی۔ اس دور میں جان خطرے میں ڈالے بغیر دین کے بارے میں گفتگو کرنا ممکن نہ تھا حتی کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ جیسی شخصیت کو کئی بار اتنا مارا گیا کہ آپ پر بے ہوشی طاری ہو جاتی(551) اور حضرت عمر بن خطابؓ جیسے طاقتور اور زبردست انسان جو اونٹ کو بھی پچھاڑ دیتے تھے کو کئی بار مارا اور روندھا گیا۔(552) جب ان حضرات جیسے معروف لوگوں پر اس قدر ظلم و ستم ڈھایا گیا تو باقی لوگوں کا کیا حال ہوگا۔

ایسے تاریک اور مایوس کن ماحول میں رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کے ساتھ مخصوص طرز عمل اختیار فرمایا۔ مثلاً آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم نہیں دیا، کیونکہ یہ لوگ مکہ کی مشکلات کو برداشت کر سکتے تھے نیز حضرت علی اور زبیر کو ان کی کم عمری کی وجہ سے ہجرت حبشہ کے لیے نہیں کہا۔ دوسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جسمانی لحاظ سے کمزور تھے اور ان کے لیے مکہ کا سخت مخالفانہ ماحول برداشت کرنا مشکل تھا، نیز وہ حبشہ میں مسلمانوں کی بہتر نگہداشت کر سکتے تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ ذمہ داری سونپ کر حبشہ کی طرف روانہ فرما دیا۔(553)

ذیل میں اس بارے میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

الف: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوذر غفاریؓ مکہ مکرمہ آئے اور قبول اسلام کا اعلان کیا، لیکن ان جیسے شدید حساس اور جذباتی انسان کے لیے ان حالات میں مکہ میں ٹھہرنا نہ صرف یہ کہ مناسب نہ تھا، بلکہ خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے نقصان کا باعث بھی بن سکتا تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انہیں واپس اپنے قبیلے میں جا کر دعوت کی ذمہ داری سرانجام دینے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''جب تک تمہارے پاس میرا کوئی فرمان نہ پہنچے اس وقت تک اپنی قوم میں جا کر دعوت دو۔'' چنانچہ وہ اپنی قوم میں لوٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے۔(554)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ زاہد و عبادت گزار انسان تھے۔(555) وہ معاشرتی انصاف کے اس قدر حامی تھے کہ معاصر علمائے اجتماع حیرت سے انگشت بدندان ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے میں وہ اشتراکی فکر کے بانی تھے۔ خیر! اشتراکی فکر کو ایک طرف رکھیے اور ان سوالات پر غور فرمایئے: ''غربت کیا ہے؟'' اور ''اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ یہ سولات اٹھانے والے پہلے بہادر انسان تھے۔ وہ ان تین افراد میں سے تھے، جن کے لیے جنت بھی مشتاق رہتی ہے۔(556) لیکن اس سب کچھ کے باوجود جب وہ منصب امارت کے خواہش مند بن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس لوٹا دیا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں خود حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی: ''یارسول اللہ! کیا آپ مجھے عامل نہیں بنائیں گے؟'' یہ سن کر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر مار کر فرمایا: ''اے ابوذر! تم کمزور ہو، جبکہ یہ ایک بڑی امانت ہے، جو قیامت کے دن رسوائی و شرمندگی کا باعث بنے گی سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے اسے کماحقہ ادا کیا اور اس بارے میں اپنی ذمہ داری کو سرانجام دیا۔''(557)

نبی اکرم ﷺ نے جو بات ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمائی تھی وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے نہیں ارشاد فرمائی، بلکہ ان حضرات کے منصب امارت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ سے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑ کر ارشاد فرمایا: ''میرے دو وزیر آسمان والوں میں سے ہیں اور دو وزیر زمین والوں میں سے ہیں۔ آسمان والوں میں سے میرے وزیر جبرائیل اور میکائیل ہیں اور زمین والوں میں سے میرے وزیر ابوبکر اور عمر ہیں۔''(558)

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کو پردہ غیب سے چاروں خلفائے راشدین کی خلافت کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور آپ ﷺ نے اس بارے میں کچھ اشارے بھی دیئے تھے، چنانچہ ایک موقع پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انہیں آنے دو اور انہیں پہنچنے والی آزمائش کے ساتھ جنت کی خوش خبری دو۔''(559) فی الواقع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آخری دور آزمائشوں کا دور تھا۔

رسول اللہ ﷺ اپنی جمعیت کے افراد کو بخوبی جانتے تھے، بلکہ انہیں خود ان سے بھی زیادہ جانتے تھے۔ آپ ﷺ نے کسی فرد کو کوئی ذمہ داری سونپنے میں کبھی غلطی نہیں کی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ وہ منصب امارت کے اہل ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ حضرت ابوذر کو ان سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے انہیں امارت کی ذمہ داری نہیں سونپی اور ان سے ارشاد فرمایا: ''اے ابوذر! تم کمزور ہو اور یہ قیامت کے دن رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہوگی...۔''

اس سلسلے میں ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:

ب: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ

صحیح مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت عمرو بن عبسہ سے مروی ہے کہ میں مکہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا: ''آپ کون ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نبی ہوں۔'' میں نے پوچھا: ''نبی ہونے کا کیا مطلب ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔'' میں نے پھر پوچھا: ''خدا نے آپ کو کیا حکم دیکر بھیجا ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا نے مجھے صلہ رحمی، بت شکنی، توحید خداوندی اور شرک کی ممانعت کے احکام دے کر بھیجا ہے۔'' میں نے پوچھا: ''اس دین پر آپ کے ساتھ اور کون کون ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''آزاد اور غلام۔'' اس وقت آپ ﷺ کے ماننے والوں میں ابوبکر اور بلال شامل تھے، چنانچہ میں نے عرض کی: ''میں بھی آپ کا پیروکار رہوں۔''

یہ واقعہ مکی دور میں پیش آیا جب رسول اللہ ﷺ کو اپنی قوت بڑھانے کے لئے اپنی حمایت میں کھڑے ہونے والے ہر شخص کی شدید ضرورت تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ بھی معلوم تھا کہ کس سے کیا اور کہاں کام لینا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے حضرت عمرو بن عبسہ سے بھی وہی بات ارشاد فرمائی جو آپ نے حضرت ابوذر غفاری سے فرمائی تھی کہ چونکہ تم مکہ میں ٹھہر کر ظلم واستبداد کا مقابلہ نہ کرسکو گے، اس لیے تم اپنی قوم کی طرف لوٹ جاؤ، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فی الحال تم یہ مشکلات برداشت نہیں کر سکتے۔ کیا تم میرا اور میرے ساتھیوں کا حال نہیں دیکھ رہے؟ لہٰذا تم اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ جاؤ اور جب تمہیں میری فتح کی خبر ملے تو میرے پاس چلے آنا۔''

چنانچہ ایسے ہی ہوا اور حضرت عمرو اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے۔ اس واقعے پر کئی برس بیت گئے۔ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو مسلسل فتوحات حاصل ہونے لگیں۔ ان کی خبریں حضرت عمرو کو بھی پہنچیں تو وہ مدینے روانہ ہوئے اور مسجد نبوی میں آئے جہاں نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ واقعے کا بقیہ حصہ خود حضرت عمرو کی زبانی سنیے: ''میں مدینے پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''یارسول اللہ! کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! کیا تم وہی شخص نہیں، جو مکہ میں میرے پاس آئے تھے؟'' (560)

حضرت عمرو نبی کریم ﷺ کی یاداشت کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے، کیونکہ حضرت عمرو کا مکہ میں پیش آنے والے اس واقعے کو یاد رکھنا کوئی اہم بات نہ تھی، کیونکہ ان کے لئے اپنی زندگی کے اس اہم ترین

واقعے کو فراموش کرنا ممکن نہ تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کا معاملہ اس سے مختلف تھا، کیونکہ مصائب و آلام سے بھرپور ان برسوں میں آپ ﷺ کی زندگی میں اس قسم کے متعدد واقعات پیش آچکے تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کا صرف دو چار منٹ کے لیے دیکھے ہوئے چہرے کو مشکلات میں گھرے ہوئے اتنے سالوں کے بعد کہ جن میں انسان اپنے قریب ترین ساتھیوں کو بھی بھول جاتا ہے، پہچان لینا یقیناً قابل تعجب بات تھی، لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے کسی تعلق والے کو کبھی فراموش نہیں فرمایا، اس لیے آپ ﷺ نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا اور اگر حضرت عمرو بن عبسہ اور حضرت ابوذر غفاری فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر نہ ہوتے تو آپ ﷺ پیغام بھیج کر انہیں بلواتے، کیونکہ فتح مکہ کے بعد مکمل فتح حاصل ہو چکی تھی۔

رسول اللہ ﷺ اپنے پیروکاروں کو اس سے زیادہ جانتے تھے جتنا کہ ہم اپنی اولاد کو جانتے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کے دل میں ہر انسان کا ایک خاص مقام تھا اور یہ واقفیت صحابہ کرام کو ایسی ذمہ داریاں سونپنے کے لیے ناگزیر تھی، جنہیں وہ بحسن وخوبی سرانجام دے سکیں۔

کیا تاریخ میں کوئی اور ایسا قائد گزرا ہے، جسے اپنی جماعت اور پیروکاروں کا اس قدر علم ہو۔ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف قائد اور راہنما ہی نہ تھے، بلکہ نبی بھی تھے۔ ہماری ساری گفتگو کا محور آپ ﷺ کی نبوت ہی ہے۔

ج: حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ

اوپر ہم حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ سے متعلق گفتگو کر چکے ہیں... عمر کے اس حصے میں دوسرے نوجوانوں کی طرح انہیں بھی جنس مخالف سے متعلق بعض نفسیاتی مشکلات کا سامنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس مشکل کو سمجھتے ہوئے ان کے لیے دعا فرمائی، لیکن دعا فرمانے سے پہلے آپ ﷺ نے اپنی مسحور کن گفتگو کے ذریعے انہیں اس برائی کے ترک کرنے پر آمادہ کیا۔[561] چنانچہ وہ مدینے کے سب سے زیادہ پاکدامن نوجوان بن گئے۔

حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جلیبیب عورتوں کے پاس آتے اور ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ میں نے اپنے گھر والوں سے کہہ رکھا تھا کہ جلیبیب تم لوگوں کے پاس ہرگز نہ آئے ورنہ میں کوئی سنگین اقدام اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اگر کسی انصاری صحابی کی کوئی غیر شادی شدہ بیٹی ہوتی تو وہ اس وقت تک اس کی شادی نہ کرتا جب تک اسے رسول اللہ ﷺ کی اس کے ساتھ نکاح کرنے میں رغبت یا عدم رغبت کی اطلاع نہ مل جاتی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری صحابی سے فرمایا: ''مجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیجئے۔'' انہوں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! چشم براہ! یہ تو ہمارے لیے باعث شرف بات ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ رشتہ اپنی ذات کے لیے نہیں چاہتا۔'' انصاری صحابی نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! پھر آپ کس کے لیے چاہتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جلیبیب کے لیے۔'' اس پر انہوں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ میں لڑکی کی ماں سے مشورہ کر کے بتاؤں گا۔'' چنانچہ وہ اس کی ماں کے پاس آئے اور کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے تمہاری بیٹی کے لیے پیغام نکاح بھیجا ہے۔'' اس نے کہا: ''قبول ہے، یہ تو باعث مسرت بات ہے۔'' انصاری صحابی نے کہا: ''آپ ﷺ اس کا رشتہ اپنے لیے نہیں بلکہ جلیبیب کے لیے مانگ رہے ہیں۔'' اس پر اس نے کہا: ''کیا جلیبیب کے لئے؟ نہیں (اس نے یہ بات تین دفعہ کہی) نہیں، خدا کی قسم! تم اس کے ساتھ (میری بیٹی کا) نکاح نہیں کراؤ گے۔'' جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا کر انہیں لڑکی کی والدہ کی رائے کے بارے میں بتانے کے لیے اٹھنے لگے تو لڑکی نے خود پوچھا: ''آپ لوگوں کی طرف میرے لئے نکاح کا پیغام کس نے بھیجا ہے؟ جب اس کی والدہ نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے کہا: ''کیا آپ لوگ رسول اللہ ﷺ کی بات کو رد کر رہے ہیں؟ مجھے (جلیبیب کے نکاح میں) دے دیجئے، کیونکہ آپ ﷺ مجھے ضائع نہیں فرمائیں

گے۔'' چنانچہ اس کے والد نے جا کر رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ لڑکی کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے ساتھ جلیبیب کا نکاح فرما دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ایک غزوے میں تشریف لے گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتح دی تو آپ نے صحابہ سے فرمایا: ''کیا تم کسی شخص کو غائب پاتے ہو؟'' انہوں نے عرض کی: ''فلاں فلاں شخص مفقود ہے۔'' آپ ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: ''کیا کسی اور کو بھی مفقود پاتے ہو؟ صحابہ نے اس دفعہ نفی میں جواب دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں جلیبیب کو غائب دیکھ رہا ہوں۔ اسے مقتولین میں تلاش کرو۔'' چنانچہ صحابہ نے انہیں تلاش کیا تو انہیں سات افراد کے درمیان پایا، جنہیں قتل کرنے کے بعد وہ خود بھی ان کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ صحابہ نے آپ ﷺ کو بتایا: ''یارسول اللہ! وہ سات افراد کے درمیان پڑے ہیں، جنہیں قتل کرنے کے بعد وہ خود بھی ان کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا: ''اس نے سات افراد کو قتل کیا اور پھر ان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔'' آپ ﷺ نے یہ بات دو یا تین دفعہ ارشاد فرمائی۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور ان کے لیے قبر کھودی گئی۔ ان کی چارپائی آپ ﷺ کے بازو ہی تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں قبر میں اتارا۔ (562) آپ ﷺ نے اسے فراموش نہیں کیا، کیونکہ آپ ﷺ ایسے پیکرِ وفا تھے، جس نے اپنے کسی بھی پیروکار یا دوست کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

د: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

معرکہ خیبر برپا تھا اور محاصرہ جاری تھا، لیکن کئی دن بغیر کسی فیصلہ کن کامیابی کے گزر گئے۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کل میں یہ علَم ایک ایسے شخص کو دوں گا، جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح نصیب فرمائیں گے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اسے پسند کرتے ہیں۔'' لوگوں نے وہ رات اسی فکر میں گزاری کہ دیکھئے علَم کسے ملتا ہے۔ جب صبح ہوئی تو سب کے سب دل میں امید کی کرن لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''علی بن ابی طالب کہاں ہے؟'' صحابہ نے عرض کی: ''یارسول اللہ! انہیں آنکھ کی تکلیف ہے۔'' چنانچہ ان کی طرف پیغام بھیجا گیا اور جب وہ حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھ پر لگا کر ان کے لیے دعا فرمائی، جس کی برکت سے وہ ایسے صحت یاب ہو گئے جیسے انہیں کوئی تکلیف ہی نہ تھی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے انہیں علَم دیا۔(563)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوئی اور خیبر حضرت علی بن ابی طالب کے ہاتھوں فتح ہوا۔ آپ ﷺ جسے بھی کوئی ذمہ داری سونپتے وہ اسے کامیابی سے سرانجام دیتا۔ مثلاً آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ ''سیف اللہ'' (خدا کی تلوار) ہیں۔(564) چنانچہ حضرت خالد واقعۃً اللہ تعالیٰ کی تلوار ثابت ہوئے۔ وہ جس معرکے میں بھی شریک ہوتے فتح یاب ہوتے، اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق فرمایا کرتے تھے: ''کسی ماں نے خالد جیسا سپوت نہیں جنا۔''(565)

رسول اللہ ﷺ نے قعقاع بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ کو بھی بہت سے اہم ذمہ داریاں سونپی تھی، جنہیں انہوں نے کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا تھا حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: ''جس لشکر میں ان جیسا (بہادر) انسان موجود ہو اسے شکست نہیں ہو سکتی۔''(566)

آپ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں ایک لشکر کا سپہ سالار مقرر فرما کر موتہ کی طرف روانہ فرمایا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عمر بھر یہ ثابت کیا کہ وہ اس منصب کے اہل تھے۔(567)

ہ: ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن

آپ ﷺ کا سینکڑوں عورتوں میں سے اپنی ازواج مطہرات کا انتخاب ایک عمدہ انتخاب تھا، جو بجا طور پر غور و فکر کا مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے ایسی ازواج مطہرات کا انتخاب ناگزیر تھا، جو امہات المؤمنین کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی اہلیت رکھتی ہوں، چنانچہ آپ ﷺ کا انتخاب سو فیصد درست ثابت ہوا۔ زمانے نے ثابت کیا کہ وہ خالص کندن تھیں، جنہوں نے مرشد و معلم کی حیثیت سے اسلام کی عظیم خدمات سرانجام دیں اور اپنی چوکھٹ پر حاضر ہونے والی بہت سی عظیم ہستیوں کے حق میں دعوت وارشاد کی ذمہ داری سرانجام دی۔ مسروق، طاؤس بن کیسان اور عطا بن ابی رباح جیسی کتنی ہی زہد و عبادت کا شغف رکھنے والی عالمانہ شخصیات نے ان کے سامنے زانوائے تلمذ طے کیے اور ان کے چشمہ علم سے فیض یاب ہوئیں۔

رسول اللہ ﷺ ایسی خاتون کا انتخاب فرماتے جو مستقبل میں مرشدہ بنتی۔ آپ ﷺ جیسے اس میں حصول علم کی صلاحیت پیدا فرماتے ایسے ہی اسے مستقبل میں نبوی دعوت کی وارثہ بن کر علم کی ترویج کے لیے تیار فرماتے تھے۔ ازواج مطہرات میں کوئی بھی ایسی خاتون نہ تھی جو اس معیار پر پورا نہ اترتی ہو۔ جس طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دعوت کے آغاز میں اپنی ساری دولت و ثروت راہِ خدا میں خرچ کر کے اسلام کی خدمت کی اسی طرح دوسری ازواج مطہرات نے بھی اسی ولولے کے ساتھ اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کے ہدف کو حاصل کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ سے لے کر دیگر ازواج مطہرات تک سب کا انتخاب نبوی فراست کی روشنی میں کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبوت سے پہلے شادی کی تھی، لیکن اس وقت بھی آپ ﷺ نبوت کی بشارات و علامات کے زیر سایہ تھے۔ آپ ﷺ کے اس قدر درست چناؤ کی کوئی اور توجیہ ممکن ہی نہیں۔

چوتھی فصل: نورِ وحی سے منور فراست کے مالک

کسی بھی راہنما کا اپنی جماعت اور پیروکاروں کا اعتماد حاصل کرنا اس کے اپنی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے ان میں مقبول و پسندیدہ اور ان کی نظروں میں ایک قابل اعتماد شخصیت ہونے پر موقوف ہوتا ہے، جو اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنے پیروکاروں کی تمام مشکلات خواہ وہ انفرادی ہوں یا خاندانی، معاشرتی ہوں یا معاشی و سیاسی کو حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ راہنما کو ان مشکلات کے حل کرنے میں جس قدر کامیابی حاصل ہوگی اس کے پیروکاروں میں اس کی مقبولیت، محبت اور عزت و احترام کا گراف اسی قدر بلند ہوگا اور وہ ایک ابدی رمز بن جائے گا۔ رسولِ خدا محمد ﷺ انسانیت کے ایک ایسے ہی راہنما تھے۔ انسانی مشکلات کو حل کرنے میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

مشکلات کا ایک متبادل حل بھی موجود ہے، جس سے مراد دباؤ اور طاقت کا استعمال، سزاؤں کا اجراء، جلاوطنی، انسان کو شہریت کے تمام حقوق سے محروم کر کے اس پر قید خانے کے دروازے کھولنا، ہر قسم کی تکالیف پہنچانا اور جاسوس پھیلا کر اہل وطن میں خوف و ہراس کی کیفیت پیدا کرنا ہے، لیکن اس طریقے سے کوئی بھی مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف یہ کہ اس سے مشکلات کا حل ممکن نہیں، بلکہ یہ معاشرے میں مختلف پیچیدگیوں اور بحرانوں کے پیدا ہونے کا باعث بنتا ہے، لہٰذا یہ کوئی مناسب حل نہیں، اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک یہی مشکلات کا حل ہے، لیکن درحقیقت یہ مزید مشکلات کو پیدا کرنے اور بند گلی میں داخل ہونے کے مترادف ہے۔ اس میں انسان ایک مشکل کو حل کرنے پر خوش ہو رہا ہوتا ہے کہ اچانک اسے ایسی مشکلات پیش آجاتی ہیں، جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اور جب کوئی اس بند دائرے میں پھنس جاتا ہے تو جب تک وہ اسے توڑ کر باہر نہیں نکلتا اس وقت تک ہر حرکت اسے دلدل میں مزید دھنسانے کا باعث بنتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے انسانی ارادے کی آزادی کو قابل لحاظ واحترام سمجھتے ہوئے دباؤ، دہشت اور طاقت کو استعمال کیے اور اس بند گلی میں داخل ہوئے بغیر انتہائی سہولت و آسانی کے ساتھ تمام مشکلات و مسائل کا حل پیش کیا اور اگر آپ ﷺ کے مافوق الفطرت حالات اور بہت سے معجزات سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تب بھی یہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی دلیل ہے۔ آپ ﷺ اول و آخر رسول تھے، ورنہ ان تمام مشکلات کو دور کرنا کیسے ممکن تھا؟ حالانکہ آپ ﷺ اجڈ پن، گمراہی، سرکشی اور تاریکی میں ڈوبے ہوئے ایک ایسے معاشرے میں پروان چڑھے تھے جہاں لوگ معمولی سی بات پر مشکلات کھڑی کر دیتے اور خون ریز جنگیں شروع کر کے فتنوں کی آگ بھڑکا دیتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے

معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری آپ ﷺ کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ (الحشر: ۲۱) ''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔'' اس آیت مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کندھوں پر ڈالی جانے والی یہ ذمہ داری اس قدر گراں بار تھی کہ اگر پہاڑوں کو سونپی جاتی تو وہ اس کے وزن سے پھٹ پڑتے۔ گمراہی میں مبتلا اس اجڈ اور پس ماندہ معاشرے میں اس ذمہ داری کو ادا کرنا اور بھی دشوار تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایک ایک کر کے اس معاشرے کی مشکلات کو حل کیا اور اس کی الجھنوں کو سلجھا کر اسے اطمینان اور سلامتی کے ساحل تک پہنچایا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس گئے گزرے معاشرے سے اطمینان وسکون کا حامل ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جسے ''مثالی شہر'' پر لکھی جانے والی کتابوں مثلاً افلاطون Platon کی ''جمہوریت''، تھامس مور Thomas Moor کی اٹوپیا اور کمپانیلا Companella کی ''The City of the Sun'' میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ کتابیں رسول اللہ ﷺ کے تشکیل کردہ معاشرے جیسے معاشرے کی جستجو اور شوق کے نتیجے میں موجود میں آئیں۔ ہمیں ان لوگوں کو خیالات کی دنیا میں سرگرداں چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھنا چاہیے، جنہوں نے صدیوں پیشتر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو ان مثالی اور خیالی معاشروں میں پائے جانے والے منفی پہلوؤں سے بھی خالی تھا اور اسے بعد میں آنے والوں کی راہنمائی کے لیے آسمان میں درخشاں ستاروں کی مانند مثالی معاشرے کے طور پر پیش کیا۔ جو شخص بھی اس سے راہنمائی لیتا ہے، وہ حق تک پہنچ کر اپنے دل کو اطمینان وسکون سے لبریز کر لیتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس حقیقت کا واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے خیال میں صحابہ کرام کا معاشرہ صحیح معنوں میں حقیقی اور واقعی تھا۔ مستقبل میں ہمارا نصب العین ایسے ہی نورانی معاشرے کی طرف پیش قدمی کرنا ہے۔

اگر رسول اللہ ﷺ اس دور کے انسان کی تمام مشکلات ومسائل کو حل نہ فرماتے تو کیا انسانیت کے لیے باعث فخر صحابہ کرام کا ظہور ممکن ہوتا؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، لیکن کیا رسول اللہ ﷺ ان تمام مشکلات کو محض اپنی عقل کی مدد سے حل فرمایا کرتے تھے؟ ہرگز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نبوی فراست عطا فرمائی تھی جو وحی کی روشنی سے منور تھی اور جس کے ذریعے آپ ﷺ نے انتہائی آسانی کے ساتھ تمام مشکلات کو دور فرما دیا۔ یہ آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے اور ہماری گفتگو کا موضوع بھی یہی ہے۔ آئندہ سطور میں ہم چند مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کریں گے:

الف: حجر اسود کے بارے میں فیصلہ

اس دور میں لوگ اپنی مشکلات کے حل کے لیے آپ ﷺ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ جب کعبے کی تعمیر مکمل ہوگئی، جس میں آپ ﷺ نے خود بھی شرکت فرمائی تھی تو حجر اسود کو اپنی جگہ پر نصب کرنے کا معاملہ ایک ایسی مشکل کی صورت میں سامنے آیا، جس کی وجہ سے قبائل عرب کے درمیان خونریز تصادم کا خطرہ تھا اور واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ اگر دو ایک دن میں یہ مشکل حل نہ ہوئی تو جنگ یقینی ہے۔ اوپر ہم بتا چکے ہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ سب کے لیے قابل قبول طریقے کے مطابق حجر اسود کو اپنی جگہ پر رکھ کر اس مسئلے کو حل نہ فرماتے تو خونریز تصادم شروع ہو جاتا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کپڑے کی ایک ٹکڑے پر حجر اسود کو رکھا اور قبائل کے سرداروں کو اس کے کناروں سے پکڑ کر اسے ایک ساتھ اٹھانے کے لئے کہا اور جب وہ حجر اسود کی جگہ کے قریب پہنچ گئے تو اسے خود اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب فرما دیا۔

اس واقعے سے جس کی تفصیلات میں ہم نہیں جانا چاہتے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نبوت ملنے سے پہلے بھی کس قدر فراست کے مالک تھے۔

اس فیصلے کے وقت آپ ﷺ کی عمر بیس سے تیس سال کے درمیان تھی، یعنی یہ واقعہ آپ ﷺ کے نبوت سے سرفراز ہونے، بہت سی دوسری گہرائیاں حاصل کرنے، آپ ﷺ پر لا متناہت کے دروازے کھلنے اور اپنے پروردگار سے حصول علم سے پہلے پیش آیا، بلکہ وحی کے نزول سے پہلے آپ کے دل پر القا ہونے والے الہامات کی برکت سے آپ ﷺ لوگوں کے دلوں میں اس قدر بس گئے تھے کہ جونہی کفارِ قریش نے آپ ﷺ کو مسجد کے دروازے سے اندر آتے ہوئے دیکھا تو خوشی سے پکار اٹھے: یہ امین ہے، ہم اس پر راضی ہیں، یہ محمد ہے۔"[568] چنانچہ آپ ﷺ تشریف لائے اور مسئلے کو حل فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کو یہ مشکل حل کرنے کے لیے طویل غور و فکر، انتظار یا مشاورت کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ آپ ﷺ نے اسے اتنی سہولت سے حل فرما دیا جیسے مکھن سے بال نکالتے ہیں۔ آپ ﷺ کے لیے یہ ایک بالکل معمولی بات تھی۔ کسی نے آپ ﷺ پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور اعتراض کی گنجائش بھی نہ تھی، کیونکہ انہوں نے خود آپ ﷺ کو فیصل مقرر کیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے بغیر کسی تردد، لغزش یا غلطی کے انتہائی عمدگی سے فیصل کی ذمہ داری سرانجام دے کر سب کو خوش کر دیا۔

آپ ﷺ کی زندگی میں کبھی بھی تنزل نہیں آیا، کیونکہ آپ ﷺ اپنی غیر معمولی فراست کے ذریعے اپنے پروردگار کی طرف سے القا کردہ باتوں کو حقہ سمجھ جاتے۔ آپ ﷺ کی فراست پھول کی ان کلیوں کی مانند تھی، جو کھل کر مختلف رنگ اختیار کر لیتی ہیں اور مشکلات اور ادھوری خواہشات میں گھرے ہوئے اداس انسان کے سامنے مسکرانے لگتی ہیں۔

شاید آپ کو خیال ہو کہ آپ ﷺ کی عظمت کی جہات ختم ہو چکی ہیں یا آپ نے ان سب کا احاطہ کر لیا ہے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ صوفی شاعر یونس امر کے بقول:

''آپ ﷺ ایسی کلی ہیں، جس میں اور بہت سی کلیاں پنہاں ہیں۔''

آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے طویل عرصے میں اور بھی بہت سے لوگوں نے آپ ﷺ سے مراجعت کی جن میں سے آپ نے کسی کو بھی پریشان و غمگین نہیں لوٹایا، بلکہ ان کی مشکلات کا حل نکالا۔ آغاز سے ہی آپ ﷺ فتنے اور مشکلات کھڑی کرنے والی اپنی قوم کی مشکلات حل فرماتے۔ وہ مشکلات پیدا کرتے اور آپ ﷺ انہیں ایک ایک کر کے حل فرما دیتے تھے۔

ہجرت بذات خود ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔ جنگ وحرب، امن وامان، مادی مفادات ومنافع اور غنیمت کے مسائل اس پر مستزاد تھے۔ اگر آپ ﷺ ان مشکلات سے نہ نکل پاتے تو آپ ﷺ کی جنگ وجدل کی دلدادہ قوم کا باہمی اختلافات کا شکار ہو کر خانہ جنگی میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا۔

ب: غزوہ حنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم

اس موقع پر مسلمانوں کو فتنے میں مبتلا ہونے سے بچانے میں آپ ﷺ کی حکمت، دور اندیشی اور حساس فراست کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے آپ ﷺ کا وہ دلفریب خطاب بھی ذکر کیا تھا، جس میں آپ ﷺ نے انصار صحابہ کو بتایا کہ میں نے غنائم کے ذریعے سردارانِ قریش کی دلجوئی کی ہے اور تمہیں تمہارے اسلام کے سپرد کیا ہے، نیز انہیں سمجھایا کہ یہ غنائم تو فانی دنیا کا تھوڑا سا حصہ ہیں، جبکہ وہ اپنے ساتھ رسول خدا ﷺ کو لے جانے کی وجہ سے یقیناً فائدے میں ہیں پھر آپ ﷺ نے نہ صرف ان کے لیے بلکہ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے بھی دعا فرمائی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی دلکش گفتگو کے ذریعے ان کے دل جیت لیے اور وہ اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔[569] یہ آپ ﷺ کی فراست، ذہانت اور حاضر دماغی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ چونکہ یہ واقعہ اوپر تفصیل سے گزر چکا ہے اس لیے یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔

ج: مسئلہ ہجرت

ہجرت ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے اور آج کل ہم اسی مسئلے سے دوچار ہیں۔(570) ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس ہجرت کے نتیجے میں ہمارے ملک کو دوہری مشکلات کا سامنا ہے۔ میں نے مختلف تقریروں میں اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہو کہا تھا کہ یہ ان سازشوں کا نتیجہ ہے، جن کا تانا بانا ملک سے باہر بنا جاتا ہے اور پھر ترکی کے اسٹیج پر ڈرامہ رچایا جاتا ہے۔ کل کو وہ نفاق کا دروازہ مشرق میں اور اختلاف کا دروازہ مغرب میں کھولیں گے نیز ایک فتنہ شمال میں تو دوسرا جنوب میں برپا کریں گے۔ وہ ایسا کر بھی سکتے ہیں، کیونکہ ایشیا کے ظالم کفار اور منافق ہمارے لیے مشکلات کھڑی کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ماضی میں بھی انہوں نے ہمارے کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بین الاقوامی توازن برقرار رکھنے والی سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کیے تھے اور اگر قوم آخرکار معرکہ ''چنق قلعہ'' اور ''جنگ آزادی'' میں اپنی روح کی حقیقت اور اپنے عقیدے کی اساس کی طرف رجوع نہ کرتی تو شاید آج اس قوم کا دنیا میں نام ونشان تک نہ ہوتا، بلکہ اس سے سارے عالم اسلام کو نقصان پہنچتا، لیکن ''چنق قلعہ'' اور ''جنگ آزادی'' کے فدائیوں نے اس امت کی روح میں موجود طاقت اور اس کے عقیدے وروح سے پھوٹنے والے افکار کو استعمال کیا اور نصرتِ خداوندی کے ساتھ اس امت کو بلغاریہ، ترکستان، ازبکستان اور منگولیا جیسے انجام سے دوچار ہونے سے بچا لیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ممالک کو بھی اپنے گلے میں ڈلے پھندوں کو توڑ کر اپنے دشمنوں کا محاسبہ کرنے کا موقع دے۔(571) کیونکہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَتِلْكَ الأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاس﴾ (آلِ عمران: ١٤٠) ''اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔''

اگر آج زمانہ ان کے ساتھ ہے تو کل کو ان سے رخ موڑ بھی سکتا ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں ان دکھی اور ستم رسیدہ ممالک کی رونقیں بحال ہو جائیں گی۔

ہجرت بذاتِ خود ایک مشکل ہے۔ حالیہ ہجرت جس کی وجہ سے ۵۵ ملین نفوس پر مشتمل قوم اور اس کی حکومت کو مشکلات کا سامنا ہے اس کی واضح مثال ہے۔ دوسری طرف اُس وقت پیش آنے والی ہجرت کے نتیجے میں مہاجرین کی تعداد مدینہ کی آبادی کے قریب قریب تھی، لیکن اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے اپنی فراست کے ذریعے حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کو مادی مشکلات سے محفوظ رکھا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف دنیوی مشکلات کو حل فرمایا، بلکہ اچھے نتائج بھی حاصل کیے اور یہ

حقیقت ہے کہ دنیا کی تاریخ میں نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر حاصل ہونے والی کامیابی جیسی کامیابی کسی اور ہجرت میں حاصل نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ نے اس مشکل کو کیسے حل فرمایا آئندہ سطور میں ہم زیادہ تفصیلات میں جائے بغیر اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

یثرب ایک چھوٹا سا شہر تھا، جس کے باسیوں کا پیشہ زراعت تھا اور بازار پر یہودیوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ اگرچہ مکہ سے آنے والے مہاجرین تجارت میں مہارت رکھتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی ساری ثروت و جائیداد مکہ میں چھوڑ آئے تھے، اس لیے تجارت کے لئے ضروری سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لیے یہودیوں سے مسابقت کرنا ممکن نہ تھا۔ دوسری طرف مہاجرین کی تعداد میں مسلسل اضافے کی وجہ سے مدینے کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ان کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کرنا مستقل مسئلہ تھا اور اہل مدینہ کی غربت اس پر مستزاد تھی۔ غرض مشکلات کا ایک طویل سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ حل کا منتظر تھا۔ ہر کسی کی نظریں آپ ﷺ پر لگی ہوئی تھیں اور انہیں آپ ﷺ کی ان تمام مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا اور عملی طور پر آپ ﷺ نے انتہائی مختصر وقت میں ان مشکلات پر قابو پا کر دکھا بھی دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں آتے ہی انصار اور مہاجرین کے درمیان مواخات قائم فرما دی اور ان کے دلوں میں اس مواخات کی ایسی روح پھونکی کہ وہ نسبی اخوت سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ثابت ہوئی یہاں تک کہ کچھ عرصہ تک تو ان کے درمیان وراثت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔[572] وہ مواخات اس قدر مضبوط تھی کہ انصار نے اپنے مال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ مہاجرین کو دے دیا، بلکہ اس مواخات کے نتیجے میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جسے سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

بخاری میں مروی ہے کہ جب مہاجرین مدینہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت سعد بن ربیع کے درمیان مواخات قائم فرمائی۔ حضرت سعد بن ربیع نے حضرت عبدالرحمان سے کہا: ''میں انصار میں سب سے مالدار ہوں۔ میں اپنے مال کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہوں اور میری دو بیویاں ہیں تمہیں ان میں سے جو پسند ہو مجھے بتاؤ میں اسے طلاق دے دیتا ہوں اور عدت گزرنے کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا۔'' حضرت عبدالرحمان نے اس کے جواب میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ آپ کے مال اور گھر والوں میں برکت دے۔ مجھے صرف بازار کا رستہ بتا دیجیے۔'' چنانچہ انہوں نے انہیں بنو قینقاع کے بازار کا پتہ بتا دیا۔ جب وہ وہاں سے لوٹے تو ان کے پاس کچھ پنیر اور گھی تھا پھر وہ روزانہ صبح بازار جاتے رہے یہاں تک کہ ایک دن وہ آئے تو ان (کے کپڑوں) پر زرد نشانات تھے۔ نبی

اکرم ﷺ نیا نہیں دیکھ کر پوچھا: ''یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی: ''میں نے شادی کی ہے۔'' آپ ﷺ نے پوچھا۔ ''بیوی کو کتنا مہر دیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''ایک گٹھلی کی بقدر سونا۔''(573)

یعنی جونہی حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر والوں کے اخراجات برداشت کرنے کی اہلیت حاصل ہوئی انہوں نے شادی کر لی۔ یہ دراصل روحانی لطافت، حساس مزاجی، ذوق کی بلندی اور اپنے میزبانوں کے جذبات کے احترام کی اعلیٰ مثال ہے۔

یقیناً ایسی اخوت کے سامنے بڑی سے بڑی مشکل بھی مشکل نہیں رہتی۔ اس قدر مضبوط رشتے میں باہم منسلک یہ جانثار دنیا کو فتح کرنے کے لیے چنے جا چکے تھے اور مدینے کی فضاؤں میں بکھری ہوئی اخوت کی یہ خوشبو ایک دن سارے عالم میں پھیلنے والی تھی۔

۱- استغنا اور سخاوت میں مقابلہ

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ اکیلے تشریف فرما تھے کہ مہاجرین کے بعض سرکردہ حضرات اجازت لے کر حاضر ہوئے۔ ان کے ہمراہ کوئی انصاری صحابی نہ تھا۔ اس موقع پر مہاجرین کے ساتھ کسی بھی انصاری صحابی کا نہ ہونا توجہ طلب بات تھی۔

رسول اللہ ﷺ سے اجازت ملنے پر انہوں نے اپنے آنے کی غرض بیان کرتے ہوئے عرض کی: ''یارسول اللہ! جس قوم میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں اس سے زیادہ، زیادہ مال میں سے خرچ کرنے والا اور کم مال سے غمخواری کرنے والا ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ انہوں نے کام سے ہمیں مستغنی کر دیا ہے، لیکن منافع میں ہمیں شریک رکھا ہے، جس کی وجہ سے ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں سارا اجر وثواب وہی نہ لے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں، جب تک تم ان کے لیے دعا گو اور ان کے شکر گزار رہو گے اس وقت تک ایسے نہیں ہو سکتا۔''(574)

یہ وہ اخوت تھی، جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے دلوں میں بٹھا دیا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ ایک جسم کی مانند ہو گئے تھے۔ انصار کی خواہش تھی کہ مہاجرین ان کے گھروں میں قیام پذیر رہیں، کیونکہ ان بھائیوں کی جدائی ان کے لیے موت کی طرح تکلیف دہ تھی۔ اگرچہ ان کی ان سے مسجد میں روزانہ پانچ مرتبہ ملاقات ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود کمروں میں اور کھانے کے اوقات میں ان کی عدم موجودگی سے انہیں تکلیف پہنچتی تھی۔

ایک طرف سے استغنا تو دوسری طرف سے سخاوت، مروت اور ایثار کا مظاہرہ ہو رہا تھا اور ہر فریق کو اپنے موقف پر اصرار تھا۔ آخر دونوں فریق اس فیصلے پر پہنچے کہ مہاجرین اجرت پر انصار کے کھیتوں میں کام کریں گے، جس کے نتیجے میں وہ کسی کے زیر بار احسان رہے بغیر اپنے اخراجات اٹھانے اور مستقل مکانات میں ٹھہرنے کے قابل ہو سکیں گے، چنانچہ انصار نے اپنے کاموں میں مہاجرین کی خدمات حاصل کر کے ان سے تعاون کیا اور رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں اخوت کے شعور کو اجاگر کر کے ہجرت کے مسئلے کو بڑی حد تک حل فرما دیا۔

دوسری مشکل جسے رسول اللہ ﷺ نے حل فرمایا تجارت تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مدینے میں تجارتی سرگرمیاں یہودیوں کے زیر اثر ہیں تو آپ ﷺ نے ایک علیحدہ جگہ پر مسلمانوں کا بازار قائم کرنے کا حکم صادر فرمایا، تاکہ مسلمان اپنے علیحدہ بازار میں آپس میں خرید و فروخت کے معاملات کریں، تجارتی سرگرمیوں میں حصہ لے کر اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ کریں اور بازار پر کافروں کی اجارہ داری ختم کرنے کے لیے اپنے لیے علیحدہ تجارتی مراکز قائم کریں۔(575) چنانچہ نیا بازار قائم ہوا اور مسلمانوں نے آپس میں خرید و فروخت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہودیوں کے لیے مدینہ منورہ میں تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھنا اور مسلمانوں کے بازار میں مسلمانوں کے ساتھ تجارت کے شعبے میں مسابقت کرنا ممکن نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ مسلمان کسی کے ماتحت رہ کر اس کے احکامات کے منتظر رہیں، دوسروں کو اپنا ماویٰ و ملجا بنائیں، ان سے اپنی مشکلات کے حل کی امید رکھیں یا ان سے رحم کی درخواست کریں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بالکل پسند نہیں، بلکہ مسلمان کو چاہیے کہ باوقار طریقے سے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اپنے کام خود سرانجام دے، اپنی مشکلات خود حل کرے، تمام معاملات کو دوسروں کی نظروں کی بجائے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے افکار کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے اپنی اصالت کی حفاظت کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایسے ہی طرزِ زندگی کی بنیاد رکھی تھی۔

۲- پہلا دستور

رسول اللہ ﷺ نے مدینے پہنچتے ہی ایک اعلامیہ جاری فرمایا۔(576) رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے مختصر عرصے بعد جاری ہونے والے اس اعلامیے کو ماہرین قانون ”رسول اللہ ﷺ کے دستور“ کا نام دیتے ہیں۔

اس اعلامیے یا معاہدے میں ہمارے ہاں رائج ”انسانی حقوق کے چارٹر“ اور ”فرمان تنظیمات“

کے اکثر مشمولات کے اصول پائے جاتے ہیں۔آپ ﷺ نے عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے جو حقوق مقرر فرمائے تھے،ان کی بدولت اہل مدینہ کی وحدت کو مضبوط کرنے اور انہیں مسلمانوں کے قریب لاکر مسلمانوں کے بازنطینی، ساسانی اور قریشی دشمنوں سے دور کرنے میں مدد ملی، یہی وجہ تھی کہ ایک عرصے تک یہودی مسلمانوں کے زیرِ سایہ اطمینان وسکون سے رہتے رہے اور اسی لیے مشہور منافق عبداللہ بن ابی بن سلول نے قریش کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں اپنے دین کی نشرواشاعت سے کوئی اندیشہ نہیں،لیکن اصل خطرے کی بات یہ ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ کو مشرکین کے خلاف اپنے ساتھ ملا رہے ہیں۔

یہ معاہدہ،اعلامیہ یا دستور ایک لمبے عرصے تک مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین صلح وامن کے قیام کا باعث بنا رہا یہاں تک کہ یہودیوں نے خود ہی اسے توڑ ڈالا۔یہودی رسول اللہ ﷺ کی طرف مراجعت کرکے آپ ﷺ کے فیصلوں کو بخوشی قبول کرتے تھے۔

کتب حدیث سے پتا چلتا ہے کہ یہودیوں نے چوری،قصاص اور زنا کے معاملات میں آپ ﷺ کی طرف رجوع کیا تھا، نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں نے یہودیوں کے معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرکے انہیں آزادی دے رکھی تھی،لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں اور خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے ہاں زیادہ عدالت اور اہلیت پاتے تھے اور اسی لیے ہر معاملے میں آپ ﷺ کی طرف مراجعت کرکے آپ ﷺ کو فیصل بناتے تھے، چنانچہ وہ مقدس سرچشمہ جو مستقبل میں ساری انسانیت کے لیے مرجع بننے والا تھا اس نے اپنے ابتدائی ایام میں ہی اپنی مرجعیت کو ثابت کردیا۔اس طرح رسول اللہ ﷺ نے مختصر سے عرصے میں ہجرت کی مشکل کو حل فرمادیا تاکہ مسلمان پورے عالم کی طرف اطمینانِ قلب کے ساتھ توجہ دینے کی لیے فارغ ہوسکیں۔

د: جنگ کا مسئلہ

جنگ اور ہزیمت کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں بھی جنگ وانقلاب اور فتح وصلح کے مسائل موجود ہیں۔ ہم نے ۱۹۷۴ء میں قبرص میں فوجیں اتاری تھیں، لیکن اس کی مشکلات کا ہم آج تک سامنا کر رہے ہیں۔ میں وہاں لڑنے اور دشمن کا مقابلہ کرنے والے ترکی سپاہیوں کو سلام عقیدت پیش کرتا ہوں اور ان کی شجاعت کو کبھی بھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہم سب کے سامنے ہے کہ ابھی تک ہم اس کی مشکلات کو حل نہیں کر سکے، حالانکہ جزیرہ قبرص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں سہولت اور تیزی سے بغیر کسی مشکل کا باعث بنے فتح ہو گیا تھا، لیکن موجودہ صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ میں نے مسئلہ قبرص کا تذکرہ صرف ایک مثال کے طور پر کیا ہے، ورنہ میرا اصل مقصود جنگ وصلح کے مسائل کے حل کی مشکلات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ جنگ بلقان کو ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کے آثار آج تک باقی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی جنگیں فرمائیں، پہلے اپنی قوم اور قبیلے سے، پھر مدینے اور اس کے گردونواح کے یہودیوں سے اور پھر بازنطینی سلطنت سے۔ آپ ﷺ دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اور یہ دشمن آپ ﷺ کے لیے مختلف مشکلات پیدا کرنے کا سرچشمہ بھی تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ہر دفعہ اپنے آپ کو ان مشکلات سے ایسے نکال لیا جیسے بال مکھن سے نکالتے ہیں۔

ا- غزوہ احد کی حکمت عملی

میں یہاں غزوہ بدر کی فتح، غزوہ خندق کی تیاری، غزوہ موتہ میں بہادروں کے رقم کردہ مفاخر اور جنگ یرموک میں پیش کیے جانے والے شجاعت کے بے مثال کارناموں میں سے کسی کا بھی ذکر نہیں کروں گا، بلکہ میں یہاں غزوہ احد جس میں ایک لحاظ سے شکست کا پہلو بھی ہے، سے پیدا ہونے والے مسائل کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کر کے ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے موقف اور درست اقدامات کی طرف اشارہ کروں گا۔

غزوہ احد وہ پہلا معرکہ ہے، جس میں مسلمانوں کی صفوں میں ہزیمت کے آثار نمودار ہوئے۔ میں کسی حقیقی مسلمان کی طرف ہزیمت کی نسبت کرنے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ دراصل اس واقعے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص معیارات تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے

مقابلے میں خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسے سیاسی اور عسکری ماہرین موجود تھے، جنہوں نے مستقبل میں دشمنوں کے بڑے بڑے لشکروں کے قدم اکھاڑنے تھے۔ اگرچہ آج وہ بدقسمتی سے مشرکین کی صفوں میں موجود تھے، لیکن وہ مستقبل میں صحابیت کے مقام پر فائز ہونے والے تھے، لہٰذا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس جنگ میں مستقبل کے صحابہ اس وقت کے صحابہ پر غالب آ گئے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جن تیر اندازوں کو رسول اللہ ﷺ نے مخصوص ہدایات دے کر ایک خاص مقام پر متعین کیا تھا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایات پر عمل نہیں کیا، بلکہ ان میں سے بعض کے دل میں مالِ غنیمت جمع کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، لیکن انہیں اپنی توقعات کے برعکس نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان عظیم صحابہ کرام پر تنقید کرنے کی ہم میں اہلیت ہے اور نہ ہی ہمیں یہ حق حاصل ہے۔ وہ مقربین کے مرتبے پر فائز تھے اور مقربین کے ساتھ برتاؤ کے خاص معیارات ہوتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان فرشتہ صفت لوگوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کا معاملہ خاص نوعیت کا تھا، ورنہ ہماری نیکیاں ان کے نزدیک سیئات کا درجہ رکھتی ہیں۔

اگر ہم وہ طرزِ عمل اختیار کریں جو انہوں نے اس وقت اختیار کیا تھا تو ہم بلاشبہ ثواب کے مستحق قرار پائیں گے، کیونکہ اجتہاد ہمیشہ ثواب کا باعث ہوتا ہے، لیکن وہ ان مخلص اور جانثار لوگوں میں سے تھے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر آخرت کی خاطر دنیا کو چھوڑنے کا عہد کیا اور مقرب فرشتوں پر بھی سبقت لے گئے۔ چونکہ ان سے مقربین کی شان کے منافی عمل سرزد ہوا تھا اس لیے ظاہری طور پر وہ مغلوب نظر آئے اور وہ حادثہ پیش آیا، جس میں ان چند سو صحابہ میں سے جن کے نام ہم جانتے ہیں ستر صحابہ شہید ہو گئے۔(577) اور اتنی ہی تعداد اس قدر زخمی ہوئی کہ حرکت کے قابل بھی نہ رہی اور اگر مسلمان جبل احد کی پناہ نہ لیتے تو مشرکین مسلمانوں پر ایک اور وار بھی کر سکتے تھے۔ چونکہ مشرکین کے خیال میں ان کا پلڑا بھاری تھا، اس لیے انہوں نے دوسری مرتبہ خطرہ مول لینا پسند نہ کیا اور میدانِ جنگ کو فوراً خالی کر دیا۔ دراصل مشرکین کے دل میں خوف سرایت کر گیا تھا، جس کی توجیہ ان کے ذہنوں میں یہ آئی کہ ہم نے مسلمانوں کو اس قدر زک پہنچائی ہے کہ وہ اس شکست کے اثرات سے جلد چھٹکارا نہ پا سکیں گے، لہٰذا ہمیں اب واپس چلے جانا چاہیے، کیونکہ دوسری مرتبہ حملہ کرنے کی صورت میں برآمد ہونے والے نتائج کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، چنانچہ اس بنیاد پر وہ پیچھے ہٹ گئے اور میدانِ جنگ چھوڑ کر چلے گئے پھر جب ان میں سے ایک شخص (جو بعد میں صحابی بنے اور جلیل القدر خدمات سرانجام دیں) نے قریش کو جنگ جاری رکھنے کی ترغیب دی، جس کے بارے میں قرآن

کریم میں آیا ہے کہ شیطان نے قریش کو ابھارا اور اس نے ان سے کہا کہ جب تک حالات تمہارے حق میں ہیں مدینے تک جاؤ۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ انہیں مدینے بھیج کر اسے ایسے ہی تاخت وتاراج کرانا چاہتا تھا جیسے رومیوں نے قارتاجہ نامی شہر کو نیست ونابود کر کے اس میں ایک انسان کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا، کیونکہ اگر ان میں سے ایک فرد بھی زندہ بچ گیا تو وہ بہت جلد زیادہ ہو کر ان کے لیے دوبارہ مشکلات کھڑی کر دیں گے۔(578)

جونہی رسول اللہ ﷺ تک یہ بات پہنچی آپ ﷺ نے حکم جاری فرمایا کہ غزوہ احد کے تمام تندرست وزخمی شرکا دشمن کے مقابلے کے لیے فلاں مقام پر پہنچ جائیں۔(579)

چنانچہ وہ زخمی صحابہ کرام جنہوں نے ایک دن پہلے جبل احد کی اوٹ میں پناہ لی تھی، آج ایک دوسرے حملے کے لیے تیاری کر رہے تھے، کیونکہ مسلمانوں کو درپیش مایوس کن حالات کے سدباب اور تلافی کے لیے بڑے پیمانے پر روحانی طاقت کا مظاہرہ کرنا ناگزیر تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو درج ذیل مایوس کن حالات کا سامنا تھا:

پہلی مایوس کن بات یہ تھی کہ مسلمانوں کی روحانی طاقت میں کمزوری آئی، دوسرے کفار کے حوصلے بلند ہوئے اور تیسرے مسلمانوں کی بدحالی دیکھ کر منافقین کی خوشی میں اضافہ ہوا، جس کے مسلمانوں کے روحانی پہلو پر منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے، چنانچہ اس مشرک کی طرف سے مسلمانوں کی جڑ اکھیڑنے کے لیے ایک بڑے حملے کی تجویز پھیلنے اور مجالس کا موضوع بننے لگی تھی، جو کہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑے خطرے کی گھنٹی تھی اور اگر رسول اللہ ﷺ خطرے کی سنگینی کو فوراً بھانپ کر اس کا تدارک نہ فرماتے تو کسی بڑی مشکل یا ایسے سنگین خطرے کا ظہور ہو سکتا تھا، جس کا سامنا کرنا مسلمانوں کے لیے دشوار ہوتا۔ اگرچہ مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچ چکا تھا، جس طرح معرکہ ''چنق قلعہ'' میں ترک فوج کو نقصان پہنچا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی بدحالی کو دور کر کے اپنے سر پر شکست کے منڈلاتے خطرات کو نصرتِ خداوندی سے فتح میں تبدیل کر دیا۔ جونہی رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو تیار ہو کر جمع ہونے کے لیے کہا وہ تیار ہو کر جمع ہو گئے اور حملے کے لیے چل پڑے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ زخمی تھے تو کسی کے پاؤں اور بعض انتہائی مشقت سے چل رہے تھے، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی پکار سنتے ہی وہ ایک متعین مقام پر جمع ہو گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے رسول اللہ ﷺ کے انفاس طیبہ نے انہیں نئی زندگی عطا کر کے ان میں قوت وعزم کی روح پھونک دی تھی، جس کے نتیجے میں وہ آپ ﷺ کی آواز پر لبیک کہنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کرنے لگے تھے۔ شاعر بوصیری نے کہا تھا:

لو ناسبت قدره آياته عظماً أحيا اسمه حين يدعى دارس الرمم

یعنی اگر آپ ﷺ کے معجزات کا وہی مقام ہوتا جو آپ ﷺ کا تھا تو آپ ﷺ کا نام لینے سے قبروں میں پڑی بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو جاتیں...... آپ ﷺ کی پکار نے احد کے شر کا کوئی زندگی عطا کی اور وہ آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرنے لگے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس واقعے کی تفصیل ایک صحابی کی زبانی سنیں۔ صحابی کی گفتگو کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

ہم نے اپنے ایک دوست کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا، جو چل نہیں سکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم اسے میدانِ جنگ تک اٹھا کر لے جائیں، کیونکہ اگرچہ وہ تیر اندازی نہیں کر سکتا، لیکن نیزہ چلا سکتا ہے۔ ہم میں سے کسی نے ایک دوسرے شخص کو اٹھایا ہوا تھا۔ ہم میں سے بعض بے ہوش ہو کر گر بھی پڑتے، لیکن اس حالت میں بھی ہم وادی حمراء الاسد تک جا پہنچے، جہاں سے مشرکین مسلمانوں کے چولہوں سے اٹھنے والے دھوئیں کو دیکھ سکتے تھے۔ جونہی مشرکین نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھا، جسے وہ اپنے خیال میں ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے تھے، حیرت سے ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابوسفیان پر تو اس قدر خوف طاری ہوا کہ وہ چلا چلا کر کوچ کرنے کے لیے کہنے لگا۔ اگرچہ وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے، لیکن اب انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں اس دفعہ ان پر کوئی مصیبت نہ آن پڑے، لہٰذا اب انہیں صرف جلد از جلد مکہ پہنچنے کی فکر لاحق تھی۔ (580)

اگر آپ غور فرمائیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ کیسے رسول اللہ ﷺ نے مختصر سے عرصے میں جنگ کی تمام مشکلات کو ایسے حل فرمایا کہ ان کے کسی قسم کے اثرات تک باقی نہ رہے۔ قرآن کریم بھی اس مشکل گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَاناً وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (آلِ عمران: ۱۷۳) ''(جب) ان سے لوگوں نے آکر بیان کیا کہ کفار نے تمہارے (مقابلے کے) لیے (لشکر کثیر) جمع کیا ہے تو ان سے ڈرو۔ تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے ہم کو خدا کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔'' (581)

اس موقع پر قریش اپنی ہر چیز چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، جبکہ مسلمانوں کو ماضی سے پہنچنے والے صدمے سے نجات حاصل ہوئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے بغیر کوئی نقصان اٹھائے مدینے

لوٹ آئے۔(582) بعض مغازی اور سیرت نگار جنگ احد کو مسلمانوں کی شکست قرار دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر اس میں شکست کا کوئی پہلو ہے تو وہ صرف ان صحابہ کرام کے لحاظ سے ہے، جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی ہدایات کو توجہ سے نہ سنا اور اس کے نتیجے میں شہادت پا کر پاک صاف ہو کر اپنے خالق سے جا ملے، لیکن دوسری طرف غزوہ احد میں فتح کا پہلو بھی ہے اور میں اسی پہلو پر زور دینا چاہتا ہوں، جسے رسول اللہ ﷺ نے ثابت کر دکھایا، کیونکہ اصل کارنامہ شکست کو فتح میں بدلنا ہوتا ہے۔

مغرب میں ترک قوم کے بارے میں ایک مقولہ مشہور ہے: "بعض لمحات ایسے آتے ہیں جب ہر قوم کی قوتِ مدافعت جواب دے دیتی ہے، لیکن ایسے وقت میں یہ قوم جنگ کا آغاز کرتی ہے۔"

دراصل یہ مقولہ سچے مسلمانوں کے حق میں کہنا چاہیے، تاکہ اس کی صداقت ہمیشہ قائم رہے، یعنی جن لمحات اور حالات میں دوسری قوموں کی قوتِ مدافعت جواب دے دیتی ہے اور وہ سپر ڈال دیتی ہیں، رسول عربی ﷺ اس وقت حملے کا آغاز کرتے ہیں اور اس حملے کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے مشکلات ختم ہوتی چلی جاتی ہیں، اہل ایمان کے دلوں میں ایمان و امید کی کرن پیدا ہوتی ہے، منافقین کے دلوں پر یاس و قنوط کی تاریکی چھا جاتی ہے اور مشرکین کی خواہش ان کے دلوں کا روگ بن جاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے شکست کو فتح میں بدلنے، مسلمانوں کو فتح و مسرت کے ساتھ مدینے لوٹانے اور اپنی حکمت عملی کے ذریعے سے پیچیدہ مشکل کو حل کرنے کو آپ ﷺ کے رسول برحق ہونے کی شہادت کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

۲- شوریٰ

رسول اللہ ﷺ پیش آمدہ بعض مشکلات کو مشاورت کے ذریعے حل فرمایا کرتے تھے۔ اگرچہ آپ ﷺ کو کسی سے مشاورت کی ضرورت نہ تھی، لیکن آپ ﷺ شوریٰ کے معاملے کو ایک اہم اصول کی حیثیت سے راسخ کرنا چاہتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ کے بعد امت مسلمہ کے نمائندوں کو باہمی مشاورت کی ضرورت پڑنے والی تھی، ورنہ آپ ﷺ کو تو تائید الٰہی حاصل تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کسی بھی معاملے میں تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اگر آپ ﷺ بیمار پڑتے تو اس کا علاج الہام خداوندی کی ذریعے آپ کو القا کر دیا جاتا تھا۔ آپ ﷺ کا عالم ملکوت کے ساتھ گہرا تعلق تھا، لیکن اس کے باوجود آپ باہمی مشورے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کی فراست کا ایک اور پہلو ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد صدیوں تک شوریٰ کو نظام سلطنت کے چلانے میں مرکزی حیثیت رہی ہے۔

چونکہ اسلام میں ادارتی نظام کی بنیاد شوریٰ پر ہے، اس میں لچک اور وسعت پائی جاتی ہے اور وہ اپنی عالمگیریت کے سبب کئی زمانوں پر محیط ہوسکتا ہے، اس لیے وہ زمانے کی حدود پھلانگ کر دورِ حاضر تک پہنچ گیا ہے۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی بعض مثالیں پیش کریں گے:

۱- رسول اللہ ﷺ ہر کسی سے مشاورت فرماتے اور اس کی رائے لیتے، کیونکہ آپ ﷺ معاشرے میں شوریٰ کے نظام کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مشاورت فرمائی جن کا مقولہ مشہور ہے کہ اگر حجاب اٹھا دیا جائے تو میرے یقین میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوگا۔(583) لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نبوی مکتبِ فکر کے شاگرد بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے اس دور میں مشورہ لیا جب وہ بالکل نوجوان تھے۔(584)

واقعہ افک میں منافقین نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تھی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت نازل فرمائی۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو پورا یقین تھا کہ وحی کے ذریعے اس بارے میں فیصلہ کن بات معلوم ہو جائے گی اور آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کوئی تشویش نہ تھی، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے کئی بار مشورہ فرمایا، کیونکہ اس قسم کے مشوروں میں مصلحت تھی۔ مشورے میں ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے کبھی نقصان نہیں ہوتا اور رسول اللہ ﷺ کی تو بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہمارے لیے خیر کے امور کی طرف ہماری راہنمائی فرمائیں۔

اس واقعے کے بارے میں ایک ضعیف روایت میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! عائشہ بری الذمہ اور پاک صاف ہیں۔'' جب آپ ﷺ نے پوچھا کہ انہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی تو حضرت عمر نے جواب دیا: ''ہمیں یہ بات یوں معلوم ہوئی کہ ایک دفعہ آپ نماز پڑھ رہے تھے، لیکن آپ کو معلوم نہ تھا کہ آپ ﷺ کے جوتے کے ساتھ معمولی سی نجاست لگی ہوئی ہے، اس پر جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور آپ ﷺ کو جوتا اتارنے کے لیے کہا۔ جب اللہ تعالیٰ آپ کو اتنی معمولی سی نجاست کے بارے میں بتا دیتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آپ کے لیے ایسی بیوی پسند فرمائیں، جو معاذ اللہ اس قسم کے گناہ کا ارتکاب کرتی ہو۔ یقیناً حضرت جبرائیل آ کر آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عفت کے بارے میں آگاہ کریں گے۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''مشاورت کرنے والا پشیمان نہیں ہوتا۔''(585) اسی لیے آپ ﷺ نے مشاورت فرمائی۔ اس قسم کی مشاورت سے آپ ﷺ کا تو کچھ گیا نہیں، بلکہ ہوسکتا ہے یہ

حضرت عمر کا دل ایک بار پھر جیتنے کا باعث بن گئی ہو۔ آپ ﷺ اپنے شاگردوں سے مشاورت فرما کر ان کی رائے لیا کرتے تھے۔ اگر چہ اس قسم کے مشوروں میں ان طلباء کا ہی فائدہ ہوتا تھا، کیونکہ اس طرح آپ ﷺ اپنے طلباء کو اخلاقی درس دیا کرتے تھے، نیز آپ ہی کا ارشاد ہے: ''مشاورت کرنے والا کبھی پشیمان نہیں ہوتا۔''

۲- جب رسول اللہ ﷺ غزوہ بدر کے لیے نکلے تو آپ نے انصار و مہاجرین سے مشاورت فرما کر ان کی آراء لیں، چنانچہ حضرت مقداد بن عمرو نے مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کی: ''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ جو بات آپ کو سُجائے اس کے مطابق فیصلہ فرمایئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم! ہم آپ سے وہ بات نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ تم اور تمہارا پروردگار جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ اور آپ کا پروردگار جا کر لڑو، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا! اگر آپ ہمیں برک الغماد تک لے گئے تب بھی ہم آپ کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے وہاں تک جائیں گے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خوب'' اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔'' آپ ﷺ انصار کا مشورہ چاہتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کی اکثریت تھی، دوسرے انہوں نے عقبہ میں بیعت کے وقت کہا تھا۔ ''یا رسول اللہ! جب تک آپ ہمارے شہر میں نہیں پہنچ جاتے، اس وقت تک ہم آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہیں، البتہ جب آپ ہمارے پاس پہنچ جائیں گے تو آپ ہماری حفاظت میں ہوں گے۔ ہم ہر اس چیز سے آپ کا دفاع کریں گے، جس سے ہم اپنی عورتوں اور بچوں کا دفاع کرتے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ کو اندیشہ تھا کہ کہیں انصار یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ ان کے ذمے میری مدد صرف ان دشمنوں کے خلاف ضروری ہے، جو مدینے میں آکر مجھ پر حملہ آور ہوں اور ان کے شہر سے باہر کسی دشمن کی طرف جانا ان پر ضروری نہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو سعد بن معاذ نے عرض کی: ''بخدا! شاید آپ ہمارا مشورہ چاہتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں'' اس پر انہوں نے عرض کی: ''ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی اور جو دین آپ لے کر آئے اس کی صداقت کی گواہی دی۔ ہم نے آپ کے ساتھ اطاعت گزاری کے عہد و پیمان کیے ہیں۔ یا رسول اللہ! آپ جو چاہتے ہیں کر گزریئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! اگر آپ ہمیں سمندر کے سامنے لے گئے اور پھر آپ اس میں اتر گئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس میں اتر جائیں گے

اور ہم میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہمیں یہ بات ناپسند نہیں کہ آپ ہمیں کل اپنے دشمنوں کے مقابلے میں آنے کے لئے کہیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے اور دشمن سے سامنے کے وقت اپنی بات کے سچے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے خوش آئند بات دکھائیں گے۔ اب اللہ کا نام لے کر چل پڑیئے۔"(586)

رسول اللہ ﷺ مسلمانوں میں اتفاق کی روح اجاگر کرنے کے لیے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ انصار و مہاجرین ایک چیز پر متفق تھے اور وہ تھی جہاد اور شہادت کا عزم۔ یہی وہ طرزِ عمل تھا جو ان پرغیظ و غضب سے بھرے اور تلواروں، نیزوں اور تیروں کے ذریعے ان کا خاتمہ کرنے کے لیے تیار دشمنوں کے لشکر جرار کے خلاف اختیار کرنا ضروری تھا۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ حق، اسلام کی عزت و ناموس اور امت مسلمہ کے شرف کی حفاظت کے لیے تیار تھے۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ سے مشاورت فرماتے، اپنی رائے گرامی کا وسیع پیمانے پر اظہار فرما کر اسے ٹھوس دلائل سے ثابت فرماتے اور پھر اپنی اس رائے کو اپنے تمام صحابہ کے احساسات اور مشاعر کے سامنے امانت کی حیثیت سے رکھ دیتے۔ مشاورت آپ ﷺ کی ایک اہم غایت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سامنے راستے کا نقشہ کھینچ کر آپ کو آپ کا لائحہ عمل بتا دیا تھا، لیکن آپ ﷺ اللہ تعالی کی اس راہنمائی کے ساتھ ساتھ کسی بھی اہم معاملے میں فکر و احساس کی سطح پر اشتراک پیدا کرنے کے لیے اپنے صحابہ کے ساتھ مشاورت فرماتے رہتے، حالانکہ کسی بھی صحابی کے لیے آپ ﷺ کی مخالفت یا حکم عدولی کرنے کی گنجائش نہ تھی، کیونکہ وہ آپ ﷺ کی اطاعت اختیار کرنے کا عہد و پیمان کر چکے تھے اور ایک دن آنے والا تھا، جب آپ ﷺ نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہنا تھا: "تم پیچھے کیوں رہ گئے، کیا تم نے اپنی ذات کا سودا نہ کیا تھا۔" حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عقبہ میں رسول اللہ سے عہد کیا تھا کہ جب تک رات دن کا سلسلہ جاری رہے گا اس وقت تک تنگی اور آسانی میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہیں گے۔(587) وہ آپ ﷺ کے ساتھ عہد کر چکے تھے، چنانچہ انہوں نے پوری رضامندی کے ساتھ اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

رسول اللہ ﷺ اس لیے بھی مشاورت فرماتے تھے تاکہ تمام مسلمان آپ ﷺ کی دعوت کے علمبردار بن جائیں، چنانچہ ہر ایک اپنی استطاعت کی بقدر آپ ﷺ کی مدد کے لیے لپکتا، اس دعوت کا علمبردار بننے کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتا اور اس کی خاطر شہادت کو اپنی سب سے بڑی خواہش قرار دیتا۔

۳- جب رسول اللہ غزوہ بدر کے موقع پر مدینے سے نکلے تھے تو ٹھہرنے کے لیے جگہ کا تعین

اور وہاں موجود کنوؤں اور ٹیلوں پر قبضہ کرنا ناگزیر تھا، نیز اس کے بارے میں صحابہ سے مشاورت بھی ضروری تھی۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں: ''چنانچہ رسول اللہ ﷺ نکلے اور صحابہ کو لے کر تیزی سے پانی کی طرف بڑھے اور مقام بدر کے سب سے قریبی پانی کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ مجھے بنو سلمہ کے بعض لوگوں کے واسطے سے بتایا گیا کہ حباب بن منذر بن جموح نے اس موقع پر پوچھا: ''یا رسول اللہ! آپ کا اس پڑاؤ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں پڑاؤ ڈالنے کے لیے کہا ہے کہ جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی یا یہ ایک رائے، جنگی حکمت عملی اور چال ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ یہ رائے، جنگی حکمت عملی اور چال ہے۔'' اس پر انہوں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! تب یہاں پڑاؤ مناسب نہیں۔ لوگوں کو لے کر چلئے یہاں تک کہ ہم (دشمن) قوم کے سب سے قریبی پانی تک پہنچ جائیں اور وہاں پڑاؤ ڈالیں پھر ہم اس سے دوسری طرف کے کنوؤں کو بند کر دیں گے اور ان پر حوض بنا کر اس میں پانی بھر لیں گے، جس کے نتیجے میں ہم ایسی حالت میں (دشمن) قوم کے ساتھ جنگ لڑیں گے کہ ہمارے پاس تو پانی ہوگا لیکن وہ پیاسے ہوں گے۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے درست مشورہ دیا ہے۔''(588)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی غلام تھے۔ شروع میں وہ مجوسی تھے پھر عیسائیت قبول کی اور آخر میں غلامی کی حالت میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ قبولِ اسلام کے وقت ان کے پاس مال و دولت تھی اور نہ ہی اہل و عیال۔ وہ اپنی نسبت مکمل طور پر اسلام کی طرف کرتے تھے۔ جب ان سے ان کے باپ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے یہ بات اس مختصر سے جملے میں ارشاد فرمائی: ''لوگ قیس و تمیم پر فخر کرتے ہیں، لیکن میرا باپ اسلام ہے۔ اس کے سوا میرا کوئی باپ نہیں۔'' بلاشبہ انہوں نے اپنا اصلی نسب پا لیا اور ابن الاسلام کہلائے۔

غزوہ خندق میں بھی رسول اللہ ﷺ نے حسب عادت صحابہ کرام سے مشاورت فرمائی اور ہر ایک نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ جب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی باری آئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ وہ اپنے ملک میں دشمن کے حملہ آور ہونے کی صورت میں شہر کے گرد خندق کھود لیا کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے مدینہ کے گرد خندق کھودنے کی تجویز دی۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ ﷺ نے خندق کی کھدائی کا حکم دیا، بلکہ خود بھی کھدائی کے کام میں شرکت کر کے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔(589)

۵- آپ ﷺ صرف مردوں سے ہی مشاورت نہ فرماتے، بلکہ عورتوں سے بھی رائے لیتے تھے، چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت اُم سلمہ سے رائے لی اوران کی تجویز پر عمل درآمد کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ فرمایا۔(590)

آپ ﷺ نے عمر بھر یہ طرزِ عمل اختیار کیے رکھا اور مشاورت کے ذریعے مشکل ترین مسائل کو حل فرمایا۔ ہمیں ملکی معاملات کے چلانے میں مشاورت کی اہمیت کا احساس دیر سے ہوا ہے۔ ڈکٹیٹر اپنے جانے سے پہلے مشکلات کا طوفان کھڑا کر چکے تھے۔ آپ ﷺ نے عقل اور فکر کا احترام کرنا سکھایا ہے۔ جس طرح عقل کے وجود یعنی غور وفکر اور عقلی مقدمات قائم کرنے میں حکمت ہے، اسی طرح انسانی فکر کے وجود میں بھی حکمت ہے کہ اس فکر کی طرف نہ صرف وحی پر مبنی دعوتیں، بلکہ وحی سے منسلک ہستیاں بھی رجوع کرتی ہیں کہ ان کی توجیہ اسی فکر کے ذریعے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص میں عقل نہ ہو وہ ہماری شریعت میں مکلّف نہیں کہلاتا۔ اس بات کو ہمارے دین کی ایک اہم اساس کا درجہ حاصل ہے۔

پانچویں فصل: وحدتِ فکر و عمل

رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو وحدتِ فکر و عمل ہے۔ آپ ﷺ نے جس ہدف تک پہنچنا چاہا اس کی طرف چل پڑے اور جو بھی فکر پیش کی اسے عملی جامہ پہنا کر دکھایا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے پیروکاروں نے بغیر کسی تردّد، اضطراب اور حیرت کے آپ ﷺ کے ہر ارشاد کو عملی زندگی میں اپنایا۔

الف: منصوبہ ساز انسان

منصوبہ سازی کو دورِ حاضر میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ریاستیں اور قومیں بہبود و ترقی کے شعبے میں ایک اہم اساس کی حیثیت سے ہر معاملے میں منصوبہ بندی کا خصوصی اہتمام کرتی ہیں۔ اسی ہدف کے حصول کے لیے ہمارے ہاں سرکاری سطح پر منصوبہ سازی کا ادارہ ہے، جس کے بغیر نمو، پیش رفت اور متوازن ترقی ممکن نہیں ہوتی۔ کسی بھی معاشرے کی نبض اس کے منصوبوں کی روشنی میں ٹٹولی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی کمپیوٹر یا الیکٹرانک مشین تھی اور نہ ہی کوئی منصوبہ ساز ادارہ، لیکن اس کے باوجود آپ موقع پر ہی فوراً درست فیصلے فرماتے اور پھر ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اقدامات شروع فرما دیتے۔ آپ ﷺ صدیوں پرانے مسائل کے بارے میں فیصلے فرماتے، لیکن کسی بھی مسئلے میں کوئی مشکل باقی نہ رہتی، یعنی کسی نے بھی کسی مسئلے کے بارے میں آپ ﷺ کی رائے کی مخالفت کی اور نہ ہی ایسا ممکن تھا۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ چونکہ آپ ﷺ تبلیغ کے مکلّف تھے، جس پر ہم اوپر ایک مختلف پہلو سے روشنی ڈال چکے ہیں، اس لیے آپ ﷺ اپنے اقدامات کے بارے میں نہایت محتاط تھے اور اپنے ہدف سے ایک ذرہ برابر بھی آگے پیچھے نہ ہوتے تھے۔ آپ ﷺ کی ساری زندگی اس بات کی شاہد ہے۔ مکہ میں ہم آپ ﷺ کو صبر و تحمل کا نمونہ بنا ہوا دیکھتے ہیں۔ آپ ﷺ بغیر کسی اکتاہٹ کے دعوت کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے صبر و سکون کے ساتھ انتظار فرماتے رہے۔ آپ ﷺ کے سمندر جیسے گہرے سکون کو خاموش سرگرمی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں آپ ﷺ کمزوروں کی حفاظت کے لیے مختلف علاقوں کی طرف ہجرت کرنے کے احکام بھی جاری فرماتے رہے، چونکہ اس دور میں طاقت کا پلڑا آپ ﷺ کے دشمنوں کی طرف جھکا ہوا تھا اور آپ ﷺ کے پاس زیادہ قوت نہ تھی، اس لیے آپ ﷺ کی پوری کوشش جذبات کو ٹھنڈا کرنے، معاملات کو پرسکون بنانے اور حتی الامکان دشمن کو نہ چھیڑنے پر مرکوز تھی، جبکہ دوسری طرف مدینے میں آپ ﷺ نے وہاں کی طاقتوں کے توازن اور مدمقابل کی قوت کے مطابق دعوتی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کی۔ درحقیقت مکہ اور مدینہ کے ادوار کی حکمت عملی کا فرق دعوت کی وسعت، ترقی اور پختگی کے اختلاف کا فطری نتیجہ تھا۔ مکی اور مدنی دور کے اپنے اپنے مخصوص تقاضے تھے۔ اگر آپ ﷺ مکہ میں مدینہ کی حکمت عملی اختیار فرماتے تو نعوذ باللہ یہ دوررس اور گہری حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے مالک انسان کی حکمت عملی میں بہت بڑا نقص ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو انسانیت کو اضطراب و پریشانی کی حالت سے نکالنے کی خاطر درست فیصلے کرنے کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔

لہٰذا آپ ﷺ نے مدینہ میں وقت کی ضرورت کے مطابق ایک دوسری حکمت عملی اختیار فرمائی۔ آپ ﷺ کا ہر پہلا اقدام اگلے اقدام کے لیے تمہید اور ہر اگلا اقدام پہلے اقدامات کا قدرتی نتیجہ ثابت ہوتا۔ آپ ﷺ نے عمر بھر کبھی بھی پیچھے کی طرف قدم نہیں اٹھایا، بھلا جس شخصیت نے غزوہ احد میں شکست کو فتح میں بدل دیا ہو، اس سے پیچھے کی طرف قدم اٹھانا کیسے ممکن تھا؟ لہٰذا آپ ﷺ نے کبھی بھی پیچھے کی طرف قدم نہیں اٹھایا، بلکہ آپ ﷺ کا ہر اقدام آپ کی رسالت کی دلیل تھی۔ ہجرت کے مسئلے میں آپ ﷺ کا طرز عمل اور حکمت عملی اس کی زندہ مثال ہے۔ حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت دراصل ہدایت و نصرت کی تمہید اور خفیہ راہداری تھی۔

ب: نسل پرستی: دور حاضر کا اہم ترین مسئلہ

کتنی ہی مشکلات ہیں، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اُس دور میں حل فرما دیا تھا، لیکن آج وہ نا قابل حل مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ مستقبل قریب اور بعید میں جو مشکلات سر اٹھانے والی ہیں، وہ تعداد میں زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے مربوط ہوں گی، مثلاً اس بات کا واضح امکان ہے کہ سیاہ فاموں کا مسئلہ مستقبل بعید میں انسانیت کو درپیش اہم ترین مسئلہ بن جائے۔ یہ مسئلہ آج بھی سر اٹھانے کے لیے بالکل تیار ہے اور کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں ہے۔ اس مسئلے کی سنگینی کا ادراک رکھنے والا ہر انسان پریشان ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں، لیکن ابھی تک سیاہ فام شخص کو انسان کی حیثیت سے نہیں دیکھا جاتا۔ جنوبی افریقہ میں وہ اپنی رنگت کی وجہ سے تذلیل کا شکار ہے تو امریکہ میں کسی اہم منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ فرانس اور جرمنی میں غیر ملکیوں کو اہانت اور مار پٹائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس مسئلے پر اپنا دست شفقت رکھ کر اسے بڑی سہولت سے حل فرما دیا تھا۔ آپ ﷺ کے متعارف کردہ اصولوں کے پیش نظر ساری انسانیت کنگھے کے دندانوں کی طرح مساوی ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری حاصل ہے اور نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر۔[591] اگر ایک حبشی غلام بھی شرائط کے مطابق حاکم بن جائے تو اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔[592]

اس موضوع پر اور بھی بہت سی احادیث نبویہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درج ذیل ارشاد ہے: ''ابوبکر ہمارے سردار ہیں جنھوں نے ہمارے سردار (حضرت بلال) کو آزادی دلائی۔''[593]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی رنگت سیاہ تھی اور انہیں غلام کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے انہیں آزاد فرما کر اپنا لے پالک بنا لیا۔[594] یہ بات اس دور میں نا قابل فہم اور معیوب سمجھی جاتی تھی۔ بھلا ایک عالی النسب انسان کیسے ایک سیاہ فام غلام کو لے پالک بنا کر اپنا وارث ٹھہرا سکتا ہے۔[595] صرف یہی نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے ان کے بیٹے حضرت اسامہ کو ایک ایسے لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا، جس میں حضرت ابوبکر، عمر اور علی جیسے کبار صحابہ شامل تھے۔[596] اور اس سے بھی بڑھ کر نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید کی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے شادی کی[597] جو اپنے حسب ونسب کی وجہ سے ایک نبی کی بیوی بننے کی حقدار تھیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ حضرت زید بن حارثہ اور ان کے بیٹے حضرت اسامہ رسول اللہ ﷺ کے اس قدر مقرب تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے والد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ان کے دورِ خلافت میں شکوہ کرتے ہوئے کہنا پڑا: ''اے امیر المؤمنین! آپ مجھ پر ایک ایسے شخص کو فوقیت دیتے ہیں، جو مجھ سے عمر میں بڑا ہے اور نہ ہی ہجرت میں افضل ہے اور نہ ہی وہ کسی ایسی لڑائی میں شریک ہوا ہے، جس میں میں نے شرکت نہ کی ہو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: ''وہ کون شخص ہے؟'' حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: ''اسامہ بن زید'' اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بخدا تم نے درست کہا۔ میں نے یوں اس لیے کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو زید بن حارثہ، عمر سے اور اسامہ بن زید، عبداللہ بن عمر سے زیادہ محبوب تھے۔''(598)

اس دور میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا کسی ایسے لشکر کی قیادت سنبھالنا بڑی اہمیت رکھتا تھا، جس میں قریش کے شرفا میں سے حضرت جعفر بن ابی طالب شامل ہوں۔(599) یہاں اس قسم کی مثالیں پیش کر کے محض مدح سرائی مقصود نہیں، بلکہ اسلامی اصولوں کو عملی زندگی میں منطبق ہوتے ہوئے دکھانا مقصود ہے۔

اوپر ہم نے مستقبل میں انسانیت کو درپیش جس مشکل کا ذکر کیا ہے، اس کا واحد حل مزید وقت ضائع کیے بغیر سیاہ فام آبادی کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق برتاؤ کرنا ہے۔ انسانیت کو چاہیے کہ پانی سر سے گزرنے سے پہلے اس حل کو آزما لے۔

انسان آزد پیدا ہوتے ہیں، کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کو غلام بنائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳) ''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے۔''

ج: صلح حدیبیہ

ہم ایک بار پھر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے افکار کو عملی جامہ پہنانے اور انہیں ایک جیتی جاگتی تصویر کے طور پر پیش کرنے کے لحاظ سے بے مثال قائد و راہنما تھے۔ اس بارے میں بے شمار دلائل و شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں، تاہم ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

ابن اسحاق سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھ ہجری میں اشتیاق سے لبریز صحابہ کرام سے عمرے کی ادائیگی کا وعدہ فرمایا۔ اس عمرے سے مہاجرین کے دلوں میں وطن کی محبت و شوق کی سلگتی آگ بجھنی اور مسلمانوں میں نئی قوت محرکہ پیدا ہونی تھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ چودہ سو صحابہ کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے سے پہلے قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو جس کے بارے میں اہل مکہ کو صحابی رسول ہونے کا علم نہ تھا، اطلاعِ احوال کے لیے آگے بھیج دیا۔ آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ قریش نے قبائل عرب کو اپنے ساتھ ملا کر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے مکہ میں داخل نہ ہونے پر اتفاق کر لیا ہے۔

قریش ہر قیمت پر مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے کے بارے میں پرعزم تھے، خواہ اس کے لیے انہیں اسلحہ ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے، بلکہ انہوں نے ''بلدح'' نامی مقام پر جنگجوؤں کو مقرر کر کے اپنے ارادے کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ دوسری طرف خالد بن ولید یا عکرمہ بن ابی جہل دو سو جنگجوؤں کے ہمراہ ''کراع الغمیم'' تک آئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ایک مقام ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو آپ مسلمانوں کے ہمراہ اس طرف بڑھے۔ خالد نے یہ دیکھا تو قریش کو نئی خبر سنانے کے لیے مکہ کی طرف دوڑے۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ حدیبیہ تک پہنچ گئے۔ (600) ''حدیبیہ'' مکہ سے پچاس ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جگہ کا نام ہے، جہاں کسی دور میں اس نام سے ایک کنواں ہوتا تھا۔ اسی کنویں کے نام سے وہاں موجود بستی کو ''حدیبیہ'' کہا جاتا تھا۔

۱- پانی کا معجزہ

جہاں مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تھا، وہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں ایک کنواں ہوتا تھا، لیکن اب وہ خشک پڑا تھا، چنانچہ لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! اس وادی میں تو کہیں بھی پانی نہیں کہ جس کے پاس پڑاؤ ڈالا جائے۔'' آپ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر صحابہ میں سے

ایک شخص کو دیا۔ وہ اسے لے کر ایک کنویں میں اترا اور اسے اس میں گاڑ دیا، جس کے نتیجے میں وہاں سے پانی ابلنے لگا۔ یہ بلاشبہ معجزہ تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی پانی کی ضرورت پورا کرنے کے لئے اپنے نبی کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا تھا۔ سارے لوگوں نے اس سے پیاس بجھائی، وضو کیا اور اپنے اپنے برتن بھر لیے۔

۲- نمائندوں کا تبادلہ

اگرچہ قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور جب انہیں قریش کی جنگی تیاریوں کی اطلاع ملی تو ان کا ایک وفد اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کو بتانے کے لیے روانہ ہوا... بدیل بن ورقہ بھی وفد میں شامل تھے، جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے، بلکہ فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ ان پر اعتماد کرتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے انہیں اہل مکہ کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میں لڑائی کرنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ میرا مقصد عمرے کی ادائیگی ہے۔

بُدیل نے مکہ آ کر قریش کو رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچا دیا۔ سامعین میں عروہ بن مسعود ثقفی بھی شامل تھے، جنہیں بُدیل کی بات میں معقولیت نظر آئی، چنانچہ انہوں نے اہل مکہ کی طرف سے جا کر رسول اللہ ﷺ سے مذاکرات کرنے کی تجویز دی۔ قریش نے ان کی نمائندگی کو پسند کیا۔

عروہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گفتگو کا آغاز کیا اور گفتگو کے دوران عربوں کی عادت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی داڑھی مبارک کو ہاتھ لگانے لگے۔ مغیرہ بن شعبہ رسول اللہ ﷺ کے سرہانے زرہ پہنے کھڑے تھے اور جب عروہ رسول اللہ ﷺ کی داڑھی مبارک کو پکڑتے تو یہ ان کے ہاتھ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہتے: ”اپنے ہاتھ کو رسول اللہ ﷺ کے چہرے مبارک سے دور رکھو پہلے اس کے کہ وہ تمہاری طرف لوٹ کر نہ جائے۔“ عروہ نے پوچھا: ”اے محمد! یہ کون ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ تمہارا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ ہے۔“ اس نے کہا: ”او غدار! تمہارے کار بد کو کل ہی تو میں نے دھویا ہے۔“ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی تھی کہ انہوں نے مغیرہ کے ایک جرم کی پاداش میں دیت ادا کی تھی۔ ان کے بھتیجے مغیرہ قبولِ اسلام کے بعد اس قدر تبدیل ہو گئے تھے کہ ان کے چچا بھی انہیں نہ پہچان سکے پھر مسلمانوں کا اپنے قائد کے ساتھ اس قدر شدید محبت کا مظاہرہ اس پر مستزاد تھا۔ آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کا رویہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ آپ ﷺ وضو فرماتے تو صحابہ اس کے پانی پر لپکتے اور اگر آپ ﷺ کا کوئی بال مبارک گرتا تو وہ اسے اٹھا لیتے۔ جب عروہ قریش کے پاس واپس گئے تو ان سے کہا:

''اے قریش کے لوگو! میں کسریٰ، قیصر اور نجاشی کے درباروں میں گیا ہوں۔ بخدا! میں نے کسی قوم کے ہاں بادشاہ کا ایسا مقام نہیں دیکھا، جیسا مقام محمد کو اپنے صحابہ کے ہاں حاصل ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے، جو کسی بھی چیز کے عوض ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، لہٰذا تم اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرو۔''

یہ مذاکرات بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خراش بن امیہ خزاعی کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے قریش کے پاس بھیجا، لیکن قریش نے رسول اللہ ﷺ کے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خراش بن امیہ خزاعی کو قتل کرنا ہی چاہتے تھے کہ احابیش نے مداخلت کر کے انہیں بچا لیا، چنانچہ قریش نے ان کا راستہ چھوڑ دیا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آئے۔

۳- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ایلچی کی حیثیت سے

قریش کی طرف ایک اور نمائندہ بھیجنا ضروری سمجھا گیا۔ ابتدا میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا گیا، لیکن چونکہ مکہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دشمن زیادہ اور دوست کم تھے، اس لیے مذاکرات میں ان کی کامیابی کے امکانات کم تھے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس خدشے کا اظہار کیا تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔

قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو روک لیا۔ اسی دوران ان کے قتل کی افواہ پھیل گئی، جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی واپسی میں تاخیر سے مزید تقویت ملی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو حضرت عثمان کے قتل کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہم (دشمن) قوم سے جنگ تک یہاں سے نہ ہٹیں گے۔'' آپ ﷺ نے بیعت کی دعوت دی اور ایک درخت کے نیچے بیعت کے لیے بیٹھ گئے۔ اسی لیے اس بیعت کو ''بیعة الرضوان تحت الشجر'' ''درخت کے نیچے بیعت رضوان'' کہتے ہیں۔ مسلمان آپ ﷺ سے موت پر بیعت کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس درخت کو اس اندیشے سے کاٹ دیا کہ کہیں لوگ اسے مقدس نہ سمجھنے لگیں۔ (601)

۴- موت پر بیعت

مسلمانوں کو جونہی بیعت کے بارے میں پتا چلا وہ شہادت تک لڑتے رہنے کی بیعت کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑے۔ اس موقع پر ایک شخص کے سوا تمام مسلمانوں نے جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی۔ (602)

اس وقت مکہ میں ایک شخص تھا، جو اس بیعت میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ وہ شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے، جن کے بارے میں مسلمانوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ آیا وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر کچھ لمحات ایسے بھی گزرتے جب زمان و مکان آپ ﷺ کے سامنے سمٹ جاتے اور آپ ان سے ماوراء چلے جاتے۔ اس موقع پر کچھ ایسی ہی کیفیت میں آپ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ یہ ارشاد فرماتے ہوئے اٹھایا: ''یہ میرا ہاتھ ہے۔'' پھر بایاں ہاتھ یہ کہتے ہوئے اٹھایا: ''یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔'' پھر ان میں سے ایک کو دوسرے پر رکھ دیا۔[603] وہ بیعت کس قدر مقدس ہوگی، جو رسول اللہ ﷺ نے بطور وکالت کے کی۔

معاملہ انتہائی سنگینی اختیار کر چکا تھا، کیونکہ احساسات مجروح اور جذبات بھڑکے ہوئے تھے، جو کسی وقت بھی آتش فشاں کی طرح پھٹ سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ واحد شخص تھے، جنہیں اپنے اوپر مکمل قابو حاصل تھا، اگرچہ آپ ﷺ کے سینے میں بھی جذبات کا آتش فشاں کھول رہا تھا، جس سے کسی بھی وقت لاوا بہہ سکتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اپنی مافوق الفطرت قوتِ ارادی کے ذریعے جذبات پر قابو پا رکھا تھا۔ سبحان اللہ! آپ ﷺ کس قدر مضبوط ارادے کے مالک تھے۔

۵- غم کے بادل چھٹ گئے

ماحول میں کشیدگی طاری تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف آتے ہوئے ایک گھڑ سوار کے غبار کو دیکھا۔ وہ سہیل بن عمرو تھے، جنہیں رسول اللہ ﷺ پہچانتے تھے، آپ ﷺ نے اپنے پاس کھڑے لوگوں سے کہا: ''اس آدمی کو بھیجنا اس بات کی دلیل ہے کہ قوم صلح کی خواہش مند ہے۔'' کیا رسول اللہ ﷺ نے سہیل کے نام سے نیک فال لیتے ہوئے یہ رائے قائم کی تھی کہ اب معاملات میں سہولت پیدا ہوگی؟ یہ ایک دوسرا موضوع ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی لوگوں کے بارے میں آگاہی اور تجربے کو دیکھئے کہ آپ ﷺ نے سہیل کو دیکھتے ہی نتائج کا اندازہ لگا لیا۔ اگرچہ عروہ کو دیکھ کر بھی آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ قریش صلح چاہتے ہیں، لیکن سہیل کی آمد سے اس کی مزید تائید ہوگئی۔ واقعات نے رسول اللہ ﷺ کے اندازے کی توثیق کر دی، کیونکہ سہیل نے آ کر بتایا کہ وہ صلح کو حتمی شکل دینے کے لیے آئے ہیں۔

٦- معاہدہ

نبی اکرم ﷺ نے معاہدے کی جو دفعات طے کی تھیں وہ بظاہر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف دکھائی دیتی تھیں، لیکن قرآن کریم نے مستقبل کے اعتبار سے انہیں مسلمانوں کی فتح قرار دیا۔

سہیل جب بھی مسلمانوں کو کسی بات سے دستبردار کرتے اسے اپنی بہت بڑی کامیابی قرار دیتے

اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اعتراض کرتے، مثلاً جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کے ساتھ معاہدہ صلح لکھوانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے فرمایا: ''بسم اللہ الرحمان الرحیم لکھو۔'' تو سہیل نے کہا: ''میں اسے نہیں جانتا، بلکہ ''باسمك اللهم لکھو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''باسمك اللهم ہی لکھ دو۔'' چنانچہ انہوں نے ایسے ہی لکھ دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا لکھو: ''یہ وہ معاہدہ ہے، جس پر اللہ کے رسول محمد نے سہیل بن عمرو سے صلح کی ہے۔'' اس پر سہیل نے کہا: ''اگر میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا تو آپ سے جنگ نہ کرتا، لہٰذا اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھو۔'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''رسول'' کا لفظ جسے وہ لکھ چکے تھے، مٹانے کا اشارہ فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس میں تردد ہوا، کیونکہ ان کے لئے ''رسول'' کا لفظ مٹانا مشکل تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو خود مٹا کر فرمایا: ''لکھو: یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی ہے۔ دونوں نے دس سال تک آپس میں جنگ نہ کرنے پر اتفاق کیا ہے، اس دوران لوگ پرامن طور پر رہیں گے اور ایک دوسرے (کے خلاف جنگ کرنے) سے رُکے رہیں گے۔ اس شرط پر کہ قریش میں سے جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد کے پاس آئے گا اسے محمد قریش کے حوالے کریں گے اور محمد کی طرف سے جو شخص قریش کی طرف جائے گا وہ اسے محمد و نہیں لوٹائیں گے۔ ہمارے درمیان جنگ بندی ہوگی، جس دوران خفیہ جنگی کاروائی ہوگی اور نہ خیانت۔ جو لوگ محمد کے عقد اور عہد میں داخل ہونا پسند کریں گے وہ اس میں شامل ہوں گے اور جو قریش کے عقد اور عہد میں داخل ہونا پسند کریں گے وہ اس میں شامل ہوں گے۔''

چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے لوگ یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ ہم محمد کے عقد اور عہد میں شامل ہوتے ہیں اور بنوبکر کے لوگ یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ ہم قریش کے عقد اور عہد میں شامل ہوتے ہیں۔ قریش کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر یہ شرط بھی لگائی گئی تھی کہ اس سال آپ مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس جائیں گے۔ آئندہ سال ہم آپ کو راستہ دیں گے اور آپ اپنے صحابہ کے ساتھ اس میں داخل ہو کر یہاں تین دن تک قیام کریں گے۔ آپ کے پاس ایک سوار کی ضرورت کا اسلحہ ہوگا اور تلواریں نیام میں ہوں گی، بصورتِ دیگر آپ مکہ میں داخل نہ ہو سکیں گے۔

۷۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی برافروختگی

معاہدے کی دفعات خصوصاً وہ دفعہ جو مشرکین کی اذیتوں سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں کو واپس لوٹانے سے متعلق تھی، پہلی نظر میں مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نظر آتی تھیں۔ ان دفعات نے

مسلمانوں کو عموماً اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خصوصاً برافروختہ کیا، چنانچہ وہ غمزدہ حالت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یا رسول اللہ! کیا آپ رسولِ خدا نہیں ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہیں، یقیناً ہوں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہیں، بالکل ہو۔''

حضرت عمر نے پھر عرض کی: ''کیا وہ مشرکین نہیں ہیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہیں، بالکل ہیں۔

اس پر حضرت عمر نے عرض کی: ''پھر ہم اپنے دین کے بارے میں ذلت کیوں اختیار کر رہے ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔''

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے یہی بات کہی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: ''اے عمر! ان کی پیروی اختیار کرو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ خدا کے رسول ہیں۔''

بعد میں حضرت عمر کو اس وقت اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکنے پر ندامت ہوئی اور فرمایا کرتے تھے: ''میں اس دن کی گفتگو کی وجہ سے اس دن سے اپنے طرزِ عمل کے کفارے کے طور پر مسلسل روزے رکھتا رہا، صدقہ کرتا رہا، نمازیں پڑھتا رہا اور غلام آزاد کرتا رہا یہاں تک کہ مجھے امید ہوگئی کہ اب میرے ساتھ خیر کا معاملہ ہوگا۔''

۸- ابو جندل

اب ہم معاہدے کی تکمیل کی طرف لوٹتے ہیں، جونہی معاہدے پر دستخط ہوئے ابو جندل مشرکین قریش سے فرار ہو کر بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے آ پہنچے۔ ابو جندل اسی سہیل بن عمرو کے بیٹے تھے، جس کے ساتھ

رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ طے پایا تھا۔ جب سہیل بن عمرو نے اپنے بیٹے ابو جندل کو دیکھا تو ان کے پاس جا کر ان کے چہرے پر تھپڑ مارا اور ان کے گریبان سے پکڑ کر کہا: "اے محمد! اس کے آنے سے پہلے میرے اور آپ کے درمیان معاملہ طے پا چکا تھا۔" آپ ﷺ نے انتہائی مغموم حالت میں فرمایا: "تم نے سچ کہا۔" چنانچہ سہیل انہیں گریبان سے پکڑ کر قریش کی طرف کھینچنے اور گھسیٹنے لگے، جبکہ ابو جندل بلند آواز سے پکار رہے تھے: "اے مسلمانو! میں ان مشرکوں کی طرف لوٹایا جا رہا ہوں، جنہوں نے مجھے آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔" اس سے مسلمانوں کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو جندل کو دلاسا دلانے کے لیے کہ یہ صورتحال عارضی ہے اور عنقریب کشادگی پیدا ہو جائے گی، ارشاد فرمایا: "اے ابو جندل: ثواب کی نیت سے صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور تمہارے ہمراہ دیگر کمزوروں کے لیے کشادگی اور خلاصی کی راہ ہموار کرنے والے ہیں۔" اور فی الحقیقت رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ (604)

۹- ابو بصیر اور ان کے ساتھی

صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ابو بصیر عتبہ بن اسید فرار ہو کر مدینے میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ قریش نے ابو بصیر کو واپس لانے کے لیے دو آدمی بھیجے، جن کے ساتھ آپ ﷺ نے انہیں واپس بھیج دیا، لیکن راستے میں ابو بصیر نے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا، جبکہ دوسرا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ابو بصیر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "اے اللہ کے نبی! آپ نے مجھے واپس بھیج کر اپنی ذمہ داری پوری فرما دی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے نجات عطا فرمائی۔" تاہم رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینے میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی، کیونکہ آپ ﷺ معاہدہ فرما چکے تھے اور آپ اپنے وعدے اور بات کے پابند تھے، چنانچہ ابو بصیر مدینے سے نکل کر "ذی المروہ" کے قریب "سیف البحر" نامی جگہ پہنچ گئے۔ مکہ کے کمزور مسلمانوں کو یہ بات پتا چلی تو وہ بھاگ کر ان کے پاس جانے لگے۔ ابو جندل بن سہیل بن عمرو سب سے پہلے بھاگ کر آنے والے لوگوں میں سے تھے، چنانچہ وہاں ایسے لوگوں کا ایک گروہ جمع ہو گیا، جو قریش کے شام کی طرف جانے والے قافلوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ اس پر قریش نے نبی کریم ﷺ کی طرف پیغام بھیجا اور رشتہ داری کا واسطہ دیتے ہوئے درخواست کی کہ ان لوگوں سے کہیے کہ ان میں سے جو آپ ﷺ کے پاس آئے گا وہ مامون ہو گا، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے انہیں پیغام بھیج کر مدینے بلوا لیا۔ اس طرح اس ظالمانہ دفعہ کا خود اہل مکہ کی درخواست و اصرار پر خاتمہ ہوا، جو مسلمان کی فتح مبین تھی۔ (605)

حدیبیہ سے واپسی پر سورہ فتح کے نزول کا آغاز ہوا، جس میں حدیبیہ کے معاہدے کو فتح مبین سے تعبیر کیا گیا۔ (606)

رسول اللہ ﷺ انتہائی خوش تھے۔ آپ ﷺ نے معاہدے کرتے وقت جو کچھ سوچا تھا وہ اپنے وقت پر وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس فتح کی بنیاد صلح حدیبیہ میں رکھ دی تھی، لیکن لوگوں کو اس وقت واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھی، چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد ''سیف البحر'' کے بہادر نوجوان ''ثنیات الوداع'' کے راستے مدینہ میں داخل ہو رہے تھے اور اہل مدینہ اور رسول اللہ ﷺ انتہائی خوشی کے عالم میں ان کا استقبال کر رہے تھے۔ اس طرح ظالم مشرکین خود اپنے معاہدے کو توڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پھر وہ دن بھی آنے والا تھا جب مشرکین نے نبی کریم ﷺ کے ایک حلیف قبیلے پر دھوکے سے حملہ کر کے اپنے معاہدے کو توڑ ڈالا۔(607) جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اُس فتح و نصرت کو حتمی صورت دینے کے لیے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، جس کی بنیاد آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں رکھی تھی۔

د: صلح حدیبیہ کے نتائج

اب ہم صلح حدیبیہ کے ثمرات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے مسلمانوں کو کیا کیا فوائد حاصل ہوئے۔

ا۔ سیف الاسلام خالد بن ولید اس صلح کے عرصے میں مسلمان ہونے والے پہلے شخص تھے۔ حضرت خالد بن ولید کی شان کے مناسب نہ تھا کہ وہ لڑائی میں شکست کھا کر مسلمان ہوتے۔ ان کی عزتِ نفس جو بعد میں اسلامی حمیت میں تبدیلی ہوگئی، تلوار کے زور پر اسلام قبول کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی، تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے مستقبل کے اس بے مثال سپہ سالار کے لیے عزتِ نفس کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی راہ ہموار کردی۔ اگر صلح کے عرصے میں اس قسم کی فضا قائم نہ ہوتی تو حضرت خالد بن ولید کے دل کی برف کبھی نہ پگھلتی۔

صلح کے اس عرصے میں حضرت خالد کو غور وفکر کرنے کا موقع ملا۔ صلح حدیبیہ کے حالات جو بظاہر مسلمانوں پر ظلم دکھائی دیتے تھے اور آئندہ سال مسلمانوں کے عمرہ کرنے کی کیفیت نے حضرت خالد بن ولید جیسی بہت سی سمجھ دار شخصیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ صلح کی یہ مدت ان کے حق میں طہارت کی مدت ثابت ہوئی اور کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اعلانیہ طور پر قبولِ اسلام کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ (608)

ان کا برضا ورغبت قبولِ اسلام کا اعلان کرنا ان کے ''سیف اللہ'' بننے کا سبب بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو ان سے ایسے ہی طرزِ عمل کی توقع تھی۔ حضرت عمرو بن عاص بھی اسی عرصے میں اسلام قبول کرنے والوں میں سے تھے۔ (609) صلح حدیبیہ کے بعد اکتا دینے والی معمول کی زندگی سے ان بہادرانِ قوم کے دل اچاٹ ہوگئے، جس کے نتیجے میں وہ حرکت وزندگی سے لبریز اُس محاذ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے، جس کی قیادت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں تھی۔

حضرت عثمان بن طلحہ بھی ان عظیم انسانوں میں سے تھے، جن کے دل اسلام نے اس عرصے میں جیتے تھے۔ قبولِ اسلام سے پہلے کعبے کی چابیاں ان کے پاس ہوتی تھیں۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے کعبے کی چابیاں انہی کے حوالے کردیں۔ یہ لوگ اپنی سیاسی اور عسکری مہارت کے ذریعے بڑے بڑے لشکروں کو شکست دے سکتے تھے، لیکن صلح کے اس عرصے میں جب انہوں نے اپنی ذات میں جھانکا تو انہیں حق کی طرف راہنمائی مل گئی۔

۱- کعبے پر کسی کی اجارہ داری نہیں

اس دن تک قریش دوسرے تمام لوگوں کو تکبر و تعلّی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں: ''ہم بیت اللہ کے مالک ہیں۔'' یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی شخص ان کی اجازت کے بغیر کعبے کے قریب نہیں آ سکتا تھا۔ کعبے کی زیارت کے لیے آنے والے ہر شخص کو مخصوص ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، بصورتِ دیگر اسے اس زیارت سے روک دیا جاتا تھا۔

صلح حدیبیہ میں اس ٹیکس یا تاوان کی ادائیگی کی کوئی شرط شامل نہ تھی، جو کہ قریش کے حق میں بہت بڑی غلطی تھی، لہٰذا جب ایک سال بعد مسلمانوں نے یہ ٹیکس ادا کیے بغیر کعبہ کا طواف کیا تو دوسرے قبائل کی بھی آنکھیں کھل گئیں، کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ قریش اکیلے ہی کعبہ کے مالک نہیں، ورنہ مدینہ سے آنے والے مسلمانوں نے یہ ٹیکس ادا کیے بغیر کعبہ کا طواف کیسے کر لیا؟ وہ بھی اس قسم کا حق محفوظ کیوں نہیں رکھتے؟ ہر کوئی اس موضوع پر گفتگو کرنے لگا اور سب پر واضح ہو گیا کہ قریش کو کعبہ پر اجارہ داری حاصل نہیں، چنانچہ آئندہ سالوں میں سارے لوگ بیت اللہ میں بغیر کسی رکاوٹ کے حاضر ہوئے۔

۲- حالتِ امن: دعوتی کام کے لیے سب سے سازگار فضا

اس صلح کے نتیجے میں امن وامان کی فضا قائم ہوئی اور دس سال کے لیے قریش کے مسئلے سے نجات حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کے لیے یہ عرصہ انتہائی اہم بھی تھا اور وقت کی ضرورت بھی۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ کو اپنی تربیت کردہ جماعتوں کو مختلف اطراف میں بھیجنے کی فرصت ملی، جس کے نتیجے میں اسلام کی صدا جزیرہ عرب کے گوشے گوشے میں گونجنے لگی، قرآن کی آواز ہر جگہ بلند ہونے لگی اور لوگ اسلام کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے لپکنے لگے۔ اسی زمانے کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرآن کریم نے کہا تھا: ﴿وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا﴾ (النصر: ۲) ''اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔'' دس سال کا عرصہ ایک پوری نسل تیار کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ قریش کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو کس قدر قیمتی موقع دے دیا ہے، ورنہ وہ اس قسم کے معاہدے کا سوچتے بھی نہیں۔ مسلمانوں نے کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے ترقی کرنے کے لیے اس عرصے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے وہ اسلام کی عسکری قوت میں اضافے اور انہیں مزید پُراُمید بنانے کا باعث بنتے، یہی وجہ تھی کہ جب مناسب وقت پر مسلمان فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے تو قریش کے پاس سپر ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

۳- صلح کے دوران اسلام کا تعارف

صلح حدیبیہ سے ایک دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس سے پہلے فریقین کے درمیان تعلقات منقطع تھے، جس کی وجہ سے ایک فریق کا کوئی فرد دوسری طرف نہیں جا سکتا تھا اور دونوں فریقوں کے درمیان رابطے کی واحد صورت میدانِ جنگ میں آمنا سامنا تھا، جبکہ جنگ کی صورت حال میں مدمقابل تک اسلامی حقائق پہنچانا ممکن نہ تھا، تاہم صلح ہو جانے کے بعد فریقین کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو لوگ اسلام کے حسن و جمال اور محاسن سے ناواقف تھے وہ مدینے آ کر ان سے واقف ہونے لگے۔ وہ اسلام کے حسن و جمال سے حیرت زدہ اور اس کے فضائل و محاسن کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ مدینے کی زندگی انہیں جنت کا نمونہ لگی، جس کے سحر میں وہ گرفتار ہو گئے۔ وضو، اذان، با جماعت نماز، نماز میں نمازیوں پر طاری خشوع و خضوع اور ان کی زندگی میں پایا جانے والا اطمینان و سکون اہل مکہ کے دلوں کو مسحور کر کے اسلام کے قریب لے آیا۔ صلح حدیبیہ کی برکت سے بشمول ابو جہل کے گھرانے کے کوئی گھرانہ بھی ایسا نہ بچا جس تک اسلام کی آواز اور قرآن کا پیغام نہ پہنچا ہو۔ اگر اس وقت ابو جہل زندہ ہوتا تو اپنے گھرانے میں صرف وہی دائرہ اسلام سے باہر رہ جاتا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ صلح حدیبیہ فتح مکہ سے پہلے ہی فتح و نصرت ثابت ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ کوئی بھی اقدام خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتے۔ جونہی آپ ﷺ اپنے ناظرین کے سامنے کوئی خالی جگہ دیکھتے آپ وہاں اپنا قدم مبارک رکھ دیتے۔ وحدت فکر و عمل ہی آپ ﷺ کے تمام مشکلات پر قابو پانے کا راز تھا۔

۴- باقاعدہ طور پر اسلام کا اعتراف

اس صلح کا پانچواں فائدہ یہ حاصل ہوا کہ تمام قبائل اور اقوام نے رسول اللہ ﷺ کی مدینہ میں قائم کردہ ریاست کے وجود اور اس کے معاہدات کرنے کے حق کو تسلیم کر لیا۔ جس طرح دورِ حاضر میں نئی قائم ہونے والی یا اپنی آزادی کا اعلان کرنے والی ریاستیں اپنے ساتھ دوسرے ممالک کے کیے جانے والے معاہدات کو اپنے ریاستی وجود کے جواز کی دلیل کے طور پر پیش کرتی ہیں، اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کا معاہدہ کیا تو آپ ﷺ کو بھی یہ فائدہ حاصل ہوا، مثلاً جب قریش نے آپ ﷺ کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کے ساتھ صلح حدیبیہ کا معاہدہ کر لیا تو اہل طائف کے پاس آپ ﷺ کا اعتراف نہ کرنے کا کوئی جواز نہ رہا؟ چنانچہ اس کے بعد اس قسم کے اعترافات کا تانتا بندھ گیا۔

رسول اللہ ﷺ کتنے عظیم انسان تھے کہ آپ ﷺ نے سخت شرائط پر مشتمل معاہدے سے اتنی بڑی کامیابی حاصل کرلی۔ایک ایسی فضا میں کہ جس میں آپ ﷺ کے لیے زیادہ غوروفکر کا موقع نہ تھا آپ ﷺ کے لیے فیصلہ کرکے اُس معاہدے پر دستخط کرنا ضروری تھا جو بعد میں غیر متوقع طور پر کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا۔بلاشبہ انسان کے وہم وگمان سے بڑھ کر حاصل ہونے والی یہ کامیابیاں آپ ﷺ کے رسول خدا ہونے کی دلیل ہیں، کیونکہ کوئی انسان خواہ کتنی ہی عبقری صلاحیتوں کا مالک کیوں نہ ہو مسلمانوں کی شکست دکھائی دینے والے ایسے معاہدے سے اتنی بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، کیونکہ ایسی کامیابی انسانی حدود سے بالاتر قوت، عزم اور علم پر موقوف ہوتی ہے۔

۵- اس سب کچھ کے پیچھے قدرتِ خداوندی کارفرما تھی

جب انسان اُن مسائل ومشکلات کا جائزہ لیتا ہے، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے حل فرمایا تھا، تو وہ ساری کائنات پر محیط قوت کو آپ ﷺ کی پشت پناہ کی حیثیت سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پہاڑوں جیسی اس بوجھل امانت اور پیغام کو اتنے عمدہ طریقے سے ادا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ دستِ قدرت نے آپ ﷺ کی حفاظت وحمایت اور نگہبانی کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے اور بزبانِ حال کہہ رہا ہے: ''آپ ﷺ میرے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔''جس کے نتیجے میں ہم حالت وجد میں بے اختیار پکار اٹھتے ہیں: "محمد رسول الله" ''محمد اللہ کے رسول ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ تیزی سے فیصلے فرماتے اور انتہائی کم وقت میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ فرمالیتے۔آپ ﷺ جو کام بھی شروع فرماتے اسے کامیابی سے پورا فرماتے۔آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اس بات کی شاہد ہے کہ آپ ﷺ کا کوئی بھی فیصلہ یا طرزِ عمل ایسا نہ تھا کہ بعد میں آپ ﷺ کو اس کے نقص کو دور کرنے یا اس کے انحراف کو درست کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو، بلکہ بعض ایسے امور جو دوسروں کو ابتدا میں ہزیمت دکھائی دیتے تھے، آپ ﷺ نے انہیں بھی فتح میں بدل دیا۔آپ ﷺ کے ہاتھ میں شکست بھی کامیابی میں بدل جاتی، گویا آپ ﷺ چیزوں کی فطرت کو بدل کو انہیں نیا رخ اور جہت عطا فرماتے۔درحقیقت ان تمام امور کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی قدرت کارفرما تھی۔ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ (الصافات: ٩٦)''حالانکہ تم کو اور جو تم بناتے ہو اس کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنی اکرم، اشرف اور افضل ترین مخلوق کے ہاتھوں اپنے افعال کی تخلیق اس لیے فرمارہے تھے، تاکہ لوگوں کو بتائیں کہ یہ میرا بندہ اور رسول ہے اور یاد رکھو میں ہر معاملے میں اس کا

مددگار ہوں، لہٰذا اگر تمہاری تعداد اربوں کھربوں میں ہوئی اور وہ اکیلا ہوا تب بھی وہ تم سب پر غالب آجائے گا، کیونکہ میں اس کا حامی و ناصر ہوں۔ اللہ کے بغیر کسی میں نیکی کرنے کی طاقت ہے اور نہ ہی گناہ سے بچنے کی قوت۔ یہ بات نہ بھولو کہ میں اس کا پشت پناہ ہوں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حمایت یافتہ شخص سے جنگ کرتا ہے درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے جنگ کرتا ہے۔

محمد ﷺ کبھی مغلوب ہوئے اور نہ ہی ایسا ممکن تھا۔ جو لوگ ایسا چاہ رہے تھے وہ اپنی عقل و دل کو جھٹلا رہے تھے، دوسرے لفظوں میں وہ بیچارے ایک محال کام سرانجام دینا چاہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں بعض اشارات دیتے ہیں: ''اپنی حدود سے تجاوز کرنے والو! بیدار ہو جاؤ۔'' اگر انہوں نے ایسے اشارات نہ سمجھے تو ان کی گرفت فرما کر ان کا قصہ تمام کر دیں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کے مددگار ہیں، اس لیے ان کا مقابلہ یا سامنا ممکن نہیں حتی کہ جب آپ ﷺ کو اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے کوئی ناخوشگوار بات پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ﴾ (التحریم: ٤) ''خدا اور جبریل اور نیک کردار مسلمان ان کے حامی (اور دوست دار ہیں) اور ان کے علاوہ (اور) فرشتے بھی مددگار ہیں۔''

جب یہ ساری ہستیاں آپ کی فوج میں شامل ہیں تو اربوں کھربوں لوگ بھی آپ پر غالب نہیں آسکتے اور اگر کسی نے ایسا اقدام کیا تو یہ چٹان سے سر پھوڑنے کے مترادف ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے لیے دو، چار، دس یا پچاس دفعہ انہیں مہلت دیتے رہتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ ان سے کہہ رہے ہیں: ''غور و فکر کرو، سمجھو اور صراط مستقیم کی طرف آؤ تاکہ قیامت کے دن تمہارے پاس کوئی عذر نہ رہے۔'' لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کی پکڑ فرماتے ہیں تو جیسا کہ احادیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے بڑی سخت پکڑ فرماتے ہیں۔[610]

حواشی وحوالاجات

(1) اور بھی بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے صدقِ دل سے اسلام قبول کیا جیسے لیوپولڈ وائس (Leopold Weiss) ''محمد اسد'' اور ''کولن ٹورنز'' وغیرہ (عربی مترجم)

(2) اصحاب کہف کے کتے کا نام ہے۔ (عربی مترجم)

(3) الدارمی، المقدمة، ٣؛ المسند، امام احمد، ١٨٤/٤؛ الشفاء، قاضی عیاض، ١٧٣/١.

(4) المسند، امام احمد، ٧٦/٢.

(5) كشف الخفاء، العجلونی ١٦٤/٢.

(6) دیکھئے: جامع البيان، الطبری، ١٥/١٥؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ١٣٩/٣.

(7) دیکھئے: البخاری، القدر، ٤؛ مسلم، الفتن، ٢٢-٢٥؛ ابو داؤد، الفتن، ١؛ المسند، الامام أحمد، ٤/١، ٣٨٦/٥.

(8) البخاری، المغازی، ١٠، المسند، الامام احمد بن حنبل ٢٩٤/٢، السيرة النبوية، ابن هشام ١٨٢/٣

(9) البداية و النهاية، ابن كثير، ٧٦/٤؛ حياة الصحابة، الكاندهلوی، ١/ ٥٢٤-٥٢٥.

(10) مجمع الزوائد، الهيثمی، ١١٥/٦؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٧٦/٤.

(11) ایک حدیث کا مفہوم ہے: ''جو شخص آپ ﷺ سے میل جول رکھتا وہ آپ ﷺ کا گرویدہ ہو جاتا۔'' الترمذی، باب المناقب، ٨.

(12) دیکھئے: السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٠٣/١-٢٠٤.

(13) الطبقات الكبری، ابن سعد، ١٦٩/١.

(14) الدارمی، مقدمة، ١.

(15) البخاری، بدء الوحی، ١٣؛ مسلم، الایمان، ٢٥٢.

(16) البداية و النهاية، ابن كثير ٢٤١/٣؛ دلائل النبوة، بيهقی ٥٠٧/٢.

(17) دیکھئے: بخاری، بدء الوحی، ٣، ٦؛ مسلم، جهاد، ٧٤.

(18) السيرة النبوية: ابن هشام ١٧٨/١؛ الطبقات الكبری، ابن سعد، ١١٨/١.

(19) حدیث مبارک میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی نسل کو اس کے نسب سے پیدا فرمایا، لیکن میری نسل کو علی بن ابی طالب کے نسب میں رکھ دیا۔'' مجمع الزوائد، الهيثمی، ١٧٢/٩؛ فيض

القدير،مناوی ۲/۲۲۳؛تاریخ بغداد،بغدادی،۱/۳۱۷.

(20) كنزالعمال، الهندی، ۱۱/۳۸٤.

(21) سنة النار: یعنی دوزخا آتشیں کلہاڑا (عربی مترجم)

(22) تورات کے انگریزی ترجمے میں دس ہزار کی تصریح ہے، جس سے فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن اہل کتاب نے عربی تراجم سے دس ہزار کے الفاظ حذف کر دیئے ہیں۔ (عربی مترجم)

(23) البخاری، بدء الوحی، ۳؛ مسلم، الایمان، ۲٥۲.

(24) البخاری، البیوع، ٥۰؛ المسند، الامام أحمد، ۲/۱۷٤.

(25) أبو داود، الأدب، ۱؛ المسند، الامام أحمد، ۲/۳۷۷.

(26) السيرة النبوية، ابن هشام، ٤/٥٥.

(27) البخاری، الأنبياء، ٤۹؛ مسلم، الایمان، ۲٤٤/۲٤۷۔

(28) ﴿اَلَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِىَّ الۡاُمِّىَّ الَّذِىۡ يَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ﴾ [الأعراف: ۱٥۷] ''وہ جو (محمد) رسول (اللہ) کی جو نبی امی ہیں پیروی کرتے ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔'' ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِى التَّوۡرٰٮةِ وَمَثَلُهُمۡ فِى الۡاِنۡجِيۡلِ...﴾ [الفتح: ۲۹] ''اُن کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں...'' ﴿وَاِذۡ قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوۡرٰٮةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ‌ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ﴾ [الصف: ٦] ''اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب مریم کے بیٹے عیسی نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں (اور) جو (کتاب) مجھ سے پہلے آچکی ہے (یعنی) تورات اس کی تصدیق کرتا ہوں (پھر) جب وہ اُن لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔'' نیز دیکھئے: البخاری، البیوع، ٥۰؛ المسند، الامام أحمد، ۲/۱۷٤؛ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: الخصائص الكبرى، السيوطی، ۱/۱۸-۱۳.

(29) البداية والنهاية، ابن كثير، ۲/۲۹٦-۲۹۹.

(30) البخاری، بدء الوحی، ۳؛ مسلم، الایمان، ۲٥۲.

(31) المسند، الامام أحمد، ٥/٤٥۱؛ الترمذی، الأطعمة، ٤٥، القيامة، ٤۲؛ ابن ماجه، اقامة الصلاة، ۱۷٤، الأطعمة، ۱.

(32) الاصابة، ابن حجر، ۲/۳۲۰.

(33) مختصر تفسير ابن كثير، الصابونی، ۱/۱٤۰؛ نیز دیکھئے: الدر المنثور، السيوطی، ۱/۳٥۷.

(34) البخاری، الأنبياء، ۱، مناقب الأنصار، ٥۱؛ المسند، الامام أحمد، ۳/۱۰۸، ۲۷۱-۲۷۲.

(35) یہ اہل مدینہ کا قبرستان تھا جو مدینے کے حدود میں ہی واقع تھا۔ (عربی مترجم)

(36) السيرة النبوية، ابن هشام، ١/٢٢٨-٢٣٤.

(37) البداية والنهاية، ابن كثير، ٣/٨٣؛ كنز العمال، الهندي، ١٤/٣٩-٤٠.

(38) البداية والنهاية، ابن كثير، ٣/٨٣.

(39) البداية والنهاية، ابن كثير، ٣/٨١-٨٢؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ١/٣١٣.

(40) المكتوبات، بديع الزمان سعيد النورسي، ٤٧٧.

(41) البخاري، الدعوات، ٦٦؛ مسلم، الذكر، ٢٥؛ الترمذي، الدعوات، ١٢٩؛ المسند، الامام احمد، ٢/٢٥٢-٢٥٣.

(42) البخاري، المغازي، ٨٣، المرضى، ١٩؛ مسلم، السلام، ٤٦؛ أبو داؤد، الطب، ١٩؛ الترمذي، الدعوات، ٧٦۔

(43) مسند امام أحمد، ١/٤٤٩؛ جامع البيان، الطبري، ٢٤/٣٣۔

(44) بخاري، مناقب الأنصار، ٤٥؛ مسلم، فضائل صحابة، ٢۔

(45) [الأنبياء اخوة لعلات، أمهاتهم شتى ودينهم واحد] یعنی تمام انبیائے کرام ایک باپ کے بیٹوں کی طرح آپس میں بھائی ہیں، اگر چہ ان کی مائیں مختلف ہیں، یعنی سب کا دین ایک ہی ہے اگر چہ بعض فروعی احکام میں اختلاف ہے۔ (بخاري، أنبياء، ٤٨؛ مسلم، فضائل، ١٤٥)۔

(46) البخاري، بدء الخلق، ٧؛ مسلم، جهاد، ١١١؛ البداية والنهاية، ابن كثير ٣/١٦٦؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ٢/٦٠-٦٣۔

(47) حج اور عمرہ دونوں ایک ساتھ ادا کرنا حج اکبر کہلاتا ہے۔ حج اکبر کے بارے میں ایک غلط نظریہ لوگوں میں مشہور ہے کہ یہ وہ حج ہے جس میں جمعہ کے دن یوم عرفہ ہو۔

(48) البخاري، الحج، ١٣٢، المغازي، ٧٧؛ مسلم، الحج، ١٤٧؛ ابن ماجة، المناسك، ٨٤؛ أبو داؤد، المناسك، ٥٦۔

(49) البخاري، فضائل الصحابة، ١؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٢٠٨-٢٠٩۔

(50) البخاري، فضائل الصحابة، ١؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٢١٢۔

(51) كشف الخفاء، العجلوني، ٢/٦٤؛ الفوائد المجموعه، الشوكاني، ٢٨٦۔

(52) مجمع الزوائد، الهيثمي، ١/٢٩٥؛ الطبقات الكبرى، ابن سعد، ٣/٣٥٠۔

(53) حلية الأولياء، أبو نعيم، ١/٣٠-٣١۔

(54) دیکھئے: مسلم، زهد، ٧٤؛ مسند امام أحمد، ١/٢٢٣؛ البداية والنهاية، ابن كثير ٦/١٣٥۔

(55-1) دیکھئے: ﴿ربنا وابعث فیهم رسولاً منهم یتلو علیهم آیاتك ویعلمهم الكتاب والحكمة ویزكیهم انك انت العزیز الحكیم﴾ [بقرة:۱۲۹] ''اے پروردگاران (لوگوں) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجئے جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان (لوگوں) کو پاک صاف کیا کرے۔ بے شک تو غالب (اور) صاحب حکمت ہے۔'' ﴿كما أرسلنا فیكم رسولاً منكم یتلو علیكم آیاتنا ویزكیكم ویعلمكم الكتاب والحكمة ویعلمكم مالم تكونوا تعلمون﴾ [البقرة:۱۵۱] ''جس طرح (من جملہ ان نعمتوں کے) ہم نے تم میں تمہیں میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور تمہیں پاک بناتے اور کتاب (یعنی قرآن) اور دانائی سکھاتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔'' ﴿لقد من الله علی المؤمنین اذ بعث فیهم رسولاً من أنفسهم یتلو علیهم آیاته ویزكیهم ویعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفی ضلال مبین﴾ [آل عمران:۱٦٤] ''خدا نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجے جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔'' ﴿هو الذی بعث فی الأمیین رسولاً منهم یتلو علیهم آیاته ویزكیهم ویعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفی ضلال مبین﴾ [الجمعة:۲] ''وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔'' نیز دیکھئے: المسند، الامام أحمد، ۱/۲۰۲، (وہ گفتگو جو جعفر بن ابی طالب اور نجاشی کے درمیان ہوئی)۔

(55-2) زیر نظر آیات اسی بات کی وضاحت کر رہی ہیں: ﴿أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى﴾ [القیامة:۳۵] ''کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟'' ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ [المؤمنون:۱۱۵] ''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟''

(56) دیکھئے: ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَراً حَتَّى إِذَا جَاؤُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا بَلَى وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ [الزمر:۷۱] ''اور کافروں کو گروہ گروہ بنا کر جہنم کی طرف لے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو اس کے داروغے ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے پروردگار کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ کہیں گے کیوں نہیں، لیکن کافروں کے حق میں عذاب کا حکم ہو چکا تھا۔''

(57) دیکھئے: السیرة النبویة، ابن هشام، ۱/۲۸۵۔

(58) البخاری، التوحید، ۳۲؛ مسلم، الایمان، ۳۲٦۔

(59) البدایة والنهایة، ابن کثیر، ٦/ ٦٠۔

(60) المسند، الامام أحمد، ٢/ ٢٣١؛ مجمع الزوائد، الهیثمی ٩/ ١٨۔١٩۔

(61) مجمع الزوائد، الهیثمی ٩/ ٢١۔

(62) الکلمات، بدیع الزمان سعیدنورسی ص: ٨؛ اللمعات، بدیع الزمان سعیدنورسی، ص: ٢٤٢۔

(63) السیرة النبویة، ابن هشام ٤/ ٤٧؛ مجمع الزوائد، الهیثمی، ٦/ ١٦٩۔

(64) أبو داؤد، الأدب، ؛ المسند، الامام أحمد، ٥/ ٢٥٣۔

(65) البخاری، الایمان، ٣٧؛ مسلم، الایمان، ٧،٥۔

(66) ایک حدیث مبارک میں ہے: [من عمل بمایعلم ورّثه الله علم مالم یعلم] ''جوشخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نئے نئے علوم عطا فرماتے ہیں۔'' (حلیة الأولیاء، أبو نعیم، ١٠/ ١٥)

(67) دیکھئے: ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ﴾ [فاطر: ١٠] ''اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل ان کو بلند کرتے ہیں۔''

(68) الأسرار المرفوعة، علی القاری، ص: ١٩٣۔

(69) مسلم، فضائل الصحابة، ٦١۔

(70) المؤطا، القرآن، ٣٢، الحج، ٦ ٢٤؛ کنز العمال، الهندی، ٥/ ٧٣۔

(71) مسلم، فضائل الصحابة، ١٤١۔

(72) مسلم، الامارة، ١٤٨۔

(73) البخاری، المغازی، ١١؛ ابن ماجة، المقدمة، ١١۔

(74) السیرة النبویة، ابن هشام، ١/ ٢٠٩؛ المسند، الامام أحمد ٣/ ٤٢٥۔

(75) دیکھئے: البخاری، بدء الوحی، ٣، ٦؛ مسلم، الجهاد، ٧٤۔

(76) المسند، الامام أحمد، ٥/ ٣٢٣۔

(77) الترمذی، القیامة، ٦٠؛ المسند، الامام أحمد ١/ ٢٢٠۔

(78) فیض القدیر، المناوی ٣/ ٢٣٢؛ کنز العمال، الهندی ٣/ ٣٤٤۔

(79) البخاری، الأدب، ٦٩؛ مسلم، البر، ١٩٥؛ أبو داؤد، الأدب، ٨٠۔

(80) مسلم، التوبة، ٥٣؛ البخاری، المغازی، ٧٩۔

(81) أبو داؤد، الأدب، ٨٢۔

(82) مسلم، الفتن، ٢٥؛ المسند، الامام أحمد، ٥/ ٣٤١۔

(83) مسلم،الایمان،۲۷۱۔

(84) دیکھئے آیت: ﴿ومایـنـطق عن الھویٰ ان ھوالاوحی یوحی﴾[النجم:۳-۴]"اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ(قرآن)توحکم خداہے،جو(ان کی طرف)بھیجا جاتاہے۔"۔

(85) بخاری،الأنبیاء،٤٥؛مسلم، فضائل الصابة، ٢٣؛الترمذی، المناقب، ١٧۔

(86) البخاری،الدعوات،٣٥،الفتن،١٥؛مسلم،الفضائل،١٣٤۔

(87) مسلم،الجنة،٧٦-٧٧؛النسائی،الجنائز،١١٧۔

(88) المسند امام احمد بن حنبل ٣٦٠/٤_٣٦٤

(89) دلائل النبوة،البیھقی،٥/٢؛البدایة والنھایة،ابن کثیر،٣٤٨/٤۔

(90) الاصابة،ابن حجر،٣٦/٣؛رجال حول الرسول،خالدمحمدخالد،ص:٣٠٤-٣١٢۔

(91) البخاری،الأدب،٢٢؛المسند،الامام أحمد٥/٢٠٥۔

(92) البدایة والنھایة،ابن کثیر،٣٣٥/٢؛مختصرتاریخ دمشق،ابن عساکر،ابن المنظور٢٥٠/٤۔

(93) البخاری،فضائل المدینة،٨؛مسلم،الفتن،٩۔

(94) مسلم،الفتن،٢٦؛البخاری، الصوم۔

(95) البخاری،المناقب،٢٥؛أبوداؤد،الجھاد، ٩٧۔

(96) البخاری،الاستئذان،٤٣؛ مسلم،فضائل الصحابة،٩٨-٩٩؛ ابن ماجة،الجائز،٦٤۔

(97) البخاری،المغازی،٨٣؛مسلم،فضائل الصحابة،٩٨۔

(98) سیرأعلام النبلاء،الذھبی،١٣٤/٢؛ابن ماجة،الجنائز،٥٦؛المسند،الامام أحمد،١٩٧/٣۔

(99) البخاری،المغازی،٣٨؛مسلم،الجھاد،٥٢؛المسند،الامام أحمد،٦/١۔

(100) البخاری،الصلح،٩؛الترمذی،المناقب،٣٠؛النسائی،الجمعة،٢٧؛أبوداؤد، السنة،١٢؛ المسند،الامام أحمد،٤٩/٥۔

(101) البدایة والنھایة،ابن کثیر،٤٥/٨۔

(102) مجمع الزوائد،الھیثمی،٤٠٤/٩-٤٠٥۔

(103) مسلم،الذکر،٤٢؛ أبوداؤد،الوتر،٢٦۔

(104) البخاری،مناقب الأنصار،٩؛مسلم،الجھاد،١٢٧۔

(105) البخاری،المغازی، ٢٩؛مسلم،الجھاد،١٢٣-١٢٥۔

(106) البدایةوالنھایة،ابن کثیر،١١٦/٤؛السیرةالنبویة،ابن ھشام،٢٣٠/٣؛المسند،الامام أحمد،

٣٠٣/٤۔

(107) الترمذی، المناقب، ٥٤ (براء بن مالک انس بن مالک کے بھائی تھے)

(108) الاصابۃ، ابن حجر، ١٤٣/١-١٤٤۔

(109) البخاری، المناقب، ٢٥۔

(110) البدایۃ والنھایۃ، ابن کثیر، ٢٢٥/٩۔

(111) البخاری، الصلاۃ، ٦٣؛ مسلم، الفتن، ٧٠-٧٣۔

(112) الترمذی، المناقب، ٣٤۔

(113) کنز العمال، الھندی، ٥٣٩/١٢؛ البدایۃ والنھایۃ، ابن کثیر، ٢٩٦/٧۔

(114) مسلم، الزکاۃ، ١٤٢؛ البخاری، الأدب، ٩٥، المناقب، ٢٥۔

(115) البخاری، المناقب، ٢٥، الأدب، ٩٥؛ المسند الامام أحمد، ٥٦/٣۔

(116) ایضاً

(117) البدایۃ والنھایۃ، ابن کثیر، ٣٢٠/٧-٣٢١۔

(118) المسند، الامام أحمد، ٨٢/٣؛ مجمع الزوائد، الھیثمی، ١٨٦/٥، ١٣٣/٩۔

(119) البخاری، الجھاد، ٨/٣؛ مسلم، الامارۃ، ١٦٠-١٦١۔

(120) الاصابۃ، ابن حجر، ٤٤١/٤؛ البخاری، الجھاد، ٨۔

(121) البخاری، الجھاد، ٩٥، ٩٦؛ أبو داؤد، الملاحم، ١٠؛ ابن ماجۃ، الفتن، ٣٦؛ المسند، الامام أحمد، ٤٠/٥-٤٥.

(122) المستدرك، الحاكم، ٤٢٢/٤: المسند، الامام أحمد، ٣٣٥/٤.

(123) الاصابة، ابن حجر، ٤٠٥/١.

(124) أبو داؤد، الملاحم، ٥؛ المسند، الامام أحمد، ٢٧٨/٥.

(125) کنز العمال، للھندی، ۴۲۴/۱۱

(126) البخاری، الفتن، ١٦؛ مسلم، الفتن، ٥٤؛ المسند، الامام أحمد، ٥٠/٢، ٧٢.

(127) یہ ۱۹۸۹ کی بات ہے۔

(128) البخاری، الفتن، ٢٤، مسلم، الفتن، ٣٠؛ أبو داؤد، الملاحم، ١٣.

(129) دیکھئے: مسلم، الایمان، ٢٤٤-٢٤٧.

(130) مسلم، الفتن، ١١٠؛ الترمذی، الفتن، ٥٩؛ المسند، الامام أحمد، ١٨٢/٣.

(131) المسند، الامام أحمد، ١/٤٠٧-٤٠٨؛ المستدرك، الحاكم، ٤/٩٨.

(132) درج ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (البقرة: ٨٣) ''اور جب ہم نے بنی اسرئیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں، باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا۔'' ﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (النساء: ٣٦) ''اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔'' ﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (الاسراء: ٢٣) ''اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔''

(133) الدارمی، المقدمة، ٢٧.

(134) ابن ابی الدنیا، العقوبات، ص۔٢١٦

(135) مجمع الزوائد، الهيثمی، ٧/٣٢٤.

(136) ابن ماجة، التجارة، ٥٨؛ المسند، الامام أحمد، ٢/٤٩٤؛ النسائی، البيوع، ٢.

(137) زیرِ نظر آیت مبارکہ پر غور فرمائیے: ﴿يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله و ذروا ما بقی من الربا ان كنتم مؤمنين فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله و رسوله وان تبتم فلكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون﴾ (البقرة: ٢٧٨ - ٢٧٩) ''مومنو! خدا سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) خدا اور رسول سے جنگ کرنے کیلئے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کرلو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے، جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔''

(138) كنز العمال، الهندی، ١١/١٧٦-

(139) مجمع الزوائد، الهيثمی، ٧/٣٠٧-

(140) كنز العمال، الهندی، ١٤/٥٩١.

(141) البخاری، الصلاة، الفتن، ٧٠-٧٣؛ المسند، الامام أحمد، ٢/١٦١-١٦٤.

(142) طالقان نام کے دو شہر ہیں، ان میں سے ایک خراسان میں مروالروذ اور بلخ کے درمیان واقع ہے۔

(143) مسلم، العلم، ٦؛ البخاری، الأنبياء، ٥٠.

(144) أبو داؤد، الصلاة، ٨٨؛ المسند، الامام أحمد، ٥/٢٦٤-٢٦٥.

(145) البخاری، الطب، ١؛ ابن ماجة، الطب، ١.

(146) أبو داؤد، الطب، ١١؛ المسلم، السلام، ٦٩؛ المسند، الامام أحمد، ٣/٣٣٥.

(147) الترمذی، الطب، ٢؛ ابن ماجة، الطب، ١؛ ٤/٢٧٨؛ أبو داؤد، الطب، ١.

(148) الكلمات، بديع الزمان سعيد النورسي، ص ٢٧٩.

(149) البداية والنهاية، ابن كثير، ٨/ ٩٠-٩١؛ الكامل في التاريخ، ابن الأثير، ٢/ ٥٦٠.

(150) كتاب فضائل الصحابة، الامام أحمد بن حنبل، ٢/ ٧٤٢.

(151) البخاري، فضائل أصحاب النبي، ٢١؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٥٣-٥٥.

(152) البخاري، الطب، ٣٠؛ مسلم، السلام، ٩٨.

(153) البخاري، الطب، ٣٠؛ مسلم، السلام، ٩٨.

(154) البخاري، الطب، ١٩؛ المسند، الامام أحمد، ٢/ ٤٤٣.

(155) مسلم، الطهارة، ٩١؛ أبو داود، الطهارة، ٣٧؛ الترمذي، الطهارة، ٦٨؛ النسائي، الطهارة، ٥١، المياه، ٧.

(156) البخاري، بدء الخلق، ١٧؛ مسلم، الطهارة، ٩٣.

(157) أبو داود، الأضاحي، ٢١؛ الترمذي، الصيد، ١٦؛ النسائي، الصيد، ١٠؛ ابن ماجة، الصيد، ٢؛ المسند، الامام أحمد، ٣/ ٨٥.

(158) البخاري، الوضوء، ٢٦؛ مسلم، الطهارة، ٨٧؛ النسائي، الطهارة، ١، ١١٦؛ أبو داود، الطهارة، ٤٩؛ الترمذي، الطهارة، ١٩.

(159) البخاري، الجمعة، ٨؛ مسلم، الطهارة، ٤٢؛ أبو داود، الطهارة، ٢٥؛ الترمذي، الطهارة، ١٨؛ النسائي، الطهارة، ٦؛ ابن ماجة، الطهارة، ٧؛ المسند، الامام أحمد، ١/ ٨٠۔

(160) رسول دین کا مبلغ ہوتا ہے، واضع نہیں ہوتا، دین کی واضع صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے۔

(161) البخاري، الوضوء، ٧٣؛ مسلم، الطهارة، ٤٦-٤٧.

(162) الترمذي، الزهد، ٤٧؛ ابن ماجة، الأطعمة، ٥٠؛ المسند، الامام أحمد، ٤/ ١٣٢.

(163) كنز العمال، الهندي، ٣/ ٤٦٠.

(164) مسلم، السلام، ٨٨؛ أبو داود، الطب، ١٤؛ الترمذي، الطب، ٥، ٩؛ النسائي، الزينة، ٢٨؛ ابن ماجة، الطب، ٦، ٢٥.

(165) ابن ماجة، الطب، ٢٩؛ الترمذي، الطب، ١٣.

(166) البخاري، الطب، ٧.

(167) البخاري، الطب، ٥٨، بدأ الخلق، ١٧؛ أبو داود، الأطعمة، ٤٨.

(168) کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس چیز میں مکھی گر پڑے، مکھی کو اس میں ڈبونے کی بجائے اس چیز کو پھینک کیوں نہیں دیا جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ کسی غریب گھرانے کو پیش آئے جس کے پاس اس

کھانے کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو۔ایسی صورت حال میں یہ حل پیش کرنا اسے کھانا استعمال کرنے سے منع کرنے سے بہتر حل ہے۔(عربی مترجم)

(169) البخاری،الوضوء، ٦٣؛ مسلم، الحیض، ٦٢؛ أبو داؤد، الطهارة، ١٠٩،الطب، ١١.

(170) البخاری،اللباس،٦٣؛الاستئذان، ١٥؛ مسلم، الأشربة، ١٢؛النسائی، ١١٠٩؛الترمذی، الأدب، ١٤؛ ابن ماجة، الطب، ٢٨.

(171) مسلم، الطهارة،٤٩، ٥٦؛أبو داؤد،الطهارة،٢٩.

(172) صیقل الأسلام أو آثار سعید القدیم، بدیع الزمان سعیدالنورسی ،ص ٣٨٦.

(173) الشفاء،القاضی عیاض،١٧/١.

(174) البخاری،الحج، ١٣٢، المغازی،٧٧؛مسلم،الحج،١٤٧؛أبو داؤد،المناسك،٥٦؛ابن ماجة،المناسك،٧٦، ٨٤.

(175) البخاری،التوحید، ٢٢؛ مسلم؛ الایمان، ٢٨٨.

(176) مسلم،الجهاد، ٥٨؛المسند،الامام أحمد،١ /٣١- ٣٣.

(177) البخاری،الاعتکاف،٨؛مسلم ، السلام، ٢٤؛ابوداؤد،الصوم،٧٩، الأدب، ٨١؛ابن ماجة،الصیام، ٦٥.

(178) السیرة النبویة،ابن هشام، ٢٠٩/١. المسند احمد ابن حنبل٣/٢٥٤

(179) المسند، الامام أحمد،٣ /٤٤٧؛أبو داؤد، الأدب، ٨٠.

(180) البخاری، الایمان،٢٤؛مسلم،الایمان، ١٠٧.

(181) عمر بن الخطاب: جوانبه المختلفة وادارته للدولة،شبلی النعمانی ،٢١٣/١-٢١٤.

(182) أبو داؤد،الأدب، ٣٥؛ الترمذی، القیامة، ٥١؛ المسند، الامام أحمد، ١٨٩/٦.

(183) حضرت ماعز بن مالکؓ کے ساتھ بدکاری میں شریک عورت کو جب رجم کی سزا دی جانے لگی تو اس کا خون ایک صحابی کے چہرے پر لگا،جس پر انہوں نے اس عورت کو گالی دی، نبی کریم ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا:''اس کی توبہ اللہ کے ہاں قبول ہو چکی ہے۔''(عربی مترجم)مسلم، الحدود، ٢٣.

(184) أبو داؤد،الوتر،٣٢؛ النسائی، الاستعاذة،١٩، ٢٠؛ ابن ماجة، الأطعمة، ٥٣.

(185) البخاری، الجزیة، ٢٢؛البخاری، الادب٩٩، مسلم، الجهاد، ٩؛ أبو داؤد، الجهاد، ١٥٠.

(186) المسند،الامام أحمدبن حنبل،١٥٦/١.

(187) السیرةالنبویة،ابن هشام،١٢٧/٢.

(188) البخاری، تفسیر سورة(٩)٩؛المسند،الامام أحمد،٤/١.

(189) البخاری، الجهاد، ۲۰ ؛مسلم،الجهاد، ۷۸.

(190) البخاری، الجهاد، ۸٤، المغازی، ۳۱،

(191) الاصابة، ابن حجر، ۲/ ٤٦٠؛ السیرة النبویة، ابن هشام، ٤/ ٥٥.

(192) البخاری ، العلم، ۲، المسند الامام احمد ،۲ / ۳۲۱

(193) البخاری،الجمعة، ۱۱،الوصایا، ۹؛ مسلم،الامارة، ۲۰؛أبو داؤد،الامارة، ۱.

(194) المسند، الامام أحمد، ۳/ ۱۳۵.

(195) الترمذی، الایمان، ۱۲؛ النسائی ،الایمان، ۸؛ابن ماجة،الفتن، ۲؛ المسند،الامام أحمد ۲/ ۲۰٦، ۲۱۰، ۳۷۹.

(196) الترمذی، الایمان، ۱۲؛ ابن ماجة،الفتن، ۲.

(197) کنز العمال،الهندی، ٥/ ۳۲۸.

(198) المسند،الامام أحمد، ٥/ ۳۲۳.

(199) شجرہ طوبیٰ: مقام سدرۃ المنتهی پر ایک درخت ہے، جس نے پوری جنت کو اپنے سائے میں لیا ہوا ہے۔ (عربی مترجم)

(200) زیر نظر آیات دیکھئے: ﴿وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (هود: ۲۹) ''اور اے قوم! میں اس (نصیحت) کے بدلے تم سے مال و زر کا خواہاں نہیں ہوں میرا صلہ تو خدا کے ذمے ہے۔'' ﴿وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الشعراء: ۱۰۹) ''اور میں اس کام کا تم سے صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو خدائے رب العالمین ہی پر ہے۔'' ﴿قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (سبا: ٤۸) ''کہہ دو کہ میں نے تم سے کچھ صلہ مانگا ہے تو وہ تمہارا۔ میرا صلہ خدا ہی کے ذمے ہے اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے۔''

(201) البخاری،الرقاق، ٥۰؛مسلم،الایمان، ۳۷٤؛الترمذی، القیامة، ۱٦.

(202) السیرة النبویة،ابن هشام، ۳/ ۸٤_۸٥.

(203) الشفاء،القاضی عیاض، ۱/ ۱۰٥؛ البخاری، الأنبیاء، ٥٤؛ مسلم،الجهاد، ۱۰٥.

(204) المسند،الامام أحمد، ٥/ ۲٥٦_۲٥۷.

(205) المسند،الامام (206) مسلم، فضائل الصحابة، ۱۳۱؛ المسند،الامام أحمد، ۲/ ۱۳٦، ٤/ ٤۲۲، ٤۲٥.

(207) البخاری،المظالم، ۲۱ تفسیر سورة(٥)، ۱۰؛ مسلم،الأشربة، ٤؛ المسند الامام أحمد،

.۲۱۷/۳

(208) الرسول، سعيد حوى، ١٩/١؛ ایک دوسری روایت کے لیے دیکھئے: الاصابة، ابن حجر، ٣٠٧/٢.

(209) الترمذى، القيامة، ٤٢؛ ابن ماجة، اقامة الصلاة، ١٧٤، الأطعمة، ١؛ الدارمى الصلاة، ١٥٦، الاستئذان، ٤؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ١٦٣/٢ـ١٦٤.

(210) تفسير القرآن العظيم، ابن كثير، ١٦٤/٢؛ الجامع لأحكام القرآن، القرطبى، ١٩٧/٤.

(211) البخارى، التهجد ٦؛ مسلم، صفات المنافقين، ٨١. أحمد، ٤٢٢/٤.

(212) مسلم، الصلاة، ٢٢١-٢٢٢؛ الترمذى، الدعوات، ٧٥، ١١٢؛ النسائى، الطهارة، ١١٩، التطبيق، ٤٧؛ أبو داؤد، الصلاة، ١٤٨، الوتر، ٥: ابن ماجة، اقامة الصلاة، ١١٧، الدعاء، ٣؛ المسند، الامام أحمد، ٩٦/١، ١٨٨.

(213) السيرة النبوية، ابن هشام، ٣١٣/١ـ٣١٤؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٨٠/٣.

(214) المسند، الامام أحمد، ٢٣١/٢؛ مجمع الزوائد، الهيثمى، ١٩/٩-٢٠.

(214) المسند، الامام أحمد، ٢٣١/٢؛ مجمع الزوائد، الهيثمى، ١٩/٩-٢٠.

(215) البخارى، تفسير سورة (٦٦) مسلم، الطلاق، ٣١ـ

(216) ﴿اتبعوا من لا يسئلكم أجراً وهم مهتدون﴾ [يس: ٢١] ''اے میری قوم ایسوں کے پیچھے چلو جو تم سے صلہ نہیں مانگتے۔''

(217) البخارى، البيوع، ٥٧، مناقب الأنصار، ٤٥، اللباس، ١٦؛ المسند، الامام أحمد، ١٩٨/٦؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٢١٨/٣.

(218) حلية الأولياء، أبو نعيم، ١٠٩/٧؛ كنز العمال، الهندى، ١٩٩/٧.

(219) مسلم، الأشربة، ١٤٠؛ الترمذى، الزهد، ٣٩.

(220) البخارى، فضائل أصحاب النبى، ١٢، ١٦؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٩٣ـ٩٤.

(221) البخارى، المناقب، ٢٥؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٩٨ـ٩٩.

(222) البخارى، فضائل أصحاب النبى، ٩.

(223) النسائى، الزينة، ٣٩؛ المسند، الامام أحمد، ٢٧٨/٥.

(224) البخارى، فضائل أصحاب النبى، ٥؛ المسند، الامام أحمد، ٢٠٤/٢.

(225) مجمع الزوائد، الهيثمى، ٢١/٦.

(226) البخارى، الصوم، ٢٠؛ مسلم، الصيام، ٥٦.

(227) البخاری،الأطعمة،٢٣،الرقاق،١٧،الزهد،٢٠،٢٦.

(228) البخاری، الجنائز،٨٠؛مسلم،الایمان،٢٤؛النسائی،الجنائز،١٠٢؛البداية و النهاية،ابن كثير،١٥٣/٣.

(229) الاصابة،ابن حجر،١١٦/٤؛المسند،الامام أحمد،١٦٠/٣؛السيرة النبوية،ابن هشام، ٤٨/٤.

(230) مجمع الزوائد،الهيثمی،١٠١/٧.

(231a) "انّ الاسلام يجبّ ما كان قبله." "اسلام اپنے سے پہلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔" المسند،الامام أحمد،١٩٩/٤.

(231b) الاصابة،ابن حجر،٣٥٣/١؛ أسدالغابة،ابن الأثير،٥١/٢.

(232) البخاری،المغازی،٢٣؛المسند،الامام أحمد،١٠٥/٣؛السيرالنبوية،ابن هشام،٧٦/٣-٧٧.

(233) أسد الغابة،ابن الأثير،٧٠/٤-٧٣؛الاصابة،٤٩٦/٢-٤٩٧.

(234) البخاری،تفسير سورة(١١١)١؛مسلم،الايمان، ٣٥٥.

(235) المسند،الامام أحمد،١٥٩/١.

(236) السيرة النبوية،ابن هشام:٦٠/٢.

(237) السيرة النبوية،ابن هشام:٦٣/٢.

(238) السيرة النبوية،ابن هشام:٧٣/٢.

(239) رجال حول الرسول،خالدمحمدخالد،ص:٣٩.

(240) البخاری،الجنائز،٢٨.

(241) السيرةالنبوية،ابن هشام،٧٧/٢.

(242) السيرة النبوية،ابن هشام:٧٩/٢.

(243) البدايةو النهاية،ابن كثير،١٢١/٥.

(244) السيرةالنبوية،ابن كثير،١٢٠/٥.

(245) البدايةو النهاية،ابن كثير، ١٠٤/٣۔

(246) البدايةو النهاية،ابن كثير،١٠٥/٣.

(247) دلائل النبوة،البيهقی،٣٠٠/٢.

(248) كتاب الفقه على المذاهب الأربعة،الجزيری،٥٢٢/١.

(249) البخاری،بدء الوحی،٦؛مسلم،الجهاد،٧٤.

(250) البخاری،بدء الوحی،٦؛ مسلم،الجهاد،٧٤.

(251) البخاری،بدء الوحی،٦،تفسیر سورة(٣)٤.

(252) مجمع الزوائد،الهیثمی،٢٣٦/٨-٢٣٧؛الاصابة،ابن حجر،٢١٦/٢.

(253) البدایةو النهایة،ابن کثیر،٣٢٤/٥.

(254) البخاری،العلم،٧؛المسند،الامام أحمد،٢٤٣/١.

(255) البدایةو النهایة،ابن کثیر،٢٦٩/٤-٢٧٣.

(256) البدایة و النهایة،ابن کثیر،٢٧٣/٤؛کنزالعمال، الهندی،٣٧٤/١٣.

(257) البدایة و النهایة،ابن کثیر،٢٧١/٤؛المسند،الامام أحمد،١٩٩/٤.

(258) دیکھئے: البخاری،الصلاة،١؛مسلم،الایمان،٢٠٩؛ تفسیر القرآن العظیم،ابن کثیر،٤٢٤/٧.

(259) حضرت ابوموسیٰؓ سے مروی حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ کا حجاب نور ہے (اور ایک روایت میں السنار کے الفاظ ہیں) اگر اللہ تعالیٰ اس حجاب کو اٹھالیں تو تجلی خداوندی سے تاحد نگاہ باری تعالیٰ ہر چیز جل جائے۔'' مسلم، الایمان، ٢٩٣؛ ابن ماجة، المقدمة، ١٣؛ المسند،الامام أحمد، ٤٠١/٤.

(260) الشفاء، القاضی عیاض، ٦٧/١؛حلیةالأولیاء، أبو نعیم، ٢٦/٤.

(261) المسند، الامام أحمد، ٤٢٥/٣؛السیرة النبویة، ابن هشام، ٢٠٩/١.

(262) آسمان میں موجود معبود سے مراد حق تعالیٰ کی ذات تھی، جسے وہ اپنے دل سے نہ نکال سکے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تصور اور اس پر ایمان لوگوں کے دلوں میں اتنا اتر چکا تھا کہ طویل دورِ جاہلیت بھی اسے پوری طرح مسخ نہ کر سکا۔ اس کی یہی کافی دلیل ہے کہ زبان دل کی آواز کی سچی ترجمان ہوتی ہے۔

(263a) حضرت عمرانؓ حضرت حصینؓ کے بیٹے ہیں۔ (عربی مترجم)

(263b) الاصابة، ابن حجر، ٣٣٧/١.

(264) دیکھئے: کشف الخفاء، العجلونی، ١٣٢/١.

(265) المسند، الامام أحمد، ٦٥/٣،٦٤/٥؛مجمع الزوائد، الهیثمی،٧٢/٨.

(266) کتاب المغازی، الواقدی، ٩٩٣/٣-٩٩٤.

(267) کتاب المغازی،الواقدی،٩٩٣/٣-٩٩٦؛ السیرة النبویة، ابن هشام،٤١٣/٤-٤١٤؛البدایة و النهایة، ابن کثیر، ٣٥٩/٤-٣٦٠.

(268) مسلم، الزکاة،١٣٢-١٤١؛البخاری، مناقب الأنصار،١-٢،المغازی، ٥٦؛البدایةو النهایة، ابن کثیر،٤١١/٤.

(269) المسند، الامام أحمد،٢٥٠/٢،٤١٢؛ کنزالعمال،الهندی،٤١٢/١١.

(270) البخاری، الجهاد، ۱۲۲؛ مسلم، المساجد، ۶؛ نیز دیکھئے: کنز العمال، الهندی، ۱۱/۴۲۵.

(271) براق: وہ سواری جس پر آپ ﷺ سفرِ معراج واسراء میں سوار ہوئے تھے۔ (عربی مترجم)

(272) حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کے اس خطاب کی طرف اشارہ ہے: ﴿أم أنا خير من هذا الذي هو مهين ولا يكاد يبين﴾ (الزخرف: ۵۲) ''بیشک میں اس شخص سے جو کچھ عزت نہیں رکھتا اور صاف گفتگو بھی نہیں کرسکتا کہیں بہتر ہوں۔''

(273) الترمذی، القيامة، ۵۹.

(274) البخاری، الرقاق، ۳؛ الترمذی، الزهد، ۲۵؛ ابن ماجة، الزهد، ۳.

(275) دیکھئے: كشف الخفاء، العجلونی، ۲/۲۹۱.

(276) البخاری، الأدب، ۶۹؛ مسلم، البر، ۱۰۵؛ أبو داؤد، الأدب، ۸۰.

(277) البخاری، الأدب، ۹۶؛ مسلم، البر، ۱۶۵.

(278) البخاری، الحدود، ٤_٥؛ أبو داؤد، الحدود، ۳۵؛ المسند الامام أحمد، ۲/۲۹۸_۲۹۹.

(279) الترمذی، البر، ۵۵؛ المسند، الامام أحمد، ۵/۱۵۳

(280) كنز العمال، الهندی، ۶/۸۹

(281) البخاری، الجمعة، ۱۱؛ مسلم، الامارة ۲۰

(282) دیکھئے: ﴿ان الله لايغيّر مابقوم حتى يغيّر وا ما بأنفسهم﴾ (الرعد: ۱۱)''
؎ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (اقبال)

(283) الاصابة، ابن حجر، ٤/۲۸۸

(284) البخاری، بدء الوحی، ۱؛ مسلم، الامارة، ۱۵۵؛ أبو داؤد، الطلاق، ۱۱.

(285) مجمع الزوائد، الهيثمی، ۱/۶۱، ۱۰۹

(286) البخاری، الايمان، ۳۹؛ المساقاة، ۱۰۷؛ المسند، الامام أحمد، ٤/۲۷۰

(287) البخاری، الرقاق، ۳۱؛ مسلم، الايمان، ۲۰۶_۲۰۸.

(288) البخاری، الجهاد، ۱؛ مسلم، الامارة، ۸۵

(289) أبو داؤد، الجهاد، ۳۳؛ مجمع الزوائد، الهيثمی، ۱/۱۰۶

(290) درج ذیل حدیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے: ''حقیقی مہاجر وہ شخص ہے، جو اللہ تعالیٰ کی منع کردہ باتوں کو چھوڑ دے'' دیکھئے: البخاری، الايمان، ٤؛ النسائی، الايمان، ۹؛ أبو داؤد، الجهاد، ۲؛ ابن ماجة، الفتن، ۲.

(291) تذكرة الأولياء،فريدالدين عطار، (ترکی ترجمہ)ص ١٤٦_١٤٩.

(292) البخاری، الایمان، ٤؛ النسائی الایمان، ٩؛ أبو داؤد، الجهاد، ٢؛ ابن ماجة، الفتن، ٢

(293) البخاری، الایمان، ٢٠؛ مسلم، الایمان، ٦٢

(294) الترمذی، الزهد، ١١؛ ابن ماجة، الفتن، ١٢

(295) عمر بن الخطاب، جوانبه المختلفة، وادارته للدولة، شبلی النعمانی، ٢٩٩/١

(296) البخاری، الایمان، ١_ آئندہ چل کر ہم اس حدیث پر اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

(297) البخاری، الجنائز، ٣٢؛ مسلم، الجنائز، ١٤_١٥

(298) مسلم؛ الجنائز، ١٠٦؛ النسائی، الجنائز، ١٠٠؛ أبو داؤد، الجنائز، ٧٧؛ الترمذی، الجنائز، ٦٠؛ ابن ماجة، الجنائز، ٤٧

(299) مسلم، الجنائز، ١٠؛ البخاری، الجنائز، ٣٢

(300) أبو داؤد، النكاح، ٤٣؛ الترمذی، الأدب، ٢٨؛ الدارمی، الرقاق، ٣؛ المسند، الامام أحمد، ٣٥٣/٥، ٣٥٧.

(301) البخاری، الوصايا، ٩، الزكاة، ١٨؛ مسلم، الزكاة، ٩٤؛ النسائی، الزكاة، ٥٢؛ أبو داؤد، الزكاة، ٢٨؛ الدارمی، الزكاة، ٢٢؛ المسند، الامام أحمد، ٤/٢.

(302) الدارمی، الزكاة، ٢٢؛ البخاری، الزكاة، ١٨

(303) الترمذی، المناقب، ٥٥، نیز دیکھئے: الاصابة، ابن حجر، ١٤٣/٢، ١٤٤.

(304) أبو داؤد، الزكاة، ٢٧؛ ابن ماجة، الزكاة، ٢٥؛ المسند، الامام أحمد، ٢٧٧/٥، ٢٧٩، ٢٨١.

(305) البخاری، الزكاة، ٨؛ مسلم، الزكاة، ٦٣/٦٤.

(306) مسلم، الایمان، ١٧١_١٧٤؛ الترمذی، البيوع، ٥؛ النسائی، الزكاة، ٦٩، أبو داؤد، اللباس، ٢٥؛ المسند، الامام أحمد، ١٦٢/٥_١٦٨

(307) البخاری، المغازی، ٧٩؛ تفسير سورة (٩) ١٤_١٩؛ مسلم، التوبة، ٩.

(308) دیکھئے: اللمعات، بديع الزمان، سعيد النورسی، ص ١٠.

(309) مسلم، الایمان، ١٤٩؛ الترمذی، البر و الصلة، ٦١؛ أبو داؤد، اللباس، ٢٦؛ ابن ماجة، الزهد، ١٦.

(310) مسلم، البر و الصلة، ١٣٦؛ أبو داؤد، اللباس، ٢٦؛ ابن ماجة، الزهد، ١٦.

(311) الترمذی، البر، ٤٠.

(312) البخاری، الرقاق، ٢٣؛ الحدود، ١٩؛ الترمذی، الزهد، ٦١؛ المسند، الامام أحمد، ٣٣٣/٥.

(313) البخاری ،الجنائز،٣؛المسند،الامام أحمد،٤٣٦/٦ .

(314) فیض القدیر،المناوی، ٦٢٩/٣؛ کنز العمال،الهندی،٢٧٦/١٦ .

(315) مسلم ،الزکاة،٥٣؛المسند،الامام احمد،٥/ ١٦٧، ١٦٨ .

(316) مسلم،الطهارة،٣٩؛النسائی،الطهارة،١١٠؛ابن ماجة،الزهد،٣٦؛المسند، الامام أحمد،٣٠٠/٢ .

(317) مسلم،الطهارة، ٤١؛ الترمذی، الطهارة، ٣٩ .

(318) الترمذی،القیامة،٤٩؛ابن ماجة،الزهد،٣٠؛ الدارمی، الرقاق،١٨؛المسند،الامام أحمد،١٩٨/٣ .

(319) البخاری، الأذان،٣٦؛مسلم،الزکاة،٩١؛الترمذی،الزهد،٥٣ .

(320) مجمع الزوئد،الهیثمی،٢٧١/٢ .

(321) أبو داؤد،الأدب، ٧٨؛ المسند،الامام أحمد،٣٦٤/٥،٣٧١ .

(322) النسائی ،عشرة النساء،١؛ المسند، الامام أحمد،١٩٩/٣ .

(323) کنز الأعمال،الهندی،٢٨٤/٧ .

(324) دیکھئے:ابن ماجة،الطهارة،١١٤؛ المسند،الامام أحمد،٢٥٠/٥ .

(325) مجمع الزوائد،الهیثمی،٦١/١،١٠٩ .

(324) دیکھئے:ابن ماجة،الطهارة،١١٤؛ المسند،الامام أحمد،٢٥٠/٥ .

(325) مجمع الزوائد،الهیثمی،٦١/١،١٠٩ .

(327) البخاری، التوحید،٣٥؛مسلم،الجنة،٤-٥ .

(328) تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر،٩١/١ .

(329) مسلم، البر والصلة،٤٣؛أبو داؤد،اللباس،٢٥؛الترمذی،الأطعمة،٣٠؛ نیز دیکھئے:فیض القدیر،المناوی،١٢١/١؛کنز العمال،الهندی،٥٧٦/٦ .

(330) البخاری،الرقاق،٣٨ .

(331) البخاری،الأنبیاء،٥٤؛مسلم،السلام،١٥٣،١٥٤ .

(332) البخاری،المساقاة،٩؛مسلم، السلام،١٥١ ، ١٥٥؛الدارمی ،الرقاق،٩٣؛المسند،الامام أحمد،٥٠٧/٢ .

(333) البخاری،الرقاق، ٢٨؛ مسلم، الجنة، ١ .

(334) البخاری،الرقاق،٢٦؛مسلم،الفضائل،١٨؛الترمذی،الأدب،٨٢.

(335) الترمذی، العلم،١٦؛منهل الواردين شرح رياض الصالحين،صبحی صالح،١٥٢/١؛نیز دیکھئے:ابن ماجہ کی مختلف روایات ،المقدمة،٦؛المسند،الامام أحمد،١٢٦/٤-١٢٧؛ أبو داؤد،السنة،٥.

(336) البخاری،الأدب،٨٣؛مسلم،الزهد،٦٣.

(337) البخاری،المناقب،١؛مسلم،البر،١٦٠؛المسند،الإمام أحمد،٥٣٩/٢.

(338) البخاری،تفسير سورة(١١)،٥؛ مسلم،البر،٦١.

(339) كشف الخفاء،العجلونی،٦٤/٢-٦٥.

(340) آیت کریمہ: وكأين من قرية أمليت لها وهی ظالمة ثم أخذتها والی المصير ﴾(الحج:٤٨)
''اور بہت سی بستیاں ہیں کہ میں ان کو مہلت دیتا رہا اور وہ نافرمان تھیں پھر میں نے ان کو پکڑ لیا اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

(341) البخاری،الأذان،٣٦؛مسلم،الزكاة،٩١؛الترمذی،الزهد،٥٣.

(342) مسلم، الأمارة، ١٨؛ النسائی، القضاة، ١؛ المسند، الامام أحمد، ١٥٩/٢.

(343) الترمذی،الزهد،٤٤؛ابن ماجة،الزهد،٣؛المسند،الامام أحمد،٣٠١/١.

(344) البخاری،التيمم،١،الصلاة،مسلم،المساجد،٣.

(345) حدیث مبارک سے عبادت کا عبادت خانوں سے عدم ارتباط پہلے درجے میں اور مذہبی طبقے سے عبادت کا عدم ارتباط ثانوی درجے میں ثابت ہوتا ہے۔

(346) أبو داؤد،الجهاد،٣٣؛مجمع الزوائد، الهيثمی،١٠٦/١.

(347) البخاری،الجمعة،١١؛مسلم،الامارة،٢٠.

(348) البخاری،تفسير سورة(٥)١١؛مسلم،الأقضية،١٢.

(349) البخاری، الرقاق،٢٣؛مسلم،الايمان،٧٥.

(350) البخاری،تفسير سورة(٣١) ٢؛مسلم،الايمان،٥،٧.

(351) البخاری،التوحيد،٣٥؛مسلم،الجنة،٢-٤.

(352) البخاری،الدعوات،٦،٨،٩؛مسلم،الذكر،٥٦،٥٧.

(353) البخاری،الأذان،٨٩؛مسلم،المساجد،١٤٧؛ابن ماجة،الدعاء٤.

(354) المسند،الامام أحمد،١٤٧/٦.

(355) البخاری،الأذان،١٥٥؛مسلم،الصلاة،٢٠٥؛أبو داؤد،الصلاة،١٣٩.

(356) المسند،الامام أحمد،١٩١/٥؛مجمع الزوائد،الهیثمی،١١٣/١٠.

(357) المسند،الامام أحمد،١٩١/٥؛مجمع الزوائد،الهیثمی،١١٣/١٠.

(358) المسند،الامام أحمد،١٩١/٥؛مجمع الزوائد،الهیثمی،١١٣/١٠.

(360) مجمع الزوائد،الهیثمی،١١٧/١٠.

(361) الترمذی،الدعوات،٨٨.

(362) مسلم، الذکر،٧٣؛ أبو داؤد، الوتر، ٣٢.

(363) الترمذی،الدعوات،٢٣؛النسائی، السهو،٦١؛ مجمع الزوائد،الهیثمی،١٧٣/١٠.

(364) الترمذی،تفسیر سورة (٣٨) ٢؛ الموطأ،القرآن،٤٠.

(365) المستدرك،الحاکم،٥٢٠/١.

(366) المستدرك،الحاکم،٤٩٩/١.

(367) ابن ماجة،الدعاء،٢؛مسلم،الذکر،٧٢؛ الترمذی، الدعوات، ٧٢؛المسند،الامام أحمد،٤١٦/١،٤٣٤،٤٣٧.

(368) المسند،الامام أحمد،١٨١/٤؛المستدرك، الحاکم،٥٩١/٣.

(369) الشفاء،القاضی عیاض،١٧/١.

(370) مجمع الزوائد،الهیثمی،٢١٦/١٠، کنز العمال،الهندی، ٢٤٤/٤.

(371) البخاری،الأنبیاء،٥٤؛مسلم،السلام،١٥٣.

(372) البخاری،المساقاة،٩؛مسلم،السلام، ١٥١؛ الدارمی،الرقاق،٩٣؛المسند،الامام أحمد،٥٠٧/٢.

(373) البخاری،المغازی،٢٣.

(374) السیرة النبویة،ابن هشام،١٠٣/٣.

(375) البخاری،المغازی، ٣٤؛مسلم،الجهاد، ١٠٠-١٠١.

(376) البخاری، الأنبیاء،٥٤؛مسلم،الجهاد،١٠٤-١٠٥.

(377) السیرة النبویة،ابن هشام، ٥٥/٤؛ البدایةو النهایة،ابن کثیر،٣٤٤/٤-

(378) البدایةو النهایة،ابن کثیر، ٣٢١/٣- ٣٢٢؛السیرة النبویة،ابن هشام،٣٦٦/٢.

(679) البدایة و النهایة،ابن کثیر،٣٢٢/٣-

(380) مسلم،الجهاد،٥٨؛ الترمذی،تفسیر سورة(٨)٣؛المسند،الامام أحمد،١/٣٢؛السير النبوية،ابن هشام،٢/٢٧٩؛البداية و النهاية،ابن كثير،٣/٣٣٢.

(381) البخاری،الكفالة،٤؛ مسلم،الفرائض، ١٤.

(382) البخاری، الاستقراض، ١١؛مسلم،الفرائض،١٤؛المسند،الامام أحمد،٣/٣٣١۔

(383) البخاری،فضائل أصحاب النبی،٢٠؛أسد الغابة،ابن الأثير،١/٤٦٨.

(384) أسد الغابة،ابن الأثير،١/٤٦٨.

(385) مسلم،البر،٨٧.

(386) الشفاء، القاضی عياض، ١/١٧.

(387) المقفّی: یعنی خاتم النبیین ۔(عربی مترجم)

(388) الحاشر: یعنی وہ جس کے اور حشر ونشر کے درمیان کوئی اور نبی نہ ہو،ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے سامنے حشر برپا کریں گے۔(عربی مترجم)

(389) مسلم، الفضائل،١٢٦؛المسند،الامام أحمد،٤/٣٩٥.

(390) البخای،الأذان، ٦٥، مسلم،الصلاة، ١٩٢.

(391) مسلم،الحدود،١٧-٢٣؛البخاری،الحدود،٢٨؛المسند،الامام أحمد،١/٢٣٨،٢/٤٥٠.

(392) مسلم،الأيمان،٣١،٣٣؛أبو داؤد،الأدب،١٢٣؛ المسند، الامام أحمد،٣/٤٤٧.

(393) مسلم، الأيمان،٣٠.

(394) المسند،الامام أحمد،٣/١١٢.

(395) البخاری،الأدب،١٨؛مسلم،الفضائل،٦٠.

(396) الترمذی، البر،١٦؛ أبو داؤد، الأدب،٥٨.

(397) البخاری، الأدب،١٨؛مسلم، الفضائل،٦٤؛ابن ماجة،الأدب،٣؛المسند،الامام أحمد،٦/٥٦.

(398) البخاری، الجنائز،٤٥؛مسلم،الجنائز،١٢.

(399) الترمذی،فضائل الجهاد،١٢.

(400) البخاری،الجنائز،٣.

(401) البخاری،المغازی،٢٧؛مسلم،الفضائل،٣٠؛ النسائی،الجنائز،١٠٣؛الطبقات الكبرى،ابن سعد،٢/٢٠٥؛السيرة النبوية،ابن هشام،٤/٣٠٠.

(402) البخاری،الطلاق،٢٥،الأدب،٢٤؛ مسلم،الزهد،٤٢.

(403) أبو داؤد،الأدب،١٦٤،الجهاد،١١٢؛المسند،الامام أحمد،٣٠٣/١.

(404) البخاری،الجهاد،١٥٣؛مسلم،السلام،١٤٨.

(405) البخاری، جزاء الصيد،٧؛مسلم،السلام،١٣٧؛ النسائی،الحج،١١٤؛المسند،الامام أحمد،٣٨٥/١.

(406) المستدرك،الحاكم،٢٣١/٤،٢٣٣.

(407) مجمع الزوائد، الهيثمی،٩/٩؛الخصائص الكبری،السيوطی،٩٥/٢.

(408) السيرة النبوية،ابن هشام،٨٨/٣؛ البداية والنهاية،ابن كثير،٣٦/٤.

(409) مسلم،صلاة المسافرين،١٣٩؛ ابن ماجة،الأحكام،١٤؛المسند،الامام أحمد،٩١/٦.

(410) البخاری،الأنبياء،٢٤؛ مسلم، الايمان،٢٧٢.

(411) یہاں ترکی کی تحریک النور کے بانی بدیع الزمان سعید نوری مراد ہیں، جنہوں نے تمام عمر ایک عدالت سے دوسری عدالت اور ایک جیل سے دوسری جیل منتقل ہوتے گزاری۔ (عربی مترجم)

(412) أبو داؤد،الأدب،٨٥؛الترمذی، الفتن،٣؛المسند،الامام احمد،٣٦٢/٥.

(413) البخاری، الفتن٧؛ مسلم،البر والصلة،٢٦.

(414) البخاری،المرضی،٣،١٣؛مسلم،البر،٤٥؛ المسند، الامام أحمد،٣٨١/١.

(415) البخاری،التوحيد،٣٧؛ مسلم، الايمان،٢٦١؛النسائی،الصلاة،٢.

(416) البخاری،التوحيد، ٣٧؛الدعوات،٣؛الترمذی،تفسير سورة(٤٧)١؛ابن ماجة،الأدب،٥٧؛المسند،الامام أحمد،٢٨٢/٢،٣٤١.

(417) ممکن ہے اس شخص کا تعلق مغل نسل سے ہو، کیونکہ سیرت کی کتابوں میں اس کی یوں تصویر کشی کی گئی ہے کہ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، پیشانی اٹھی ہوئی، رخسار ابھرے ہوئے اور چہرہ ڈھال کی طرح گول تھا۔

(418) البخاری،الأدب،٩٠؛المناقب،٢٠؛ مسلم، الزكاة، ١٤٢؛المسند الام أحمد،٦٥/٣.

(419) مسلم،الزكاة،١٤٢؛ المسند، الامام أحمد،٣٥٤/٣.

(420) البخاری،المناقب،٢٥؛ مسلم، الزكاة، ١٤٢.

(421) البخاری،الهبة،٢٨؛أبو داؤد،الدية،٦؛ البداية والنهاية،ابن كثير،٢٣٧/٤.

(422) أبو داؤد،الأدب،١؛النسائی ،القسامة،٢٤.

(423) الکلمات،بدیع الزمان سعید النورسی،ص ٥٧٥_٥٧٦.

(424) المستدرك،الحاکم،٢٤٢/٣.

(425) الاصابة،ابن حجر،٥٦٦/١؛المستدرك، الحاکم،٦٠٤/٣؛الخصائص الکبری، السیوطی، ٢٦/١؛زادالمعاد،ابن قیم الجوزیة، ٥٩/١.

(426) البخاری،العلم،٢٨،الأذان، ٦١، الأدب، ٧٥؛ مسلم،الصلاة،١٨٢.

(427) [البخاری،الأذان،٦٣،الأدب،٧٤،مسلم،الصلاة،١٧٩؛النسائی،الافتتاح،٧١.

(428) البخاری،المغازی،٥١؛الدیات،٢؛مسلم،الایمان،١٥٨؛أبو داؤد،الجهاد،٩٥.

(429) البخاری،الایمان،٢٢؛مسلم،الایمان،٣٨_٤٠.

(430) البخاری،تفسیر سورة(٧)٣.

(431) السیرة النبویة، ابن هشام،٢٨٥/١.

(432) البخاری، الرقاق،٣؛ الترمذی،الزهد، ٤٤؛ المسند،الامام أحمد،٣٩١/١.

(433) حلیة الأولیاء،أبونعیم،٣٠/١.

(434) تاریخ الأمم والملوك،الطبری،٢٥٠/٤_٢٥٢.

(435a) البخاری،تفسیرسورة(٦٦)٢،مسلم،الطلاق،٣١.

(435b) الطبقات الکبری،ابن سعد،١٥٢/٢.

(436) مسلم، الفضائل،٤٨(عن أنس)؛البخاری، المناقب، ٢٣ (عن البراء)

(437) کنزالعمال، الهندی،١٦٨/٦.

(438) البخاری،الجهاد،٢٤؛مسلم،الفضائل،٤٨.

(439) البخاری،الصوم،٧؛مسلم،الفضائل،٥٠.

(440) البخاری،الدعوات،١١؛ أبو داؤد،الأدب،١٠٠؛المسند،الامام أحمد،١٣٦/١.

(441) البخاری،الجهاد،٥٢؛مسلم،الجهاد،٧٨،الفضائل،٤٨.

(442) مسلم،الفضائل،٥٩؛الاصابة،ابن حجر، ١٨٧/٢؛المسند،الامام أحمد،٤٦٥/٦؛ کنزالعمال،الهندی،٥٠٠/١٠؛ السیرةالنبویة، ابن هشام،١٣٧/٤

(443) البدایةوالنهایة،ابن کثیر،٦٣/٦.

(444) الترمذی،البر، ٤٠.

(445) کنزالعمال ،الهندی،٥٧١/٦.

(446) البدایةو النهایة،ابن کثیر،۳/۱۵۸، ۱۵۹؛أعلام النساء،عمر رضا الکحّالة، ۳۲۶ـ۳۳۱.

(447) المسند، الامام أحمد،۳/۷۶؛مجمع الزوائد،الهیثمی،۱۰/۳۲۵؛کنزالعمال،الهندی، ۳/۱۱۳.

(448) البدایةوالنهایة، ابن کثیر،۸/۵.

(449) السیرةالنبویة،ابن هشام،۲/۱۳۷.

(450) مجمع الزوائد،الهیثمی،۶/۱۶۹؛السیرةالنبویة،ابن هشام،۴/۴۷، ۴۸.

(451) الترمذی،الشمائل،۲۸۳؛المسند، الامام أحمد،۶/۲۵۶.

(452) المسند،الامام أحمد،۲/۳۸۱؛السیرةالنبویة،ابن هشام،۲/۱۴۱.

(453) الترمذی،الزهد،۳۹.

(454) مجمع الزوائد،الهیثمی،۱۰/۲۰؛ابن ماجة،الأطعمة،۳۰ـ

(455) کنزالعمال،الهندی،۳/۱۱۳؛مجمع الزوائد،الهیثمی،۱۰/۳۲۵؛المسند،الامام أحمد،۳/۷۶.

(456) الشفاء،القاضی عیاض،۱/۱۳۱.

(457) المسند،الامام أحمد،۱/۸۶.

(458) البخاری،الرقاق،۱۸،المرضی،۱۹؛ مسلم، ۷۱ـ۷۶.

(459) الترمذی،الدعوات،۱۰۹؛ ابوداؤد،الوتر، ۲۳؛ ابن ماجة،المناسك،۵.

(460) المسند،الامام أحمد،۲/۲۳۱؛مجمع الزوائد،الهیثمی، ۹/۱۸ـ۱۹.

(461) الشمائل،الترمذی،ص ۲۷۶ـ۲۷۸؛الترمذی،المناقب،۸؛الطبقات الکبری،ابن سعد،۱/۱۲۱.

(462) کشف الخفاء العجلونی،۲/۶۴؛الفوائدالمجموعة،الشوکانی،ص۲۸۶.

(463) البخاری،الهبة،۱،الرقاق،۱۷؛مسلم، الزهد،۱۸.

(464) دیکھئے:البخاری،المغازی،۸۳؛ابن ماجة،الجنائز، ۶۵؛ الدارمی،المقدمة،۱۴.

(465) البخاری،فرض الخمس،۱؛ مسلم،الجهاد،۵۲؛مجمع الزوائد،الهیثمی،۹/۲۱۱؛الطبقات الکبری،ابن سعد،۸/۲۹؛الاصابة لابن حجر،۴/ ۳۷۹.

(466) یہ دوآیتیں دیکھئے: ﴿یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیَاةَ الدُّنْیَا وَزِینَتَهَا فَتَعَالَیْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحاً جَمِیلاً ()وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْراً عَظِیماً﴾(الأحزاب:۲۸ـ۲۹)''اے پیغمبر!اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم

دنیا کی زندگی اوراس کی زینت وآرائش کی خواستگار ہوتو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کردوں اوراگرتم خدا اور اس کے پیغمبراور عاقبت کے گھر (یعنی بہشت) کی طلبگار ہوتو تم میں جونیکوکاری کرنے والی ہیں ان کے لیے خدانے اجرعظیم تیارکررکھاہے۔

(467) البخاری،النکاح،٩٨؛مجمع الزوائد، للهيثمي، ٦٤٦/٩.

(468) أبو داؤد،الطلاق،٣٨؛النسائی،الطلاق، ٧٦ ؛ ابن ماجة ،الطلاق ،١؛الدارمی ،الطلاق ،٢؛مجمع الزوائد،الهيثمي،٢٤٤/٩.

(469) البخاری،الصلاة،٨٠؛فضائل أصحاب النبی،٣؛ مسلم، فضائل الصحابة،٢.

(470) البخاری،الوضوء،٤٤؛ الأذان،٩؛ مسلم، الصلاة، ٩١-٩٢.

(471) النسائی،عشرة النساء،٢؛أبو داؤد، النكاح،٣٧-٣٨؛الترمذی،النكاح،٤٢؛الطبقات الكبرى،ابن سعد، ٢٣١/٢.

(472) البخاری،الأدب،٦٨؛مسلم،فضائل الصحابة،٢٢.

(473) البخاری،الشروط،١٥.

(474) الترمذی،الرضاع،١١؛ أبو داؤد،السنة،١٥؛الدارمی،الرقاق،٧٤.

(475) حلية الأولياء،أبو نعيم،١٠٠/٨.

(476) البخاری،المظالم،٢٤؛مسلم الطلاق،٢٢،٣٥.

(477) الطبقات الكبرى،ابن سعد،١٠٨/٢.

(478) مسلم،الفضائل،٦٣؛المسند،الامام أحمد،١١٢/٣.

(479) البداية و النهاية،ابن كثير،٣٢٨/٥.

(480) مسلم،الفضائل،٦٣؛مجمع الزوائد،الهيثمي،١٦١/٩.

(481) البخاری، الجنائز،٤٤-٤٥؛مسلم،الفضائل ،٦٢-٦٣،الجنائز،١٢؛ابن ماجة،الجنائز،٥٣؛المسند،الامام أحمد،١٩٣/٣؛أبو داؤد،الجنائز،٢٤.

(482) مجمع الزوائد،الهيثمي،١٦١/٩.

(483) كنز العمال،الهندی، ٦٥٠/١٣.

(484) مجمع الزوائد،الهيثمي،١٨٢/٩.

(485) البخاری،الزكاة،٥٧؛مسلم،الزكاة،١٦١؛المسند،الامام أحمد،٢٧٩/٢.

(486) دیکھئے: حياة الصحابة،الكاندهلوی،٦٨٨/٢-٦٨٩.

(487) البخاری،الأدب،١٨؛ مسلم،المساجد،٤١-٤٣.

(488) مسلم،فضائل الصحابة،٩٨؛البخاری، المناقب،٢٥؛مجمع الزوائد،الهیثمی،٢٠٣/٩.

(489) البخاری،فضائل أصحاب النبی،١٦؛مسلم،فضائل الصحابة،٩٣.

(490) البخاری،فضائل أصحاب النبی،١٦؛مسلم،فضائل الصحابة،٩٣.

(491) مسلم،فضائل الصحابة،٩٨،٩٩؛البخاری،المناقب،٢٥.

(492) البخاری،فرض الخمس،١؛مسلم، الجهاد،٥٢؛مجمع الزوائد،الهیثمی،٢١١/٩؛الطبقات،ابن سعد،٢٩/٨؛الاصابة،ابن حجر،٣٧٩/٤.

(493) النسائی،الزینة،٣٩؛المسند،الامام أحمد،٢٧٨/٥.

(494) البخاری،الأدب،٩٦؛مسلم،البر،١٦٥.

(495) البخاری،فضائل أصحاب النبی،٩_مسلم،الذکر،٨٠-٨١؛أبو داؤد،الأدب،١٠٠.

(496) مجمع الزوائد،الهیثمی،١٧٢/٩؛فیض القدیر، المناوی،٢٢٣/٢؛تاریخ البغداد، البغدادی،٣١٧/١.

(497) أبو داؤد،النکاح،٤١؛الدارمی،الصلاة،١٠٩.

(498) مؤلف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ واقعات میں واضح طور پر ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ اپنے اور واقعات کے درمیان اسباب کا پردہ حائل رکھتے ہیں۔(عربی مترجم)

(499) دیکھئے: السیرة النبویة،ابن هشام،٢٦٢/١.

(500) النسائی،السهو،١٨؛أبو داؤد،الصلاة،١٠٧؛المسند،الامام أحمد، ٢٥/٤_٢٦.

(501) مسلم،الصلاة،٢٢١؛النسائی،عشرة النساء،٤.

(502) بعض غیر معتدل افراد کے اس نسب سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے یہ عمومی قاعدہ نہیں ٹوٹتا۔

(503) البخاری،المناقب،١٨؛ مسلم، الفضائل،٢٠_٢٣؛المسند، الامام أحمد،٢٥٧/٢،٣٩٨.

(504) البخاری،النکاح،٣٦؛أبو داؤد، الطلاق،٣٣.

(505) استاذ بدیع الزمان سعید نورسی مراد ہیں۔

(506) تاریخ الأمم و الملوك،الطبری،١٩٥/٥؛ حلیة الأولیاء،أبو نعیم،٥٣/١؛الطبقات الکبری،ابن سعد،٣٠٥/٣.

(507) مجمع الزوائد،الهیثمی،٣٦٠/١٠.

(508) المسند،الامام أحمد،٣٧٩/١؛الطبقات الکبری،ابن سعد،١٥٠/٣.

(509) الکامل فی التاریخ،ابن الأثیر،١٠٦/٤ .

(510) ''طارق'' عبدالحق حمید طرخان (بزبانِ ترکی).

(511) فیض القدیر، المناوی،٢٩٠/٢ .

(512) کنز العمال،الهندی،٩٠٧/٣ .

(513) البخاری،البیوع،١٥؛ابن ماجة،التجارات،١ .

(514) البخاری،الزکاة،٣،٥٠،٥٣؛البیوع،١٥؛الترمذی،الزکاة،٣٨؛ النسائی، الزکاة،٨٥؛المسند، الامام أحمد ، ١٣٤/١

(515) أبو داؤد،النکاح،٣؛النسائی،النکاح،١١؛المسند،الامام أحمد، ١٥٨/٣، ٢٤٥ .

(516) فیض القدیر،المناوی، ٢٦٩/٣ .

(517) أبو داؤد،البیع، ٥٤؛المسند،الامام أحمد،٨٤/٢ .

(518) مسلم،القدر،٣٤؛ابن ماجة،المقدمة،١٠ .

(519) الجامع لأحکام القرآن،القرطبی،٢٢٠/١٤؛روح المعانی،الآلوسی،١٩١/٢٢؛تفسیر النسفی،النسفی،٣٤٠/٣؛الکشاف،الزمخشری، ٣٠٨/٣ .

(520) کشف الخفاء،العجلونی،٣١٠/١

(521) البخاری، الوضوء،٥٦-٥٨؛مسلم،الطهارة،٩٨-١٠٠

(522) الدارمی،المقدمة،١

(523) مسلم،الزکاة،١٠٨،أبو داؤد،الزکاة، ٢٧؛ابن ماجة،الجهاد،٤١ .

(524) مسلم، الزکاة،١٠٨ ل؛ابو داؤد،الزکاة،٢٧؛ابن ماجة،الجهاد،٤١ .

(525) البخاری،الزکاة،٥؛ الوصایا، ٩؛الترمذی،القیامة،٢٩ .

(526) السیرة النبویة،ابن هشام،٣٥٩/١-٣٦٠؛المسند،الامام أحمد،٢٠١/١-٢٠٢ .

(527) اس لیے کہ استنبول کی فتح کا سال (۱۴۵۴ء) یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے تاریک دور کے اختتام اور نشاۃ ثانیہ کا آغاز تصور ہوتا ہے۔

(528) البخاری،الحدود،١٣؛مسلم،الحدود،١٠

(529) البخاری، الدیات،٥؛مسلم،القسامة،١٥،١٦

(530) البخاری، الدیات،١٠ .

(531) البخاری،تفسیر سورة(٥٩)٦؛مسلم،الاشربة،١٧٢،١٧٣ .

(532) أسد الغابة،ابن الأثير،٨٩/٧-٩٠؛ الاصابة،ابن حجر،٢٨٧/٤-٢٨٨.

(533) الترمذی،الاستئذان،٣٤؛المستدرك،الحاكم،٢٤١/٣-٢٤٢؛الاصابة،ابن حجر، ٤٩٦/٢؛ مجمع الزوائد،الهيثمی،٣٨٥/٩

(534) دیکھیے: كنز العمال،الهندی، ٥٤١/١٣؛السنن الكبری،البيهقی،٤٤/٩.

(535) كنز العمال،الهندی،٨٠٨/٥.

(536) جُهَيْنَة کی ایک شاخ ہے۔(عربی مترجم)

(537) مسلم،الحدود،٢٢-٢٣؛أبو داؤد، الحدود، ٢٤؛الدارمی،الحدود،١٧.

(538) الكامل فی التاريخ،ابن الأثير،١٠٦/٤

(539) الكامل فی التاريخ،ابن الأثير،٥٦٢/٤

(540) أصول السرخسی،السرخسی،٥/١

(541) یعنی انہیں میری یاداشت میں محفوظ احادیث کا چالیسواں حصہ یاد تھا۔(عربی مترجم)

(542) هدی الساری،ابن حجر العسقلانی،ص ٩

(543) الأسرار المرفوعة، علی القاری،ص ١٩٣

(544) جامع كرامات الأولياء،النبهانی،١٥٨/٢.

(545) مصنف اس طرف اشارہ کررہے ہیں کہ ایک امریکی مصنف مائیکل ہارٹ(Michael Hart)نے انسانی تاریخ پراثرانداز ہونے والی سو شخصیات کے ضروری کوائف کمپیوٹر کو فراہم کیے،جس کے نتیجے میں مرتب ہونے والی فہرست میں سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا اسم گرامی تھا۔یہ کتاب "The Hundred" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔(عربی مترجم)

(546) المسند،الامام أحمد،٣٦٢/١؛السيرة النبوية،ابن هشام، ٥٨/٢-٥٩؛ البداية و النهاية،ابن كثير،١٥٢/٣؛المستدرك،الحاكم،٤٣٢/٢.

(547) المسند،الامام أحمد،٢٥٧/٤؛المستدرك،الحاكم،٥١٨/٤.

(548) البداية والنهاية،ابن كثير،١٢٩/٣.

(549) الترمذی،المناقب،٣٣.

(550) كنز العمال،الهندی،٨٩/٦.

(551) البداية والنهاية،ابن كثير،٤٠/٣-٤١.

(552) السيرة النبوية،ابن هشام،٢٣٤/١؛البداية والنهاية،ابن كثير،٢٠١/٣.

(553) السيرة النبوية، ابن هشام، ١/٢٤٤؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٣/٨٤.

(554) البخارى، مناقب الأنصار، ٣٣؛ مسلم، فضائل الصحابة، ١٣٢-١٣٣؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٣/٤٥-٤٧.

(555) مجمع الزوائد، الهيثمى، ٩/٣٣٠؛ الاصابة، ابن حجر، ٤/٦٢.

(556) مسلم، الامارة، ١٦-١٧؛ المسند، الامام أحمد، ٥/١٧٣.

(557) كنز العمال، الهندى، ١١/٥٦٣، ١٣/١٥.

(558) مجمع الزوائد، الهيثمى، ٩/٣٣٠

(559) البخارى، فضائل أصحاب النبى، ٥-٧؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٢٩.

(560) مسلم، صلاة المسافرين، ٢٩٤؛ المسند أحمد، ٤/١١٢.

(561) المسند، الامام أحمد، ٥/٢٥٦-٢٥٧.

(562) مسلم، فضائل الصحابة، ١٣١؛ المسند، الامام أحمد، ٢/١٣٦، ٤/٤٢٢، ٤٢٥.

(563) البخارى، فضائل أصحاب النبى، ٩؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٣٤.

(654) البخارى فضائل أصحاب النبى، ٢٥.

(565) رجال حول الرسول، خالد محمد خالد، ص ٢٩٣.

(566) الاصابة، ابن حجر، ٣/٢٣٩-٢٤٠.

(567) البخارى، فضائل أصحاب النبى، ١٧؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٦٣؛ الاصابة، ابن حجر، ١/٣١.

(568) المسند، الامام أحمد، ٣/٤٢٥؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ١/٢٠٩.

(569) البخارى، المغازى، ٥٦؛ مسلم، الزكاة، ١٣٢-١٣٥؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ٤/١٤١-١٤٢.

(570) ۱۹۸۹ء میں ہمارے تین لاکھ دینی اور قومی بھائیوں کو بلغاریہ سے ترکی کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس ہجرت کے دوران بڑے دردناک واقعات پیش آئے۔

(571) مؤلف نے یہ بات سویت یونین کی شکست وریخت سے پہلے کہی تھی۔ (عربی مترجم)

(572) تفسير القرآن العظيم، ابن كثير، ٤/٤٢-٤٣ اور الدر المنثور، السيوطى، ٤/١١٧-١١٨ میں آیت مبارکہ: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (الأنفال: ٧٥) ''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کرتے رہے وہ بھی تم ہی میں سے ہیں اور رشتہ دار خدا کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ

حق دار ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ خدا ہر چیز سے واقف ہے۔"

(573) البخاری، مناقب الأنصار، ۳.

(574) الترمذی، القیامة، ٤٤؛ المسند، الامام أحمد، ۳/ ۲۰۰، ۲۰٤.

(575) ابن ماجة، التجارات، ٤٠؛ مجمع الزوائد، الهیثمی، ٤/ ٧٦.

(576) السیرة النبویة، ابن هشام، ۲/ ١٤٧.

(577) البخاری، المغازی، ۲٦.

(578) السیرة النبویة، ابن هشام، ۳/ ١۲٨.

(579) البدایة و النهایة، ابن کثیر، ٤/ ٥٦.

(580) البخاری، المغازی، ٢٥؛ السیرة النبویة، ابن هشام، ۳/ ٩٩ـ ١١١؛ الطبقات الکبری، ابن سعد، ۲/ ٤۲ـ ٤٩.

(581) السیرة النبویة، ابن هشام، ۳/ ١۲٨.

(582) لبخاری، المغازی، ٢٥؛ السیرة النبویة، ابن هشام، ۳/ ٩٩ـ ١١١؛ الطبقات الکبری، ابن سعد، ۲/ ٤۲ـ ٤٩.

(583) الأسرار المرفوعة، علی القاری، ص ١٩۳.

(584) البخاری، المغازی، ۳٤؛ السیرة النبویة، ابن هشام، ۳/ ۳١۳.

(585) مجمع الزوائد، الهیثمی، ۲/ ۲٨٠.

(586) مسلم، الجهاد، ٨۳؛ المسند، الامام أحمد، ۳/ ۲٥٧؛ السیرة النبویة، ابن هشام، ۲/ ۲٦٦ـ ۲٦٧؛ البدایة و النهایة، ابن کثیر، ۳/ ۳۲٠ـ ۳۲۲.

(587) البخاری، المغازی، ٧٩؛ مسلم، التوبة، ٥۳.

(588) السیرة النبویة، ابن هشام، ۲/ ۲٧۳؛ البدایة و النهایة، ابن کثیر، ۳/ ۳۲٦.

(589) السیرة النبویة، ابن هشام، ۳/ ۲۳٥؛ الطبقات الکبری، ابن سعد، ۲/ ٦٦؛ البدایة و النهایة، ابن کثیر، ٤/ ١٠٩.

(590) دیکھئے: البخاری، الشروط، ١٥.

(591) المسند، الامام أحمد، ٥/ ٤٤١؛ کشف الخفاء، العجلونی، ۲/ ۳۲٦؛ الفوائد المجموعة، الشوکانی، ص ۲۲٧؛ المسند الفردوس، الدیلمی، ٤/ ۳٠٠.

(592) البخاری، الأحکام، ٤؛ مسلم، الامارة، ۳٧؛ ابن ماجة، الجهاد، ۳٩.

(593) البخاری،فضائل أصحاب النبی،٢٣؛أسدالغابة،الجهاد،٣٩.

(594) یہ واقعہ لے پالک بنانے کی حرمت سے پہلے کا ہے۔(عربی مترجم)

(595) البخاری،المغازی،١٢؛النکاح،١٥؛ أبو داؤد، النکاح،٩؛النسائی ،النکاح،٨؛الاصابة،ابن حجر،٥٦٣/١ـ ٥٦٤؛أسد الغابة،ابن الأثیر،٢٨١/١.

(596) البخاری،فضائل أصحاب النبی،١٧؛مسلم،فضائل الصحابة،٦٣.

(597) الاصابہ،ابن حجر،٥٦٤/١.

(598) الطبقات الکبری،ابن سعد،٨٠/٤؛الاصابہ،ابن حجر،٥٦٤/١.

(599) البخاری،المغازی،٤٤؛المسند،الامام أحمد،٢٩٩/٥.

(600) السیرةالنبویة،ابن هشام،٣٢٣/٣؛الطبقات الکبری،ابن سعد،٩٥/٢.

(601) الطبقات الکبری،ابن سعد،١٠٠/٢.

(602) السیرةالنبویة،ابن هشام،٣٣٠/٣.

(603) السیرةالنبویة،ابن هشام،٣٣٠/٣.

(604) السیرةالنبویة،ابن هشام،٣٢١/٣ـ ٣٣٣؛البدایةو النهایة،ابن کثیر،١٨٨/٤.

(605) السیرةالنبویة،ابن هشام، ٣٣٧/٣ـ ٣٣٨.

(606) السیرةالنبویة،ابن هشام،٣٣٤/٣.

(607) السیرةالنبویة،ابن هشام، ٣٢/٤ـ ٣٧.

(608) البدایة و النهایة،ابن کثیر، ٤/ف٢٧٢.

(609) البدایة و النهایة،ابن کثیر،٢٦٩/٤.

(610) البخاری، تفسیر سورة(١١)٥؛مسلم،البرو الصلة،٦١.

نورِ سرمدی

جولوگ سالہا سال تک اپنے افکار ونظریات بارہا تبدیل اور ایک نظریہ چھوڑ کر دوسرا نظریہ اختیار کرتے رہے ہیں وہ یہ دیکھ اور آزما چکے ہیں کہ ان کی جدوجہد اور کوششوں کو کس طرح ناکامی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر انہوں نے مان لیا کہ واحد مکتب فکر جس کے قریب سے بھی رسوائی اور ناکامی کا گزر نہیں ہوا آپ ﷺ کا مکتب فکر ہے اور آپ ہی کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، چنانچہ انہوں نے اسے قبول کرلیا۔

کیا ہم دورِ حاضر کے انسان کے دل کو سید المرسلین ﷺ کی محبت سے لبریز اور آپ کی عظمت سے معمور کر سکے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔

اگر انسانیت آپ ﷺ کو کما حقہ پہچان اور سمجھ لیتی تو عشق ومحبت میں اپنے حواس کھو بیٹھتی اور اگر آپ ﷺ کی خوبصورت یادیں روحوں پر چھا جاتیں تو ان کے شوق کے جذبات بھڑک اٹھتے، آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتے، آپ ﷺ کی پاکیزہ نبوت کے عالم کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے بدن کانپ اٹھتے اور روحیں اپنے آپ کو ہوا کے سامنے ڈال دیتیں تاکہ آپ ﷺ کی آتشِ عشق میں جلنے والے دلوں کی چنگاری خاک ہو جانے کے بعد پھر سے بھڑک اٹھے اور وہ ہوا اسے اڑا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے جائے

ہماری عقلیں اس حقیقت کو سمجھیں اور اس کا احاطہ کریں یا نہ کریں، ہمارے دل ہمیشہ اسی شمع کے گرد اڑتے اور اسی آفتاب کے گرد چکر کاٹتے ہیں اور عنقریب آپ ﷺ کی طرف رجوع نہ کرنے اور آپ کے بارے میں لاپرواہی برتنے والے ندامت کے آنسو بہائیں گے اور رنج والم کے کڑوے گھونٹ پئیں گے۔ جس نے آپ کی پیروی نہ کی اور بھاگا اور موسم سرما کی مکھی کی طرح علیحدہ اور تنہا رہا، وہ عنقریب تکلیف سے کراہتے اور پشیمانی وحسرت سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہوئے کہے گا: ”میں کیوں نہ آپ کی طرف متوجہ ہوا اور پروانوں کی طرح آپ کے گرد گھوما۔“ لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی اور بہت سے لوگوں کے ہاتھ سے وقت نکل چکا ہوگا۔

ISBN 978-969-9110-21-4

9789699110214